# ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کا مابعد نوآبادیاتی مطالعہ

## تحقیقی مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی (اُردو)

مقالہ نگار

فردوس احمد بھٹ

نگران

پروفیسر (ڈاکٹر) عارفہ بشریٰ

شعبۂ اُردو

یونیورسٹی آف کشمیر، حضرت بل، سرینگر

(۲۰۲۲ء)

# فہرست

# پیش لفظ

اردو زبان وادب کے میدان میں بہت سی باکمال شخصیتیں عالمِ وجود میں آئیں جنھوں نے اپنے قابلِ قدر کارناموں سے زبان وادب کو معراج تک پہنچا دیا، انھیں باکمال ہستیوں میں ڈپٹی نذیر احمد کا بھی شمار ہوتا ہے۔ڈپٹی نذیر احمد ہندوستان کے نوآبادیاتی دور سے تعلق رکھتے ہیں جب انگریزوں نے ہندوستان کو اپنی نوآبادی بنایا تھا۔انھوں نے مختلف موضوعات ومضامین پر اپنے خیالات اور احساسات و جذبات کا اظہار کیا ہے۔مختلف اصنافِ ادب پر تخلیقی وتصنیفی کارنامے انجام دیئے ہیں لیکن بطور خاص ناول نگاری کے میدان میں انھیں بے پناہ شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی۔وہ اردو ناول کے موجد تسلیم کئے جاتے ہیں۔ان کے ناولوں میں عام طور پر اصلاحی پہلو غالب نظر آتا ہے۔لیکن اس کے علاوہ ان کے ناولوں کو مختلف پہلوؤں سے بھی جانچا گیا جیسا کہ اس مقالے میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ ان کے ناولوں کو مابعد نوآبادیاتی مطالعہ کے تناظر میں دیکھنے کی سعی کی گئی ہے۔مابعد نوآبادیاتی ادب میں نوآبادیاتی دور میں تخلیق کئے گئے ادب کو مطالعہ میں لایا جاتا ہے۔

کسی بھی زبان کے ادب نے ہمیشہ اپنے عہد کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا ہے۔کسی تخلیق کار کے تخلیقی عمل کا تجزیہ کرنے کے لیے اس کے عہد و ماحول کا مطالعہ ناگزیر تصوّر کیا جاتا ہے کیونکہ ہر تخلیق کار اپنے ادبی ماحول وفضا کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے احساسات و جذبات کا اظہار کرتا ہے اور بہ اقتضائے وقت اپنے موضوعات ومضامین کا انتخاب بھی کرتا ہے۔ڈپٹی نذیر احمد نے جس دور میں آنکھیں کھولیں وہ دور تعلیمی اور اخلاقی، سیاسی وسماجی اور مذہبی وملی اعتبار سے ایک انقلاب آفریں دور تھا۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد نوآبادیاتی نظام آہستہ آہستہ پورے معاشرے پر اثر انداز ہو رہا تھا جس کے نتیجے میں سماج میں کافی تبدیلیاں دیکھنے کو ملتی تھیں۔

ڈپٹی نذیر احمد کا عہد ان ہی تبدیلیوں کا عہد تھا۔معاشرے میں بہت ساری تبدیلیاں رونما ہو رہی

تھیں۔ڈپٹی نذیر احمد نوآبادیاتی دور کے ایک عظیم مفکر اور مصلح تھے لہٰذا انھوں نے نئی تبدیلیوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار بہت مؤثر انداز میں کیا۔انھوں نے معاشرے کے غلط رسم و رواج ،مغربی تہذیب/نوآبادکاروں کی اندھی تقلید،توہم پرستی جیسے عیوب سے معاشرے میں جو خرابی پیدا ہو رہی تھی اس کو اپنے مختلف ناولوں میں اس طرح اجاگر کیا کہ عوام ان برائیوں اور عیوب کو سمجھ کر ان سے بچنے کی کوشش کریں۔

نثری صنف ناول زندگی کی رنگ بدلتی قوس قزح اور حقیقت کی باریک ترین جزئیات کو ایک خاص قرینے سے پیش کرنے کا فن ہے لیکن یہ زندگی کا ہو بہو چربہ نہیں۔مگر ہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ کسی بھی ملک کے رہنے والوں کی تہذیب کی روح اس کے ناولوں میں جلوہ گر ہوتی ہے اسی لیے ناول کا فکر و فن انسانی تصور و تخیل نہیں بلکہ انسانی رشتے ہیں۔اس میں فرد کی انفرادی حیات سے لے کر اجتماعی زندگی سبھی داخل ہو جاتے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ تہذیب و معاشرت کا ارتقائی عمل اس میں پیش کیا جاتا ہے۔دوسرے لفظوں میں ناول نہایت وسیع اور ہمہ جہات صنف ادب ہے جس کے بارے میں ورجینا وولف نے کہا کہ ناول ایک ایسا شتر مرغ ہے جو ہر چیز ہضم کر سکتا ہے۔

انیسویں صدی میں ہندوستان پر برطانوی تسلط کے استحکام کے بعد یہ صنفِ ادب انگریز نوآبادکار فاتحین کی تہذیبِ جدید کے دوش بہ دوش برصغیر میں غیر محسوس طریقے سے در آئی۔ یہ بات خالی از دلچسپی نہیں کہ اردو کا پہلا ناول نوآبادیاتی یا استعماری حکومت کی طرف سے انعامی اعلان کے جواب میں لکھا گیا۔اہم بات یہ ہے کہ صرف ناول ہی میں پورا انسان اور اس کی کائنات کا جاندار عکس نظر آتا ہے کسی اور صنف ادب میں اس قدر ممکن نہیں ،یعنی انسان ،سماج ،تہذیب و ثقافت وغیرہ سب کچھ ناول کے محیطِ بیکراں میں ہے۔

ناول کے بارے میں اس تمہیدی گفتگو کا مقصد یہ عرض کرنا ہے کہ زیر نظر مقالے کا موضوع بھی یہی اہم صنف ادب ہے مگر اہم وضاحتی امر یہ ہے کہ راقم کے پیش نظر اردو ادب کا وہ گوشہ ہے جو اردو ادب میں ابھی تازہ اور نیا موضوع ہے۔یعنی ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کا مابعد نوآبادیاتی مطالعہ ہے۔ یہ موضوع اس لحاظ سے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کے قلب میں کئی کہانیاں موجود ہیں اور ان

ہی ناولوں کے ذریعے نوآبادیوں کے لوگ اپنی شناخت اور تاریخ کی موجودگی کو جتایا کرتے ہیں۔ چونکہ برصغیر آج تک نوآبادیاتی اثرات سے آزاد نہیں ہوا اور ہمارے فکر وادب پر غیر ملکیوں کی چھاپ کسی نہ کسی حوالے سے آج بھی موجود ہے لہذا ہماری اپنی تاریخ وتہذیب کی مکمل تفہیم کے لیے ضروری ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کو مابعد نوآبادیاتی پہلو سے دیکھا جائے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ مابعد جدیدیت کے اس دور میں ثقافتی مطالعات کی ایک شق میں نوآبادیات کا مطالعہ بھی ہے جس کو ماہرین نے مابعد نوآبادیاتی مطالعات کا نام دیا ہے۔ یہ نوآبادیاتی مطالعے اس امر پر دال ہیں کہ نوآبادیات کے نظام میں علمی اور ثقافتی استحصال کا پہلو بھی مخفی ہوتا ہے۔ یعنی نوآبادیاتی حکمرانوں کی مقامی آبادی کی علمی، ادبی، ثقافتی اور اخلاقی ترقی کے پیچھے خود ان حکمرانوں کی اپنی غرض وغایت بھی ہوتی ہے یعنی اپنی قوت کو مستحکم کرنے کے لیے وہ علمی میدان میں بھی ایسی ہی صورت پیدا کرتے ہیں جو ان کی حکمرانی کو مزید استحکام بخشے۔ وہ عوام کے قلوب واذہان کو بھی کچھ یوں متاثر کرتے ہیں کہ محکوم قومیں لازماً یہی تصور کرتی ہیں کہ حکمرانوں کے یہ سارے اقدامات ان کی ترقی کے لیے ہی ہیں اور ان سے دامن کشاں گزرنے میں ذہنی اور علمی پسماندگی کا ازالہ ممکن نہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ نوآبادیاتی حکمران اپنی حکمرانی کے خاتمے کے بعد کئی ایسے دیرپا اثرات چھوڑ جاتے ہیں جن سے پیچھا چھڑانا مشکل ہوتا ہے۔ یوں نسلی امتیازات کی لکیریں اتنی واضح طور پر کھینچ دیں جو آج بھی ہمارے ذہنوں میں اسی طرح موجود ہیں۔

ہندوستان کے تناظر میں انگریزوں کی خدمات پر نگاہ ڈالی جائے تو بالائی سطح پر یہی کہا جائے گا کہ انگریز حاکموں نے ہندوستانیوں کی ترقی اور بہتری کے لیے کئی اقدامات کیے۔ نئے علوم کے در وا کیے۔ نئی زندگی کے اسباق سکھائے، نئے ولولوں سے ہمکنار کیا۔ ممکن ہے کہ یہ بات جزوی طور پر درست ہو مگر اس امر سے انکار بھی ممکن نہیں ہے کہ آزادی کے حصول کے اتنے عرصے بعد بھی ذہنی غلامی کا طوق ہم اپنی گردنوں سے نکال پھینک سکے نہ ہی ان اثرات سے آزاد ہو سکے۔

زیرِ نظر مقالہ پیش لفظ اور کتابیات کے علاوہ چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

باب اوّل ''مابعد نوآبادیاتی تناظر میں اُردو ادب'' کے عنوان کے تحت ہے۔ مقالے کے اس باب

میں مابعدنوآبادیات کے تصور پر ایک صحت مند بحث ہوئی ہے۔اس کی تعریف، ہندوستان اور برصغیر پر اس کے اثرات اور نوآبادیاتی دور میں لکھے گئے ادب پر بات ہوئی۔ساتھ ہی اردو زبان کے ان قلم کاروں کی نشاندہی کی گئی جنھوں نے نوآبادکاروں کی پیروی کی یا اس کے ردعمل میں اپنے خیالات وجذبات کا اظہار کیا ہے اور اس کے خلاف دبے الفاظ اور علامتوں کے سہارے مزاحمت بھی کی ہے۔

باب دوم ''ڈپٹی نذیر احمد کے عہد کا سماجی اور تہذیبی پس منظر'' پر مشتمل ہے۔اس باب میں متعلقہ عہد اور مختلف سماجی تحریکات جو اس دور میں رائج تھیں ان پر بحث ہوئی۔سماجی برائیوں کو دور کرنے میں ان تحریکات کا رول واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

باب سوم ''اردو ناول میں ڈپٹی نذیر احمد کی انفرادیت'' کے تحت رکھا گیا ہے۔مقالے کے اس باب میں اردو ناول میں ان کے منفرد مقام کی نتیجہ خیز مباحثہ اور نذیر احمد کی ناول نگاری پر سیر حاصل بحث ہوئی ہے۔ان کے ناولوں کے موضوعات اور فکر وفن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔یوں ان کو اردو ناول کی تاریخ میں ایک منفرد ناول نگار کی حیثیت سے ادبی مقام کا تعیّن کیا گیا ہے۔

باب چہارم ''ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کا مابعدنوآبادیاتی مطالعہ'' سے متعلق ہے۔یہ مقالہ کا اہم باب ہے۔مقالے کے اس باب میں ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کا مابعدنوآبادیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔اس باب میں ان کے ناولوں کو مابعدنوآبادیاتی تھیوری کے تحت تجزیہ کیا گیا ہے اور ایک بحث تیار کی گئی ہے جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ نوآبادیاتی نظام کے بارے میں ڈپٹی نذیر احمد کی رائے یا مؤقف کیا ہے۔ان کے ذہن اور فکر پر جو نوآبادیاتی نظام کی چھاپ پڑ گئی تھی وہ اپنے ناولوں میں اس کو دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ڈپٹی نذیر احمد نوآبادیاتی فکر سے کبھی مغلوب ہونے اور کبھی مزاحمت کا انداز اختیار کرنے کا تاثر دیتے ہیں۔یہی نکتہ اس باب میں ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

آخر میں ''محاکمہ'' ہے۔اس میں تمام ابواب کے اہم نکات دیتے ہوئے ڈپٹی نذیر احمد کا مابعد نوآبادیاتی فکر کے تحت ایک ناول نگار کی حیثیت سے مقام ومرتبہ کا تعیّن کیا گیا ہے۔

شکریہ کے فرائض میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہدیہ تشکر بجالاتا ہوں جس نے وقت پر کام کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔مقالے کی تکمیل کے اس مبارک موقع پر میں سب سے پہلے اپنے والدین

(والد۔ثناءاللہ بھٹ،والدہ۔شکیلہ بانو) کاشکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں مجھے اس قابل بنایا اوراعلیٰ تعلیم کے لیے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی۔والدہ ہمیشہ یہ دعا کرتی ہیں کہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کروں۔ان کی دعائیں ،شفقت ومحبت میرے لیے باعث رحمت اور میرا سرمایہ حیات ہے۔والدین کے ساتھ ساتھ تمام رشتہ داروں کی محبتیں اور دعائیں بھی میرے ساتھ ہیں ۔جن میں خاص کر بھائی(رؤف احمد بھٹ ) ،بہنیں(افروزہ ،شبروزہ اورقرۃالعین ) شامل ہیں ۔یہاں اس امر کا اظہار بھی بے محل نہ ہوگا کہ میری شریک حیات(رضیہ فردوس)کے پیہم تعاون نے میرا حوصلہ قائم رکھا۔ان کی حوصلہ افزائی اوردعاؤں نے میرے مقالہ کوجلد سے جلد تکمیل تک پہنچانے میں بڑی مدد کی ۔میں اپنے ماما جی پروفیسر عبدالوحید بھٹ صاحب کا بھی شکرگزار ہوں ۔انہوں نے مجھے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی طرف راغب کیا۔اور ساتھ ہی اپنے مفید مشوروں سے ہمیشہ نوازتے رہے جن سے مجھے ہمت اور حوصلہ ملتا رہا۔اللہ تعالیٰ ان کوجزائے خیر عطا فرمائے۔

میں اپنی نگران پروفیسر عارفہ بشریٰ صاحبہ کا بے حد شکرگزار ہوں جنہوں نے دورانِ تحقیق بھر پور وقت دیا اور مشفقانہ اورمخلصانہ رویہ سے میری رہنمائی اور حوصلہ افزائی کی۔تحقیقی مسائل جب بھی میرے سامنے آئے ان مسائل کوانہوں نے آسانی سے دور کیا۔

شکریہ کے فرائض میں شعبۂ اردو کے دیگر اساتذہ کرام بھی شامل ہیں جنہوں نے دورانِ تحقیق اپنے مفید مشوروں سے نوازا اور حوصلہ افزائی کی۔

شعبۂ اردو کے دیگر ملازمین اورعملہ کا بھی شکرگزار ہوں جوآفس کا کام پڑنے پر خندہ پیشانی سے پیش آتے اوراچھا برتاؤ کرتے ہیں۔

میں ڈاکٹر ریاض اورڈاکٹر یونس کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جن کی حوصلہ افزائی،ہمدردی اوردعائیں میرے ساتھ رہی۔ان کے بھر پور تعاون کی بدولت اوران کے ہمراہ تحقیق کی دشوارگزار راہیں آسانی سے طے ہوگئیں۔اس کے علاوہ مواد کی فراہمی میں میری مدد فرمائیں۔

اپنی معصوم اور پیاری بچی عطوفہ جان کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ وہ بھی اس تحقیقی سفر میں اپنے ننھے

ننھے ہاتھوں سے مجھے حتی المقدور آسانیاں فراہم کرنے میں پیش پیش رہی اور وہ میرے لیے خوشیوں کا سرچشمہ ہے۔اللہ کریم ان کو ہمیشہ خوشیوں اور کامیابیوں سے نوازے۔

اس مقالے میں جو خوبیاں موجود ہیں وہ میرے فاضل اساتذہ کرام ،نگران محترمہ اور صاحب علم دوستوں کا ثمرہ ہیں۔مقالے میں اگر کچھ کمزوریاں راہ پا گئی ہوں تو ان کا سزاوار راقم ہے۔یہ بھی خیال رہے کہ بہتری کی گنجائش ہر جگہ موجود ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔آمین

**گلوان پورہ، بڈگام**

فردوس احمد بھٹ

☆☆☆

# بابِ اوّل

# مابعد نوآبادیاتی تناظر میں اُردو ادب

## ہندوستان میں انگریزوں کی آمد

ہندوستان میں انگریزوں کا پہلا تجارتی جہاز ۱۶۰۱ء میں بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا۔ اس وقت انگلستان میں ملکہ الزبتھ کی حکومت تھی۔ جب کہ ہندوستان میں شہنشاہ اکبر براجمان تھے۔ انگلستان کے بادشاہ جیمز اول کی طرف سے باقاعدہ سفارت ۱۶۱۴ء میں دربارِ جہانگیری میں پیش ہوئی۔ آگرہ میں انگریز سرتھامس دو تین سال تک مقیم رہا۔ سترہویں صدی کے شروع میں ہی ولندیزیوں نے پرتگیزوں کے مقبوضہ علاقوں پر قبضہ شروع کر دیا۔ بعد ازاں دوسری اقوام جیسے فرانس، جرمن بشمول انگریز بھی اس دوڑ میں شامل ہو گئے۔ انہوں نے اپنے اپنے تجارتی مفادات کے لئے کئی جنگیں لڑیں۔ مگر ان سب اقوام میں سے انگریز غالب آ گئے۔ ۱۷۰۷ء میں اورنگزیب عالمگیر کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت زوال پزیر ہونا شروع ہوئی تو انگریزوں نے بھی اپنے قدم مظبوط کرنے شروع کر دیئے۔ پلاسی کی جنگ ۱۷۵۷ء کے بعد جہاں برصغیر کے شمال مشرقی علاقے اور بنگال و بہار انگریزوں کے قبضے میں چلے گئے۔ وہیں اس جنگ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کا سیاسی اقدار قائم کر دیا۔ اگلے پچاس برسوں میں ایسٹ انڈیا کمپنی پورے جنوبی ہندوستان پر قابض ہو چکی تھی۔ اور کئی اعتبار سے اٹھارویں صدی کا برصغیر ایسٹ انڈیا کمپنی کے متحرک فوجی عمل کا محور و مرکز بن گیا۔

پلاسی کی جنگ نے ایک تجارتی کمپنی کو حکمران اور با اختیار و با اقتدار ادارے میں تبدیل کر دیا۔ اس کے بعد بکسر کی لڑائی ۱۷۶۴ء نے جہاں ایسٹ انڈیا کمپنی کو ایک فوجی قوت کے طور پر تسلیم کرایا وہیں ایسٹ انڈیا کمپنی کو دیوانی مراعات بھی حاصل ہوئیں۔ جی ایم ٹریویلین کے مطابق:

> ''دیوانی کے حصول نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو جائز اور با اقتدار ادارہ بنا دیا اور اس طرح
> برصغیر میں ۱۷۶۵ء کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی تجارتی ادارے کی بجائے ایک ایشیائی''
> ریاست'' کے طور پر نمودار ہوئی۔'' ۱

۱۷۸۴ء کے انڈیا ایکٹ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے نظم و نسق میں کئی تبدیلیاں کیں جن میں سے ایک اہم تبدیلی یہ ہوئی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو براہ راست برطانوی کابینہ کے ماتحت کر دیا گیا اور ایک بورڈ آف کنٹرول قائم کیا گیا۔ یہی بورڈ برصغیر میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار اور سیاسی پالیسیوں کی نگرانی کرتا

تھا اس بورڈ کا ڈائریکٹر برطانوی کابینہ نامزد کرتی تھی جو مرتبے میں برطانوی وزیر کے برابر تھا۔

اٹھارویں صدی کے خاتمے تک ایسٹ انڈیا کمپنی کی سیاسی اور انتظامی ذمہ داریوں میں اس حد تک اضافہ ہوا کہ کلکتے میں گورنر جنرل کے دفتر کا کام نمٹانے کے لیے زیادہ سے زیادہ ملازمین بھرتی کرنا پڑے۔اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے مشرقی طرز کے مدرسے قائم کئے گئے جو بعدازاں اوراورینٹل کالج کے نام سے پکارے گئے اس کے ساتھ انگلستان سے ہندوستان آنے والے نواردان کو ہندوستان کی تہذیب وتمدن اور زبان سے روشناس کرانے کے لئے بھی ادارے قائم گئے جن میں ابتدائی کوششوں میں خاص طور پر مدراس کے فورٹ سینٹ جارج میں قائم کیا جانے والا کالج شامل ہے۔جسے جوزف کلیٹ نے قائم کیا۔ان اورینٹل کالجوں کے ذمے ہندواور مسلم قوانین کوانگریزوں میں ڈھالنے کا کام تھا۔سب سے پہلا کالج محمڈن اورینٹل کالج ۱۷۸۰ء میں کلکتہ میں قائم کیا گیا۔بعدازاں ایسے ہی کالج بنارس، آگرہ اوردلی میں قائم ہوئے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی مقبوضات نے کمپنی کے کردار میں بنیادی تبدیلیاں پیدا کردہ تھیں اور کمپنی تجارتی ادارے سے حکمران اور بااقتدارادارے کی حیثیت اختیار کر چکی تھی اوراس کے استعماری عزائم بھی کھل کر سامنے آچکے تھے۔پروفیسرابوالکلام قاسمی اس صورت حال کا جائزہ یوں پیش کرتے ہیں:

> ''مغربی استعماریت کوحتمی اورکلی حیثیت یوں تو ۱۸۵۷ء میں حاصل ہوئی۔مگراس سے پہلے کی لسانی خدمات اور تعلیمی پالیسی نے مغربی تہذیب کی برتری کا اعتبار قائم کرنا شروع کر دیا تھا۔فورٹ ولیم کالج ، رائل ایشیاٹک سوسائٹی ، اورینٹل سمینری ، دہلی کالج ،کلکتہ مدرسہ اورآگرہ کے کالجوں کی ظاہری مشرقیت پسندی اور تعلیمی خدمات نے ایک ایسی فضا قائم کر دی تھی کہ ایک بڑے علمی حلقے کواس نوع کا کوئی برطانوی اقدام نہ صرف یہ کہ شک وشبہے سے بالاتر نظر آنے لگا تھا بلکہ اس نوع کے اقدامات میں ہی اسے ہندوستانی عوام کی تعلیمی اور تہذیبی فلاح و بہبود کا رستہ دکھائی دینے لگا تھا۔'' ۲

جب نوارد انگریز ہندوستان میں تاجر کے روپ میں وارد ہوا تو اس وقت اس کے ذہن میں میں کوئی نسلی یاکسی اور قسم کا برتری کا احساس نہیں تھا۔شروع میں انگریز کے ذہن ودل میں اخلاص تھا۔کسی قسم کی بری نیت یا لالچ نہیں تھا بلکہ وہ یہاں کی تہذیب وثقافت کو پسند کرنے لگا اور یہاں کے لوگوں کے ساتھ

مل جل کر رہنے لگا۔اس سلسلے میں ڈاکٹر مبارک علی نے لکھا ہے کہ:

''ابتدائی دور میں جب انگریز بحثیت تاجر کے ہندوستان میں آئے، تو وہ ہندوستانی تہذیب وتمدن اور ثقافت سے متاثر ہوئے۔ وہ یہاں کے لوگوں میں گھل مل کر رہتے ۔انھوں نے یہاں کا رہن سہن، طرزِ معاشرت اور عادات واطوار کو اختیار کیا اور اسی ثقافت میں مدغم ہوگئے۔ ابتدائی دور کے انگریز نہ تو تہذیبی برتری کے تصور میں مبتلا نظر آتا ہے اور نہ ہی نسلی فوقیت کا شکار اور نہ ہی اس میں اہل ہندوستان کے لئے نفرت وحقارت کے جذبات ملتے ہیں۔ سترہویں سے اٹھارہویں صدی تک انگلستان اور ہندوستان کی ثقافت میں برابری کا احساس تھا۔'' ۳

جیسے جیسے ایسٹ انڈیا کمپنی مظبوط ہوتی گئی، انگریزی اقدار مستحکم ہوتا رہا، اور لوگوں کا ان سے واسطہ پڑنے لگا تو ان کے بارے میں لوگوں کی رائے بھی بدلنے لگی، انھیں ''صاحبان عالیشان''، لاٹ صاحب وغیرہ کے خطابات اور القابات سے یاد کیا جانے لگا۔ جب ان کی حکومت اور ماضی کی حکومتوں کا تقابل ہوا تو لوگوں کو ان دونوں میں فرق نظر آیا۔خصوصاً وہ ہندوستانی کہ جنھوں نے کمپنی کی ملازمت کر لی تھی وہ انگریزوں کے طور طریق، عادتوں اور ان کی انتظامی صلاحیتوں سے بڑے نرعوب ہوئے۔ خاص طور پر انگریزوں نے جنگ آزادی کے برصغیر پاک و ہند میں اپنی حیثیت کو بہت مستحکم کر لیا، مسلمان اب تاج وتخت اور اقتدار سے محروم ہو چکے تھے اور سیاسی میدان میں ان کی حیثیت صفر کے برابر رہ گئی تھی۔

پروفیسر جیلانی کامران اس صورتحال میں زبان کے کردار کے حوالے سے یوں تبصرہ کرتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی مقبوضات جس برصغیر میں نمودار ہوئی تھیں وہ اسلامی ہندوستان تھا جس کی تہذیب اور تہذیبی زبان پر مسلمانوں کے اثرات غالب تھے۔ عربی اور فارسی علم وحکمت کی زبانیں تھیں اور برصغیر کے طول وعرض میں فارسی دفتر ودربار کی زبان تھی۔'' ۴

یہی وجہ تھی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے جب نظم ونسق کے لئے مختلف محکمے قائم کئے اور مال گزاری اور عدالتوں کے سلسلے میں حقائق کا سامنا کرنا پڑا تو انھوں نے بھی فارسی زبان کو ہی استعمال کیا اور چونکہ ایسٹ انڈیا کمپنی ایک وسیع تر تہذیبی براعظم میں ان نئی ذمہ داریوں کو بخوبی ادا کرنے کے لیے اپنا پورا زور لگا رہی

تھی ۔اس لئے کمپنی کی تعلیمی پالیسی میں بھی ان زبانوں کو صرف شامل کیا گیا بلکہ ان کی ترویج کے لئے اورینٹل کالجز قائم کئے گئے ۔مگر بعد میں اس تہذیبی زبان کو سرکاری زبان کی حیثیت سے خارج کر دیا گیا اور انگریز نے بڑی ہوشیاری سے اس سرچشمے کو خشک کر دیا۔جس سے وابستہ رہتے ہوئے اہل ہند کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ اپنی تہذیبی روایات سے دامن چھڑا سکیں۔

کیا ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی محض سیاسی جنگ تھی ہرگز نہیں، یہ ایک جنگ تو تھی مگر ''مقامی اور غیر مقامی'' دو تہذیبوں کے درمیان ایسی آخری کشمکش تھی جس میں دساوری تہذیب فتح یاب ہوئی ۔یہی وہ نکتہ آغاز تھا جس نے بعدازاں تاجری سے تاجوری کی شکل اختیار کی ۔یعنی ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکمرانی سے آگے بڑھتے ہوئے ہندوستان کا رشتہ انگلستان کی پارلیمنٹ سے قائم ہوا۔برصغیر کے عوام اب براہ راست مغربی اثرات کی زد میں آ گئے اب یہ محض تاجروں کی تہذیب نہیں تھی بلکہ تاجوروں اور حکمرانوں کی تہذیب بن گئی ۔اس وجہ سے اس تہذیب کو اتنی تقویت حاصل ہوئی کہ یہ مقامی لوگوں کے گھروں اور دلوں میں داخل ہوگئی ۔مگر اہم بات یہ ہوئی کہ یہ مسلمانوں نے اس تہذیب کو عمومی طور پر قبول نہیں کیا اور یہاں تہذیبی ملاپ کی بجائے تہذیبی کشمکش کا آغاز ہوا۔ڈاکٹر عابد حسین اس تہذیب کے اثرات کے حوالے سے رائے دیتے ہیں:

> ''اٹھارویں صدی کے ربع آخر سے مغربی تہذیب کے تھوڑے بہت اثرات ایک محدود علاقے میں ہندوستان پر پڑنے شروع ہو گئے تھے لیکن وہ اتنے نہیں تھے کہ ہندوستانی تہذیب کی عام شکل میں اور عہد وسطیٰ کی ذہنیت میں جس پر یہ تہذیب بنی تھی کوئی تبدیلی کر سکیں۔'' ۵

مغربی تعلیم کے آنے سے مغربی فلسفیانہ خیالات بھی تہذیبی زندگی پر اثر ہونے لگے جن کی بدولت لوگوں کی زندگیوں پر مختلف اثرات مرتب ہوئے اور ان اثرات کی بدولت ،معیار زندگی اور طرز معاشرت حتیٰ کہ مذہبی خیالات ورجحانات میں تبدیلی واقع ہوئی ۔ڈاکٹر عابد حسین لکھتے ہیں:

> '' جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کا بگل بجتے ہی وہ جو ایک جھجک اور در پردہ حکومت کی مصلحت تھی، ختم ہوگئی، نئی تہذیب کا وہ قافلہ جو آہستگی سے چل رہا تھا۔اچانک برق رفتاری سے رواں دواں ہوگیا ۔ انگریزی حکومت کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب

پورے ملک پر چھا گئی اوراس نے ہندوستان کی ساری زندگی کودرہم برہم کردیا۔'' ۶

مغربی تعلیم کے سب سے زیادہ اثرات طرز معاشرت پر پڑے اور ہم نے ہر چیز میں نقالی شروع کردی اور معاشرت بدیسی تہذیب کا ایک چربہ بن گئی اور مضحکہ خیز'' بابو' والی صورت حال پیدا ہوئی۔اس بارے میں گستاوَلی بان یوں منظر کشی کرتے ہیں:

'' خیالات کی پراگندگی کے ساتھ' بابو' پر جو ایک خوفناک اثر پوری تعلیم کے متعلق لاپرواہی آ گئی ۔۔۔وہ اپنے باپ دادا کے اعتقادات کھو بیٹھا اور یورپی لوگوں کے اصول چال چلن بھی اس نے اختیار نہیں کیئے۔'' ۷

اس قسم کے اثرات کا سب سے قوی محرک ذہنی غلامی ہے اور یہ ایسی صورتحال ہے۔جس کا نقشہ البرٹ میمی جو تیونس کا باشندہ ہے اس نے اپنی کتاب دی کالونیزر اینڈ دی کالونیزڑ میں پیش کیا ہے اور خاص طور پر ان نفسیاتی عوامل کا ذکر کیا ہے جو ایک مغلوب قوم پر احساس کمتری کی وجہ سے اثر انداز ہوتے ہیں۔اس نے مغلوب قوم کے باشندوں کے بارے میں لکھا ہے کہ چونکہ وہ غالب قوم سے ذہنی طور پر مرعوب ہوتے ہیں اور اس پر رشک بھی کرتے ہیں اس لئے انہیں اپنے آقاوں کی نقل کرنے میں ذہنی تسکین ملتی ہے کیونکہ انہیں اپنے آقاوں کے اندر قوت اور اقتدار نظر آرہا ہوتا ہے۔

برصغیر کے لوگ چوں کہ اب محکوم تھے لہذا ان کی تہذیب بھی محکوموں کی تہذیب تھی اور انگریزوں کی تہذیب فاتح حکمرانوں کی تہذیب تھی۔لہذا برصغیر میں تصور حقیقت سے عاری اور افلاس کی ماری محکوم قوم مغربی تہذیب کی طرف بڑھی اور عجیب صورت حال سے دوچار ہوئی ایسی ہی صورتحال کا تجزیہ ڈاکٹر اقبال نے کیا ہے:

''تہذیبیں تصور حقیقت کے مطابق ڈھلتی ہیں جیسا تصورِ حقیقت ہوگا اس کے مطابق تہذیب ہوگی۔جب دو تہذیبوں کا اتصال ہوتا ہے تو یقینی طور پر مغلوب قوم کا تصور حقیقت مجروح ہوتا ہے اسی لئے کسی تہذیب سے کچھ اخذ کرتے ہوئے نہایت احتیاط اور ضبط کی ضرورت ہوتی ہے۔'' ۸

مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ جب کوئی بڑا سیاسی انقلاب رونما ہوتا ہے تو اپنے اقتدا کو استحکام اور دوام بخشنے کے لئے تہذیبی قوتوں کو ضرور بروئے کار لاتا ہے اگر فاتحین کی تہذیب کسی بھی اعتبار سے جاندار ہے تو

محکوم تہذیب کو پھلنے پھولنے کا موقع ملنے کے بجائے دوسری تہذیب پھیلے گی۔ انگریزی سیاسی تبدیلی جب برصغیر میں وقوع پذیر ہوئی تو انگریزوں نے نظم ونسق کو بہتر بنانے کی آڑ میں ایسی اصلاحات کیں جن کا برصغیر کی معاشرت اور تمدن پر براہ راست اثر ہوااور یہاں ایک تبدیلی رونما ہوئی۔ اس تغیر نے ان ممتاز اور خاص لوگوں کی اہمیت اور حیثیت کم کر دی جو کہ قدیم روایت اور پرانی وضع کے حامی تھے۔ تہذیبی روایات کے امین نوابوں اور امراء کی بجائے انگریزی داں ملازم ہو گئے اور وہ انگریزوں کو خوش کرنے کے لئے ہر اس چیز کی حوصلہ افزائی کرتے جس کا تعلق مغرب سے ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ مغربی فلسفہ، ادب، سیاست، جمہوریت اور معاشرت کے تصورات ہماری تہذیب میں نمایاں جگہ پانے لگے۔ ۱۸۶۹ء میں نہر سویز کے کھلنے پر ہندوستان کا بیرونی دنیا سے رابطہ ہو گیا۔ بیرونی دنیا میں اس وقت صنعتی انقلاب نے مذہب اور سائنس کو ایک دوسرے کا حریف بنا دیا تھا۔ روحانیت کے خلاف مادیت صف آراء تھی۔ مذہب سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہونے پر اس کونے کار سمجھا گیا۔ جدید علوم کے ذریعے ایسے ہی تصورات نے برصغیر کے عوام کی معاشرت کو بھی متاثر کیا اور مذہب وسائنس کی یہ آویزش مذہبی مناظروں کے علاوہ ادب میں بھی ظاہر ہوئی۔

غرض یہ کہ انگریزوں کی آمد سے برصغیر کے معاشرے میں ہمہ گیر اثرات مرتب ہوئے جس نے سارا منظر نامہ تبدیل کر دیا۔ سیاست، معیشت، معاشرت، عقائد، نظریات، سماجیات وغیرہ ہر چیز پر مغربی رنگ جھلکنے لگا۔ جب برطانوی تسلط نے عملی شکل حاصل کر لی تو یہ اثرات پہلے سے بھی زیادہ واضح ہو کر سامنے آنے لگے اور دوسرے تمام شعبہ حیات کی طرح مقامی ادب نے بھی انگریزوی ادب سے بالواسطہ یا براہ راست اثرات قبول کرنے شروع کر دیے تو مقامی زبان میں بھی جدید موضوعات ادب کا حصہ بنے اور اس کے ساتھ افکار واسالیب میں بھی مغربی اثرات نظر آنے لگے۔ یہی وہ تاریخی منظر نامہ تھا جس میں انگریزوں اور اینگلو انڈین ادباء نے ناول لکھے۔ اردو ناول بھی مغرب سے قریب تر ہوتا گیا اور انگریزی کے ساتھ فرانسیسی ناولوں کے اثرات بھی فزوں تر ہو گئے۔ ذہنی رویوں کے بدلنے کے ساتھ ہی عوام کی زندگیوں میں انقلاب آیا اور ادب چونکہ سوسائٹی سے اثر پذیر ہوتا ہے۔ اس لیے ادب میں بھی انقلاب آیا ۔اصنافِ ادب میں بھی بڑی تبدیلیاں دیکھنے کو ملیں اور ہمارے مقامی ادیبوں کا ذہن انگریزی فکر اور تخیل

کی سطح پر تیرنے لگا۔ دوسرے لفظوں میں انگریزی حکومت کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب پورے ملک پر چھا گئی۔

انگریزوں کی ہندوستان میں آمد کے بعد انگریزوں اور ہندوستانیوں کے باہمی تعلق پر بڑی تعداد میں فکشن اور نان فکشن ادب تخلیق ہوا۔ انگریز ۱۶۰۰ء میں بحیثیت تاجر ہندوستان میں وارد ہوئے اور کشور ہندوستان کے تاجور بنے۔ تقریباً دو صدیوں سے زائد عرصے پر محیط ان کا قیام ہندوستان میں نوآبادیاتی عہد کہلاتا ہے۔

## مابعد نوآبادیاتی مطالعہ کی وضاحت

مابعد جدیدیت کے اس دور میں ثقافتی مطالعات کی ایک شق میں نوآبادیات کا مطالعہ بھی ہے جس کو ماہرین نے مابعد نوآبادیاتی مطالعات کا نام دیا ہے۔ یہ نوآبادیاتی مطالعے اس امر پر دال ہیں کہ نوآبادیات کے نظام مین علمی اور ثقافتی استحصال کا پہلو بھی مخفی ہوتا ہے۔ یعنی نوآبادیاتی حکمرانوں کی مقامی آبادی کی علمی، ادبی، ثقافتی اور اخلاقی ترقی کے پیچھے خود ان حکمرانوں کی اپنی غرض و غایت بھی ہوتی ہے یعنی اپنی قوت کو مستحکم کرنے کے لیے وہ علمی میدان میں بھی ایسی ہی صورت پیدا کرتے ہیں جو ان کی حکمرانی کو مزید استحکام بخشے۔ وہ عوام کے قلوب و اذہان کو بھی کچھ یوں متاثر کرتے ہیں کہ محکوم قومیں لازماً یہی تصور کرتی ہیں کہ حکمرانوں کے یہ سارے اقدامات ان کی ترقی کے لیے ہی ہیں اور ان سے دامن کشان گزرنے میں ذہنی اور علمی پسماندگی کا ازالہ ممکن نہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ نوآبادیاتی حکمران اپنی حکمرانی کے خاتمے کے بعد کئی ایسے دیرپا اثرات چھوڑ جاتے ہیں جن سے پیچھا چھڑانا مشکل ہوتا ہے۔ یوں نسلی امتیازات کی لکیریں اتنی واضح طور پر کھینچ دیں جو آج بھی ہمارے ذہنوں میں اسی طرح موجود ہیں۔

نوآبادیاتی عہد وہ ہوتا ہے جس میں براہِ راست مقامی آبادی اور باشندوں کے بجائے کوئی غیر ملکی طاقت اقتدار پر براجمان ہو جاتی ہے۔ یہ ایک غیر ملکی تسلط ہوتا ہے جو کسی بھی خطے کے مظلوم عوام کو محکوم بنانے کے لیے ہوتا ہے جبکہ نوآبادیات ایسی فتوحات ہوتی ہیں جو کوئی بھی طاقتور ملک اپنی سرحدوں سے باہر وسعت کی خاطر کرتا ہے اور وہاں پر مفتوحہ اقوام کی مرضی کے خلاف اپنا اقتدار قائم کر کے ان پر محسوس یا غیر محسوس طریقے سے اپنی مرضی ٹھونستا ہے۔ اس میں فوجی طاقت کے استعمال کے علاوہ بعض اوقات

طاقتور عوام اقتصادی اور ثقافتی طریقے سے کمزور اقوام کو زیرنگیں لے آتی ہیں۔اس دور میں سیاسی، سماجی اور معاشرتی سطح پر کئی تبدیلیاں اور تغیرات رونما ہوتے ہیں۔اور انہی میں سے ایک تہذیبی آویزش یا آمیزش بھی شامل ہے۔

## نوآبادیات اور مابعد نوآبادیات: تعریف وتوضیح

انگریزی اصطلاح (colonialism) کا اردو ترجمہ ''نوآبادیات'' کیا جاتا ہے جو لفظ کلونیہ سے نکلا ہے ۔کشاف اصطلاحات تاریخ کے مطابق اس لفظ کا سب سے پہلے استعمال روم میں کیا گیا ۔"colonia" لفظ کی وضاحت اس میں یوں کی گئی ہے:

> "colonia" پرانے رومی فوجیوں کی شہری بستی ۔ وہ رومی شہری جو قصبے میں رہتے تھے ان کے پاس وسیع زرعی زمین ہوتی اور کافی حد تک مقامی امور میں ان کو حکومت کی خود اختیاری حاصل ہوتی۔اس میں اردگرد کا علاقہ شامل ہوتا تھا۔'' ۹

دی آکسفورڈ انگلش ڈکشنری میں بطور اصطلاح ''کالونیلزم'' کے ذیل میں درج ہے۔

"The alleged policy of expoliatation of backward or weak peoples by foreign power ."

یعنی کمزور اور پسماندہ عوام کے استحصال کے لیے غیر ملکیوں کی جانب سے تشکیل دی جانے والی ممکنہ حکمت عملی جبکہ ویبسٹیرس تھارڈ نیو انٹرنیشنل ڈکشنری میں اس کے برعکس لکھا گیا:

"The aggregate of various economic ,political ,and social policies by which an imperial power maintains and extends its control over other areas or people ."

''مختلف النوع معاشی، سیاسی اور سماجی پالیسیوں کا ایسا مجموعہ جس کے ذریعے ایک سامراجی قوت کسی بھی دوسرے علاقے یا لوگوں پر قبضہ برقرار رکھنے کے ساتھ اسے وسعت دیتی ہے۔''

رینڈم ہاوس ڈکشنری آف دی انگلش لینگوئج کے مطابق کالونیلزم کے یہ معنے دئے گئے ہیں:

> "The policy of so uniting the separate parts of an empire with separate governments as to secure

for certain purposes a single state.'

''ایک سلطنت کے منقسم حصوں کو علیحدہ حکومت کے ساتھ مدغم اور متحد کرنے کی پالیسی تاکہ وہ واحد ریاست مخصوص مقاصد کے لیے محفوظ بن سکے۔''

نوآبادیات کے ساتھ ضروری ہے کہ مابعد نوآبادیات (پوسٹ کالونیل) کی اصطلاح پر بھی ایک نظر کی جائے۔ گیرتھ گرفتھس، بل اشکرافٹ اور ہیلن ٹیفن نے اپنی کتاب "The Empire Writes Back" میں اس کی تعریف یوں بیان کی ہے:

> We use the term " post colonial " ...to coverall the culture afffected by the imperialprocess from the moment of colonializationto present day . This is because there iscontiniuity of preoccupations through the historical process initiated by Europeanimperial aggression.10

جب کہ مابعد نوآبادیاتی ادب (پوسٹ کالونیل لیٹیریچر) کی تعریف گالاگھر (Gallaghar) نے حسبِ ذیل الفاظ میں پیش کی ہے:

> Writing that emerges from peoples who were once colonised by European powers , now have some form of political independece , but continue to live with the negative economic and cultural legacy of colonialism.11

''ایسے لوگوں کی تحریریں جو ایک دفعہ یورپی طاقتوں کی طرف سے محکوم بنائے گئے ہوں اور اب انہیں سیاسی آزادی کسی بھی شکل میں میسر ہو، مگر اب وہ بھی منفی معاشی اور ثقافتی استعماری میراث کے ساتھ زندہ ہوں۔''

پوسٹ کولونیل لٹریچر اور تھیوری اس تحقیق کے گرد گھومتی ہے کہ جب دو کلچر کا ٹکراؤ ہوتا ہے اور اس

میں سے ایک اپنے آپ کو دوسرے سے بہتر صلاحیتوں کا مالک اور برتر مخلوق سمجھتے ہوئے طاقت کے استعمال سے دوسرے کے اختیارات ،ان کے وسائل اور ان کی تہذیب پر قابض ہو جائے تو کمزور اور مغلوب قوم اور اس کے ادب پر اس کے کیا اثرات ہوتے ہیں؟ نوآبادیاتی لوٹ کھسوٹ کے بعد بھی جس قوم کے تخلیق کاروں کے تخلیقی سوتے خشک نہیں ہوئے ۔انہوں نے اپنے کچلے اور پسے ہوئے لوگوں کا ہاتھ تھام کے خاک سے اٹھایا اور تسلّط کاروں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بات کرنے کا نیا لہجہ، نیا ڈھنگ اور نیا وقار عطا کیا۔

آنیا لومبا(Anai Loomba) نوآبادیات کی تعریف ان الفاظ میں کرتی ہیں:

''نوآبادیات سے مراد دوسرے لوگوں کی زمین کو فتح کر کے ان کی املاک پر قبضہ کر لینا ہے۔''۱۱

ایڈورڈ ڈبلیو سعید نوآبادیات اور سامراجیت کے درمیان فرق کو واضح کرتے ہوئے دونوں کی تعریف اس طرح سے بیان کرتے ہیں:

''سامراجیت (Imperialism) کسی دور دراز خطے پر مقتدر کسی غالب میٹروپولٹین مرکز کے عمل ،نظریے اور رویے کا نام ہے جب کہ نوآبادیات (Colonialism) سامراجیت کے نتیجے میں دور دراز خطے پر نوآبادکاری مسلّط کرنے کا عمل ہے۔''۱۲

مابعد نوآبادیاتی ادب میں اصل میں نوآبادیاتی دور میں تخلیق کیے گئے ادب کو زیرِ بحث لایا جاتا ہے ۔نوآبادیاتی دور میں تخلیق کئے گئے ادب میں استعمار زدہ لوگوں کی کبھی مفاہمت اور کبھی مذاحمت اور استحصال کی صورت حال نظر آتی ہے ۔اسی مفروضے کو مابعد نوآبادیاتی تحقیق و نظریے اور طرزِ مطالعہ میں ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ نوآبادیات کی تعریفات میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ مغربی باشندوں نے تجارتی و دیگر مقاصد کے لیے بعض علاقوں میں رہائش اختیار کی ،انہیں اپنی مقبوضات بنایا اور اس طرح یہ تاثر بھی دیا گیا کہ نئی جگہوں پر آئندہ نسلوں کے ساتھ ایک قومیت تشکیل دی۔ گویا نئی جگہوں پر پہلے سے انسانی آبادی موجود نہیں تھی۔مگر اصل میں نوآبادیات کسی خاص علاقے یا قوم کو

مفتوح بنانے اوران کے ہر سطح پر استحصال سے عبارت ہے۔ یہ استحصال ان کے سیاسی، معاشی، معاشرتی، ثقافتی، تہذیبی حقوق ضبط کر کے بھی کیا جاتا ہے۔ جبکہ کسی دوسری قوم یا مفتوح ریاست کے امور کو اپنے مخصوص مفادات کے حصول کے لیے بروئے کار لانا نوآبادیات کی بنیادی ترجیح ہوتا ہے۔

## مابعدنوآبادیات تصوّر کے نظریہ ساز

ایڈورڈ سعید مابعدنوآبادیات کے بنیادی نظریہ سازوں میں ایک اہم نام مانا جاتا ہے۔ان کی کتاب شرق شناسی (Orientalism)۱۹۷۸ء میں منظرعام پر آئی۔جس نے مابعدنوآبادیات کی فکری تشکیل میں اہم کردارادا کیا۔اگرچہ اس سے پہلے فرانزفینن کی افتادگانِ خاک میں افریقہ میں نوآبادیاتی چیرہ دستیوں کو بے نقاب کیا گیا،نوآبادکاراورنوآبادیاتی باشندوں کے مابین موجود طاقت اور تشدّد کے رشتوں کا انکشاف کر کے مابعدنوآبادیات کی بنیاد رکھ دی گئی تھی مگر مابعدنوآبادیات بطور نظریہ استحکام حاصل کرنے میں ایڈورڈ سعید کی شرق شناسی کا محتاج ہے۔شرق شناسی میں ایڈورڈ سعید نے اس طریقہ کار اور حکمت عملی کو طشت ازبام کرنے کی کوشش کی ہے جس کے تحت مغرب نے مشرق کی ایک غیرمہذب''غیر''کے طور پر تصویر بنائی۔ایڈوردسعید کے مطابق اورینٹلزم کا آغاز ۱۷۹۸ء میں مصر پر نپولین کے قبضے کے بعد مشرق کے متعلق یورپی ادیبوں کی تحریروں سے ہوا۔انھوں نے مشرق کے متعلق لکھتے ہوئے عمومیت کا اصول اختیار کیا۔اور ان کی علمی کاوشوں کے پسِ پردہ وہ بیانیہ کارفرما تھا جس نے مغرب اور اس کی تہذیب کو برتر جبکہ مشرق کو کمتر قرار دیا۔سعید نے جن بنیادوں پر مشرق کے متعلق علم کو ایک تشکیل قرار دیا اس میں ایک تو یورپ کا علمی اور ثقافتی برتری کا زعم ہے۔دوسرے مقامی ثقافتوں کو نظر انداز کرنے کا رویہ ہے۔انھوں نے مشرق کا مطالعہ مغربی ثقافتی اقدار کے تناظر میں کیا۔سعید کا نقطہ نظر یہ ہے کہ مشرق کی جو جغرافیائی،علمی،ثقافتی،لسانی،تاریخی اور سیاسی تصویر مستشرقین کی تحریروں میں دکھائی جاتی ہے اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں بلکہ وہ نوآبادکاروں کے سیاسی،معاشی مقاصد کے حصول کے لیے مستشرقین کی وضع کردہ ہے۔اسی طرح مستشرقین کا علم بھی خالص شکل میں نہیں تھا بلکہ اس کے پیچھے یورپ کی افادیت پسندی کا تصوّر کارفرما تھا۔یورپی سیاحوں،مستشرقین اور نوآبادیاتی منتظمین کی جانب سے حاصل کی گئی مشرق کی معلومات اور تخلیق کردہ علم کو اورینٹلزم کہا گیا۔ایڈورڈ سعید نے اسی اورینٹلزم کو اپنے مطالعے کا

موضوع بنایا اور اسے یورپ کے علم کے افادی تصور کی پیداوار قرار دیا۔انھوں نے اُن رجحانات اور میلانات سے پردہ اٹھایا جن کی بنیاد پر یہ علم وجود میں آیا۔سعید نے اورینٹلزم کو بیانیہ قرار دیا جو طاقت اور علم کے گٹھ جوڑ سے وجود میں آیا۔

نوآبادیاتی دور میں مشرق کے متعلق پیدا کردہ ادب ، تاریخ اور دوسرے تصوّرات میں اصل حقیقت نوآبادکار کی علمی اور سیاسی طاقت کے پیچھے چھپ جاتی ہے۔محکوم باشندے اپنی ثقافت ،روایات ،تاریخ اور اصل کے متعلق مغربی بیانیے پر یقین کر کے ایک قسم کے تاریخی نسیان کا شکار ہوتے ہیں۔گائتری چکرورتی سپیوک کہتی ہیں کہ نوآبادکاروں کے متون میں محکوم باشندوں کی نمائندگی نہیں ہے اگر چہ وہ آواز رکھتے ہیں مگر نوآبادیاتی نظام میں یہ آواز نوآبادکاروں کی سماعتوں تک نہیں پہنچتی۔گائتری مابعد نوآبادیاتی مفکر ہیں ان کی فکر پر دریدا کے اثرات ہیں جس کو تنقید کا نشانہ بھی بنایا گیا کہ کہ حاشیے پر موجود لوگوں کے مطالعے کے لئے یورپ کی تھوری سے مدد لینا یورپ کو دراصل ایک بار پھر طاقت کا مرکز ماننا ہے۔گائتری کا کہنا ہے کہ ''محکوم گونگے ہیں'' کیونکہ جب محکوم کی ترجمانی نوآبادکار کرتا ہے تو وہ اپنے سامنے اپنے معیارات اور اپنے مفاد رکھتا ہے لہذا مقامی ثقافت کی گہرائیوں سے نابلد ہونے کی وجہ سے وہ مقامی رسومات کے حساس پہلوؤں پر نظر نہیں کرسکتا۔نوآبادکار کے بیانیے میں محکوم کی آواز نہیں ہوتی کیونکہ اسے محکوم کی آواز سننے کے لیے تشکیل ہی نہیں دیا جاتا۔

ہومی کے بھابھا مابعد نوآبادیاتی مفکر کے طور پر چوتھی کھونٹ کا پتہ دیتے محسوس ہوتے ہیں، وسیع پیمانے پر انسانی استحصال کے ایک اہم دور کو سمجھنے کے لیے استحصال کی صورتوں کو بے نقاب کرتے ہوئے بیسویں صدی کے اواخر میں کئی مفکرین نے مختلف زاویوں سے حقائق تک پہنچنے کی کوشش کی۔مگر ہومی بھابھا نے اپنے پیش روؤں اور اپنے ہم عصروں کے کام کو کہیں آگے بڑھاتے ہوئے (ایڈورڈ سعید) اور کہیں ان کی فکر کو نئی جہت دیتے ہوئے (فینن کا نقل کا تصور) مابعد نوآبادیات میں فکر انگیز تصورات متعارف کروائے ہیں۔ہومی بھابھا نے ثقافت کے مطالعات کو مابعد نوآبادیات کے ساتھ ملا کر سوچ کو نئی صورت دی ہے۔نوآبادیاتی نظام کا اگر جائزہ لیں تو یہ تضادات پر قائم نظر آتا ہے۔آقا اور غلام ،حاکم اور محکوم ،مہذب اور وحشی ،جدید اور روایتی جیسے تضادات میں کسی ایک کو غالب اور دوسری کو لازمی طور پر مغلوب

سمجھا گیا۔ یہی تضادات نوآبادکار کی اور نوآبادیاتی باشندے کی شخصیت میں بھی موجود ہوتے ہیں۔جنھیں ہومی بھابھانے نوآبادکار کی مشنری سرگرمیوں میں بھی نشان زد کیا ہے کہ ایک طرف تو مقامی لوگوں کو مہذب بنانے اوران کی اصلاح کے لیے عیسائیت کی تعلیم دی جاتی ہے دوسری طرف اصلاح کے ساتھ ساتھ روشن خیالی اورآزادی کی منتقلی کے خدشے کے پیشِ نظر گریز کا رویہ بھی ہے۔نوآبادکار کو اپنے لیے ایسے نمائندے درکار ہیں جو صرف رنگ اور نسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں۔ایسے نمائندے نوآبادکار کی نقل یا مضحک نقل تو ہو سکتے ہیں مگر ان کی ترجمانی نہیں کر سکتے نہ ہی اس طاقت کے حامل ہوتے ہیں جو نوآبادکار کے پاس ہے۔ بھابھا یہاں پر نقل میں دوجذبیت کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ یہ اگر ایک طرف نوآبادکار کے لیے مثبت اس کی استعماری طاقت کی مددگار ہے تو دوسری طرف نوآبادکار کی طاقت کے لیے ایک چیلینج بھی بنتی ہے کیونکہ نقل میں یہ گنجائش ہمہ وقت رہتی ہے۔ جہاں نوآبادیاتی باشندے نوآبادکار کے کردار و عمل کی نقل کرتے ہیں وہیں وہ نوآبادکار کو حاصل آزادی، حاکمانہ حیثیت اوراختیار کی خواہش بھی رکھتے ہیں۔ یہاں اس بات کا ذکر کرنا ہے کہ بھابھانے مابعد نوآبادیات کی کچھ اصطلاحات وضع کیں جن میں دوجذبیت ،دوغلاپن،مخلوطیت،نقل وغیرہ شامل ہیں۔

## مابعد نوآبادیاتی ادب کی اہمیت

پچھلی چند صدیوں میں یورپ کی چند متمول اور طاقتور قوموں نے استعماری طاقتیں بن کر ایشیا اورافریقہ کے کئی ممالک کو محکوم بنالیا تھا۔ان استعماری قوموں میں فرانس،سپین، پرتگال اورانگلستان شامل تھے۔ان قوموں نے ایشیا اورافریقہ کی قوموں کو اپنی کالونیز بنایا اوران کے وسائل پر قبضہ کیا۔اس طرح استعماری قومیں حاکم اور مقامی قومیں محکوم بن گئیں۔ایسا حاکم ومحکوم کا رشتہ آہستہ آہستہ ظالم ومظلوم اور جابرو مجبور کا رشتہ بن گیا۔ یہ حاکمیت کئی ممالک میں کئی صدیوں تک قائم رہی۔

جسٹن ایڈورڈز لکھتے ہیں کہ کلونیلزم کے ظلم اور جبر نے محکوموں اور مظلوموں کی معیشت ہی نہیں بدلی ان کی نفسیات بھی بدل ڈالی۔محکوم اپنی عزتِ نفس کھو بیٹھے اوراپنے آپ کو دوسرے درجے کا شہری سمجھنے لگے۔ایسی سوچ نے محکوم قوموں کی نسلوں کی مجموعی شخصیت کو متاثر کیا۔

بیسویں صدی میں جب ساری دنیا کے سماجی ،معاشی اور سیاسی حالات بدلے اور دو عالمی جنگیں

ہوئیں تو ان محکوم قوموں اور مجبور ریاستوں نے کلونیل پاورز سے آزادی حاصل کی اور ساری دنیا میں نئی ریاستیں قائم ہوئیں جن میں ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش، افریقہ کے کئی ممالک اور کریبین کے کئی جزیرے شامل ہیں۔ ان ممالک کے ادیبوں نے آزادی حاصل کرنے کے بعد جو ادب تخلیق کیا ہے اسے جسٹن ایڈورڈز پوسٹ کلونیل لٹریچر کا نام دیتے ہیں۔

پوسٹ کلونیل ادب کو سمجھنے کے لیے ہمارے حاکم و محکوم، جابر و مجبور اور ظالم و مظلوم کے رشتے کی نفسیات کی تفہیم ضروری ہے۔ اس مخصوص نفسیات کو سمجھنے کے لیے فرانز فینن کی کتاب "The Wretched of the Earth" بہت مقبول ہوئی اور اس کتاب کے متعدد زبانوں میں ترجمے ہوئے۔ وہ آہستہ آہستہ انقلابیوں کی بائبل بن گئی۔ فینن ایک ماہر نفسیات تھے اور فرانس میں نفسیاتی معالج کے طور پر کام کرتے تھے۔ وہ الجیریا کے فریڈم فائٹر اور گوریلا فوجیوں سے اتنا متاثر ہوئے کہ نفسیاتی علاج چھوڑ کر انقلاب کا حصہ بن گئے۔ انہوں نے انقلاب کا یہ نظریہ پیش کیا کہ جو تشدد ظالم اور حاکم، مظلوم اور محکوموں پر کرتے ہیں وہ ان کے سماجی لاشعور میں جمع ہوتا ہے اور جب محکوم، مجبور اور مظلوم آزادی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو وہ حاکموں اور جابروں کو اسی تشدد کا نشانہ بناتے ہیں جس تشدد کا وہ کئی دہائیوں اور کئی صدیوں تک نشانہ بنتے رہے تھے۔ فینن کی نگاہ میں Decolonialization is always a violent phenomenon.

فینن کا ماننا تھا کہ کلونیلزم سے آزادی حاصل کرنے کے لیے مارکس کا نظریہ ناکافی ہے۔ مارکس صرف کلاس سٹرگل پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہیں لیکن یہاں مسئلہ رنگ و نسل کا بھی ہے۔ اس انقلاب میں کلاس اینڈ ریس دونوں شامل ہیں۔ بیسویں صدی کے بہت سے محکوم و مظلوم مزدور بھی ہیں زور کالے بھی۔ وہ دو محاذوں پر جنگ لڑ رہے ہیں۔ اور وہ مزدور جو عورتیں بھی ہیں تین محاذوں پر اور جو گے اور لیسبین بھی ہیں وہ چار محاذوں پر جنگ لڑ رہے ہیں۔

جسٹن ایڈورڈز ہمیں بتاتے ہیں کہ جہاں فینن آزادی حاصل کرنے کے لیے تشدد کو ناگزیر سمجھتے ہیں وہیں جنوبی افریقہ کے کالوں کی سیاسی آزادی ایک ایسی مثال ہے جہاں انقلاب کی صبح جمہوریت کی راہ سے ہو کر طلوع ہوئی اور کالوں نے الیکشن سے اکثریت حکومت حاصل کی۔ اقتدار حاصل کرنے کے

بعد بھی ان کے لیڈر نیلسن منڈیلا اور ڈزمنڈ ٹوٹو نے نہ تو گوروں کو قتل کیا اور نہ ہی انہیں سمندر میں پھینکا بلکہ کالوں اور گوروں کت تضادات کے حل کے لیے ایک کمیشن قائم کیا جس میں ظالم اور مظلوم، جابر و مجبور کو یکجا کیا تا کہ دونوں اپنی اپنی کہانی ایک دوسرے کو سنا سکیں، ظالم معافی مانگ سکیں اور مظلوم انہیں معاف کر سکیں۔اس طرح ان کے زخم مندمل ہوئے اور انہوں نے پرتشدد ماضی کو خیر باد کہہ کر ایک پرامن مستقبل کو گلے لگایا۔

آزادی کے بعد کے ادب کا ایک متنازعہ مسئلہ زبان ہے۔بعض انقلابی ادیبوں کا موقف ہے کہ محکوم ریاستوں کے ادیبوں کو صرف اپنی مادری زبان مین لکھنا چاہیئے کیونکہ اگر وہ حاکموں کی زبان میں لکھیں گے تو اپنی جدوجہد سے انصاف نہیں کر پائیں گے۔اس کی ایک مثال کالوں کی جدوجہد ہے۔اگر کالے ادیب انگریزی زبان میں احتجاج کریں گے تو وہ احتجاج انگریزی زبان کے تعصب سے متاثر ہوگا۔انگریزی زبان کے الفاظ بلیک ما کیٹ، بلیک شیپ اور بلیک لسٹ انگریزی زبان کے تعصب کے آئینہ دار ہیں۔

بعض ادیب اس موقف سے اتفاق نہیں کرتے۔ان کی نگاہ میں عالی زبانیں اب کسی ایک قوم یا ملک یا خطے کی زبانیں نہیں رہیں۔اگر محکوم چاہتے ہیں کہ ساری دنیا ان کے مسائل کو سمجھے تو انہیں عالمی زبانوں میں لکھنا چاہیئے وہ ایک زمانے میں حاکموں کی زبان ہی کیوں نہ رہ چکی ہوں ورنہ ان کا ادب صرف ان کی اپنی قوم تک محدود ہو جائے گا۔

بعض ادیبوں کا خیال ہے کہ ہر قوم کے ادیب مختلف ادبی، سماجی، نفسیاتی، مذہبی اور نظریاتی حالات سے متاثر ہو کر ادب تخلیق کرتے ہیں۔اس لئے ہندوستان، کیوبا اور جنوبی افریقہ کے ادب کو پوسٹ کلونیل ادب کی ایک ہی عینک سے دیکھنا انہیں محدود کرتا ہے۔

بعض ادیبوں کا یہ بھی خیال کہ پوسٹ کلونیل ادب کا نظریہ ایک سیاسی نظریہ ہے جسے ادب پر لاگو کیا جا رہا ہے۔ان قوموں اور زبانوں کے ادب کی تاریخ کلونیلزم کے دور سے بہت پہلے تک پھیلی ہوئی ہے۔ایسے ادب کے سیاسی حوالے کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت سے حوالے ہیں۔ان کا موقف ہے کہ ادب کو صرف ادبی معیار پر پرکھنا چاہیئے کسی مذہبی، سیاسی یا نظریاتی معیار پر نہیں اور پوسٹ کلونیل ادب کا

حوالہ سیاسی حوالہ ہے ادبی حوالہ نہیں۔

بعض نقادوں کا خیال ہے کہ یہ سمجھنا کہ کلونیل طاقتیں رخصت ہوگئی ہیں اور ان محکوم قوموں نے مکمل طور پر آزادی حاصل کر لی ہے خام خیالی ہے۔ یہ قومیں سیاسی طور پر تو آزاد ہوگئی ہیں لیکن معاشی اور نفسیاتی طور پر آج بھی محکوم ہیں۔ وہ آج بھی حاکموں کے انداز سے سوچتی ہیں اور اپنے آپ کو دوسرے درجے کا شہری سمجھتی ہیں۔ ڈاکٹر خالد سہیل کی ایک چھوٹی سی نظم کلونیلزم کے برے اثرات پر روشنی ڈالتی ہے۔ نظم ''کلونیلزم'' ملاحظہ فرمائیں۔

کلونیلزم

ہم نے اپنے آقاؤں سے نفرت کی ہے

لیکن ان کے نقشِ قدم پر سر بھی جھکایا

ان کے منہ پر تھوکا لیکن

ان کے عمل کو دل سے لگایا

ہم بھی کتنے سادہ دل ہیں

اس صدی کی ایک تلخ حقیقت یہ ہے کہ بہت سے محکوموں، غلاموں اور مظلوموں نے اپنے حاکموں اور آقاؤں کے خیالات اور نظریات کو داخلی بنالیا یا اپنا لیا اب وہ ان کی شخصیت کا اور نفسیات کا حصہ بن چکے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ چونکہ وہ مزدور ہیں، کالے ہیں، عورت ہیں اور مادری زبان بولتے ہیں اس لئے وہ دوسرے درجے کے شہری ہیں۔ نفسیاتی طور پر آزاد ہونا سیاسی طور پر آزاد ہونے سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ پوسٹ کلونیل ادب سیاسی آزادی کے ساتھ ساتھ معاشی اور نفسیاتی آزدی کی نشاندہی کرتا ہے۔ پوسٹ کلونیل دانشوروں سے چند ادیب ایسے ہیں جو ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ سماجی اور سیاسی کارکن ہیں۔ وہ معاشی، سیاسی اور نظریاتی استبداد اور خاص طور پر گلوبلائزیشن کے مخالف ہیں۔

## نوآبادیات اور مابعد نوآبادیات بنیادی مباحث

یہ حقیقت بھی اپنی جگہ پر موجود ہے کہ ہر تاریخی تہذیبی نظام ایک نامیاتی کُل ہوتا ہے۔ جس کے حصے اور اکائیاں باہم تفاعل پزیر ہوتے ہیں۔ اور ان حصوں کی کارکردگی کا انحصار ایک دوسرے پر ہوتا ہے

۔جب اس کی کسی اکائی یا حصے کو دوسرے سے الگ کر دیا جاتا ہے تو پھر الگ کیا ہوا یا غیر فعال حصہ اس تبدیل شدہ یا مسخ شدہ مجموعی نظام کی کارکردگی کو متاثر کرتا ہے جس سے یہ مجموعی نظام اس وقت سے مختلف انداز میں کام کرتا ہے جب کہ اس نظام کے تمام حصے یکجا ہو کر کام کرتے ہیں۔

ایسے میں ایک تہذیبی تصادم کے نتیجے میں جب حملہ آوروں کی تہذیب حملہ شدہ معاشرے کے دفاع میں کوئی چھوٹا سا رخنہ ڈال دیتی ہے تو پھر ایک بڑے ہی سنگدلانہ طریقے سے دوسرے کو اپنے ساتھ کھینچتی ہے۔اسی بارے میں پروفیسر آرنلڈ جے ٹائن بی کا خیال ہے:

''ہماری تحقیق نے یہ واضح کر دیا ہے کہ کسی غیر تہذیب کو اپنانے کا عمل بڑا تکلیف دہ ہے۔ یہ مہم بڑی پُر خطر اور جان جوکھوں میں ڈالنے والی ہوتی ہے۔تاہم شکار ہونے والے معاشرے کی ان جدید طریقوں سے روایتی اور طبعی ناموافقت ہوتی ہے۔یہ جدید طریقے شکار ہونے والے معاشرے کے روایتی طرز زندگی کو تہہ و بالا کر دیتے ہیں۔تاہم جب ایک چیز کا دوسری کو کھینچنا ایک ناگزیر عمل ہے تو پھر وہ معاشرہ اس زبردستی گھس آنے والی تہذیب کے باقی ماندہ حصے کو بھی آہستہ آہستہ قبول کرنے پر خود کو مجبور پاتا ہے اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں کہ شکار ہونے والے معاشرے کا زبردستی گھس آنے والی اجنبی تہذیب کے بارے میں عام رویہ خود شکستگی کا ہوتا ہے جو مخالفت و مخاصمت کی پیداوار ہوتا ہے۔'' ۱۲

اشفاق سلیم مرزا،فلسفۂ تاریخ،نوآبادیات اور جمہوریت (چند نامکمل مباحث) میں ''برصغیر میں نوآبادیاتی نظام کی طرف سفر'' کے عنوان سے رقم طراز ہیں:

''عمومی طور پر نوآبادی کے لوگوں کو خودمختاری اور سیاسی آزادی حاصل نہ ہو اور اس کے مطیع ہوں اور دونوں کا رشتہ استحصالی بنیادوں پر قائم ہو۔نوآبادی پر قبضے کا بنیادی مقصد صرف یہ ہو کہ سامراجی طاقت کی دولت اور خوشحالی میں اضافہ ہو اور باہر منڈی میں خام مال اور انسانی محنت کے جو دام دینے پڑ رہے ہیں اس سے کم داموں پر سہولت میسر آ سکے اور اپنی تیار اشیاء کی کھپت مقبوضہ علاقوں مین آسانی اور منہ مانگے داموں کے عوض ہو سکے۔''۱۳

نوآبادیاتی قوتیں جب کسی ملک کو اپنی نوآبادی میں شامل کرتے ہیں۔تو وہ اپنے آپ کو ان

محکوموں سے لازمی طور پر برتر اور مہذب سمجھتے ہیں۔اور وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ یہ فتح انھیں خدا نے اس لیے دی ہے کہ وہ ان لوگوں سے اعلیٰ اور برتر ہیں۔ایسے میں وہ یہ چاہتے ہیں کہ ان علاقوں میں اپنی مرضی کے مطابق تبدیلیاں کریں، ان کا مذہب تبدیل کریں۔انھیں اپنے طور طریقے سکھائیں۔انہیں اپنی تہذیبی روایات سکھا کر ان کی شناخت ختم کر دی جائے۔وہ اس لیے بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ اس طرح ان حاکموں کے خلاف محکوموں کی مزاحمت کے امکانات بھی کم سے کم ہو جاتے ہیں۔اور مقامی آدمی اپنے حاکموں کو ذہنی طور پر حاکم تسلیم کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور ان کے مطیع ہو جاتے ہیں۔

جب یورپی اقوام نے نوآبادیاتی نظام کی بنیاد ڈالی اور مختلف ممالک میں اپنے اقتدار کو مستحکم کیا تو انہیں اپنے سیاسی اقتدار اور سماجی برتری کے لیے اخلاقی جواز کی تلاش ہوئی کہ جس کی بنیاد پر وہ نوآبادیات اور ان کے باشندوں کے استحصال کو جائز قرار دے سکیں۔اس سلسلے میں انہوں نے ''سست اور کاہل مقامی باشندے'' کا نظریہ پیش کیا۔اور مقامی باشندوں کا استحصال کرنے کا یوں جواز حاصل کیا۔ڈاکٹر مبارک علی کے مطابق:

> ''نوآبادیاتی نظام کے قیام اور سیاسی اقتدار کے مستحکم ہونے کے بعد یورپی اقوام کے اس بات کی کوشش کی کہ اپنی محکوم اقوام کو مغربی تہذیب میں ضم کر دیا جائے کیونکہ جب ان کی اپنی انفرادیت ختم ہو جائے گی اور ان کی تہذیبی شناخت کو مٹا دیا جائے گا۔تو وہ ان کے اقتدار کو تسلیم کر لیں گے اور ان کی حکومت ان کے لیے اجنبی اور غیر ملکی لوگوں کی حکومت نہیں رہے گی۔اس مقصد کی خاطر انہوں نے نوآبادیات کے معاشروں کی تہذیبی جڑیں کاٹ کر وہاں کے لوگوں کو ذہنی طور پر تبدیل کرنے کا مشن بنایا۔نو آبادیات کے لوگوں کو ذہنی طور پر پسماندہ بنانے اور فکری طور پر پسماندہ رکھنے کی شعوری کوشش کی جاتی تھیں۔اس سلسلے میں یہ بار بار کہا جاتا تھا کہ ان کی کوئی تاریخ نہیں۔یہ بات نہ صرف نو دریافت ملکوں کے لیے کہی گئی بلکہ ان ملکوں کے لیے بھی جو کہ ماضی میں تہذیب کا گہوارہ رہ چکے تھے مثلاً ہندوستان کے بارے میں مشہور فلسفی ہیگل سے لے کر نامور مؤرخ رانکے تک یہی بات کہتے رہے کہ اس ملک کی کوئی تاریخ نہیں۔'' ۱۴

پروفیسر ٹائن بی نے بھی ایک مثال کے ذریعے اس تعامل پذیری کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

''جب کسی گرم تاب تہذیب کی ثقافتی شعاع کسی دوسرے تہذیبی ڈھانچے پر شعلہ زن ہوتی ہے تو حملہ شدہ بیرونی ڈھانچے کی مزاحمت تہذیبی شعاع میں شامل عناصر کو بکھیر دیتی ہے بالکل ایسے جیسے روشنی کی تکون شیشے کی مزاحمت سے سات فنون لطیفہ کی کرنیں شامل ہوتی ہیں۔ جب ایک برسر پیکار تہذیبی شعاع کسی بیرونی معاشرتی ڈھانچے کی مزاحمت کا سامنا کرتی ہے کہ جس پر حملہ آور ہوتی ہے تو اس میں شامل کرنیں بکھر جاتی ہیں۔تہذیبی شعاع افشانی کے عمل میں ایک کرن کی قوت اثر پذیری میں عموماً اس کرن کی تہذیبی اہمیت کی نسبت معکوس ہوتی ہے۔'' ۱۵

یہ بھی درست ہے کہ دنیا میں جب بھی کوئی بڑا سیاسی انقلاب آتا ہے تو وہ اپنے استحکام کے لیے تہذیبی قوتوں کو بروئے کار لاتا ہے۔ اگر تو غالب تہذیب محکوم تہذیب سے زیادہ جاندار ہے تو محکوم تہذیب دب جائے گی اور غالب تہذیب کو پھیلنے کا موقع ملے گا۔ جب انگریزوں نے برصغیر پر حکومت کی تو برصغیر میں بھی ایک تہذیبی کشمکش شروع ہوئی ۔ کیونکہ انگریزوں کی آمد کے ساتھ جب ان کی تہذیب نے ہندوستان میں قدم جمانے شروع کیے تو ہندوستان کی تہذیبی اقدار پر اثرات پڑنے شروع ہوئے۔انگریزی تہذیب کے ان اثرات نے برصغیر کی تہذیب کو متاثر ضرور کیا مگر اس کو مکمل طور پر ختم نہ کر سکی بلکہ ایک طرح سے نئے تہذیبی بحران کو جنم دیا۔ کیونکہ کہ استعمار کی آمد کے بعد ایک مختلف نوعیت کے پیٹرن نے انفرادی اور اجتماعی طور پر مقامی آبادی کو مغلوب کرنے کی کوشش کی۔ یہ عمل اٹھارویں صدی کے آواخر میں شروع ہوا۔ جب مغرب کے تہذیبی اور علمی سانچے انتشار کا شکار مشرقی تہذیب میں متبادل کے طور پر پیش کیے جانے لگے۔اور اس طرح ایک ثقافتی جنگ کا آغاز ہوا۔شبنم سبحانی کے لکھتے ہیں:

> ''نئے آنے والے جس تہذیب کے پیکر بن کر آئے تھے وہ مادیت اور عقلیت کی آغوش میں پروان چڑھی تھی۔ ہندوستان کا روحانی اور غایت درجہ مذہبی مزاج اسے ٹھنڈے دل سے گوارا کرنے پر تیار نہیں تھا۔ سیلاب میں انھیں اندیشہ نظر آیا کہ کہیں صدیوں کے نقوش ذہن و دل سے مٹ کر نہ رہ جائیں اور حکومت کے ساتھ ہی دین و ایمان سے ہاتھ نہ دھونا پڑے چناچہ ایک عوامی کشمکش اور بیداری کا آغاز ہوا۔'' ۱۶

نوآبادیاتی نظام کا مشاہدہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظام ایسی سوچ اور فکر کی پیداوار تھا جس کا

بنیادی نقطہ ہی یہ ہوتا ہے کہ دنیا میں نسلیں اور قومیں باہم فرق فرق ہیں۔ کچھ اعلیٰ و برتر اور مہذب ہیں اور کچھ پس ماندہ اور غیر مہذب، جاہل گنوار۔ اب اعلیٰ اور مہذب نسلوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ان غیر مہذب اور پس ماندہ اقوام کو مہذب بنائیں اور اسی نقطے کو اپنی حکمرانی کا جواز بنایا۔ چناچہ اہل ہندوستان بھی غیر مہذب قرار پائے اور انگریز مہذب اور متمدن۔ اس طرح دونوں اقوام کے درمیان ایک افتراق پیدا ہو گیا اور ذہنی کشمکش کا آغاز بھی ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی نہایت اہم ہے کہ انگریز اس طرح کے ہتھکنڈے استعمال کر کے مقامی آبادی کے ذہنوں میں انگریزوں کے خلاف مزاحمتی جذبات کو بھی ختم کرنا چاہتے تھے۔ جیسا کہ ڈاکٹر مبارک علی کا موقف ہے:

> ''ہندوستانیوں کے بارے میں تضحیک اور حقارت کے رویوں کے ذریعے انگریز یہاں پر تمام مزاحمتی جذبات کو کچلنا چاہتے تھے۔ وہ ہندوستان کو تہذیبی، ثقافتی طور پر گرا کر اس مرحلہ تک لانا چاہتے تھے کہ جہاں ان میں آزادی نفس۔ حریت۔ اعتماد اور اپنی ذات کا احساس ختم ہو جائے اس لئے اس بات کی کوشش کی گئی کہ ثقافتی طور پر انگریزوں کی برتری کا احساس ہو اور ہندوستان کو اپنی تہذیب سے نفرت۔'' ۱۷

دریں حالات محکوم ہندوستان میں دو طرح کے رجحانات نے جنم لیا۔ ان میں سے ایک تو یہ تھا کہ انگریزوں سے سماجی تعلقات قائم کرنے کے بجائے ان سے دوری اختیار کی جائے اور دوسرا رجحان یہ تھا کہ انگریزوں کی قربت کے حصول کے لیے ان کے رسوم و رواج، معاشرت اور طور طریقے سیکھے جائیں۔ مگر اس طرح بھی وہ انگریزوں سے اس طرح کا احترام اور توقیر حاصل کرنے میں ناکام رہے بلکہ انگریزوں نے اس رجحان کو بھی تحقیر سے دیکھا۔ انگریزوں کے اندر بطور حاکم نسلی تفاخر اور برتری کا احساس وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زیادہ شدید تر ہوتا چلا گیا۔

برصغیر کے باشندے ایک خاص تہذیبی ماحول کے پروردہ ہیں جن کی دانش اور تمدن کے اپنے اصول اور سانچے ہیں اور ان کی اپنی قدیم تہذیبی اور ادبی روایات ہیں۔ لیکن پھر استعمار کی آمد کے بعد ایک ثقافتی جنگ کا آغاز ہوا اور انہیں انفرادی اور اجتماعی لحاظ سے مغلوب کرنے کی کوشش شروع ہوئیں۔ مغرب کے تہذیبی اور علمی سانچے متبادل کے طور پر پیش کر کے ایک ایسا تہذیبی انقطاع عمل میں لانے کی دانستہ کوشش کی گئی جس کے نتیجے میں ہماری نوجوان نسل میں فکری انتشار بڑھنے لگا۔

ایسے میں برصغیر کی عوام میں پرانی شناختوں اور جاگیرداری عظمتوں کے سنگِ میل وقت کے سیلِ بیکراں میں بہہ کر ماضی کے تاریک اور گہرے سمندر میں گم تو ہونا شروع ہو نگے مگر انھیں اپنی بے بسی اور بے چارگی کا احساس کچوکے لگانے لگتا ہے۔ یہاں کا نوجوان ذہنی تشکیک کا شکار ہوکر ماحول اور سماج سے نا آسودگی کا شکار ہوگیا اور کئی قسم کی ذہنی اور جذباتی الجھنوں کا اسیر ہوگیا۔ اور فکری ژولیدگی میں مبتلا ہوگیا۔ انہیں اپنے ہم وطنوں کی غلامی، استحصال اور حکمرانوں کے حقارت آمیز منافقانہ رویے سے مایوسی ہوئی۔ یوں عہد نوآبادیات میں چھا جانے والے تہذیبی بحران نے ہندوستان کو داخلی کشمکش، اعصابی ہیجان، روحانی کرب اور احساس محرومی میں مبتلا کر کے اس نسل کو انفرادی انتشار کے ساتھ ساتھ اجتماعی آشوب سے ہم کنار کیا۔ کیوں کہ حکمرانوں نے ان نوآبادیات پر تسلط مضبوط کرنے کے لیے محکوم قوموں اور نسلوں میں یہ احساس جاگزیں کیا کہ وہ تہذیبی طور پر ان نوآبادیاتی حکمرانوں سے کم تر ہیں۔ ایسے میں مقامی آبادی کو اپنی روایات اور اقدار سے نفرت پیدا ہوئی۔ اور اس تہذیبی بحران کا نوآبادیاتی حکمرانوں نے بھر پور فائدہ اُٹھایا اور اپنی حکومت کو مستحکم کرنے کے ساتھ مقامی لوگوں میں اس تصور کو پختہ کیا کہ جب تک نوآبادیاتی معاشرے حکمرانوں کی تہذیب اختیار نہیں کریں گے ان کی ترقی اور خوشحالی ناممکن ہے۔ یوں اپنی تہذیب سے متنفر ہونے کے باوجود کے نئی تہذیب نے بھی انہیں اس طرح قبول نہیں کیا۔ جیسے کہ وہ خواہاں تھے۔ اس طرح نوآبادیاتی حکمرانوں کی پالیسیوں سے برصغیر ایک نئے تہذیبی بحران نے جنم لیا۔ جس نے مقامی آبادی کی مشکلات میں تو اضافہ کیا مگر حکمرانوں کے لیے کئی آسانیاں پیدا ہوگئیں اور مستقبل کی تاریخ پر بھی اس پالیسی کے اثرات مرتسم ہوئے۔

یہ امر بھی قابل غور ہے کہ خود ہمارے لوگوں نے بھی علم و تحقیق کو پس پشت ڈال دیا تو ان مستشرقین نے مشرقی علوم پر توجہ مرکوز کی جیسا کہ معروف صحافی امتیاز عالم اپنے مقالہ ''دو بیانیے'' میں رقم طراز ہیں:

> ''یقیناً نوآبادیاتی اور مابعد نوآبادیاتی ادوار میں مشرق، جہاں زیادہ تر مسلمان آباد ہیں ۔مغرب کے زیرنگیں رہا ہے جو بربریت اور استحصال سے عبارت ہے لیکن یہ بنیادی حقیقت اپنی جگہ ہے کہ مسلم دنیا نے کئی صدیوں سے علم و تحقیق، فکری جستجو اور تخلیق و ایجاد کو خیر باد کیے رکھا ہے۔ یہاں تک کہ عقلیت کا دور جو مشرق سے شروع ہو کر مغرب میں جا بسا، مسلم دنیا اس سے صدیوں دور ہے۔'' ۱۸

ہندوستان میں ۱۸۵۷ء نے ہماری سیاسی تاریخ کو ہی نہیں بدلا بلکہ ہمارے شعور اور رویوں کو بھی تبدیل کر دیا۔ اور ایک ایسی فضا قائم ہوئی جس کے نتیجے میں ایسے ہندوستانی تعلیم یافتہ نوجوان پیدا ہوئے جو رنگ و نسل کے اعتبار سے ہندوستانی اور کردار اور روح کے اعتبار سے برطانوی سامراج کا نوآبادیاتی نمونے تھے۔ ایسے ماحول میں ایک خاص نوآبادیاتی صورتحال وضع کی گئی جو محض عسکری قوت کے ذریعے ممکن نہیں تھی۔ ابوالکلام قاسمی رقم طراز ہیں:

> ''برطانوی سامراج نے ہندوستانیوں کے ذہن کو ایسے مغربی رنگ میں رنگنے کا خواب دیکھا تھا کہ ان کی اپنی روایات ان کے لیے بے وقعت اور ناقابل تقلید بن جائے۔''[۱۹]

یقیناً نوآبادیاتی عہد میں لکھے جانے والے ناولوں کے صفحات پر تحریر کردہ ہر عبارت غیر ارادی نہیں بلکہ ارادی اور شعوری ہوتی ہے اور'' منشائے مصنف'' کے تابع ہوتی ہے اور اس متن کو سمجھنے کے لیے اس کے مخصوص کوڈز کو سمجھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ مثلاً ہومی بھا بھا نے نوآبادیاتی سیاق میں استعمال ہونے والی انگریزی کی کئی خفیہ اور پوشیدہ خصوصیات و جہات کا مشاہدہ کرتے ہوئے نوآبادیاتی عہد کے محضر نامے میں گوناں گوں تضادات کی نشاندہی کی ہے جس سے مراد وہ زبان نہیں جو وہ بولتا ہے بلکہ وہ زبان ہے جو اس سے بولتی ہے۔

اس کے ساتھ یہ بات بھی بہت اہم ہے کہ یہ مابعد نوآبادیاتی مطالعے اس امر کے بھی شاہد ہیں کہ بیرونی حکومتیں یا استعمار اپنے دور حکمرانی میں مقامی آبادی کے نہ صرف قلوب و اذہان کو متاثر کرتی ہیں بلکہ نوآبادیاتی عہد کے خاتمے کے بعد بھی اپنے اثرات کچھ اس انداز میں چھوڑ جاتے ہیں کہ ان کے نقوش تادیر قائم رہتے ہیں۔ سامراجی عہد کے ان اہم فن پاروں کو ماضی میں جا کر اور دیگر تواریخ و روایات کو پیش نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ عصر حاضر کے تناظر میں پڑھنا اور سمجھنا نہایت ضروری ہے۔

کالونی لفظ لوگ عموماً استعمال کرتے ہیں۔ کالونی کا نام سنتے ہی ہمارے ذہن میں مرکز شہر سے ملحقہ آبادی کا تصور ابھرتا ہے۔ جو ایک طرف تو الگ حیثیت اور پہچان رکھتی ہے تو دوسری طرف وہ بہت حد تک مرکزی شہر سے وابستہ ہوتی ہے۔ نوآبادیات میں کالونی کا مطلب اس سے مختلف اور وسیع ہو جاتا

ہے۔ یہاں مرکزیت کا دائرہ عمل ایک شہر سے وابستہ کالونی سے نکل کر مختلف خطوں اور براعظموں تک پھیل جاتا ہے۔ مرکز دور ہونے کے باوجود بہتر حکمت عملی سے اپنی کالونی کو قابو میں رکھ سکتا ہے۔ انسانوں کے ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنے کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ ابتدائی دور میں جب انسان مختلف قبائل کی شکل میں رہتے تھے اس دور میں بھی طاقت ور قبیلے نے ہمیشہ کمزور قبیلے پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کی یہ سوال خاصا اہمیت کا حامل ہے کہ ایک قبیلے نے کیوں ایسا کیا کہ وہ دوسرے کو یرغمال بنائے؟ ایک قوم نے دوسری اقوام کو کیوں زبردستی زیر رکھنے کی کوشش کی؟ تمام سوالوں کا بنیادی جواب ایک ہی سامنے آتا ہے کہ وسائل کے حصول کے لیے یہ ایک تسلسل کے ساتھ تاریخی چکر چل رہا تھا۔ طاقت ور ہمیشہ من مانی کرتے ہوئے کمزوروں سے ان کے نہ صرف وسائل چھین رہا ہے بلکہ ان کی جانیں تک ضائع کر رہا ہے۔ قبائلی نظام کے ارتقاء کے بعد جب مختلف ملک معرض وجود میں آئے تو ان کی نظر ہمیشہ کمزور کو تلاش کرتی رہی اور ان کے وسائل پر قبضہ کرنے کے لیے مختلف طریقے اپنائے جاتے رہے ازل سے یہ قانون چلتا آ رہا ہے کہ طاقت ور کمزور کو دبا کر رکھتا آیا ہے یعنی جس کی لاٹھی اس کی بھیس کی بات صادق آتی ہے۔ ہر خطہ مختلف قدرتی وسائل سے مالا مال ہوتا ہے اور کسی نہ کسی حوالے سے اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ وہاں پر رہنے والی قوم نے انہیں استعمال کرنا شروع کیا اور آبادی کے تناسب سے وسائل کم ہوتے گئے تو اس قوم یا ملک نے ادھر اُدھر دیکھنا شروع کیا اور جہاں اس کا بس چلا یعنی کمزور ملک دیکھا اس کے وسائل حاصل کرنے کے لیے جدوجہد شروع کر دی اور ان وسائل کو حاصل کرنے کے لئے ہر حربہ استعمال کیا جاتا رہا انگریزی میں نوآبادی کے لیے ''کالونی'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے جس کا مطلب ہے۔

> Colonialism word comes from the Roman '' colonia'' which meant farm or settlement and referred to Romans who settled in other lands but still retained their citizenship.20

لفظ کالونیا کی جگہ اردو میں بھی انگریزی لفظ ''کولونیا'' استعمال ہوتا ہے۔ نوآبادیاتی تناظر میں دو الفاظ خاص اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ بلکہ فریق بھی یہی دو ہی ہوتے ہیں ایک ''نوآبادکار'' اور دوسرا ''

نوآبادی'' ۔ان دونوں میں فاتح اور مفتوح کا تعلق ہوتا ہے۔فاتح کا ہاتھ اوپر ہوتا ہے کیوں کہ وہ پہلے بھی اپنے مقابلے میں کمزور کو دیکھ کر وار کرتا ہے اور مفتوح ہمیشہ مغلوب ہوتا ہے۔

نوآبادیات ایک ایسا نظام ہے جس میں ایک طاقت ور طبقہ کمزور کو یرغمال بنا کر اس کے وسائل پر قبضہ کرتا ہے اور انسانی تاریخ کے طویل ارتقاء میں یہ عمل کسی نہ کسی صورت میں جاری ہے اگر چہ اس کے انداز بدلتے رہے ہیں مگر بنیادی مقاصد میں کوئی خاص فرق نہیں آیا ،لیکن نوآباد کے طریقئہ ہائے کار بدلتے رہے ہیں ۔مثلاً قبائل کا ایک خاص طریقہ تھا اس کے بعد قبائل کی تعداد میں اضافہ ہوا تو ان کے علاقہ میں وسعت آئی یعنی انہوں نے مزید خطعے زیر کر لیے اس کے بعد مختلف ملکوں نے وسائل کے لیے دوسرے ترقی پزیر ملکوں پر قبضہ کا سلسلہ شروع کیا اور آج امریکہ اپنے مقاصد کے لئے ایک نیا بیانیہ اور انداز اپنائے ہوئے اسی نظام کو لے کر چل رہا ہے۔

بنیادی طور پر نوآبادیاتی علاقہ میں دو طرح کے لوگ بستے ہوتے ہیں ایک تو اصل مقامی باشندے جو پہلے سے وہاں رہائش پذیر تھے جس کو نوآبادی کا نام دیا جاتا ہے اور دوسرا وہ جو بیرونی آنے والے نوآباد کار ہے ۔ جو حکمت عملی ،مخصوص طریقہ کار سے قابض ہوتا ہے اور پھر اپنے مقصد کی طرف بڑھتے ہیں۔

نوآبادیاتی عہد میں نوآباد کار اور نوآبادی کے درمیاں ایک خاص قسم کا تعلق ہوتا ہے۔ یہاں بات برطانوی نوآبادیات کے تناظر میں کی جارہی ہے۔اور اسی عہد کو دیکھنا مقصود اور برطانوی عہد کے تناظر میں کولونیل اور پوسٹ کولونیل کا جائزہ لینا مقصود ہے۔ کیوں کہ اگر اس برطانوی عہد سے قبل کے نوآباد کار کی طرف جائیں تو مسلمان بھی بحثیت نوآباد کار کے یہاں گروہ در گروہ آتے رہے ہیں اور قبضہ بھی کیے رکھا ۔اگر چہ مسلمانوں اور یورپیوں کے طریقہ کار اور مقاصد مختلف تھے مگر مسلمان بھی باہر سے ہی تھے ۔ چند ایک نے تو باقاعدہ لوٹ مار کی اور وسائل سمیٹنے کی اپنی پوری سعی کی ۔لیکن اس باب میں برطانوی عہد کو مکمل طور پر زیر بحث لانے اور اور بعد کے یعنی مابعد نوآبادیات اثرات کا جائزہ لینا مقصود ہے۔ کیوں کہ یہ عہد مابعد اثرات کے حوالوں سے منفرد ہے۔

Post colonial is a theory which observed or

recognized in the occupied region after

colonialism.21

بحیثیت مسلمان ہمارا یقین ہے کہ تمام حالات و واقعات فطری ہوتے ہیں لیکن پھر بھی ایک حد تک انسان کو ایک صورت حال کو بدلنے کا اختیار حاصل ہے۔نو آبادیاتی صورت حال بھی پیدا کرنے میں ایک بہت بڑا حصہ خود نو آبادی ڈالتی ہے اگر باہم مربوط رہے اور طاقت جمع رکھے تو اس طرح کی صورت حال پیدا ہی نہ ہو مگر نو آباد کار بھی تراکیب کے جال بچھا کر اور خاص طریقوں سے مقامی باشندوں کو ہم خیال بناتا ہے۔گویا شکاری تو ہمیشہ شکار کی تاک میں رہتا ہے۔جیسے موقع ملا جھپٹ پڑا۔نو آبادیات کے حوالے سے ایک بنیادی سوال اکثر ذہن میں ابھرتا ہے کہ یہ نو آبادیاتی کی صورت حال کیونکر پیدا ہوتی ہے اور کیونکر اس کی وسعت دی جاتی ہے۔

''انسان نے قدیم غیر طبقاتی نظام سے نکل کر خاندان، جائیداد اور ریاست کی تکون میں قدم رکھا تو وہ اعلیٰ و ادنیٰ طبقات میں تقسیم ہو کر استحصال کا شکار ہونے لگا وہاں اس نے دیگر انسانی گرہوں پر قبضوں اور فتوحات سے ابتدائی نو آبادیات کا آغاز کیا ۔''۲۲

بہ عین یہی معاملات جو ایک گروہ کو درپیش تھے وہی معا،ملات ایک ملک کو درپیش آئے اور وہ ملک انتشار کا شکار ہوا اور پھر طاقت ور ملک جو انتظار میں تھا اس نے صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان پر اپنا قبضہ قائم کیا۔

## نو آبادیات اور مابعد نو آبادیات کے برصغیر پر اثرات

برصغیر میں نو آبایاتی دور کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ایک عہد ۱۶۰۰ء سے پہلے کا جس کو مسلمانوں کا اور دوسرا اور ۱۶۰۰ء سے بعد کا جسے یورپی عہد کا نام دے سکتے ہیں۔یورپی اقوام سے برصغیر میں پہلے پرتگیزی لوگ یہاں وارد ہوتے ہیں۔اسکوڈے گاما سے عہد شروع ہوا یہ عہد دیگر اقوام یا نو آبادکاروں کت مقابلے میں قلیل ہے اور اس کے بعد دوسرا دور ولندیزیوں کا ہے۔انہوں نے مشرق یا

برصغیر سے تجارت کے لیے کمپنی بھی تشکیل دی گئی۔

فرانسیسی دور برصغیر میں یورپی نوآبا کاری کے حوالے سے خاص اہمیت کا حامل ہے۔فرانسیسی عہد جس میں برطانیہ بھی برصغیر میں گھس چکا تھا اوران دونوں کی باہمی مڈھ بھیڑ ہونا ایک لازمی امر تھا۔کیونکہ یہ دونوں ملک یہاں کی یجارت میں اجارہ داری چاہتے تھے۔ام کے لیے تجارت میں ایک دوسرے کی حصہ داری نا قابل قبول تھی۔اس لیے وقفے وقفے سے ان دونوں ملکوں میں تصادم ہوتا رہا اور آخر میں برطانیہ بہتر حکمت عملی کی وجہ سے کامیاب ہوا۔

''انگریزوں کے سامنے فرانسیوں کے قدم نہ جم سکے اور انہیں بالآخر برطانوی کمپنی کے لئے میدان خالی چھوڑنا پڑا۔''۲۳

اس دور کے ایک سپہ سالار نواب انوارالدین کو فرانسیسی فوجوں نے مہارت سے شکست فاش سے دوچار کیا اس کے بعد فرانسیسیوں کے لیے قدرے میدان ہموار نظر آنے لگا مگر اس کے مقابلے میں برطانوی بہتر نظم ونسق سے لڑے اور فرانسیسی فوج کو علاقے خالی کرنے پر مجبور کر دیا۔ان دونوں اقوام کا واسطہ یا تسلط تقریباً ایک ہی علاقے سے تھا۔کرناٹک کی لڑائی اور جنگ پلاسی کے بعد برطانوی نوآبادکار مضبوط سے مضبوط ہوتا گیا۔

برصغیر میں نوآبادیاتی عہد سکندر اعظم ،محمد بن قاسم ،منگول ،تغلق ،لودھی ،مغل ،یورپی اقوام، پرتگالی ،ولندیزی اور فرانسیوں سے ہوتا ہوا برطانوی عہد تک آتا ہے۔مابعد اثرات یعنی انگریز نوآبادکار کے ابھی تک مسلسل چل رہے ،چوں کہ انگریز سب سے طاقت ور نوآبادکار تھے اس لیے مابعد اثرات بھی دیرپا ثابت ہو رہے ہیں۔یہ دور (برطانوی) خاص اہمیت کا حامل ہے اس لیے بھی ہیت کہ یہ دور اپنے اندر مختلف ارتقائی مراحل رکھتا ہے ،جن سے ہم تا حال گزر رہے ہیں۔یعنی اس عہد کے تناظر میں مابعد نوآبادیاتی کیفیت زیادہ دیرپا رہی ہے۔ایک طویل نوآبادیاتی اور مابعد نوآبادیاتی صورت حال کو دیکھ کر بے اختیار یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اقوام عالم کی نظریں ہمہ وقت برصغیر پر کیوں مرکوز ہی ہیں؟ ایسی یہاں برصغیر میں کونسی خاص بات یا مفادات تھے جن کو حاصل کرنے کے لیے ملکوں اقوام کو برصغیر کی ضرورت محسوس ہوتی رہی اور وہ مختلف اوقات میں اسے نوآبادی بناتے رہے ہیں۔

۱۶۰۰ء میں ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' کا قیام عمل میں آیا اور ایک وقت میں خود کمپنی کے اختیارات کے حوالے سے مباحث برٹش پارلیمنٹ میں ہوتی رہی۔ کمپنی نے برصغیر کو اتنا لوٹا جتنا اس کا بس تھا۔ مختلف حوالوں سے اب تو اعداد و شمار بھی ہونے لگے ہیں۔ کمپنی میں ملازمین کو بہت سے اختیارات حاصل ہیں تھے۔ جن کو وہ اپنی مرضی سے استعمال کرتے تھے اور مقامی نو آبادی کے وسائل کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹتے۔ برطانیہ نے بھی کوئی کمی نہ چھوڑی اور غریب ملازم چند سالوں میں بہت مالدار بنے۔

> ''ایسٹ انڈیا کمپنی کی تاریخ قریباً اڑھائی سو سال پر پھیلی ہوتی ہے۔۔۔ یہاں تک کہ پارلیمنٹ کے ایک قانون نے کمپنی تجارت کا حق چھین لیا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد برٹش پارلیمنٹ نے کمپنی اختیار حکومت بھی ختم کر دیا۔''۲۴

ایسٹ انڈیا کمپنیا یک طویل عرصے تک پرتگالیوں، فرانسیوں اور ان سے پہلے مقامی عہدے داروں، سالاروں کے ساتھ لڑائیوں میں الجھی رہی مگر پھر بھی اس دور میں بھی کمپنی نے دولت سمیٹنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ دوسری طرف وہ مختلف محاذوں پر مخالفین سے برسرِ پیکار رہی اور مسلسل منزل کی طرف گامزن رہی کبھی بھی کمپنی نے نقصان کا سودا نہیں کیا۔ کمپنی نے ہر جائز اور ناجائز طریقے سے دولت برصغیر سے برطانیہ منتقل کی۔ تجارت کا تو بس ایک لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ اصل میں تو یہاں کے وسائل کو لوٹنا مقصود تھا وہ مکمل طور پر اس مقصد میں کامیاب رہی یا دوسرے لفظوں میں چھینی ہوئی دولت اور وسائل جن میں خام مال بھی شامل تھا، اسے برصغیر سے برطانیہ منتقل کیا اور خوب ترقی کی منزلیں طے کیں۔

۱۸۵۷ء کے بعد برصغیر بحیثیت ایک '' کالونی'' کے براہ راست برطانیہ کے زیرِ نگیں ہو گیا۔ ملکہ وکٹوریہ برصغیر کی ملکہ بن گئیں، یہ بھی اس قوقت قدم اٹھایا گیا جب کمپنی بہادر بہت سے وسائل اپنے مخالفین کے خون سمیت سمیٹ چکی تھی۔ توپ دم کرنا اور سرِ عام پھانسی سے مخالف لوگوں کو ختم کیا گیا۔ اس میں دہشت ایک اہم عنصر کے طور پر استعمال کی گئی۔ لوگوں کو دردناک سزائیں دی گئیں اس میں کمپنی بہادر کا ایک ہی مقصد تھا کہ آئندہ کے لیے کوئی سر اٹھانے سے پہلے سو بار سوچے کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ دہشت کے ذریعے بہت حد تک مقامی نو آبادی کو دبا کر رکھا گیا اور اٹھنے والے سروں کو کچل دیا جاتا۔ من پسندوں کے نوازنے کا سلسلہ بھی یہاں سے شروع ہوتا ہے۔

''نوآبادیاتی صورت حال، فطری اور منطقی صورت حال نہیں ہے۔۔۔اسے پیدا کیا جاتا اور تشکیل دیا جاتا ہے اس لیے مخصوص مقاصد کو سامنے رکھا جاتا ہے۔''۲۵

جب ایک قوم ملک کسی دوسری جگہ پر قبضہ کرتا ہے یا کسی طرح اس خطہ پر کنٹرول حاصل کرتا ہے تو اس کے بہت سے مقاصد ہوتے ہیں۔ برطانوی بھی اپنے انہی مقاصد کے حصول کے لیے یہاں آئے۔ برطانوی بادشاہت سے الگ ہونے کے بعد یعنی ۱۹۴۷ء کے بعد مابعد نوآبادیاتی صورت حال پیدا ہوتی ہے جیسے مابعد نوآبادیات کہا جاتا ہے جیسے انگریزی میں پوسٹ کولونیلزم کہا جاتا ہے۔ایک عرصہ تک انگریزوں نے برصغیر کو نوآبادی بنائے رکھا اور اپنی معاشی مقاصد کے حصول کے لیے انہوں نے ایک خاص طریقہ کار اختیار کیا۔اگر ایک سطح تک اس بات کو مان لیا جائے کہ مفتوح یا نوآبادکار کے مابعد اثرات فطری ہوتے ہیں تو برصغیر کے حوالہ سے یہ بات درست معلوم نہیں ہوتی۔مسلمانوں نے انگریزوں کے مقابلے میں برصغیر پر طویل عرصہ حکومت کیا اور انہوں نے بھی مقامی نوآبادی پر اثرات مرتب کیے اب مابعد نوآبادیاتی صورت حال کا جائزہ لیا جائے تو انگریزوں کے آنے کے بعد مسلمانوں جو کہ بحیثیت نوآبادکار آئے تھے ان کے اثرات زائل ہو گئے وہ دیرپا نہیں تھے یا دیرپا ثابت نہیں ہو سکے مگر انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے بعد ہم آج بھی اس دور سے نہیں نکل سکے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نوآبادیات نے مختلف اشکال تبدیل کی ہیں لیکن کسی نہ کسی صورت میں موجود رہا ہے۔دوسری طرف نوآبادیاتی اثرات بھی موجود رہے ہیں۔ایک قوم اسی وقت ہی زیر ہوتی ہے جب وہ مختلف حوالوں سیاسی، معاشی اور ثقافتی سے زوال پزیر ہوتا ہے۔ان میں سب سے اہم مضبوط اور مرکزی حکومت کا نہ ہونا ہے۔برصغیر میں جب انگریزوں نے تسلط قائم کی تو یہاں برصغیر میں بھی ایک انتشار کی کیفیت تھی۔اس لیے انہوں نے آسانی سے یہاں قدم جما لیے۔اس انتشار کو ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' فارمولے کا نام دیا جا سکتا ہے۔

ایک پیروں کار کو پنڈت نے ایک خاص وقت تک چلا کاٹنے کے لیے کہا کہ تم کو یہ تصور کر کے ۴۰ دن ایک غار میں گزارنے ہیں کہ میں گائے ہوں اس نے ایسا ہی کیا جب مقررہ وقت ختم ہوا تو پنڈت اس کے پاس آیا اور کہا کہ اب تم باہر آجاؤ تو اس آدمی نے جواب دیا کہ غار کا دہانہ زیادہ کھولا نہیں میرے سینگ

اس سے اٹک جائیں گے۔ یہی صورت حال ترقی پذیر ملک انڈیا کی ہے۔ ہمارے حکمرانوں کے پاس اپنا کوئی نظام نہیں یہ کہتے ہیں کہ اگر ان کے بنائے ہوئے اصول چھوڑ دیں تو ہم چل نہیں سکتے اس لیے مجبوراً انہی اصولوں کو اپنا رکھا ہے۔ ناصر عباس لکھتے ہیں:

"کولونیل ازم ایک نیا ڈرامہ تھا، جس کا اسکرپٹ یورپ نے لکھا اور جیسے کھیلنے کے لیے اشیاء و افریقا کی سرزمین کو منتخب کیا۔ ڈرامے کے مرکزی کردار یورپی تھے تاہم کچھ معاون اور ضمنی کردار ایشیائی و افریقی تھے۔" ۲۶

برصغیر ایک عرصہ سے نوآبادی چلا آ رہا ہے۔ مابعد نوآبادیاتی صورت حال ابھی بھی جاری ہے۔ ایک وقت تک انگریزوں نے یرغمال بنائے رکھا مگر یہ برصغیر کے لیے نیا نہیں تھا۔ ٹھیک ہے برصغیر کو انگریزوں نے یرغمال بنائے رکھا مگر اب تو وہ چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ مگر ہم اب بھی انہی کے بنائے ہوئے راستوں پر چل رہے ہیں۔ ملک پر آج بھی وہی خاص طبقہ حکمرانی کر رہا ہے جس کو انگریزوں کے عہد میں بھی ان کو آشرباد حاصل رہی انہی کا پسندیدہ طبقہ آج بھی ہم پر مسلط چلا آ رہا ہے۔ بس ان مہروں کی شکل بدلتی رہی ہے۔

۱۹۴۷ء سے قبل ہمارے حکمرانوں اور بیوروکریسی کو مشکل نہیں تھی انگریز برصغیر میں ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام کرتے تھے اور ان کی خاص مقاصد کے تحت ذہن سازی کے بعد انہیں کائی بھی منصب سونپا جاتا تھا اب وہی مہرے اچھی خاصی رقم خرچ کر کے لندن سے تربیت حاصل کرتے ہیں اور یہاں آ کر حکمرانی کرتے ہیں۔

" انگریزوں کا ہندوستان میں آنا ہندوستان کی اپنی داخلی تبدیلیوں کا نتیجہ تھا۔ ان کے ابتدائی مقاصد میں ہندوستان سے تجارت تھی۔۔۔" ۲۷

میرے خیال میں ایسٹ انڈیا کمپنی یا برطانوی حکومت کا یہ مقصد نہیں تھا کہ برصغیر پر تسلط قائم کیا جائے ان کا مقصد تجارت تھا اور تجارت میں مغل حکمرانوں سے زیادہ سے زیادہ سہولتوں کا حاصل کرنا۔ اس کے لیے کمپنی نے ہر حربہ استعمال کیا۔ رشوت کی ضرورت پڑی وہ دی خوشامد کے رنگ میں کام نکلتا تھا تو خوشامد کی۔ آگے چل کر مغل حکمرانوں کی کمزوریوں اور باہمی انتشار کی وجہ سے حالات سازگار ہوتے گئے اور وہ اپنے قدم مظبوط سے مظبوط تر کرتے چلے گئے۔ یہ سوال بھی ذہن میں آتا ہے کہ جب کمپنی کا تسلط کا

مقصد نہیں تھا تو فوج کیوں رکھی یہ سوال اہمیت کا حامل ہے۔ ایک تو مرکزیت کمزور ہونے دوسرا دیگر گروہوں کا لوٹ مار کا بازار گرم کرنے کے نتیجے میں کمپنی نے اپنی یجارت، مفاد اور مال کی حفاظت کے لیے فوج رکھی جس میں بتدریج ہوتا گیا۔ کمپنی نے ابتدا سے ہی جارحانہ پالیسی رکھی کہ تجارتی مقاصد کے حصول میں رکاوٹ بننے والوں کو راستے سے ہٹاتے جاؤ اور وہ اپنی اس حکمت عملی میں کامیاب رہی۔

مابعد نوآبادیات جیسا کہ نام سے بھی ظاہر ہے نوآبادیات کے بعد کے اثرات کا دور ہوتا ہے۔ اس کا زیادہ تر تعلق تہذیب و ثقافت سے ہوتا ہے۔ جس میں نوآبادکار ایک علاقہ کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے اور وہاں مقامی لوگ انتظام و انصرام سمبھالتے ہیں اور لوگ اسے آزادی کے نام سے جانتے ہیں:

> '' اٹھارویں صدی کے دوسرے نصف تک ہندوستان میں کمپنی نے قدم جمالیے تھے اہم سیاسی اور تجارتی کام یابیوں کے بعد اپنی اس خواہش کے لیے کوشاں ہوئی جیسے ثقافتی غلبے کی خواہش کہنا چاہیے۔'' ۲۸

مابعد نوآبادیات میں ثقافتی مطالعہ اور اس کے اثرات خاص اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ انگریزوں نے اس سلسلے میں خاص ذہن سازی کا ایک تسلسل کے ساتھ انتظام کیا اور اس لحاظ سے مقامی نوآبادی کو یہ باور کروایا کہ ان کی تہذیب و ثقافت ادنیٰ درجے کی ہے اور گوروں کی اعلیٰ ہے۔ کمپنی سیاست کے ساتھ ساتھ ثقافتی لحاظ سے بھی اپنا تسلط چاہتی تھی۔ اور اسی سلسلے میں انگریز نوآبادکار نے اپنے تسلط کو قائم رکھنے اور اسے پھیلانے کے لیے نوآبادی کو خاص رخ پر ڈھالنے کی طرف خاص توجہ دی اور یہی اس کی کامیابی کا راز بھی ہے مقامی آبادی کو یہ باور کروایا کہ اصل میں ہماری ثقافت کی تقلید کرو تمہاری ثقافت قابل عمل نہیں۔ مقامی آبادی میں اکثریت اس بات کی قائل ہوگئی۔

جب کسی ملک پر تسلط ہوتا ہے اور وہ نوآبادی کی حیثیت اختیار کرتا ہے تو وہاں کی آبادی میں دو گروپ بن جاتے ہیں۔ ایک مخالف کرنے والا یعنی آزادی کے لئے کوشش کرنا والوں کی، ان کی تعداد ابتدا میں بہت کم ہوتی ہے۔ اور نوآبادکار کو یہ تعداد بھی ہضم نہیں ہوتی کیوں کہ یہ چنگاری کسی وقت بھی بھڑک سکتی ہے اور دوسرا گروپ جس کی اکثریت ہوتی ہے وہ تقلید میں ہی عافیت سمجھتا ہے۔ برصغیر میں تقلید کرنے والے آج بھی عیش و آرام کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور مخالف کرنے والوں نے اپنی جانی گنوادیں

اور اگر بچ نکلے تو ان سے سب کچھ چھین لیا۔ ان کے لیے جینا محال کر دیا گیا۔ اپنے گھر میں ان کے لیے اس طرح کے حالات پیدا کر دیے جاتے ہیں کہ انہیں زندگی کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

> ''انگریزوں نے (برصغیر میں) اجتماعی نسل کشی کی بجائے طاقت کے استعمال کی ایک اور صورت دریافت کی۔ ۳۰ کروڑ آبادی کے ہندوستان پر صرف چند ہزار برطانوی سپاہی ملازمین نے قبضہ کیے رکھا۔'' ۲۹

بنیادی طور پر قبضہ کو دو طرح کے حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے اور خاص طور پر نوآبادیاتی اور مابعد نوآبادیاتی تناظر میں اس کی دو شکلیں سامنے آتی ہیں۔ ایک تو برطانوی قبضہ تھا جس میں انگریزوں نے قتل وغارت کی اور اپنے مخالف باغیوں کو بری طرح سزائیں دیں اقو رانہیں نشان عبرت بنایا تاکہ دیگر عوام میں ہمارے خلاف ہتھیار نکالنے والا اپنے نتائج دیکھ لے یہ ظاہری قبضہ کی صورت ہے۔ دوسری صورت مابعد نوآبادیات کی ذیل میں آتی ہے انگریزوں نے ایک طویل مدتی منصوبہ بندی سے حالات کو ہموار رکھنے کی کوشش کی۔ اس میں ثقافتی غلبہ خاصا اہم ہے جس میں شعبۂ تعلیم پر خاص توجہ دی جاتی ہے جو ایک بہت اہم ہتھیار کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

انگریز نوآبادکار نے برصغیر پر تسلط کو برقرار رکھنے اور اسے طول دینے کے مختلف ہتھکنڈوں استعمال کیے اس میں سب سے پہلے تو ظاہری طاقت کا استعمال اہم ہے جس کے تحت باغیوں کو سرعام پھانسیاں دی گئیں اور بہت سے لوگوں کو توپ دم کیا یہ سب سے پہلا اور اہم طریقہ تھا کہ کوئی ہمارے سامنے سر نہ اٹھا سکے باقیوں کے لیے ایک طرح کا سبق ہو کہ مخالف رستے کے انتخاب سے ہمارا حال بھی انہی جیسا ہو گا۔

> ''ہندوستان، آئرلینڈ افریقی ممالک جائیداد تھے۔ انہیں حکمت عملی وتدبیر اور سازش ومنصوبہ بندی ہی سے ہتھایا گیا طاقت سے غلام بنے اور اس وقت تک غلام رہے جب تک طاقت ایک اثر صورت ظاہر رہی۔'' ۳۰

طاقت کے استعمال میں برطانیہ نوآبادکار کو برتری حاصل تھی اور اس بات کا انہوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور اس طاقت سے راستے کو صاف کرنے میں بہت حد تک مدد ملی اس کے بعد یعنی جب ۱۸۵۷ء عام معافی کا اعلان ہوا تو طاقت مختلف صورتوں میں ڈھل گئی۔ اور مختلف حوالوں سے مخصوص طرز

پر ذہن سازی میں اہم کردار ادا کیا، جو مابعد قبضہ میں موئثر ثابت ہوا۔

دورِ غلامی میں نو آبادی کو قدم قدم پر اپنی پہچان کے مسائل درپیش ہوتے ہیں۔تقلید پسند گروہ کے لیے نو آبادکار ایک امام کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ آنکھیں بند کرکے اس کے پیچھے چل پڑتے ہیں اور انہیں اپنی تہذیب وثقافت بری لگنی لگتی ہے۔نو آبادکار انہیں پوری طرح یہ باور کروادیتا ہے دنیا میں وہ افضل ہیں اسی طرح ان کی تہذیب وثقافت بھی برتر ہے اور مقامی نو آبادی تہذیب وثقافت محض فضول ہے۔ نو آبادی میں اکثریت انہی کی زبان بولتی ہے اور اس بات پر فخر کرتی ہے کہ انہیں اپنی زبان نہیں آتی اور اسی طبقہ کو نوازا جاتا ہے۔

زبان کے معاملے میں نو آبادی کو بتایا گیا کہ دنیا میں افضل ترین زبان انگریزی ہے۔اس زبان کو بولنے والے مہذب ہوتے ہیں اور مابعد نو آبادیات میں آج بھی ہمارا حال ایسا ہے اپنی علمیت اور بڑا پن ظاہر کرنے کے لیے آج بھی ہم انگریزی کا سہارا لیتے ہیں۔ہماری عوام میں سے اکثریت خواندہ نہیں ہیں مگر پھر بھی ہمارے وزراء اور عدالتی کاروائی تمام تر انگریزی میں ہوتی ہے۔ ہمارے منتخب کردہ نمائندے ایوان میں انگریزی میں تقریریں کرتے ہیں۔جو کہ ترقی پذیر ملکوں کی عوام کی اکثریت کے لیے محض شعور کی حیثیت رکھتی ہے۔

> ''پوسٹ کالونیل کو سمجھنے کے لیے ہمیں پاکستان میں بیوروکریسی کی ساخت اور کردار کو
> برطانوی سامراج کے ہندوستان پر قبضے اور کالونیل دور کے مختلف مراحل کے پس
> منظر میں سمجھنا ہوگا۔'' ۳۱

انگریزی نو آبادکار ایک حکمت عملی اور تدبیر سے برصغیر کی زبان اردو، فارسی کی جگہ پر انگریزی لے آیا اور باقی زبانوں کے جانے والے ان پڑھ شمار کیے جانے لگے۔یہاں سے برصغیر میں دو نظام تعلیم کی ابتداء ہوتی ہے ایک طرف نو آبادی میں سے انگریزی پڑھنے والا طبقہ اور دوسری طرف مدراس میں عربی ،فارسی اور دیگر مقامی زبانیں میں پڑھنے والے لوگ تھے۔یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ نو آبادکار کا پیروکار طبقہ انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ ہوا اور انہی کو نوازا جانے لگا جب کہ دیگر مطلوبہ حدف حاصل کرنے میں پیچھے رہے۔اور معاشرہ میں دوسرے درجہ کے شہری بن کر رہ گئے۔عزت، رتبہ اور معیار

محض انگریزی زبان بن کر رہ گئی اور آج بھی ہم بیوروکریسی سمیت اعلیٰ طبقہ نوآبادکار کے بتائے ہوئے انہی راستوں پر چل کر حکومت کر رہا ہے۔

اعلیٰ طبقہ سے مراد یہاں وہ طبقہ ہے جن کو نوآبادتی دور میں جاگیروں سے نوازا گیا۔ بادشاہ کا ساتھ دینے والوں یا آزادی پسندوں سے نوآبادکار نے سب کچھ چھین لیا۔ کسی کے پاس تھوڑی بہت زمین تھی بھی تو اس پر بہت زیادہ ٹیکس لگا دیا گیا اور ان کی زمینیں اپنے حلیفوں میں بانٹ دی گیں اور انہی حلیف جاگیرداروں سے ہی لوگ انگریزی پڑھ کر بیوروکریسی میں گئے اور عوام کو پوری طرح لوٹنے میں نوآبادکار کے لیے آلہ کار بنے اور بدلے میں چند مراعات حاصل کیں۔ وہی طبقہ آج عوام کی رگوں سے خون چوس رہا ہے۔

نوآبادکار یا انگریز نے برصغیر میں مقامی طرز حکومت کا طریقہ اختیار کیا اور مقامی راجوں اور اپنے ہی بنائے ہوئے جاگیرداروں کے ذریعے حکومت کی۔ مقامی لوگوں کے لیے تھوڑے سے اختیارات کا ملنا غنیمت سے کم نہیں تھا۔ انہوں نے اپنے آقا کو خوش کرنے لے لیے مقامی آبادیوں سے خوب مالیا اکٹھا کر کے نوآبادکار کے سپرد کیا۔

> ''قبضے کا بنیادی اصول ہے کہ قبضے کو زیادہ دیر برقرار نہیں رکھا جاسکتا۔ جب تک مقامی لوگوں کے ایک گروپ کو مفادات میں شراکت دارانہ بنالیا جائے۔''۳۲

انگریز نوآبادکار نے بڑی حکمت عملی سے برصغیر میں اپنے شرکت دار پیدا کیے اور انہی کے ذریعے اپنے مفادات کا حصول ممکن بنایا۔ اگر مقامی لوگوں کی حمایت حاصل نہ کی جاتی تو یہ قبضہ زیادہ دیر برقرار نہیں رکھا جاسکتا تھا۔ ایک طرف بیوروکریسی کا محکمہ قائم کیا گیا جو آج بھی مابعد نوآبادیات کے تناظر میں جوں کا توں موجود ہے اور دوسرا طبقہ اسی معاشرہ سے پیدا کردہ جاگیردار کا تھا۔

نسلی برتری کا تصور یہاں برصغیر مین بہت سرائیت سے اور مختلف اشکال میں آج تک موجود چلا آرہا ہے۔ انگریز نوآبادکار نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ نوآبادی کو یہ پوری طرح باور کردار دیا کہ وہ نسلی لحاظ سے ادنیٰ درجے کے ہیں اور ان کے لیے'' کالے لوگ''، نیٹوز'''اور دیگر حقیر الفاظ متعارف کروائے گئے۔ ان کالے لوگوں کو یہ بھی ذہن نشین کروادیا گیا کہ گورے اعلیٰ نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور گوری چمڑی

والوں کی تہذیب وثقافت دنیا میں اعلیٰ درجہ کی حامل ہے یہ احساس دلانے کے بعد نوآبادی کو اپنا پیروکار رکھنے میں بہت سی آسانیاں پیدا ہو گئیں اور وہ آنکھیں بند کیے نوآبادکار کی ہو بہو نقل کرتے چلے جاتے ہیں۔ اپنی تہذیب وثقافت ان کو حقیر نظر آنے لگتے ہیں۔ نوآبادی نے اپنے آپ کو مکمل طور پر انگریز کے رنگ میں رنگنے کی پوری طرح سعی کی اور آج مابعد نوآبادیاتی دور میں اسی صورت حال سے دوچار ہیں۔ وہ رنگ ہم پر اس حد تک چڑھ گیا ہے کہ اترنا محال ہو گیا ہے۔

انگریز نوآبادکار برصغیر سے ۱۹۴۷ء میں رخصت ہو گیا مگر ان کے بنائے ہوئے مہرے جن سے انہوں نے شطرنج کی بازی کھیلی تھی وہ آج بھی اسی طرح کی روش اپنائے ہوئے ہیں۔ ترقی پذیر ممالک کا یہ المیہ ہے کہ حکمران طبقہ کا رویہ عوام کے ساتھ سردار، نوکر کا ہے۔ اکثر علاقوں میں یہ مہرے عام کسانوں اور مزدوروں کو اپنے سامنے زمین پر بٹھاتے ہیں۔ اپنے برابر بیٹھنا توہین سمجھتے ہیں:

> ''جس طرح نوآبادیاتی دور میں انگریز حکمران مقامی روایت اور اداروں کو حقارت سے دیکھتے تھے آج بھی ہمارا طبقہ اعلیٰ انہی جذبات کا اظہار کرتا ہے۔''۳۳

مابعد نوآبادیاتی تجزیہ کرتے ہوئے اگر اہم اپنے نعاشرہ میں آس پاس کا جائزہ لیں تو اعلیٰ طبقہ مقامی لوگوں سے مناسب فاصلہ رکھتا ہے اور عام مزدوروں اور محنتی لوگوں کے لیے کمی کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ جب کہ وہ جاگیردار کی کوئی چیز اپنے لیے استعمال نہیں کر سکتا۔

دوہرے نظام تعلیم کے تحت جس طرح کے آج کل امتحان ہو رہے ہیں ایک غریب مزدور یا عام کسان اپنی اولاد کو اس سطح کی تعلیم دلانے سے قاصر ہے۔ ہمارا اشرافیہ اور اعلیٰ طبقہ جانتا ہے کہ اگر یکسان نظام تعلیم نافذ کر دیا گیا تو ایک موچی، مراثی کا لڑکا ان کی اولاد کو بھی آگے نہیں نکلنے دے گا اور ہماری شان میں اس طرح کمی واقع ہو جائے گی اسی اصول کے تحت یکسان نظام نہیں لاگو کیا جاتا کہ حکومت ہاتھ سے نکل جائے گی۔ اشرافیہ اور طبقہ اعلیٰ نام نہاد جمہوریت کے راگ الاپتے ہوئے آج بھی جمہوری کے نام پر ڈراما کر رہا ہے اور نوآبادیاتی عہد کا یہ ورثہ تمام عوام جن کی اکثریت ہے ان کو بحیثیت انسان ماننے کو بھی تیار نہیں اور مسلسل استحصال رویہ اپنائے ہوئے ہے۔ آج امیر طبقہ امیر تر اور غریب طبقہ غربت کی چکی میں پس رہا ہے، غریب آدمی کے لئے جمہوریت محض ایک ڈراما ہے۔ دو وقت کی روٹی بمشکل سے خاندان کو مہیا

کرنے والے کسان، مزدور کے لیے ایک ووٹ کی پرچی کیا قدر و قیمت رکھتی ہے یہ ہم ایک جاگیردار کے سامنے بیٹھے کسان کے چہرے کے تاثرات سے بخوبی لگا سکتے ہیں۔ جو اس کے ڈر سے کانپ رہا ہوتا ہے اور اس نے زندگی گزارنی ہوتی ہے۔ جیسا کہ نوآبادی کی جان کی قیمت بیان ہوئی ہے کہ ایک برابر ہے دس، پندرہ یعنی اگر گورے ایک کی جان جاتی ہے تو کالے لوگ پندرہ بھی اس کے بدلے میں کم ہیں۔

مابعد نوآبادیاتی جائزہ سے یہی درج بالا بات صادق آتی ہے۔ دنیا بھر میں مسلمانوں کا قاتل عام ہو رہا ہے ان بے کسوں کی آواز کسی کو سنائی نہیں دیتی مگر گورے کسی کو کوئی مسئلہ بنتا ہے تو دنیا کو سر اٹھا لیا جاتا ہے یہی تجربہ انگریز نے نوآبادیاتی عہد میں کیا، مقامی نوآبادی کو یہ بات باور کروادی گئی کہ ان کی عزت، مال دولت گوروں کے مقابلے میں ہیچ حیثیت رکھتے ہیں۔ دنیا میں گوروں کی تہذیب وثقافت، زبان سب سے اعلیٰ وارفع ہے۔ نوآبادی پر یہ احسان ہے کہ ہم نے (انگریزوں) ان کو زیر کیا ہے۔

> ''ہندوستان ہمیشہ سے انسانی جھونپڑوں کے ہجوم میں چمکتے دمکتے محلات کی سرزمین تھی جہاں متوسط طبقے کا وجود نہیں تھا اور نہ حملہ آور (انگریز) تک جمہوریت کا کوئی جھونکا اس کی خاک کو چھو کر گزرا تھا۔''۳۴

یہ الگ بحث ہے جو لاحصل ہے کہ اگر برصغیر کے سابقہ بادشاہوں (نوآبادکاروں) جو کہ مسلمان تھے۔ انہوں نے محلات کی جگہ تعلیمی ادارے بنائے ہوتے تو کیا ہوتا۔ اب ہم جس طرح ہر نظریہ کو درآمد کر رہے ہیں کہ وہ یہاں کے مذاق اور زمین کے لیے مناسب یا چل سکتا ہے یا نہیں؟ کیا جمہوریت یہاں کارگر ثابت ہو سکتی ہے یا نہیں۔ انگریز نوآبادکار سے پہلے والی آمریت میں برصغیر کی دولت وسائل کا رخ تو کم از کم باہر کی طرف نہیں تھا اور اس جمہویت میں اس کا رخ موڑا گیا جو مابعد بھی اثر دیکھا رہی ہے اور ہمارے رہنماؤں کی جاگیریں لندن سے نکل رہی ہیں۔ دولت کا رخ مابعد نوآبادیات میں بھی اس سمت میں ہی چل رہا ہے جس سمت پر انگریز نے اسے ڈالا تھا۔

یہاں تک تقریباً نوآبادکار کے مقاصد کے جواب سے ایک رخ زیر بحث آیا ہے کہ انگریز یہاں دولت اور وسائل کے حصوں کے لیے آیا تھا۔ کتنے پونڈ اور کب برطانیہ منتقل ہوئے یہ اعداد و شمار بھی منظر عام پر آ گئے ہیں دوسرا اہم مسئلہ بڑھتے ہوئے صنعتی انقلاب کے لیے خام مال کے حصول کا تھا تا کہ اپنی صنعتوں

کا پیٹ بھرا جا سکے۔

برطانیہ ایک زرعی ملک سے صنعتی ملک میں تبدیل ہوا۔صنعت کو چلانے کے لئے خام مال کی ضرورت ہوتی ہے اس مقصد کے لیے انگریز نوآبادکار نے برصغیر کو زراعت سے آگے نہیں بڑھنے دیا اور ریلوے لائینوں کا ایک جال بچھا کر خام مال برطانیہ منتقل کیا جاتا رہا ہے۔مابعد نوآبادیات میں برصغیر کا سب سے زیادہ حصہ زراعت پر مشتمل ہے اور ہم صرف خام مال ہی باہر کے مما لک کو برآمد کر رہے ہیں اور پھر اسی خام مال سے تیار کردہ سامان کی منڈی بنے ہوئے ہیں۔نوآبادکار کے تقلید پسند آج بھی حکومت کرتے ہیں اور خدمت کے دعوے دار ہیں۔بیسویں صدی کی ابتداء اور درمیانی دہائیوں میں دنیا میں اس طرح کے حالات پیدا ہوئے ہیں کہ برطانیہ کے اپنے وجود کے خطرات پیدا ہو گئے اور نوآبادیوں کو مجبوراً خیرآباد کہنا پڑا ورنہ انگریز نے کمال مہارت اور چلاکی سے اس طرح کی پالسیوں اور اداروں کی بنیادوں کو استوار کیا کہ آج بھی ہم ان سے جان نہیں چھڑا پائے۔

برصغیر میں نوآبادکار اور نوآبادی کے تعلق کی تاریخ خاصی قدیم ہے اور یہ مختلف صورتوں میں آج تک چل رہا ہے۔ہم برطانوی نوآبادکار کے مابعد نوآبادیاتی اثرات سے ابھی تک نہیں نکل پائے۔مگر ابھی تک پلڑا برطانیہ کی طرف جھکا ہوا ہے۔امریکی اثرات گو زیادہ ہیں مگر وہ بیرونی یا خارجی ہیں لیکن برطانوی نوآبادکار کے اثرات داخلی ہیں۔ ہماری ترقی کے گراف، ہماری زبان اور کلچر تک کے جانچنے کے پیمانے آج بھی برطانیہ کے معیارات ہیں۔ برصغیر کی نوآبادی کو اپنی تہذیب وثقافت جس میں زبان بھی شامل ہے کے بارے میں اس حد تک احساس کمتری کا شکار کر دیا گیا کہ ہم آج تک اسی احساس میں گرفتار ہیں۔ ہم سب کچھ جانتے ہوئے بھی واپس اپنی اصلیت کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے۔

> ''مابعد نوآبادیاتی مطالعہ ثقافت اور فکر کو استعمار کی مخفی اور عیاں زنجیروں سے رہائی دلاتا ہے۔''۳۵

ہماری ثقافت وفکر کو میرے خیال میں جکڑنے والی زنجیر دراصل خود ہمارے اپنے اندر ہے۔ نوآبادکار تو ہماری ذہن سازی کر کے چلا گیا کہ یہ کام اس طریقے اور ان اصولوں پر سرانجام دیا جا سکتا ہے اور ہم نے اسے بخوبی اور احسن طریقے سے سرانجام دیا اور آج تک اپنا فرض سمجھاتے آرہے ہیں۔ ناصر

عباس نیر نے جیسی کہ ایک مثال دی ہے کہ ایک ہاتھی کا بچہ ابتدا میں جب زنجیر سے باندھا جاتا ہے تو وہ مسلسل اس زنجیر کو توڑنے کی کوشش کرتا رہتا ہے کچھ عرصہ بعد جب وہ جوان اور طاقت ور ہو جاتا ہے تو زور لگانا اور اپنی کوشش ترک کر دیتا ہے دراصل وہ ذہنی طور پر اس قید کو قبول کر لیتا ہے حالانکہ اب تھوڑی سی محنت سے وہ آزادی حاصل کر سکتا ہے مگر وہ طاقت استعمال نہیں کرنا چاہتا اور اسی قید کو قبول کر لیتا ہے۔

برصغیر میں نوآبادیاتی اثرات کے مقابلے میں مابعد نوآبادیاتی اثرات بہت زیادہ اہمیت کے حامل اور دیرپا ہیں۔ انگریزوں کی حکمرانی یا تسلط کا دورانیہ ایک طویل عرصہ پر پھیلا ہوا ہے۔ اس میں دو بنیادی کردار ہیں۔ ایک طرف ایسٹ انڈیا کمپنی اور دوسری طرف خود برطانوی بادشاہ۔ برصغیر ان دونوں کے تحت طویل عرصہ تک پامال ہوتا رہا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی تاریخ تقریباً دوسو پچاس سالوں پر محیط ہے۔ اس میں کمپنی نے طرح طرح کے طریقوں سے برصغیر کو لوٹا اور یہاں کے وسائل کو اپنی تجوریوں میں بھرا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے برصغیر میں غداری کی رسم ڈالی اور پہلے جو چوری چھپے غداری کے واقعات تھے وہ اب ایک تسلسل کے ساتھ رونما ہونے لگے اور ایک طرف غداری اور دوسری طرف جاسوسی۔ یہاں کے مقامی درباریوں کو خریدا اور بیچا جاتا رہا۔ اس سودے میں غدار ہمیشہ ہی نقصان میں رہا اور فائدہ کمپنی اٹھاتی رہی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد اور بعد میں بھی کمال شاعرانہ انداز میں انگریز نے ان مقامی افراد کو اپنے لیے استعمال کیا اور پھر ان کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ فاتح اور مفتوح کے تعلق میں اثرات کا بہاو ہمیشہ اوپر (نوآبادکار) سے نیچے (نوآبادی) کی طرف ہوتا ہے۔ مگر ان اثرات کو قبول اور رد کرنے کا کوئی خاص معیار نہیں ہوتا۔ برصغیر کے لوگوں نے ہمیشہ آنے والوں کے اثرات کو بخوشی و رضا قبول کیا اور خود کو مکمل طور پر اس رنگ میں رنگ لیا۔

## اردو میں مابعد نوآبادیاتی مطالعات

نوآبادیات اور پس نوآبادیات دونوں ایک سکے کے دو پہلو ہیں ایک کو بغیر سمجھے دوسرے کے متعلق گفتگو کرنا ناحق ہے۔ تصور ذہن میں گنجلک ہو جائے گا اور اصل بات مخاطب اور سامع کے بیچ میں معلق ہو کر رہ جائے گی۔ جب ایڈورڈ سعید کو اوریئنٹلیزم مین پوسٹ کولونیلزم کے بارے میں جانکاری بہم پہنچائی ہوئی تو پہلے انھوں نے کالونیلزم کے بارے میں بتایا بعد میں پوسٹ کولونیلزم کے تعلق سے لوگوں کو

سمجھایا۔ چناچہ پہلے نوآبادیات کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تا کہ پس نوآبادیات کو سمجھنے میں کسی قدر آسانی ہو۔

'نوآبادیات' انگریزی کے کالونیلزم کا اردو ترجمہ ہے جو کالونی سے ماخوذ اور یہ آیا ہے اطالوی لفظ کالونیہ سے جس کے معنی ہے وہ جگہ جہاں کھیتی باڑی کی جائے۔اے پلس فارا گریکلچر۔ اصطلاح میں نوآبادیات اس نظام کو کہتے ہیں جو ایک ملک اپنے حصول مقصد کی خاطر دوسرے ملک میں آبادیاں (کالونیز) قائم کرتا۔ یہ ایک طرح کا غیر مساوی رویہ ہے جو ملکی اور غیر ملکی عوام کے بیچ میں قائم ہوتا ہے۔ کرسٹوفر کولمبس نے ۱۴۹۱ء میں امریکہ کی تلاش کی، اس کے بعد یورپین نے امریکہ کے ساتھ ساتھ پورے عالم میں اپنی آبادی قائم کرنا شروع کر دیا۔ پرتگالی، اسپینش، ڈچ اور فرانسیسی اپنا ملک چھوڑ کر امریکہ، افریقہ اور ایشیا جیسے برّ اعظم میں بسنے لگے۔ ان کے بسنے کی خاص وجہ اپنے ذریعۂ معاش کو بڑھاوا دینا تھا۔ ان کا ماننا تھا کہ اگر سونا اور دوسری قیمتی چیزیں ایک ساتھ ملیں گی تو سکہ تیار ہوگا جس سے ہماری طاقت میں مظبوطی آئے گی۔ الغرض کالونیز کو دوسرے ملکوں کے ساتھ تجارت پر پابندی لگا دی گئی اور صرف اپنے مادرِ وطن کے ساتھ تجارت کرنے کا حکم ہوا۔

یورپین نے جس جگہ اور جس علاقے میں قدم رکھا تجارت کے ساتھ ساتھ اپنی حکومت مضبوط کرنے کا منصوبہ بنایا۔ فوجیں تیار کیں اور بہت سے علاقوں پر دھاوا بول دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ جن علاقوں پر وہ آسانی سے قابض نہیں ہو سکتے تھے وہ علاقے بھی ان کے اختیار میں آ گئے۔ ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی اس کی بہترین مثال ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کے ہر شعبے میں ان کی مداخلت ہو گئی اور لوگ اپنے ہی گھر میں غیر ملکیوں کی زندگی بسر کرنے لگے۔ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ جب کوئی قبیلہ یا قوم کسی دوسرے قبیلے یا قوم پر قابض ہوتی ہے تو محکوم قوم اپنے آپ کو کم تر اور کم وقعت تصور کرنے لگتی ہے ۔حاکم طبقے کی یہ پالیسی ہوتی ہے کہ محکومین کا نہ صرف سیاسی یا معاشی استحصال کیا جائے بلکہ ثقافتی، مذہبی اور ذہنی طور پر بھی ہراس کیا جائے۔

میرؔ و غالبؔ اپنے دور کے بڑے بڑے شاعر تھے انہوں نے بھی اس بات کا افسوس کیا کہ برٹش راج میں تشدد، لوٹ کھسوٹ، ظلم و جبر اور استحصال اور مکروہ عزائم کے سوا اور کچھ نہیں۔ میرؔ کے اشعار ملاحظہ ہو

دلی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصوّر تھے

جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

دلی جوایک شہر تھا عالم میں انتخاب

ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

میؔر کے ان اشعار میں دلی شہر کی تباہی و بربادی کا نقشہ کھینچا گیا، ایک وقت ایسا بھی تھا جب دلی میں مغلوں کی حکومت تھی تو دلی میں چارسو خوشحالی تھی لیکن استعماریوں نے اپنے مفاد کے لئے دلی شہر کو تباہ و برباد کیا اور پورے ہندوستان کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ سیاسی اقتدار کی ہوس میں مسلمانوں کا قتلِ عام کیا ۔نوآبادکاروں نے ڈر اور خوف کا ماحول پھیلا کر اپنے بریٹش راج کا اعلان کیا۔ غالبؔ کے اشعار دیکھئے۔

چوک کہتے ہیں جس کو مقتل ہے

گھر نمونہ بنا ہے زندان کا

شہر دلی کا ذرہ ذرہ خاک

تشنہ خون ہے ہر مسلمان کا

غالبؔ اپنے زمانے کے مفکر تھے انھوں نے بریٹش سامراج کے عزائم کو پہچان لیا تھا ۔انہوں نے علامتوں، مبہم اور دبے الفاظ کے سہارے اپنا مزاحمتی رویہ کا اظہار کیا۔ وہ نوآبادیاتی نظام کو دھوکہ اور فراڈ سمجھتے تھے۔ ذیل کے شعر کے متن کو مابعد نوآبادیاتی تناظر میں سمجھنے کی کوشش کیجئے تو نوآبادیاتی حکومت کے سارے رازوں کا فاش ہو جاتا ہے۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ

دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا

۱۸۵۷ء کی شکست وریخت صرف سیاسی شکست وریخت نہ تھی بلکہ ذہنی سماجی، تہذیبی، مذہبی اور ثقافتی بھی تھی۔ ہندوستانی مغرب سے آئی بیشتر چیزوں کو بڑی آسانی اور بغیر کسی تامل کے قبول کر رہے تھے۔ علمی، ادبی، ثقافتی اور فنی ترقی دکھا کر انگریز ہندوستانیوں کا دل جیتنا چاہتے تھے جس میں ہندوستان کی ترقی کم ان کا ذاتی مفاد زیادہ شامل تھا۔ ایسے ہی ناگفتہ بہ حالات میں اردو کی پرورش ہو رہی تھی ۔ ہمارے

سیاسی، سماجی اور ادبی علماء جن میں سرسید، نذیر احمد، حالی اور شبلی انگریزوں کی حمایت اور انگریزی کی ترقی میں بڑے انہماک سے سرگرداں تھے۔

ہمارے رہنماؤں نے نہ صرف وفادارانہ سیاست کی تبلیغ کی بلکہ عوام کو برطانوی حکومت کی برکتوں سے خاموشی کے ساتھ مستفیض ہونے کا مشورہ دیا اور حالی، سرسید، نذیر احمد اور شبلی چاروں نے برطانوی حکومت کے ساتھ وفاداری برتنے کے لیے اسلامی تعلیمات سے جواز بھی پیش کیا۔ سرسید کے نوآبادیاتی ذہن کو سمجھنے کے لیے ان کے کاناموں پر نظر کرنا ازبس ضروری ہے۔ ایک مناجات میں سرسید نے انگریزوں کی کھل کر حمایت کی ہے اور ملکہ وکٹوریہ کو دعائیں دی ہیں۔ سرسید کا خیال تھا کہ انگریز ہمارے حاکم ہیں اور یہ ہمیشہ ہی رہیں گے اس لیے ان کی بغاوت ہماری قوم کے لیے مضر ہے۔ ان کی نظر میں انگریزوں کی حکومت اللہ کی طرف سے مسلط کی گئی ہے اور اللہ جو کرتا ہے ہماری بہتری کے لیے ہی کرتا ہے۔

سرسید نے انگریزوں سے قبل کی حکومت کو مضر بتایا اور ۱۸۵۷ء کی جنگ میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے جس طرح متحد ہو کر انگیریزوں کے خلاف جنگ کی اور یگانگت کا مظاہرہ کیا اس پر نہ زور دے کر پرانی باتوں پر اپنے دھیان کو مرکوز کرنا بہتر سمجھا۔ ان کا ماننا تھا کہ اب حکومت انگلیشیہ ہی ملک میں امن وامان قائم رکھ سکتی ہے۔

سرسید کے ساتھ ساتھ ڈپٹی نذیر احمد بھی برطانوی حکومت کی پرزور حمایت پر کمربستہ تھے، ایک طرف ہندوستان میں برطانوی سامراجی حکومت کے خلاف احتجاج ہو رہا تھا، دوسری طرف نذیر احمد جیسے دانشور احتجاج کی مخالفت اور برطانوی حکومت کی حمایت میں ہمہ تن مصروف تھے۔ نذیر احمد نے اپنی تحریروں میں ایسے بہت سے جملے لکھے ہیں جس سے ان کے سیاسی شعور کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

> ''جب خدا نے انگریزوں کو ملک پر مسلط کر دیا اور ہم نے رعایا بن کران کے ملک میں رہنا اختیار کیا تو اس کے یہی معنی ہیں کہ ہم میں اور انگریزوں میں ایک طرح کا معاہدہ ہو گیا کہ انگریز حاکم ہونے کی حیثیت سے ہمارے حقوق کی حفاظت کریں اور ہم رعایا ہونے کی حیثیت سے ان کی اطاعت ۔۔۔ ہمارے لیے انگریزی قانون ہی اسلامی شریعت ہے اور ایسا نہ ہو تو ہندوستان دارالحرب قرار پا کر ہر مسلمان پر ترک وطن یعنی ہجرت فرض ہو جائے۔''۳۶

جہاں تک حالی کا سوال ہے وہ مکمل طور پر انگریزوں کے حامی نہیں تھے ان کی ترقی اور سماجی تبدیلی کو ضرور بہتر تصور کرتے تھے۔ ان کا ذہن اس بات کو قبول کرنے سے قاصر تھا کہ ہندوستانی عوام کی یا جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کی فلاح و بہبود برطانوی حکومت ہی کے ذریعے ممکن ہے۔ ہاں وہ برطانوی حکومت کی برکتیں جس سے سماج میں نئے خیالات کے وسعت پذیر ہونے میں مدد ملی، ریلوے شروع ہوا، تار برقی وغیرہ کے رواج نے رسل ورسائل کے مسائل کو کم کر دیا اور انگریزی نظام تعلیم نے مرد عورت سبھی میں تعلیم حاصل کرنے کا جذبہ پیدا کیا۔ حالی اس کے قائل تھے، اوراس کے نقوش ان کی نظموں میں صاف طور پر نمایاں ہیں۔

اس کے علاوہ حالی نے مناظر رحم و انصاف اور مجالس النسا میں بھی برطانوی حکومت میں ہونے والی معاشرتی تبدیلیوں کا حوالہ پیش کیا ہے۔ سرسید، نذیر احمد اور شبلی نے برطانوی حکومت کی اطاعت کا اسلامی جواز پیش کیا، مظہر مہدی کے مطابق اس نوع کا شبلی کا صرف ایک مضمون ملتا ہے۔ سرسید اور نذیر احمد نے نہ صرف اس حکومت کی ستائش کی بلکہ اس کے استحکام و استقلال کے لیے بھی کوشاں رہے۔

اس بات کا بھی جائزہ لینا ضروری ہے کہ مغرب سے آنے والا ادب و ثقافت ہماری تہذیب و ادب پر کس طرح اثر انداز ہو رہا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ کے بعد اردو ادب میں بہت سی نئی اصناف متعارف ہوئیں مثلاً ناول، افسانہ، کہانیاں، مضامین، نئی نظم، روایتی نظم، آزاد نظم، نظم معرّا وغیرہ۔ اسی عہد میں نثر سلیس زبان میں لکھی جانے لگی جس نے نئی تنقید کو پنپنے میں کافی مدد کی۔ نئی تنقید مغربی خمیر لے کر اردو ادب میں شامل ہوئی اور ہر چیز مغربی نظر سے دیکھی جانے لگی۔ حالی نے 'مقدمہ شعر و شاعری' لکھا جو نئی تنقید کا پہلا مینی فیسٹو مانا جاتا ہے۔ اس کتاب میں شاعری کو موضوع بحث بنانے کا باعث انجمن پنجاب کے وہ مشاعرے تھے جن کا مقصد اردو شاعری میں ایک نئی راہ پیدا کرنا اور پرانی روایت سے انحراف تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں عربی فارسی یا پرانے نقادوں کے نظریات کو کم اور انگریزی نقادوں ملٹن اور مکالے کو زیادہ اہمیت دی۔

تنقید میں شبلی کے خیالات و تجربات انگریزی ادب سے کم متاثر نظر آتے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ مغربیت کو نہیں سراہتے تھے۔ ان کی تنقید میں مشرقیت زیادہ نمایاں ہے اس لیے کہ انھیں

انگریزی کم آتی تھی۔اس بات کا اقرار اپنی کتاب 'موازنہ انیس ودبیر' میں کچھ اس طرح کرتے ہیں:

''انگریزی زبان میں نہایت اعلیٰ درجے کی کتابیں اس موضوع پر لکھی گئی ہیں جن میں سے بعض میری نظر سے بھی گزری ہیں ۔ میں ان سے اچھی طرح مستفیض نہیں ہوسکا۔''۳۷

اب تک جتنے تنقید نگار اردو ادب میں آئے تقریباً اسی تنقید سے متاثر رہے جس کی شروعات حالی اور شبلی نے کی تھی۔انگریزی پڑھنے والوں کی تعداد کے ساتھ تنقید میں انگریزیت بھی بڑھتی رہی۔عبدالقادر سروری اولین تنقید نگاروں کے بعد دوسرے عہد کے تنقید نگاروں میں اہم مقام رکھتے ہیں،جن کی تنقید میں مغرب کا بہت گہرا اثر دکھائی دیتا ہے۔انھوں نے شعروادب کے متعلق بحث کرتے ہوئے ارسطو،افلاطون اور میتھو آرنلڈ کے خیالات کو پیش کیا ہے۔اسی کے ساتھ انھوں نے کچھ ایسے مباحث کو اردو ادب میں شامل کیا جو اس پہلے اردو ادب میں نہیں تھے مثلاً سائنس اور شاعری کی بحث یا رزمیہ اور شاعری کے اقسام پر اظہارِ خیال۔نئی چیزوں کو ادب میں شامل کرنا غلط نہیں ہے۔ادب میں لچیلا پن کا ہونا ضروری ہے لیکن بقول عبادت بریلوی:

''ان سب میں پروفیسر سروری کے اپنے خیالات کم ہیں اور دوسروں کے خیالات زیادہ ہیں۔''۳۸

یہاں میرا مقصد یہ نہیں کہ میں ہر تنقید نگار پر قلم اٹھاؤں،ہاں اتنا ضرور ہے کہ میں ان کی نشاندہی کرنا چہتا ہوں جنھوں نے مشرقی ادب اور مشرقی شعریات کا کھلے طور پر مذاق اڑا کر نوآبادیات کو فروغ دیا۔عموماً نقاد مغربی نقادوں سے متاثر نظر آتے ہیں اور ہونا بھی چاہیے لیکن جذبات میں اس طرح بہہ جانا کہ اپنی چیزوں کا خیال نہ رہے غلط ہے۔مثلاً کلیم الدین احمد کو دیکھا جائے تو وہ پوری طرح انگریزی ادب سے متاثر ہیں ان کے نزدیک مشرقی ادب اور شعریت کی کوئی حیثیت نہیں۔ہمیں اس بات کا خیال ہونا چاہیے کہ ادب میں آفاقیت ہونے کے ساتھ ساتھ قوم اور ملک کا بھی تاثر ہوتا ہے۔یہ کوئی ضروری نہیں کہ دنیا بھر کی ادبیات ایک ہی رنگ میں رنگ جائیں۔کلیم الدین احمد اپنے ادب اور تنقید کے بارے میں ایسی

باتیں کرتے ہیں کہ ان کی باتوں پر ہنسی بھی آتی ہے اور تعجب بھی ہوتا ہے۔ مثلاً ''غزل نیم وحشی صنف ادب ہے'' یا ''اردو میں تنقید کا وجود محض فرضی ہے یہ اقلیدس کا خیالی نقطہ ہے یا معشوق کی موہوم کمر'' اس طرح کسی زبان کے وجود پر الزام عائد کرنا ان کی بدگمانی اور جذباتیت کا پتا دیتا ہے۔

کلیم الدین احمد کا اشارہ ہمیشہ اس بات کی طرف ہوتا ہے کہ بغیر انگلش جانے کوئی شاعر ہو ہی نہیں سکتا، شاعر ہونے کے لیے مغربی ادب سے استفادہ کرنا ضروری ہے۔ میر اور سودا کے متعلق کلیم الدین احمد کے خیالات کو عبادت بریلوی نے یوں تحریر کیا ہے:

> ''ان شاعروں کی غزلوں سے یہ حقیقت صاف عیاں ہے کہ ان میں اعلیٰ پائے کے غزل گو ہونے کی صلاحیت موجود نہ تھی۔ اگر یہ کسی مغربی ادب سے واقف ہوتے، یا کہ آزاد اور حالی مغرب سے ناواقف ہونے کے سبب سے بعض خیالات و ذکاوت سے محروم رہے نظم کے صحیح مفہوم سے آشنا نہ ہو سکے، میر اور سودا کے متعلق یہ کہنا کہ انھیں مغربی ادب سے واقف ہونا چاہیے تھا۔ یہی خصوصیت انھیں شاعر بنا سکتی تھی ایک مضحکہ خیز بات نہیں تو اور کیا ہے۔''۳۹

متذکرہ بالا نوآبادیاتی روشنی میں یہ سمجھنا آسان ہو گیا کہ مابعد نوآبادیاتی نظریہ کیا ہے ایڈورڈ سعید اور دوسرے مفکرین نے اس کی ضرورت کیوں محسوس کی تھی۔ انگریزی میں اسے پوسٹ کالونیلزم سے موسوم کیا گیا ہے، ایسا تصور کیا جاتا ہے کہ نوآبادیات کی شروعات ایڈورڈ سعید کی مشہور کتاب اورینٹلیزم (۱۹۷۷) سے ہوئی۔ کوئی نظریہ یا تحریک ایک دن یا ایک وقت میں وجود میں نہیں آتا بلکہ لوگوں کا ذہن بنتا ہے، لوگ اس طرح سوچنا شروع کرتے ہیں، اس کا ایک مینی فیسٹو تیار ہوتا ہے، اس نظریے کے کچھ پیروکار ہوتے ہیں تب کوئی نظریہ وجود میں آتا ہے اور یہی اس کے ساتھ ہوا، غلامی کا طوق گلے میں پڑنے سے لے کر آزادی کے بعد تک کے ایک لمبے عرصے نے لوگوں کے ذہن کو اس طرح صاف کیا کہ اپنے پرانے ورثے کی طرف لوٹنے پر مجبور کر دیا۔ پوسٹ کالونیلزم کی ایک تعریف ملاحظہ ہو:

> " Postcolonialism is the academic, intellectual ,
> ideological and ideational scaffolding of the

condition of decolonization (the period following political independence for nation and culture in Africa,Asia and South America). Postcolonialism as a theory and a critique emerged from within anti- colonial activism and political movements in Asia ,Africa and South America. Intellectuals and political leaders among native's....Gandhi, Cesaire,Tagore,Senghor,Carbral,Fanon were anti colonial activist thinkers whose political views metamorphosed into political and literary-cultural theory."40

مابعدنوآبادیات ایک علمی، عقلی اورنظریاتی نظریہ ہے جو ہندوستان آزاد ہونے کے بعد ابھر کر سامنے آیا۔ جوتحریک ایشیا،افریقہ اورجنوبی امریکہ میں چل رہی تھی، جورہنما نوآبادیات کے خلاف تھے مثلاً گاندھی، سیسیر، ٹیگور، سینگھور، کیب رال،فینن وغیرہ۔ان کی تحریک نے لوگوں میں انقلاب پیدا کیا اور یہ نظریہ وجود میں آیا۔

۱۹۴۷ء میں ہندوستان اور ۱۹۶۲ء میں افریقہ کے آزاد ہونے کے بعد گرامسی اورفو کو نے مابعد نوآبادیاتی امور پرتوجہ کی تھی لیکن ایڈورڈ سعید کے گہرے تجزیے کے بعد کچھ بہتر نتائج سامنے آئے، جو بے حد دوررس ثابت ہوئے۔جس ترقی سے حالی،شبلی نذیر احمد اور سرسید احمد خان خوش ہورہے تھے اس ترقی کے حوالے سے سعید نے اپنی کتاب ''اوریئنٹلیزم'' میں کہا کہ حکمران قومیں خصوصاً بیرونی اپنی رعایا کی خدمت کی آڑ میں اپنی طاقت کا فروغ چاہتی ہیں۔

مابعدنوآبادیات کی ترویج واشاعت میں ایڈورڈ سعید، بھابھا، گائتری،فرانزفینن اوربل اشکرافٹ نے اہم رول ادا کیا ہے۔۱۹۴۷ء میں سوشیالجی آف لیٹیر یچر پر ایک کانفرنس منعقد کی گئی جس میں سعید، بھابھا اور گائتری کے ساتھ ساتھ دوسرے اسکالرز بھی مدعو تھے۔ بھابھا نے جو مقالہ پیش کیا وہ نفسیات سے

لے کر ردِتشکیل اور مابعد جدیدیت کی تھیوری پر محیط تھا۔ بھا بھا نے سیاہ اور سفید کی بحث اٹھائی اور سیاہ پر سفید کی بالادستی کے سارے عناصر سے بحث کی۔ جبکہ گائتری نے تانیثیت اور ثقافتی مطالعے کے ذریعے مابعد جدید ساختیات، ردِتشکیل، مارکسی نقطۂ نظر اور نفسیاتی گرہ کشائیوں پر کھل کر بحث کی۔ دوسرے شرکا نے بھی سیمنار میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور نوآبادیات اور پس نوآبادیات کے مسائل اور اس کے اثرات کی کھل کر نشاندہی کی، تب سے آج تک یہ بحث جاری ہے۔ اب اردو میں بھی اس جہت سے بحث شروع ہوگئی ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو مابعد نوآبادیات اس نظریے کا نام ہے جس کے تحت یہ بات ذہن نشین کرائی جاتی ہے کہ ہمیں اپنی تہذیب وثقافت اور قدیم چیزوں کو منظر عام پر لانا چاہیے نہ کہ اس پر پردہ ڈالنا چاہیے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آزادی کے اتنے عرصے گزرنے کے بعد بھی ہماری گردن میں غلامی کا طوق لٹک رہا ہے۔ احساس کمتری کا جو انداز قائم تھا وہ آج بھی باقی ہے۔ رفتہ رفتہ اب اردو کے ماہرین کو بھی احساس ہو رہا ہے کہ ہمیں اس قدر مغرب کی پیروی نہیں کرنی چاہیے۔ اپنی چیزوں پر نقطہ چینی کرنا، سب سے کمتر سمجھنا اپنی تہذیب وتمدن اور ثقافت سے انکار کرنا ہے۔

مابعد نوآبادیات کے تذکرے میں سرسید احمد خاں کی خدمت کو فراموش نہیں کیا جاسکتا، جس تہذیب وثقافت کو بچانے کی بات آج ہو رہی ہے اردو میں سرسید سے ہی شروع ہوگئی تھی۔ سرسید احمد خاں غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی تھی کہ انگریزی اور دوسرے علوم کی کتابوں کے علاوہ اسلامی تاریخ کو عربی سے اردو میں ترجمہ کیا جائے۔ بعدازاں عبدالرحمٰن بجنوری کو دیکھا جائے تو وہ دوسروں سے مختلف نظر آتے ہیں۔ وہ یورپ کی کئی زبانیں جانتے تھے، حصول تعلیم کے لیے مغرب کا بھی سفر کیا لیکن ان کے اوپر مغربی تنقید اور مغربی ادب دوسرے طریقے سے اثر انداز ہوئے۔ وہ اپنی چیزوں کو کم تر بتانے کے بجائے بہتر بتاتے تھے۔ انھوں نے اپنے مقالہ 'محاسن کلام غالب' میں غالب کا مقابلہ مشرق ومغرب کے مختلف شاعروں اور ادیبوں سے کیا ہے جس سے محسوس ہوتا ہے کہ بجنوری ان سب سے غالب کو بڑھا دینا چاہتے تھے۔

اکیسویں صدی میں اس مسئلے پر گفتگو ہونے لگی ہے ۱۹۹۰ء یا ۲۰۰۰ء کے بعد کی شاعری یا فکشن میں

مابعدنوآبادیات دکھائی دینے لگا ہے لوگ اپنے وطن اپنی ثقافت اوراپنی تہذیب کو پھر سے یاد کرنے لگے ہیں۔مثلاً اردو کے ایک مشہور شاعر منور رانا کے خیالات ملاحظہ ہوں:

''ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنی شاعری میں بش کے امریکہ کی جگہ ملی جلی آبادی والے اس گاؤں کا تذکرہ کریں جہاں آج بھی ایک بیٹی رخصتی کے درد کو پورا گاؤں محسوس کرتا ہے۔گاؤں کے کسی بزرگ کے انتقال پر بیشتر گھروں کے چولھے سارا دن آگ کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔''۴۱

اس کے علاوہ موجودہ دور کے تنقید نگاروں کو بھی اس بات کا اعتراف کرنا پڑا ہے کہ اردو ادب اپنے پرانے ورثے کو اہمیت دینے سے گریز کر رہا تھا۔ہم مانتے ہیں کہ ہمیں مغربی تصورات اور مغربی ادب سے واقفیت رکھنی چاہیے،ایک دوسرے سے استفادہ کرنا ہر ادب کی روایت رہی ہے۔ادب ادب ہوتا ہے اسے کسی زبان ، ملک اور قوم کے دائرے میں مقید نہیں کیا جاسکتا۔لیکن مغربی افکار کا اثر قبول کرنے کے ساتھ ساتھ کلاسکی شعریات کو بھی اپنی تنقید میں شامل کرنا ضروری ہے۔شمس الرحمٰن فاروقی رقم طراز ہیں:

''یہ سوال اٹھ سکتا ہے کہ کیا مغربی شعریات ہمارے کلاسکی ادب کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے کافی نہیں؟ اس کا مختصر سا جواب یہ ہے کہ مغربی شعریات ہمارے کلام میں معاون ضرور ہوسکتی ہے بلکہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ مغربی شعریات سے معاون حاصل کرنا ہمارے لیے ناگزیر ہے لیکن یہ شعریات اکیلی ہمارے مقصد کے لیے کافی نہیں ۔اگر صرف اس شعریات کو استعمال کیا جائے تو ہم اپنی کلاسیکی ادبی میراث کا پورا حق نہ ادا کر سکیں گے۔اور اگر ہم ذرا بد قسمت ہوئے ، یا عدم توازن کا شکار ہوئے تو مغربی شعریات کی روشنی میں جو نتائج ہم نکالیں گے وہ غلط، گمراہ اور بے انصاف پر مبنی ہوں گے۔''۴۲

اب ہمیں احساس ہونا چاہیے کہ ہم نے اپنی داستانوں اور مثنویوں کو غلط تناظر میں دیکھنے کی سعی کی ہے۔انھیں سطحی اور رومانیت سے تعبیر کر کے اپنی ثقافتی جڑوں سے لاعلمی کا کھلا اظہار کیا ہے۔کلیم الدین احمد، گوپی چند نارنگ (مثنوی) یا شمس الرحمٰن فاروقی (داستان) کے بارے میں نئی روشنی بہم پہنچانے کے

بعد کم سے کم ہمیں اپنی رائے بدلنی چاہیے، ہمیں احساس ہونا چاہیے کہ ہماری زندگی کی دھڑکنیں تو داستانوں اور مثنویوں میں خوب خوب سنائی دیتی ہیں۔ لوک قصے، کہانیاں، لوک گیت یہ سب تو ہمارا ثقافتی ورثہ ہیں، تو پھر ہم انھیں بھول کیوں گئے تھے۔ ہر زبان وادب کی اپنی تہذیب وثقافت ہوتی ہے جس میں وہ سانس لیتا ہے۔ اگر اسے اسی نظام کا زائیدہ تصور کریں تو اس کی اہمیت از خود واضح ہوجاتی ہے اور اس کی ساری خصوصیات نمایاں ہوکر نظر آنے لگتی ہیں۔ بقول وہاب اشرفی:

''تب ہمیں اپنی غزل نیم وحشی ہرگز نہیں معلوم ہوگی، ہمارا محبوب زندگی سے عاری نظر نہیں آئے گا، فراق ووصل کی کیفیت بے معنی نہیں ٹھہرے گی۔ ہماری تشبیہیں، استعارے اور ہماری دوسرے بلاغت اور عروضی نظام بیکار محض ہیں نہ معلوم ہوں گے، اور یہ بھی احساس ہوگا کہ سنسکرت بھی تو ہماری وراثت تھی، تو اس سے فائدہ ہم نے کیوں نہیں اٹھایا، اس کے رسوں کے نظام پر ہماری توجہ کیوں نہیں گئی، یعنی ہم نے اپنی مٹی ہی کی خبر نہیں رکھی اور ظاہر ہے اسی مٹی نے ہمارا خمیر مرتب کیا ہے۔'' ۴۳

متذکرہ بالا مضمرات وممکنات کی روشنی میں مجموعی جائزہ لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ آزادی کے بعد بھی ہم ذہنی طور پر انگریزوں کے غلام ہیں۔ اس طرح سے وہ ہمارے ملک کو عقلی، سیاسی، سماجی، نظریاتی، ادبی، ثقافتی اور مذہبی طور پر کھوکھلا کر گئے ہیں کہ آج تک ہم اس کا بدلہ چکا رہے ہیں۔ ان کے چنگل سے باہر نہیں نکل پائے ہیں۔ اب ہمیں ان کی غلامی سے باہر نکل کر اپنے ملک کی ملی جلی گنگا جمنی تہذیب کی بات کرنی چاہیے۔

اردو میں دوسری زبانوں سے ترجمے کی روایت کافی پرانی ہے۔ اور یہ کہنا مشکل ہے کہ اردو میں دوسری زبانوں سے ترجموں کا عمل پہلے شاعری میں شروع ہوا یا نثر میں۔ اردو میں تراجم سب سے پہلے عربی وفارسی وسنسکرت زبانوں سے کئے گئے۔ انگریزی سے اردو میں پہلا ترجمہ 'بائبل' کا تھا۔ اردو میں اگر ہم انگریزی ادب سے تنقید اور فکشن کے رجحانات کو مستعار لینے کی روش کا جائزہ لیں تو یہ کام الطاف حسین حالی، محمد حسین آزاد وغیرہ نے شروع کیا۔ اردو زبان میں 'سٹیٹس کو' کو توڑنے اور ہندوستانی سماج کے اندر پائے جانے والے جاگیرداری، قبیل داری، فرقہ وارانہ، اینٹی ویمن اور اینٹی ورکنگ کلاس خیالات اور

نظریات کے زیر اثر پروان چڑھنے والے ادب کو ٹھیک طرح سے چیلنج کرنے کا کام ان نوجوان ادیبوں نے کیا جو کہ جدید تعلیم سے روشناس ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی شناسائی دنیا بھر میں قومی آزادی وخودمختاری کی لڑائی لڑنے والے اقوام کی تحریکوں کے زیر اثر پیدا ہونے والے ادب ،تنقید سے روشناس ہوئے اور انہوں نے اپنے طبع زاد افسانوں ، کہانیوں ،تنقیدی مضامین میں کالونیل سماج کے اندر جنم لینے والی ترقی پسند شعری اور فکشن روایات سے استفادہ کرتے ہوئے خیال کی ان لہروں کو شعوری یا غیر شعوری طور پہ شامل کیا۔اردوادب کالونیل ریاستوں کی قومی آزادی کی تحریکوں کے زیر اثر تخلیق ہونے والے ادب سے متاثر کس قدر رہوا ہے اس کا جائزہ ابھی تک بہت کن لیا گیا ہے۔

اگر اردو ادب پہ کالونیل ریاستوں اور معاشرے کے اندر سے تشکیل پانے والے ادب کے اثرات کا جائزہ لینے کوشش کریں تو لامحالہ سب سے پہلے بالشیویک انقلاب اکتوبر ۱۹۱۷ء کی بات کرنی ہوگی ۔اس حوالے وہ ابتدائی ترقی پسند ادیب ۔شاعر ،ناقد بہت اہمیت کے حامل ہیں جنھوں نے ملکر ترقی پسند تحریک کی ادبی میدان میں تشکیل کی اور میں سمجھتا ہوں کہ ان ابتدائی ادیبوں نے ملکر 'انگارے' کے نام سے جو کہانیوں کا پہلا مجموعہ شائع کیا تو ان میں شامل کہانیوں کا بنیادی خیال نوآبادیاتی سامراج کے زیر کنٹرول نوآبادیوں کے اندر پنپنے والے ادب کا بہت ہاتھ تھا جسے اکتوبر انقلاب نے بلاشبہ مہمیز لگائی تھی۔بالشیویک انقلاب نے پہلی بار ہندوستان میں ایسا روسی ادب اردو میں متعارف کرایا جس نے اردو پڑھنے والے قاری کو روشن خیالی۔سامراج دشمن ،افتادگان خاک سے یک جہتی کی جانب راہ دی۔روسی زبان سے اردو میں ادبی تراجم کی مبسوط کوشش سعادت حسن منٹو نے کی اور تقسیم سے پہلے ادبی رسالے عالمگیر کے روسی ادب پہ خصوصی شمارے اور پھر 'فرانسیسی ادب' کے تراجم پہ مشتمل شمارے نے اردوادب میں بذات خود فکشن کی تخلیق پہ گہرے اثرات مرتب کئے ۔اور ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اردو میں جو جدید نظم کی روایت سامنے آئی اس نظم میں بھی جو سماجی تبدیلی اور سماجی انقلاب جیسے مضامین کا غلبہ دکھائی دیتا ہے وہ ترجمہ کی دین تھی۔

تقسیم کے بعد ہم اس دور سے گزرے جسے پوسٹ کالونیل دور کہا جاتا ہے۔اور ۵۰ء سے ۶۰ء

۱۹۷۰ء اور ۸۰ء کی دہائیوں میں ہمارے ہاں افریقہ، عرب میں پیدا ہونے والے ادب کے سارے حصّے اردو میں منتقل ہونا شروع ہوگئے۔ جیسے افریقہ سے چینوا ایشوبے کے ناول کا ترجمہ 'توڑ پھوڑ' کے نام سے سامنے آیا۔ اسی دوران ہم نے عرب سے محمود درویش، نزار قبانی اور ترکی کے ناظم حکمت کی شاعری کے تراجم سے آشنائی حاصل کی۔ ایران کے اندر اس دوران برطانوی سامراج اور پھر امریکی سامراج کے خلاف جدو جہد اور تحریکوں کے زیر اثر جو ادب پیدا ہونا شروع ہوا اس میں سے بھی کافی تراجم سے اردو ادب میں ہوئے اور ان کو یہاں پذیرائی ملنا شروع ہوئی۔ فلسطین، الجزائر کی آزادی کی تحریکوں کے زیر اثر جو ادب ان ممالک میں پیدا ہوا اس کی بازگشت بھی اردو ادب میں سنائی دی اور ہم نے الجزائر کے پس منظر ہی میں ژاں پال سارتر کے ناول، کہانیوں کا ترجمہ اردو میں ہوتے دیکھا اور اسی ضمن میں فرانز فین کی کتاب 'افتادگان خاک' کے نام سے اردو میں منتقل ہوئی۔ اردو ادب کے پڑھنے والوں، فکشن، شاعری کی تخلیق کرنے والوں کے ہاں روسی، فرانسیسی، نوآبادیاتی ریاستوں کی غلامی اور بعد از رسمی آزادی کے بعد پیدا ہونے والے ادب کے تراجم نے گہرے اثرات مرتب کئے، اگر یہ کہا جائے کہ اردو ادب کے بڑے ناول نگاروں، کہانی کاروں اور افسانہ نگاروں کے ہاں سماجی تبدیلی کے آدرش سے کمٹمنٹ کا ایک بڑا سبب کالونیل و پوسٹ کالونیل معاشروں میں پیدا ہونے والا مزاحمتی ادب ہے تو یہ کوئی مبالغہ آرائی پہ مشتمل دعویٰ نہیں ہوگا۔ سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، عبداللہ حسین تارڑ سے لیکر بڑے بڑے نامور کہانی نگار اور ناول نگاروں کو اس صف میں کھڑا کیا جا سکتا ہے۔

ہمارے ہاں اردو ادب کے اندر دوسرے نوآبادیاتی اور پوسٹ کالونیل معاشروں اور سماجوں سے جو ریڈیکل اور ترقی پسند ادب منتقل ہوا اور اس نے جس بڑے پیمانے پہ ادب کے قاری اور اس کے لکھاری پہ اپنے اثرات مرتب کئے اس کے جواب میں اور اس کے ردعمل میں ہم نے 'جدیدیت' کی ایک لہر اٹھتے دیکھی اور اس لہر کے سب سے بڑے علمبردار شمس الرحمٰن فاروقی تھے۔ اور اگر تھوڑا سا گہرائی میں جا کر جائزہ لیا جائے تو اس مابعد جدیدیت ادبی لہر کی بڑی جڑیں تو خود مغربی ادب اور تنقید کے اندر پیوست تھیں جن کو حسن عسکری صاحب نے ایک زمانے میں پروان چڑھایا تھا اور پھر مابعد جدیدیت کے علمبرداروں نے سماجی حقیقت نگاری کے مقابلے میں جس ابہام پرست اور علامتی فکشن کو پروان چڑھایا تھا اس کا خلاصہ

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی والا نکلا تھا۔اور آخر میں مابعد جدیدیت کا سب بڑا علمبردار شمس الرحمٰن فاروقی کو آخر کار اردو میں داستان گوئی کے فن میں پناہ لینی پڑی اور خود اپنا ایک ناول 'کئی چاند تھے سر آسمان' لیکر آئے اور ایسے ان کے افسانوں کا مجموعہ 'سوار اور دوسرے افسانے' سامنے آیا تو اس میں کہانی کے اندر سے پلاٹ غائب کرنے کا کہیں نام ونشان تک نہ تھا۔

ستر اور اسّی کی دہائیوں میں آنرے ڈی بالزاک ،سیموئل بیکٹ سمیت کئی ایسے فکشن رائٹرز کے اردو تراجم سامنے آئے جنھوں نے ہمارے اردو میں تجریدی ادب کے بارے تفہیم میں اضافہ کیا اور اس نے کافکا کو بھی زیادہ تندہی سے دریافت کرنے کا موقعہ فراہم کیا۔میلان کنڈیرا کے ناولوں کے تراجم سامنے آئے۔اور ان تراجم میں کہیں نا کہیں ،داغ داغ اجالا شب گزیدہ سحر کا تزکرہ موجود تھا۔

اسی اور نوے کی دہائیاں اردو ادب میں لاطینی امریکہ، مڈل ایسٹ اور نارتھ افریقہ کے ادب سے تراجم کی زرخیز تاریخ کی روداد سناتی ہیں۔اور اس کا بڑا کریڈٹ اجمل کمال عسالے 'آج' کو جاتا۔عمر میمن ،ارجمند آراء، زینت حسام ،اجمل کمال ،مسعود اشعر ،نیئر مسعود ، ابوا عش سمیت درجنوں نام ایسے ہیں جنھوں نے مصر،الجزائر،تیونس، لبنان ،عراق ،شام ، پولینڈ ،ہنگری ، برازیل ،کولمبیا،ساؤتھ چلی وغیرہ کے کئی معروف ادیبوں کے ناول اور کہانیوں کو اردو مین ڈھالا اور ان تراجم کے اردو ادب پہ بہت گہرے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔اور 'آج' میں شائع ہونے والے تیسری دنیا کے ملکوں کے ادب کے تراجم نے دوسرے کئی اشاعتی اداروں کو ان ممالک کے ادیبوں کے اردو تراجم شائع کرنے کی طرف راہ دی۔اور اردو ادب میں خاص طور پہ ناول کے میدان میں جو ایک کمی سی پائی جاتی تھی اسے کافی حد تک دور کرنے میں مدد فراہم کی۔

اردو ادب میں تیسری دنیا کے ادب کے تراجم نے اردو ادب کے قاری کا فکری کینوس اور ذوق ادب وسیع کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔اور آج سوشل میڈیا پہ متحرک نوجوان لڑکے اور لڑکیوں انقلابی اور مزاحمتی شعور میں ان تراجم کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔اور اردو ادب میں پاائی جانے والی رجعت پرستانہ پیٹی بورژوازی یا درمیانے طبقے کی ادبی روایت کے غلبے کو توڑنے کے لیے پوسٹ کالونیل دور کے ادبی ذخیرے کے اردو تراجم سے بڑی مدد لے سکتے ہیں۔اور سوشل میڈیا پہ اردو میں ہونے والے تیسری

دنیا کے ادب کے تراجم کا سلسلہ بڑھتا جا رہا ہے اگرچہ اب تک کسی نے بھی سوشل میڈیا پہ اردو میں تیسری دنیا کے ادیبوں کے تراجم کی لہر کے بارے میں کوئی ٹھوس مطالعہ اور تحقیق نہیں کی اور نہ یہ دیکھنے کی کوشش کی ہے زیادہ تر یہ تراجم کس ادبی لہر کے ترجمان ہیں۔ اردو ادب کی ترقی پسند روایت کو درمیانے طبقے کی مثالیت پسندانہ اور دایاں بازو کی مذہبیت اور پدرسری غلبے کے اندر سے سامنے والی ادبی روایت کی جانب سے انتہائی سریس چیلنج کا سامنا ہے۔ عمیرہ احمد سمیت کئی لکھاری اسی طرح کے ادب کی پیداوار کر رہے ہیں۔ جبکہ اس روایت کے اندر چھپے الٹرا کنزرویٹوازم اپنے تئیں لبرل روایت میں لپیٹ کر ادب کی تخلیق کرتا ہے جو کہ انگریزی زبان میں ہے۔ محمد حنیف، ندیم اسلم، محسن حامد، کاملا شمسی وغیرہ اسی قبیل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ان کے ہاں سے اگر جو تراجم اردو میں آئیں بھی تو وہ ہمارے سماج کی تقسیم کا بہت سادہ رخ، لبرل ازم بمقابلہ ملائیت پیش کرتے ہیں جبکہ اس میں کارپوریٹ سامراجی سرمایہ داری، سامراجی جنگوں اور ترقی کا موجودہ ماڈل کی ڈی کنسٹرکشن ہوتی نہیں ہے جبکہ ہمارے ادب میں اس کی عکاسی کئے جانا بہت اہم ہے۔

طاقتور قوموں کا اپنی طاقت کے بل بوتے پر اپنے تصرف سے باہر کی زمینوں پر قبضہ کرنا، وہاں کے لوگوں کو غلام بنانا، ظلم، جبر اور تشدد پر مبنی یہی توسیع پسند سوچ اور غلبہ پسند خواہش استعمار کہلاتی۔ نوآبادیاتی نظام اس خواہش اور سوچ کی عملی شکل ہے۔ جس میں نوآبادکار محکوم قوم کی سرزمین پر آباد ہو کر ان کے وسائل اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

اردو کے مشہور ادیب محمد حسین آزاد نے انگریز نوآبادکاروں کے جدید علوم اور ترقی سے بہت متاثر نظر آتے ہیں اور ان کی پیروی کرنے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ ان کے حصول کو کامیابی کا راز سمجھتے ہیں۔ ان کو مغربی خیالات اور نوآبادکاروں کے نئے علوم وفنون اقدار مشرق کی علمی ورثہ کے مقابل زیادہ مرغوب بھاتے تھے۔ اس بارے میں ڈاکٹر الطاف انجم نے اپنے مضمون میں بحث کی ہے۔ آزاد فرماتے ہیں:

> ''تمہارے بزرگ اور تم ہمیشہ سے نئے مضامین اور نئے انداز کے موجد رہے مگر نئے انداز کے خلعت وزیور جو آج کے مناسب حال ہیں وہ انگریزی صندوقوں میں بند ہیں کہ ہمارے پہلو میں دھرے ہیں اور ہمیں خبر نہیں۔ ہاں صندوقوں کی کنجی ہمارے ہم وطن انگریزی دانوں کے پاس ہیں''۔۴۴

حالؔی بھی انگریز زدگی اور انگریزی زبان کو بہت پسند کرتے ہیں ۔انگریزی خیالات و افکاراور الفاظ کو اپنانے میں خوشی محسوس کرتے ہیں ۔ انگریز زدگی کے اس جامہ کو زیب تن کرنے میں وہ مشرقی لباس یعنی شعری روایات اور جمالیات کو بھول جاتے ہیں ۔ حالؔی بھی مغرب کی پیروی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔حالؔی کے دیوان کے چہرے پہ لکھا ہے۔ ''چلوتم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی'' ڈاکٹر الطاف انجم لکھتے ہیں:

'' حالیؔ نے ''مقدمۂ شعرو شاعری '' میں ملٹن کے simple,passionate اور sensuous جیسے الفاظ استعمال کر کے اپنی انگریز زدگی کا ثبوت پیش کیا۔حالی نے جب ایک شعر میں مشرق کی شعری روایات اور جمالیات کو یکسر فراموش کرتے ہوئے کہا۔

حالؔی اب آؤ پیرویٔ مغربی کریں
بس اقتدائے مصحفؔی و میرؔ کر چلے ۴۵

حالی اور اس کے معاصرین نے اسی میں عافیت سمجھی کہ انگریزوں کے خلاف آواز اٹھانا یا احتجاج کرنا نوآبادکار کی حکومت کے عتاب کا شکار ہونا پڑے گا لہذا گوروں کی حکومت کا فرمانبرداری ہونے میں ہی بھلائی ہے۔ڈاکٹر الطاف انجم اس بارے میں لکھتے ہیں:

'' حالی اور اس کے معاصرین کے حاشیہ خیال میں بھی جدو جہد میں انگریزوں سے بازی جیتنا نہ تھا اس لیے انہوں نے عافیت اُن کے سامنے نہایت ہی ادب و احترام اور مطیع و فرمانبردار کے طور پر پیش ہونے میں سمجھی ۔واقع یہ ہے کہ ہندوستانی قوم ۱۸۵۷ء کی ناکام جدوجہد میں اپنی مزاحمتی استعداد کھو چکی تھی۔'' ۴۶

انجمن پنجاب جو کرنل ہالرائڈ اور محمد حسین آزاد کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔اس انجمن کے تحت حالی نے موضوعاتی نظمیں لکھیں۔نوآبادیاتی صورت حال میں اگر ان کا جائزہ لیا جائے تو اس کا مقصد یہاں کی معروف صنف سخن کو بےکار اور اخلاق کو بگھاڑنے والی صنف قرار دینا تھا۔اس طرح یہاں کی عوام کو اور ان سے منسوب اشیاء کو کم تر اور حقارت کا احساس دلانا تھا۔ڈاکٹر الطاف انجم لکھتے ہیں:

''حالی نے بھی اپنی تخلیقی اور لسانی مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کئی عمدہ نظمیں تخلیق

کیں۔جن میں 'چپ کی داد، مناجاتِ بیوہ، برکھارت، تعلیمِ نسواں، اہم ہیں۔آج جب ہم مابعد جدید تنقید کے مابعد نوآبادیاتی ڈسکورس کے تحت اس صورت حال کا جائزہ لیتے ہیں تو یہی نتیجہ اخذ کیا جا رہا ہے کہ انگریزوں نے موضوعاتی نظمیں لکھوانے کے پسِ پردہ جو مقصد طے کیا تھا وہ یہ تھا کہ یہاں کی مقبولِ عام شعری صنف کو از کار رفتہ اور مخربِ اخلاق قرار دے کر پسِ منظر میں دھکیل دیا جائے۔جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں نے جارحانہ اور شاطرانہ انداز میں ہندوستان کے اقدار، افکار، رسوم، رواج، تہذیب، تمدن، ثقافت کو معمولی یا دوسرے درجے کا قرار دے کر انہیں ہر سطح پر پایۂ حقارت سے ٹھکرا دینے کا کام انجام دیا۔"
۴۷

حالانکہ حالؔی نے اس بات پر بھی رونا رویا ہے کہ مختلف قوموں نے مختلف حربوں سے ہندوستان کی سرزمین کو لُوٹا ہے اور آخر میں مغربی قوم نے بھی کوئی کسر باقی نہیں رکھی، یہاں کے قدرتی وسائل، افرادی قوت اور یہاں کی کمزور حکومت کا بے تحاشا استحصال کیا۔ ہندوستان پر استعماری تسلط و اجارہ داری کی تاریخ خاصی پرانی ہے۔دنیا کی زیادہ تر قومیں اپنی طاقت کے بل اس سرزمین کو لوٹتی رہی۔مولانا الطاف حسین حالی نے نظم "حب وطن" میں اس تاریخ کو مختصراً کچھ کو یوں بیاں کیا ہے۔

کبھی تورانیوں نے گھر لوٹا
کبھی درانیوں نے زر لوٹا
کبھی نادر نے قتل عام کیا
کبھی محمود نے غلام کیا
سب سے آخر کو لے گئی بازی
ایک شائستہ قوم مغرب کی ۴۸

استعمار ایک مخصوص سوچ، طرزِ عمل کا نام ہے۔اس نظریے کے مطابق ہندوستان میں مختلف اقوام مثلاً یونانی، افغانی، ایرانی، ترک اور عرب وغیرہ کی دراندازیوں کی مختلف صورتیں بنتیں ہیں۔مثلاً وہ اقوام جو ایک خاص مقصد کے تحت یہاں آئیں بے شک وہ یہاں کے وسائل پر قابض ہوئیں لیکن واپس نہیں

گئیں اوراس سرزمین کے ہو کر رہ گئیں ۔بعض اقوام ایسی تھیں جنھوں نے یہاں کا سرمایہ بھی اپنے ملک منتقل کیا لیکن نہ یہاں پر کالونیاں بنائیں نہ تہذیبی اجارہ داری قائم کرنے کی کوشش کی وہ مکمل طور استعماری پالیسی کی مذکورہ تعریف پر پوری نہیں اتر تیں ۔ اشتراکیت پسندوں کی طرح استعمار کو صرف سرمایہ یا اقتصادیات تک محدود نہیں کیا جاتا ہے۔گوں کہ اس میں اقتصادیات کو بنیادی حیثیت حاصل ہے لیکن اس کے علاوہ مذہبی،ادبی،لسانی،تہذیبی،ثقافتی،سیاسی اورسماجی اموراس کے زمرے میں شامل ہیں۔

ہندوستان میں استعماری تاریخ کا نیاباب سولہویں صدی میں پرتگالیوں کی آمد سےشروع ہوتا ہے ۔پرتگیز کپتان واسکوڈے گاما ۱۴۹۸ءمیں یہاں آیا۔جس کے بعدولندیزی،ڈچ اورفرانسیسی وغیرہ یہاں آنا شروع ہوئے ۔تاہم ہیدوستان پراستعماری اجارہ داری میں جوقوم سب پر بازی لے گئی وہ انگریز تھے ۔ان کا پہلا جہازی بیڑا۱۶۰۱ء میں جیمس لین کی سربراہی میں یہاں پہنچا اور''ایسٹ انڈیا کمپنی'' کے نام سے ہندوستان میں تجارت شروع کی ۔تجارت سے زیادہ ان کی نظرحکومت پر رہی ۔جس کے لیے منصوبہ بندی شروع ہوئی ۔خان،نواب اورسردار کواپنے ساتھ ملایا گیا۔مقامی لوگوں کوایک دوسرے کے خلاف اکسایا گیا۔ مذہب،نسب اورزبان کے نام پرتفرقے ڈالے گئے ۔یوں میرجعفراورمیرصادق جیسے غداروں کی وجہ سے کمپنی کے وابستہ چار پانچ سوملازمین کروڑوں ہندوستانیوں پر برطانوی راج قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

جعفراز بنگال وصادق از دکن
ننگ آدم،ننگ دیں،ننگ وطن
ناقبول و ناامید و نامراد
ملتے از کارِشاں اندرفساد ۴۹

ہندوستان میں برطانوی نوآبادیاتی نظام کوتادیررہنا تھا۔یہاں کے وسائل کواستعمال کرنا تھا۔اس سرزمین کوبطورمنڈی استعمال کرنا تھا۔اس لئے یہاں کے رہائشیوں کی زبان،تعلیم،معاش،مذہب، معاشرت اورثقافت وغیرہ پراجارہ داری قائم کرنے کے لیے منصوبہ بندی شروع کی گئی ۔مقامی زبانوں کے بجائے انگریزی زبان کوترجیح دی گئی ۔ مذہبی حوالے سے عیسائی پادریوں کو یہاں بلاکرعیسائیت کا پر

چار شروع کیا گیا۔ جدید تعلیم کے نام پر یہاں روشن خیالی اور مذہب بیزاری کو رواج دیا گیا۔ مذہبی مشاہیر کو بدنام اور تاریخ ہیروز کو زیرو بنا کر پیش کرنے کی کوشش شروع ہوئی۔ شبلی نعمانی نے اپنی ایک نظم ''مذہب و سیاست'' میں یہی شکوہ کیا ہے۔

آپ نے ہم کو سکھائے ہیں جو یورپ کے علوم
اس حقیقت سے نہیں قوم کو ہرگز انکار
بحث یہ ہے کہ اس طرح سے بھی ممکن تھا
کہ نہ گھٹتا کبھی ناموسِ شریعت کا وقار ۵۰؎

ہندوستان پر استعماری اجارہ داری کے پس پشت موجود جابرانہ اور آمرانہ پالیسیوں کے خلاف مزاحمت بھی شروع ہوئی جن کی کئی شکلیں ہیں۔ مثلاً عسکری مزاحمت اورنگزیب کے دور میں شروع ہوئی تاہم ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے ساتھ اس کا خاتمہ ہوا۔ جنگ آزادی کے بعد قلمی مزاحمت شروع ہوئی، صحافت کے میدان میں زمیندار، کامریڈ، الہلال البلاغ جیسے اخبارات شائع ہونے لگے جن میں استعماری اجارہ داری کے خلاف کے مضامین چھپتے رہے۔ سیاسی سطح پر کانگرس، مسلم لیگ، ہندومہا سبھا اور آریا سماج جیسی پارٹیاں آئیں اور یوں ہندوستان میں استعماری اجارہ داری کے خلاف مزاحمت کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا۔

اس پر آشوب دور میں اللہ تعالیٰ نے اس سرزمین کو جس عظیم ہستی سے نوازا وہ علامہ محمد اقبال تھے۔ جن کا فکری ارتقاء استعماری طاقت کے برپا کردہ ہنگاموں میں ہوا۔ پروفیسر انور رومان نے اپنی کتاب'' اقبالؔ اور مغربی استعمار'' میں دعویٰ کیا ہے کہ اقبالؔ کے اردو کلام میں کم وبیش چار ہزار سات سو چھبیس اشعار ایسے ہیں جن میں استعماری اجارہ داری کے خلاف مزاحمت موجود ہے۔۵۱

اقبالؔ نے ابتدا میں اپنی شاعری میں ہندو مسلم اتحاد کو موضوع بنایا۔ ہندوستانیت کی بات کی لیکن استعماری پالیسی ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کے تحت ہندوستانی ایک دوسرے کے دشمن بن چکے تھے۔ جغرافیائی سطح پر تقسیم بنگال کا واقعہ اس حوالے سے پہلا حربہ تھا جو اقبالؔ کی شاعری کے ابتدائی دور میں پیش آیا۔ اقبال جب اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ گئے تو مغربی تہذیب کے علمبرداروں کو قریب سے دیکھا۔ کچھ حوالوں

سے ان سے متاثر بھی ہوئے۔ بالخصوص ان کی حرکت وعمل، ترقی اور جدید تعلیم وٹیکنالوجی کی طرف جھکاؤ نے انہیں فکری سطح پر متاثر کیا لیکن ان کی کھوکھلی تہذیب اور مذہب بیزاری کو انہوں نے طنز کا نشانہ بنایا۔

تمہاری تہذیب اپنے آپ ہی خودکشی کرے گی

جو شاخ نازک پر آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا ۵۲؎

یورپ سے واپس آئے تو طرابلس اور بلقان کی جنگیں چھڑ گئیں۔جن میں نہتے مسلمانوں کو ظلم و جبر کا نشانہ بنایا گیا۔اقبال اسلام اور مسلمانوں کے لیے دردمند دل رکھتے تھے یوں انہوں نے 'شکوہ' کی شکل میں مسلمان قوم کا درد ربِ کائینات کے سامنے رکھنے کی کوشش کی۔اٹلی اور فرانس کی اسلام اور مسلمان دشمنی کو دیکھ کر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ اقوام اسلام دشمنی کے پردے میں اہل مشرق اور مسلمانوں کا استحصال کر رہی ہیں۔اب مسلمانوں کو مجبوراً مداخلت کرنی پڑے گی۔''محاصرہ دارانہ'' میں انہوں نے ان جنگوں کو حق و باطل کی جنگ قرار دیا۔

ابھی یہ غم تازہ تھا کہ پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی۔جنگ میں شکست جرمنی کی ہوئی لیکن سزا ترکی کو بھگتنا پڑی۔ نتیجے میں خلافت سے ہاتھ دھونا پڑا۔عرب کی مرکزیت ختم کر دی گئی جو اسلام اور مسلمانوں کی یکجائی کا بنیادی مرکز تھا۔ ہندوستان میں انگریز سرکار کی جانب سے ہندوستانیوں کو ورغلا کر اپنے مسلمان بھائیوں کے خلاف جنگ پر آمادہ کیا گیا۔ان کے ساتھ جھوٹے وعدے کیے گئے جس کے نتیجے میں ہندوستانیوں کو جلیانوالہ باغ کی درندگی، مارشل لا اور رولٹ ایکٹ جیسی مراعات سے نوازا گیا۔ ہندوستان میں استعماری پالیسیوں کے ردعمل میں تحریک خلافت، ہجرت کی تحریک، شدھی و سنگھٹن تحریکیں ،نہرو رپورٹ، چودہ نکات، گول میز کانفرنسیں وہ سلسلے تھے جس کے نتیجے میں اقبال نے خطبہ الہٰ آباد آباد پیش کیا اور ہندوستان میں ایک الگ مسلم اکثریتی ریاست کا تصور پیش کیا۔تاریخی حوالے سے دیکھا جائے تو اقبال کا عہد ہندوستان کے درد و غم سے بھرے ہوئے دورانیہ کا نام ہے جس میں اقبآل کی فکر ارتقائی عمل سے گزرتی رہی۔ ہندوستان میں استعماری پالیسیوں کے جتنے بھی اہم نکات ہیں اقبآل نے ان سب کی مخالفت کی اور دلیل کے ساتھ نہ صرف ان کو رد کیا بلکہ ہندوستانیوں کو اس سے بچنے اور متبادل راستہ اختیار کرنے کا درس بھی دیا۔اقبال جدید تعلیم کے خواہاں اور حامی تھے لیکن برطانوی استعمار جدید تعلیم کے نام پر

ہندوستانیوں کو جو سوچ اور فکر دینا چاہتی تھی وہ اقبال کی بصیرت افروز نگاہوں سے مخفی نہیں تھی۔

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ ۵۳؎

بیکاری و عریانی و مے خواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کی فتوحات ۵۴؎

استعماری طاقتیں ایسے حربے استعمال کرتی ہیں جن کے ذریعے محکوم قوم کے ذہن میں یہ تصور پیدا کیا جاتا ہے، کہ غالب قوم ہم سے ہر لحاظ سے برتر اور تہذیب یافتہ ہے۔ جس کے نتیجے میں مغلوب اقوام کی زبان، مذہب، سرمایہ، تعلیم اور تہذیب و ثقافت پر اجارہ داری قائم کی جاتی ہے۔ ہیدوستان میں بھی انگریز استعمار نے پالیسی اختیار کی۔ پہلے انگریزی زبان کو یہاں کی مقامی زبان پر مقدم ٹھرایا۔ تعلیمی نظام اپنی مرضی سے مرتب کیا۔ مذہبی حوالے سے عیسائی پادریوں نے مناظرے شروع کر کے مسلمانوں کو شکوک وشبہات میں مبتلا کیا۔ دوسری طرف مسجدوں کی بے حرمتی اور مقدس مقامات کو گرانے کا سلسلے شروع کیا۔

اقبال نے اپنی شاعری میں استعماری اجارہ داری اور ان کی پالیسیوں کی مخالفت کی۔ ان کے مطابق آزادی انسان اور مسلمان کا بنیادی حق ہے۔ اس لئے اپنی شاعری میں ہندوستانیوں کو جاگنے اور آزادی کے حاصل کرنے پر آمادہ کرنے کے لئے دینی و دنیاوی علوم و تواریخ سے مثالیں پیش کیں۔

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے آب
اور آزادی میں بحر بے کراں ہے زندگی ۵۵؎

اقبال استعماری اجارہ داری، سامراج کی تعلیم وثقافت، حکمت، تہذیب و تمدن، تدبر اور نظامت کو اسلام اور مسلمان کے لیے خطرہ تصور کرتے تھے۔ ان کو سب سے زیادہ فکر مذہب اور تہذیب کی تھی وہ ہمیشہ ہندوستانی تہذیب سے جڑے رہے اور مغربی تہذیب کو رد کرتے رہے۔

اُٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے ۵۶؎

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے ۵۷

اقبال نے صرف شاعری میں انگریز کی استعماری اجارہ داری کی مخالفت و مزاحمت کی بلکہ عملی طور پر بھی کئی تحریکوں سے وابستہ رہے۔ جانی و مالی قربانیاں دیں۔ سیاسی میدان میں کلیدی کردار ادا کیا۔ خطبہ الہ آباد کی شکلم میں نہ صرف ایک آزاد اور خود مختار ملک کا تصور پیش کیا بلکہ اس کے انتظامی امور کا پورا منصوبہ بھی مسلم قیادت کے سامنے رکھا۔ ساتھ میں ہندوستانی نوجوانوں کی بے راہ روی، بے جا تقلید پرستی ،تقدیر پرستی، ہندوستانی مکتب و مدرسہ کے فرسودہ نصاب، کاہل استاد، تن آسان شاگرد کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا۔

وائے نادانی کہ تو محتاج ساقی ہو گیا
مے بھی تو، مینا بھی تو، ساقی بھی تو محفل بھی تو ۵۸

اقبالؔ کے یہاں نوآبادکاروں کے خلاف جو احتجاجی رویہ تھا اسی فکر کا جائزہ لیتے ہوئے عبدالرحمٰن بجنوری کہتے ہیں کہ اگر مسلمان اقبال کو سمجھ لیتا تو ایک دن بھی غلام نہ رہتا اور اگر انگریز سمجھ لیتا تو اقبال کی ساری زندگی قید و بند میں گزرتی۔

مابعد نوآبادیاتی تنقید کی فکری بنیادیں بیسویں صدی کے اواآخر میں مستحکم ہو چکی تھیں۔ مغرب میں مابعد نوآبادیات کے مباحث مختلف صورتیں اختیار کرتے رہے۔ علمی اداروں کی سطح پر بھی مابعد نوآبادیاتی مطالعات کو فروغ حاصل ہوا الغرض اکیسویں صدی کا سورج طلوع ہونے سے پہلے مابعد نوآبادیات مغرب میں ایک مقبول ڈسکورس کی حیثیت اختیار کر چکی تھی مگر اردو سے اس کی شناسائی تاخیر سے ہی ہوئی اور وہ بھی محض تعارفی نوعیت کی ہی البتہ اس حوالے سے سنجیدہ مباحث کا آغاز ڈاکٹر ناصر عباس نیّر نے کیا اس سے پہلے کہ ان مطالعات پر بات کی جائے ابتدائی حوالے سے تحریر کردہ چند مضامین کا ذکر کرنا اردو میں اس ڈسکورس کے تسلسل کو سمجھنے میں مدد دے گا۔

ڈاکٹر احمد سہیل کا مضمون ''ردِ نوآبادیاتی تنقید'' ۱۹۹۸ء میں شائع ہوا۔ ان کے اس مضمون میں نوآبادیات، پسِ نوآبایات اور ردِ نوآبایات پر تعارفی نوعیت کی بحث ملتی ہے۔ انھوں نے البرٹ کامیو ، برٹرینڈ رسل، ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ اور سارتر کے حوالوں سے ادب میں سامراجی مزاج کی نشاندہی کی ہے

۔ان کے خیال میں پسِ نوآبادیاتی تنقید دراصل اسی سامراجی مزاج سے آگاہی کا نام ہے۔ردّ نوآبادیات کے حوالے سے وہ مزید کہتے ہیں کہ یہ اس صورت حال کا رد ہے جو آزادی کے بعد سابقہ نوآبادیوں کو درپیش تھی ۔ترقی پسند تحریک اگر چہ نوآبودیات کا رد تھی مگر وہ کہتے ہیں کہ پچاس کی دہائی میں جب اشتراکیت کے پردے میں پوشیدہ سامراجیت ظاہر ہوئی تو مزاحمتی اور احتجاجی ادب کی صورت میں ردِنوآبادیاتی فکر کا اظہار شروع ہوا۔انھوں نے لاطینی امریکی ریاستوں اوران کے ادب کے حوالے سے بھی ردِّنوآبادیاتی فکر کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔وہ ردِّ نوآبادیاتی تنقید کی اشتراکیت میں موجود سامراجیت سے آگاہی کے متعلق لکھتے ہیں:

''ردِّ آبادیاتی تنقید سامراجی قدروں اور نظریات کو ہی نشانِ ہدف نہیں بناتی بلکہ دیگر جمہوری،معاشرتی اور سیاسی نظاموں میں چھپے ہوئے نوآبادیاتی سامراجی عناصر کو بھی شناخت کر لیتی ہے۔''۵۹

ڈاکٹر احمد سہیل کا مضمون اردو دنیا کو کو مابعد نوآبادیات سے محض آگاہ کرنے کی ایک کوشش ہے۔

ریاض صدیقی ''نوآبادیاتی اور مابعد نوآبادیاتی تناظر میں سرسید تحریک کا مطالعہ'' میں کہتے ہیں کہ برصغیر کی نوآبادیاتی دور کی شعری اور ادبی تاریخ کی اب تک کی تشریح وتوضیح صحیح رخ نہیں دکھاتی وہ کہتے ہیں کہ سرسید کے دوقومی نظریے کی تفسیر وتشریح بھی اسی سیاسی اور نظریاتی مصلحت کا نتیجہ ہے جو آزادی کے بعد دونوں ملکوں نے اپنے مقاصد کے لیے اختیار کی۔ریا صدیقی نے سرسید کے نظریات ان کی علی گڑھ تحریک ،سیاسی اور تعلیمی پالیسیوں اور اردو ہندی جھگڑے کے حوالے سے ان کے اقدامات کا جائزہ نوآبادیاتی تناظر ،نوآبادکاروں کی پالیسیوں اور حکمتِ عملی کی روشنی میں لیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انگریز کے موٴقف کی حمایت علی گڑھ کا نظامِ تعلیم ،طلبا کو انگریز کی وفاداری کا درس ،رسالہ در بابِ طعام کی تصنیف ایسے اقدامات ہیں جو بالکل نوآبادیاتی حکمتِ عملی کے مطابق تھے۔انھوں نے اپنے مضمون میں سرسید تحریک کے منفی اثرات کے ساتھ ساتھ مثبت کردار کا بھی اعتراف کیا ہے مگر وہ کہتے ہیں کہ اس کردار کی افادیت کو انگریز کی غیر مشروط وفاداری اور قصیدہ خوانی کے رجحان نے خاصا کمزور کر دیا تھا ۶۰۔

یہاں اس طرف توجہ دلانا ضروری ہے کہ ریاض صدیقی نے سرسید تحریک کے مثبت کردار کی طرف صرف اشارہ کیا ہے۔جبکہ نوآبادیاتی تناظر میں غیر جانب داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس تحریک کے ہر پہلو کونوآبادیاتی دور کے بیانیوں ،نظریوں ،تصورات اور کلامیوں کی چھلنی سے گزرانا ضروری تھا۔

وہاب اشرفی کا مضمون ''مابعد جدیت: نوآبادیات وپسِ نوآبادیات'' تشریحی وتوضیحی نوعیت کا ہے اس میں انھوں نے ایڈورڈسعید، ہومی بھابھا اور گائتری چکرورتی کی شخصیات، تصانیف اور ان تصورات اور ان تصورات کی تشکیل میں کارفرما محرکات سے گزرتے ہوئے نوآبادیاتی اور نوآبادیاتی صورتحال کی تفہیم اورابلاغ کی کوشش کی ہے(۶۱)اگرچہ انھوں نے مابعدنوآبادیات کے ان تینوں نظریہ سازوں کے نظریات اور مابعدنوآبادیات میں ان کی اہمیت کی وضاحت نہیں کی۔مگر یہ مضمون اردودینا کو مغرب میں مقیم ان مفکرین کے کام سےضرورآگاہ کرتا ہےفکر سے نہیں۔ابوالکلام قاسمی نے انیسویں صدی کے اواخر میں ادبی اور علمی حلقوں میں فروغ پانے والی نوآبادیاتی فکر کوسرسیداحمد خان،مولانا محمد حسین آزاد اورالطاف حسین حالی کے حوالوں سے بیان کیا ہے۔ان کے خیال میں نوآبادیاتی فکر کا غلبہ اس قدر تھا کہ آزاد جدید نظم کی تحریک میں قلی قطب شاہ اور نظیر اکبرآبادی کی نظم کی روایت کو فراموش کر گئے (۶۲)۔اُنیسویں صدی کے اواخر میں اردو کی شعری اور ادبی روایت صدیوں کے ردّ وانجذاب کا نتیجہ تھی ۔شعروادب کے ان معیارات کا خمیر اسی تہذیب اور ثقافت سے اٹھا تھا۔اس روایت میں مشرقی انسان کی فکر کا ارتقا کا تھا مگر اس ارتقا کو نظرانداز کر کے نئے پیمانوں اورنئی قدروں کی تشکیل کی گئی۔اگر ادب تہذیبی اظہار ہے تو کیا راتوں رات ادبیات کے معیاروں میں مشرق ومغرب کا فرق پیدا ہوسکتا ہے؟اگر تاریخ کے کسی دور میں یہ انہونی ہوئی ہے تو اس کے محرکات کیا تھے؟وہ کون سے عوامل تھے جنھوں نے اس تبدیلی کی راہ ہموار کیے بغیر ایسا بھونچال پیدا کیا کہ ادبی فکر کے تسلسل میں کئی خلا پیدا ہو گئے اور کئی سوالات نے جنم لیا۔ابوالکلام قاسمی نے الطاف حسین حالی کے تنقیدی نظریات میں بھی نوآبادیاتی صورت حال کے جبر کی نشاندہی کی ہے۔انھوں نے حالی کے مقدمہ شعروشاعری میں موجود تنقیدی خیالات کو مغربی نظری کی شعر کی تقلید قرار دیا ہے۔ابوالکلا قاسمی اس بات کی طرف بھی توجہ دلاتے ہیں کہ ادبی اوع شعری معیار

بندی میں آنے والی تبدیلی باقاعدہ منصوبے کے تحت تھی۔اس کے لیے نوآبادکاروں نے سب سے پہلے مشرقی کلاسیکل سرمائے کو بے وقعت قرار دیتے ہوئے ہندوستانی اذہان پر غلبہ حاصل کیا۔یہی وجہ ہے کہ اس وقت کے نابغوں نے مشرق کی شعری وادبی روایت اور تصورِتہذیب کے آپس کے تعلق کو نظر انداز کرکے نوآبادیاتی ایجنڈے کی تکمیل میں مدد دی۔

ابوالکلام قاسمی نے ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں مشرق ومغرب کی کشمکش کی طرف اشارہ کیا ہے ۔نصوح اور کلیم کے کرداروں میں کلیم کو مغرب جبکہ نصوح کو مشرق کا وکیل قرار دیا ہے تاہم اس حوالے سے ڈاکٹر ناصر عباس نیّر کا نقطہ نظر زیادہ قرین صداقت لگتا ہے کہ نصوح اس مغربی سوچ کا نمائندہ ہے جو نوآبادکار یہاں پیدا کرنا چاہتا تھا جبکہ کلیم مشرق کے شرفا کی تہذیب کا نمائندہ ہے۔

ابوالکلام قاسمی نے بیسویں صدی کے اوائل میں ہندوستان کی ادبی فکر میں مزاحمت کا بیانیہ تلاش کیا ہے ۔وہ کہتے ہیں کہ مغربی تہذیب کی یلغار اور مغرب کی برتری پر مبنی بیانیے کے مقابل اپنا احساس کمتری ایسی صورت حال ہے جس میں مغربی فکر کے دائرے سے باہر نکل کر تمام حالات کا غیر جانب داری سے مشاہدہ کرنا اور تجزیہ کرنا مشکل کام ہے لیکن اس دور میں ایسی شخصیات بھی موجود تھیں جنھوں نے اپنے زمانے کی علمی اور تہذیبی فضا سے ماورا ہو کر سچائی تلاش کی ۔اقبال ایسی ہی شخصیت تھی وہ مغربن کی صنعتی و سائنسی ترقی اور تعقل پرستی سے بھی آگاہ تھے اور مشرق کی مابعد الطبیعات سے بھی واقفیت رکھتے تھے ۔ابوالکلام قاسمی اقبال کی ردِّ نوآبادیاتی فکر کا جائزہ ان کے تصورِ قوم ،تصورِ عشق ،جمہوریت اور اشتراکیت ،مذہب وسیاست کے بارے میں ان کے نظریات کے حوالے سے لیتے ہیں اور انھیں کہیں بھی مرعوبیت کا رویہ نظر نہیں آتا۔یہاں اقبال کے حوالے سے ایک اور بات بھی ذہن میں رکھنی چاہئے کہ اقبال عربی اور حجازی علامات کو جدید تصورات کے لیے استعمال کرتے ہیں تو دراصل نوآبادیاتی فکر کے خلاف مزاحمت کے ساتھ ساتھ متبادل بیانیہ بھی پیش کرتے ہیں ۔ابوالکلام قاسمی نے اشتراکیت کے حوالے سے اقبال کے ہاں جس ردوقبول کا ذکر کیا ہے یہ وہ دہرا شعور نہیں جو نوآبادیاتی ایجنڈے کی تکمیل میں مددگار ثابت ہوا تھا بلکہ یہ ایک دانشور کی بصیرت ہے جو ان معاشی نظاموں کے معائب اور محاسن پر نظر رکھتا اور متبادل کے طور پر اپنی فکر پیش کرتا ہے۔

شمس الرّحمٰن فاروقی کہتے ہیں کہ اکبرالہٰ آبادی اور اقبال ہمارے سب سے بڑے مابعدنوآبادیاتی ادیب ہیں (۶۳) ۔اکبر کی شاعری اور فکر کا جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اکبر ترقی اور روشن خیالی کے مخالف نہیں تھے بلکہ اس استعماری غلبے کے خلاف تھے جسے مستحکم کرنے کے لیے نوآبادکاروں نے ترقی اور تہذیب کے ستونوں کا سہارا دیا تھا۔فاروقی صاحب اکبر کی شاعری میں پسِ نوآبادیاتی فکر کوئی پہلوؤں سے موجود پاتے ہیں۔نوآبادیات کی وجہ سے ہندوستان میں جو تہذیبی بحران تھا اس کا ادراک اکبر کو بخوبی تھا۔وہ کہتے ہیں کہ جدید تہذیب کے نمائندہ الفاظ، پانی کانل، ریل گاڑی، ٹیلی فون اخبار وغیرہ کی اکبر نے اپنی شاعری میں مذمّت کی ہے۔فاروقی صاحب کہتے ہیں کہ اس مذمّت کے پیچھے ترقی کی مخالفت پر مبنی سوچ تھی بلکہ اس ترقی کے ساتھ آنے والی استعماری کی غلامی کی مذمت تھی۔اکبر نے نوآبادیاتی نظام کو مستحکم کرنے والے تعلیمی نظام کی مخالفت ضرور کی مگر تعلیم کی نہیں جیسا کہ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے ۔نوآبادیاتی دور کے خاتمے کو ایک عرصہ گزر چکا مگر اس کے اثرات اور مختلف شکلوں میں استعمار کی توسیع کے تجربے سے تیسری دنیا آج بھی گزر رہی ہے۔نوآبادیات کے قیام میں سرمایہ دارانہ نظام اور ذرائع ابلاغ کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔اسی سرمایہ دارانہ نظام کی تخریبی قوّتوں سے آج دنیا نبرد آزما ہے ۔ماحول کی آلودگی کے مسائل اور طبقاتی تقسیم بھی اس حوالے سے بڑے مسائل ہیں۔شمس الرّحمٰن فاروقی کہتے ہیں کہ اکبر پہلے شخص تھے جنہوں نے ان مسائل کا ادراک کیا اور ان کو شاعری میں بیان کیا۔انگریزی تعلیم کے مقاصد کا ادراک رکھتے ہوئے اس تعلیم کی مخالفت کی کیونکہ اکبر کو مغربی تعلیم کے مضمرات کا پورا احساس تھا(۶۴)۔اردو میں مابعدنوآبادیات کے حوالے سے ڈاکٹر ناصر عباس نیّر کا نام بنیاد گزار کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔انھوں نے گزشتہ صدی سے عالمی سطح پر جاری مابعدنوآبادیاتی مباحث کا جائزہ اردو زبان وادب کے تناظر میں لیا،نوآبادیاتی صورت حال،اردو زبان وادب میں نوآبادیاتی فکر اور اردو ادیبوں کے ہاں مابعدنوآبادیاتی تصورات ان کے دائرہ بحث میں شامل ہیں۔اگر مجموعی حیثیت سے دیکھیں تو ناصر صاحب کی مابعدنوآبادیاتی تنقید تین بڑے زمرے نظر آتے ہیں۔ہر ایک کے تحت مزید مباحث ہیں۔جن کا مطالعہ ڈاکٹر صاحب کے ہاں مابعدنوآبادیاتی تنقید کے مکمل اور منضبط نظام کو منکشف کرتا ہے۔انہوں نے برِصغیر میں نوآبادیاتی صورت حال کی تشکیل میں درج ذیل عوامل کا تذکرہ کیا ہے

:ا۔علم کا افادی تصور،۲۔علمی اور ثقافتی اداروں کا قیام،۳۔بیانیے کی طاقت ۔پھر اس نوآبادیاتی صورت حال کو استحکام عطا کرنے والے عناصر کے ضمن میں زبان کے کردار، یورپی برتری کے بیانیے کے ردعمل میں اصلاحی اور احیائی رویوں اور انیسویں صدی کے اواخر میں اردو ادیبوں کے ہاں نوآبادیاتی فکر کا جائزہ لیا ہے ۔انہوں نے نہ صرف نوآبادیاتی ادیبوں کی ادبی کاوشوں کا جائزہ تصوّرِ نقل ،تصوّر قوم، دوجذبیت اور دہرے شعور کے تناظر میں لیا ہے بلکہ ان مباحث کو اردو زبان و ادب کے حوالے سے منفرد زاویہ نظر بھی عطا کیا ہے ۔ڈاکٹر ناصر عباس نیر کے تنقیدی نظام میں نوآبادیاتی تصورات کے خلاف مزاحمت پر مبنی فکر کا بھی جائزہ ملتا ہے ۔اس ضمن میں انہوں نے متبادل بیانیہ اور حاشیائی متن کے تصورات کو مختلف ادیبوں کے حوالے سے شامل کیا ہے۔

ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے برصغیر میں نوآبادیاتی صورت حال کی تشکیل میں نوآبادکاروں کے تصورِ علم کو اہم اور بنیادی عامل قرار دیا ہے ۔یورپی آباد کار علم کا افادی تصوّر رکھتے تھے ۔طبعی مظاہرے کے مانند علم کو ثقافتی مظاہرے کی تسخیر کا بھی ذریعہ سمجھتے تھے ۔یعنی ان کے ہاں ثقافت کا جامد تصوّر تھا۔جس کا وہ درست علم حاصل کر سکتے ہیں اور اس کی درست تعبیر کی بھی صلاحیت رکھتے ہیں ۔مصنف نوآبادکاروں کے علم کو ان کی آئیڈیالوجی کی طاقت کے ساتھ منسلک قرار دیتے ہیں ۔اس حوالے سے ان کا مزید کہنا ہے کہ نوآبادکاروں نے علم کو طاقت سے جوڑنے کے لیے ایک تو مشرق کے علم کو کمتر ،دقیانوسی ،زمانے کے تقاضوں سے بے خبر قرار دیا دوسرے انہوں نے ہندوستانی باشندوں ک فطرت ،ان کے توہمات ،رسم و رواج اور ثقافتی مظاہرے کا علم یورپی تصوّر کائنات کی روشنی میں حاصل کیا۔انہیں کاہل ،سست، وحوش اور غیر مہذب قرار دے کر اپنے آقاؤں کی تہذیب ،زبان ،اور رسم ورواج اپنانے کی ترغیب دی ۔ڈاکٹر صاحب مقامی ثقافتوں کے علم کو ایسی تخلیق قرار دیتے ہیں جس میں نوآبادکار منتظم اور متشرق دونوں شریک رہے ۔ان کا کہنا ہے کہ یہ علم حقیقی نہیں نہ ہی معلومات حقیقی سیاق وسباق میں اکٹھی کی جاتی ہیں اس علم کی تخلیق میں عمومیت کا اصول کارفرما رہتا ہے ۔وہ کہتے ہیں کہ نوآبادکار مقامی ثقافت کی جانکاری کو اقتدار اور غلبے کے حصول کے لیے استعمال کرتا ہے ۔وہ لکھتے ہیں:

”نوآبادیاتی سباق میں علم اور طاقت کا گٹھ جوڑ کئی صورتیں اختیار کرتا ہے ایک سیدھی

سادی صورت تو یہ ہے کہ جتنا زیادہ جتنا صحیح علم اتنی ہی طاقت ''ہم''یعنی آبادکار ''وہ'' یعنی نوآبادیاتی علاقوں کا جتنا زیادہ اور جتنا سائنسی علم رکھتا ہے اتنا ہی ''وہ'' کے معاملات کو ہاتھ میں لینے اور ''وہ'' کے معاملات میں دخل اندازی کے قابل ہوتا ہے۔'' ۶۵

سوال تو یہ ہے کہ کیا نوآبادیات کا سائنسی اور زیادہ علم درست یا صحیح ہوسکتا ہے۔نوآبادکار کے پیش نظر مقصد درست علم کا حصول نہیں ہوتا بلکہ حاصل شدہ علم کی کتر بیونت کر کے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنا ہے۔ڈاکٹر ناصر عباس نیر ولیم جونز اور رائل ایشیا ٹک سوسائٹی کے حوالے سے ہندوستان کی کلاسیکل زبانوں کے متون کے علم کو بھی نوآبادیاتی صورت حال کی تشکیل میں اہم گردانتے ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ:

''اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں ہندوستانی اصولوں یا مقامی طور طریقوں سے مراد وہ سارا مذہبی ،ادبی ،علمی اور ثقافتی سرمایہ تھا جو ہندوستان کی کلاسیکی زبانوں سنسکرت،فارسی اور عربی میں موجود تھا۔'' ۶۲

مستشرقین نے اسی کلاسیکل سرمائے کی بازیافت اور تفہیم کے ذریعے استعماری حکمت عملی کے لئے راہ ہموار کی ،ولیم جونز ایک ماہرِ لسانیات اور محقق کی حیثیت سے قابلِ قدر مگر اس کی تحقیقات کا مقصد برطانوی ایمپائر کے اثر ورسوخ کو ہندوستان میں طویل عرصے کے لیے اور گہرائی تک قائم کرنا تھا۔ڈاکٹر صاحب اس حوالے سے نوآبادکار کی حکمت عملی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''انگریزوں کی آمد سے پہلے یہی کثیر اللسانی ہندوستانی معاشرے میں لسانی درجہ بندی موجود تھی اور اس کی بنیاد سماجی طبقاتی تفریق بھی وجود میں آ گئی تھی ۔انگریزون نے اس تفریق کا علم حاصل کیا اور سیاسی ضرورت کے تحت اسے بڑھایا۔'' ۶۶

مصنف نے یہاں انگریزی پسند طبقات اور متشرقین میں لسانی طاقت کے استعمال کے حوالے سے ان کے طریق کار میں فرق جب کہ مقصد میں وحدت دریافت کی ہے۔وہ کہتے ہیں کہ انگریزی پسند طبقہ ہندوستان کے زوال کا تعلق ماضی اور حال دونوں سے جوڑتے ہوئے انگریزی زبان اور علم کو اس زوال سے نکلنے کا ذریعہ بتاتا تھا۔درپردہ مقصد انگریزی کے رواج سے نوآبادکار کی تہذیب کی برتری کا تصوّر راسخ کرنا تھا۔جب کہ متشرقین ولیم جونز صرف معاصر ہندوستان کو زوال پذیر کہتے تھے۔اور ان کے

خیال میں صرف کلاسیکی ہندوستان کی بازیافت ہی اس انحطاطی صورت حال سے نجات دلا سکتی ہے۔ ناصر عباس کے خیال کے مطابق محولہ بالا فرق کے باوجود دونوں کا مقصد ہندوستان کے علم کو نوآبادیاتی طاقت میں بدلنا تھا:

> ''ولیم جونز نے ایشیاٹک سوسائٹی کے پلیٹ فارم سے ماضی بعید کے ہندوستان کے آدمی اور فطرت کے پیدہ کردہ اور ان کے متعلق اس علم کی تحقیق کو مطمع نظر بنایا جو یورپی مفہوم میں تاریخ، سائنس اور آرٹ میں منقسم تھا۔۔۔ وہ سوسائٹی کے ذریعے ماضی بعید کے ہندوستان سے متعلق علم کی امپائر تشکیل دینے کا وہی عزم رکھتا تھا جو برطانوی اور فرانسیسی آبادکاروں کے دل میں تھا۔'' ۶۷

ولیم جونز کے کلاسیکی ہندوستان کے علم کے حصول کے پیچھے افادیت پسندی کا تصور موجود تھا یعنی ایسا علم جس کو حاصل کر کے مادی مسرت ملے اور تکالیف سے بچا جا سکے۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے ہندوستان میں نوآبادیاتی صورت حال کی تشکیل میں دو مستشرقین کے کردار کا جائزہ لیا ہے ان کے خیال میں ان دونوں مستشرقین کو نوآبادیاتی اداروں کی طاقت حاصل تھی۔ اور دونوں کا مقصد زبان کی ثقافتی طاقت دریافت اور اسے نوآبادکار کی استعماری طاقت کی صورت عطا کرنا تھا۔ ولیم جونز اور گلکرسٹ دونوں کا دائرہ تحقیق الگ مگر مقصد ایک ہی تھا۔ گلکرسٹ کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ اس نے ہندوستانی زبانوں کے علم کو تحقیق و تجزیے اور تعبیر کے مواد کے طور پر استعمال کیا مگر تجزیہ کرتے ہوئے واضح جانبداری اور تعصب کا مظاہرہ بھی کیا۔ ہندوستانی زبانوں کے ان امکانات کو وجود عطا کیا جو استعماری مقاصد کی تکمیل کرتے تھے۔ پریم ساگر اور باغ و بہار میں جدید ہندی تشکیل کے دوران لسانی آویزش کو اجاگر کیا۔ ہم آہنگی کے امکانات کو بدنیتی کے تحت دبا ڈالا۔ گلکرسٹ نے ہندوستانی کے ذریعے طاقت کا کلامیہ تشکیل دیا اور بعض تاریخی حقائق وضع کئے (۶۸)۔ ان وضع کردہ حقائق میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہندوی کی موجودگی اور اس ہندوی پر عربی اور فارسی کی یورش جیسے کلامیے شامل ہیں۔ مصنف ان حقائق کو اس لئے وضع کردہ حقائق کہتے ہیں کیونکہ ان کے متعلق کسی تاریخی واقعے کا باضابطہ حوالہ نہیں ملتا۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے ہندوستان میں نوآبادیات کے قیام میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی، فورٹ ولیم کالج اور انجمن پنجاب جیسے اداروں کے کردار کو اجاگر کیا ہے۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں ہندوستان کی کلاسیکل

زبانوں کے متون اور فورٹ ولیم کالج میں ہندوستان کی لنگوا فرنکا کے علم کے ذریعے استعماری مقاصد کی تکمیل میں مدد لی گئی۔نوآبادکاروں نے علم کو طاقت اور اقتدار کے لئے کیسے استعمال کیا اس حوالے سے ڈاکٹر صاحب نے نوآبادیاتی حکمت عملی میں یورپ کے کبیری بیانیے کا کردار دریافت کیا ہے۔انھوں نے برصغیر کی صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے بہت سے ایسے پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے جن پر ابھی تک پرانے اور روایتی طرزِ فکر کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ان مبہم الفاظ اور مدہم نقوش کو وجود عطا کیا جن کی مدد سے تاریخ کے سٹیج پر کھیلا جانے نوآبادیاتی ڈرامہ کامیاب رہا۔انھوں نے برصغیر کی تاریخ وثقافت میں راہ پانے والے ان شگافوں اور رخنوں کی گہرائیوں کو ناپنے کی کوشش کی ہے جن کے تشکیل کار بھی یورپی تھے اور ان کو اپنی پسند کے مواد سے بھرنے والے بھی وہی کردار تھے۔ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے برصغیر میں بیانیے کی طاقت کا تجزیہ کرتے ہوئے بہت سے چشم کشا حقائق کا پتہ لگایا ہے۔انھوں نے لارڈ میکالے اور چالس ٹریویلین کی پالیسیوں کے تحریری متون سے وہ کلید حاصل کی جس کے بل پر برطانیہ اپنی حکومت کو ۱۹۴۷ء تک طول دے سکا۔وہ کہتے ہیں کہ یہ بات غیر متشبہ ہے کہ بیانیے کو نوآبادیاتی طرز حکمرانی میں ایک بنیادی ستون کی حیثیت حاصل ہے(۶۹)۔

ان کا ماننا ہے کہ نوآبادیاتی ہندوستان کو انگری تہذیب وثقافت سے مرعوب کرنے کے لئے نوآبادکاروں نے بیانیہ صرف وضع کیا بلکہ اسے طول وعرض میں فروغ بھی دیا۔یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی اپنی تہذیب وثقافت اور زبان کو حقیر سمجھنے لگے اور یورپ کی عقلیت کے تصور پر یقین کرنے لگے۔بیانیے کے فروغ کے سلسلے میں مصنف نے نوآبادکار کی ایک مؤثر حکمتِ عملی کی طرف اشارہ کیا ہے کہ نوآبادکار مسلسل حقائق کو کیموفلاژ کرتا ہے۔برصغیر میں داخلے کے وقت سے یہ عمل شروع ہو گیا تھا جب انھوں نے اپنے تجارتی مقاصد کو ڈھال بنا کر غلبے کے پوشیدہ عزائم کو کیموفلاژ کیا۔نوآبادیاتی دور کے خاتمے تک وہ اس حکمت عملی پر کاربند رہے۔چالس ٹریویلین، طامس رو، مسٹرہ ہمفرے کے تحریری متون کے حوالے سے مصنف نے نوآبادیاتی صورت حال کی تشکیل میں آبادکاروں کے مکروفریب سے پردہ اٹھاتے ہوئے برصغیر کی تاریخ اور تاریخی حقائق کو مختلف زاویہ نظر عطا کرنے کوشش کی ہے۔

''ڈبلیو کروک جب لگی لپٹی رکھے بغیر یہ کہتے ہیں کہ انھوں نے شمالی ہندوستان کے

دیسی نیٹوز کے عقائد اور توہّمات کو برطانوی انتظامی افسروں ہی کے لئے جمع کیا ہے
تا کہ وہ ہندوستانیوں کی پُر اسرار داخلی زندگی کا علم حاصل کرسکیں تو وہ اس علم کو
کولونائزڈ کی طاقت بنانے کا اعلان کرتا ہے۔'' ۷۰

علم کو کولونائزڈ کی طاقت بنانے کے لئے انہوں نے اپنے مفادات کو سہارا دیتا ہوا بیانیہ تشکیل دیا، ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے برِّصغیر میں بیانیے کی تشکیل کے سلسلے میں نوآبادکار کی ایک اور حکمت عملی کا بھی انکشاف کیا ہے۔ کہ مقامی باشندوں کے حوالے سے متشرقین یا برطانوی انتظامی افسران نے جو معلومات حاصل کیں اور مقامی ثقافت، رسم و رواج، تعصّبات و توہمات کا علم حاصل کیا اسے مسخ کر کے ثقافتی غلبے کے حصول کے لئے استعمال کیا۔ پھر ان مسخ شدہ معلومات پر نہ صرف نوآبادکار بلکہ محکوم باشندوں کو بھی یقین ہوتا ہے۔ یہی مسخ شدہ معلومات یورپی تہذیب کی برتری کے بیانیے کی تشکیل میں اینٹ گارا مہیا کرتی ہیں۔ ڈاکٹر ناصر عباس کے خیال کے مطابق چارلس ٹریویلین نے نوآبادیات کے سیاسی مدبّر کے طور پر نوآبادیاتی غلبے کو طول دینے کے لیے ہندوستان کی اصلاح کی تجویز پیش کی۔ جس کی بنیاد یورپی تہذیب کی آفاقیت اور برتری کے بیانیے پر رکھی وہ کہتے ہیں کہ اس بیانیے نے طلسماتی اثر پیدا کیا اور برصغیر میں آزادی کی تحریکیں زیادہ تر اسی راستے پر چلیں جس کا خاکہ چارلس ٹریویلین کے یہاں ملتا ہے ہے(۷۱)۔

ڈاکٹر ناصر عباس بیانیہ وضع کرنے کے حوالے سے کہتے ہیں:

''چناچہ برِّصغیر میں یورپی ثقافت کے تہذیب آموز ہونے کا بیانیہ لکھنے والے دراصل
بری کولئیر تھے انھیں اس بیانیہ سے طرح طرح کے بے شمار کام لینے کے لیے جو کچھ
یہاں وہاں (مشرق و مغرب) سے دستیاب ہوا یا جسے موزوں سمجھا اسے کہانی میں
کھپا دیا۔ انھیں کہانی یا پلاٹ کے گٹھے یا ڈھیلے ہونے، واقعات میں تضاد ہونے منتخب
مواد کے مستند اور غیر مستند ہونے سے غرض نہیں تھی۔'' ۷۲

ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے لاڈ میکالے کے خیالات کے حالے سے بیانیے کی تشکیل میں نوآبادکار کی ایک اور حکمتِ عملی کا ذکر کیا ہے کہ نوآبادکار نے مشرق و مغرب کا تقابل کر کے ان میں تضاد دریافت کیا

۔اس تضاد میں برتری اور کمتری کا تناسب رکھا گیا۔تاریخ میں سے منتخب واقعات سیاق وسباق میں جوڑ کر اپنی مرضی کی کہانی وضع کی جس نے نوآبادیاتی صورت حال کی تشکیل اوراس کے استحکام میں مدد دی۔

''یورپ بہ طور کبیری بیانیے میں یورپ اور مشرق (ایشیا) ہندوستان کی تفریق بنیادی تھی ۔حقیقت یہ ہے کہ اس بیانیے کی شعریات کی تشکیل میں اس تفریق نے مرکزی کردار ادا کیا۔۔۔یورپ سے متعلق ہر بات، ہر چیز، ہر واقعہ شخص، خیال، مستند طاقت کا حامل، تہذیب آموز، روشن خیال، نا قابلِ قدر و تحسین تھا اور مشرق رہندوستان سے وابستہ ہر بات، ہر چیز ان کے برعکس خصوصیات رکھتی تھی۔'' ۴۷

نوآبادیاتی نظام کے قیام کے سلسلے میں نوآبادکار کا تصورِ علم ہو یا یورپ کی تہذیبی و علمی برتری کا بیانیہ ہر دور کی تخلیق اور اطلاق میں ڈاکٹر ناصر عباس نے ہندوستانی تناظر میں زبان کے کردار کو مرکزی حیثیت دی ہے۔ پہلے نوآبادکاروں کا ابلاغی ضروریات کی تکمیل کے لئے مقامی زبانوں کا علم حاصل کرنا پھر اس علم کی بنیاد پر ہندوستانی زبانوں کو پسماندہ اور روانی اور ایجاز سے تہی قرار دینا دراصل اس استعماری منصوبے کا حصہ تھا جس کے تحت وہ انگریزی کا تسلط قائم کرنا چاہتے تھے۔ ہندوستان میں دوغلی شناختوں کے پیچھے بھی انگریزی زبان کی استعماریت کارفرما تھی اس حوالے سے ڈاکٹر صاحب نے لارڈ میکالے کے اس منصوبے کا حوالہ دیا ہے جس کے تحت وہ ہندوستانیوں کی ایسی جماعت تیار کرنا چاہتا تھا جو رنگ اور نسل کے اعتبار سے ہندوستانی اور باقی انگریز ہو۔یوں انگریزی زبان کے ذریعے ہی ہندوستانیوں کی یورپی طرز پر اصلاح کا نوآبادیاتی منصوبہ بروئے کار لایا گیا۔ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ مستشرقین اور برطانوی انتظامی عہدے داروں نے ہندوستان کے کلاسیکل سرمائے سے آگاہی کے ذریعے براہ راست یہاں کے لوگوں کے بارے میں جاننے کے لئے مقامی زبانوں کو سیکھنے کی کوشش کی، ہماری زبان اور ادب کو ترقی سے روشناس کرایا۔ ہمیں زبان کا سائنسی علم عطا کیا۔یہ وہ خیالات ہیں جو عرصۂ دراز تک علمی و ادبی حلقوں میں اور عوام الناس میں بھی موجود رہے بلکہ لحظہ موجود تک بعض حلقوں میں گلکرسٹ کی خدمات کا صرف ایک ہی رُخ دیکھنے کو ترجیح دی جاتی رہی ہے مگر اردو میں ان کے مسلّمات کو مابعد نوآبادیاتی فکر کے تحت چیلنج کیا گیا ۔ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے مستشرقین کی ان علمی اور ادبی خدمات کے پیچھے موجود محرکات کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے اور متون کی تہہ میں موجود غیر تحریری متن کو پڑھنے کی سعی کی ہے۔انہوں نے اس ضمن میں

برنارڈ ایس کوہن، ایڈورڈ ڈیٹری، جان گلکرسٹ اور گریرسن کے حوالوں سے نوآبادیاتی مقاصد کا جائزہ لیا ہے وہ کہتے ہیں کہ برطانوی استعمار نے برِصغیر میں زبان کو ثقافتی تصور کے طور پر دیکھا گویا زبان کا علم حاصل کرنا ان کے نزدیک ثقافت کا علم حاصل کرنا تھا۔نوآبادکاروں نے زبان کو یورپی معیاروں سے جانچا اور اسے غیر ترقی یافتہ قرار دیا۔زبان کی اقداری حیثیت سے انکار کیا۔ان کے لئے زبانیں محض معلومات ہیں، جن کو وہ اپنے مقاصد کے لئے کسی بھی طرح استعمال کر سکتے تھے۔ڈاکٹر صاحب کے مطابق نوآبادکار نے زبان کی استعماری قوت کو بروئے کار لانے کے لئے ہندوستان میں انگریزی زبان کی تعلیم کا آغاز کیا۔

انیسویں صدی کے اواخر میں قائم ہونے والی انجمن برائے اشاعت مطالب مفیدہ کو مستقبل میں اردو زبان و ادب کی جہتیں متعین کرنے میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ان جہتوں کے تعین میں کون سے تصورات اور نظریات کارفرما تھے؟ ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے ان کا تجزیہ کرتے ہوئے انجمن کو ''اسٹیٹ اپریٹس'' کہا ہیا ور نوآبادیاتی مقاصد کا آلہ کار قرار دیا ہے۔بظاہر انجمن کا قیام مشرقی علوم کی ترقی اور مغربی علوم سے آشنائی کے ساتھ ساتھ صنعت و تجارت کے فروغ اور ادبی، سماجی اور معاشی موضوعات پر مباحث کی تحریک تھا مگر ڈاکٹر نو صر عباس کہتے ہیں کہ انجمن درحقیقت نوآبادیاتی حکومت کا ایک ادارہ تھا اور اس کا تنظیمی ڈھانچہ، اس کے ممبران کی سرکاری ملازمت سے وابستگی اس کے مقاصد کی قلعی کھول دیتے ہیں ۔ڈاکٹر صاحب نے انجمن کے مقاصد میں موجود تضادات کا ذکر کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ ان سب کے پیچھے ایک ہی آئیڈیالوجی کارفرما تھی جس کی وجہ سے تضادات کی موجودگی میں بھی مقصد میں وحدت پیدا ہو جاتی ہے۔انجمن کا ایک اہم کارنامہ جدید شاعری کا فروغ سمجھا جاتا ہے۔ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ جدید شاعری کی تخلیق اور فروغ میں مغربی شعریات کے تصورِ نقل کا کردار تھا۔جس نے استعارے کی آزادی کو رد کرتے ہوئے شاعر کے تخیل پر قدغن لگا دی، استعارے کی لگامیں ریاستی آئیڈیالوجی کے ہاتھ میں تھما دیں۔ناصر عباس نے کرنل ہالرائیڈ کے بیانات، مولانا محمد حسین کے لیکچرز اور مالانا حالی کے مقدمے میں موجود مماثلتوں کی نشاندہی کرتے ہوئے انجمن کے نوآبادیاتی مقاصد کا انکشاف کیا ہے اور یہ مقاصد انجمن کے یورپی عہدے داروں نے اپنے مقامی معاونین آزاد اور حالی کی مدد سے حاصل کئے ۔ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے نوآبادیاتی صورت حال کو استحکام بخشی ہوئی، استعماری مقاصد کی تکمیل میں

معاونت کرتی ہوئی اس نوآبادیاتی فکر کا تجزیہ کیا ہے جو انیسویں صدی کے اواخر میں اردو ادب میں فروغ پارہی تھی۔نوآبادیاتی فکر کو فروغ دینے والے ادیبوں کی یہ جماعت ان معاونین پر مشتمل تھی جس کی تیاری کے اشارے لارڈ میکالے کے بیانات میں ملتے ہیں۔ڈاکٹر صاحب قومی شاعری کے حوالے سے مولانا الطاف حسین حالی کو نوآبادیاتی حکومت اور ان کے ادبی نظریات کا مدح قرار دیتے ہیں۔جب وہ یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ آخر کیا وجہ ہے کہ قومی ادب کا تصور انیسویں صدی کے اواخر میں ہی سامنے آیا (۷۴)۔تو سب سے پہلے ذہن انیسویں صدی کے شروعات کے کچھ اقدامات کی جھلک دکھانے لگتا ہے۔نوآبادیاتی حکمرانوں کی طرف سے ورنیکلرز کی تعلیم کے حصول کے لیے ادارے قائم کرنا ،فنڈز مختص کرنا اور مقامی لوگوں کو اس حوالے سے ترغیب دینا خالی از مصلحت ہرگز نہ تھا۔جیسا کہ مابعد نوآبادیاتی تنقید یقین رکھتی ہے کہ نوآبادکار کی اپنی نوآبادیوں کے حوالے سے کوئی بھی پالیسی ایسی نہیں ہوتی جس سے ان کے معاشی اور سیاسی اقتدار کو فائدہ نہ پہنچے۔پھر انجمن پنجاب کا قیام اور اس کے پلیٹ فارم سے اردو کی پُرانی شاعری کو لغو کہہ کر رد کرنا اور انگریزی صندوقوں سے نئے چمک دار زیوروں کا حصول جیسے اقدامات مصنف کت سوال کے پس منظر میں موجود رہتے ہیں۔ڈاکٹر صاحب نے ایف۔جے گولڈاسمڈ کے مضمون ''مشرق میں قومی ادب کے تحفظ پر چند خیالات'' اور شیخ عبدالقادر کے مضمون ''اردو لٹریچر'' کے حوالوں سے اس سوال کا جواب تلاش کرتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ قومی ادب کا تاریخ کے اس موڑ پر پیدا ہونا وقت کی نہیں نوآبادیاتی نظام کی ضرورت تھی۔وہ کہتے ہیں کہ کثیر قومی معاشروں میں نوآبادکار کی حکمت عملی مقامی آبادی کو مختلف گرہوں میں تقسیم کرنا تھی اور یہی حکمت عملی انہوں نے ہندوستان میں ہندو اور مسلمان کے معاملے میں اختیار کی۔اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے انہوں نے نہ صرف سیاسی طاقت استعمال کی ،اسٹیٹ اپریٹس قائم کئے بلکہ حالی اور آزاد جیسے مقامی معاونین بھی تلاش کئے جن کی بات ہندوستانیوں کے لیے معتبر ٹھرتی تھی۔مصنف مزید وضاحت کرتے ہیں کہ ورنیکلرز کی تعلیم اور ورنیکلرز میں قومی ادب کی تخلیق کی تحریک دراصل مقامی لوگوں میں نئی حسیت کو جنم دینے اور ان کے خیالات اور باطنی کیفیات تک رسائی کے لیے برپا کی گئی تھی۔ناصر عباس کا خیال ہے کہ قوم کا تعلق عام انسانی تخیل سے ہے جو ایک منفعل اور باہر کے وقوعات سے اپنی صورت اور نہج حاصل کرنے والی صلاحیت ہے (۷۵) اور جو صلاحیت باہر

سے متاثر ہوکر اپنی سمت متعین کرے وہ آسانی سے سامراجی اور استعماری عزائم کا آلہ کار بھی بن جاتی ہے ۔مصنف کہتے ہیں کہ انیسویں صدی میں قوم کا جو تصوّر ابھرا وہ بھی ایک تشکیل تھا اور خارجی حالات سے متاثر تھا۔انھوں نے حالی کی نظموں میں تصورِقوم کی ارتقائی صورت دریافت کی ہے۔ان کا کہنا ہے کہ حالی کی قومی شاعری میں قوم پسندی کا تصوّر زمین سے ترقی کرتا ہوا مذہبی شناخت تک پہنچتا ہے۔ جو ایک محدود شناخت پر اصرار ہے ۔مختلف عوامل اور حقائق کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ حالی کی قومی شاعری قوم سے متعلق مغربی تشکیلات سے انحراف نہیں کرتی (۷۶)اور یہ استعمار کے مقابل آتی ہے نہ اس میں مزاحمت کی گنجائش نکلتی ہے بلکہ یہ استعمار کی مزاحمت ک بجائے اس سے مرعوبیت اور اس کی مدحت کا بیانیہ بن جاتی ہے۔

ڈاکٹر ناصر عباس نیر جب محمد حسین آزاد کی لسانی خدمات کا نوآبادیاتی تناظر میں جائزہ لیتے ہیں تو ان کے سامنے انیسویں صدی کا وہ منظر نامہ موجود ہے جہاں تقابلی اور لسانیات کی یورپی روایت تشکیل پا چکی ہے ۔علوم شرقیہ کی تحصیل کا شعبہ جامعات میں قائم ہو چکا ہے ۔ بہارعجم ،مثمر اور دریائے لطافت کی روایت جو زبان کے لغاتی پہلوؤں سے معاملہ کرتی ہے وہ یورپ اور یورپی تہذیب کے کبیری بیانیے کی نذر ہو چکی ہے اس کے بجائے ولیم جونز اور میکس مولر کے نظریات نوآبادیاتی سیاق میں اپنا اثر دکھا رہے ہیں۔ڈاکٹر ناصر عباس منظر نامے کو سامنے رکھتے ہوئے آزاد کے لسانی تصورات کا جائزہ لیتے ہیں ۔ان کے یورپی روایت سے استفادے کے حوالے سے لکھتے ہیں آزاد نے دہلی کالج سے استفادے کی وہ صورت سیکھی ہے جسے ہومی بھابھا کی اصلاح میں نقل کہنا چاہیے(۷۷)۔

### دوجذبیت

سادہ لفظوں میں دوجذبوں کا ایک وقت پایا جانا ،دوجذبیت ہے۔نوآبادیاتی ادیب دوجذبیت کے شکار تھے۔ وہ نوآبادکار کی تہذیب وثقافت کی کبھی مفاہمت اور کبھی مخالفت کرتے نظر آتے ہیں۔ان کی تحریروں میں دوجذبیت پائی جاتی ہے۔

آزاد اس دور میں سے گزرے جس میں نوآبادیاتی غلبے کی تکمیل ہوئی نہ صرف اس عمل کو دیکھا بلکہ اس کو اپنی اور اپنے خاندان کی زندگی پر ایک عذاب کی صورت بھگتا۔اردو شاعری کو نظم جدید کا تحفہ دیا۔آب

حیات کی صورت میں تذکرے اور ادبی تاریخ نویسی کے مابین ایک پُل تیار کیا۔تنقید کے معیارات کو بہتر کیا ۔یہ محمد حسین آزاد کی وہ تصویر ہے جسے روایتی تاریخ نویسی اور روایتی زاویہ نظر آج تک دیکھتا اور دکھاتا آیا ہے۔اگرچہ ان کی ان حیثیتوں سے انکار نہیں مگر ذوق کے ان شاگرد کی پیچیدہ زندگی اور گھمبیر سیاسی اور سماجی حالات ان کے نظریات اور ادبی خدمات کو دیکھنے کے لیے نئے روزن کا تقاضا کرتے ہیں ۔یہ نیا روزن مابعد نوآبادیاتی مطالعے کے ذریعے ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے فراہم کیا ہے۔انہوں نے سخن دان فارس اور آبِ حیات کے دیباچے میں محمد حسین آزاد کے لسانی نظریات کو تخلیق کی کسوٹی پر رکھا اور یہ جانچنے کی کوشش کی کہ جس ثقافتی مظہر (زبان) کی جانکاری کے ذریعے انگریز نے ہندوستان کے متعلق اپنا علم تخلیق کیا پھر اس علم کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہوئے اس خطّے میں اپنے غلبے کو طول دیا وہی زبان جب کسی نوآبادیاتی باشندے کے تصرّف میں آتی ہے تو کس طرح استعمار کی مدد کرتی ہے۔ناصر عباس نیر نے آزاد کے لسانی نظریات کو یورپی روایت وخیالات کی مضحک نقل قرار دیتے ہوئے ان کے تشکیلی محرکات کا جائزہ لیا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ ایک آزاد کے لسانی تصورات ان درسی اور تعلیمی ضروریات کے تحت وضع اور ظاہر ہوئے جن کا تعین سر رشتہ تعلیم پنجاب نے کیا تھا،دوسرے ایشیائی زبانوں میں تحقیقات فلالوجی کا ابھی تک رواج ہوا تھا (۷۸)۔لہذا آزاد کے سامنے تقابلی لسانیات کی کوئی مشرقی روایت موجود نہیں تھی ۔ناصر عباس کہتے ہیں کہ آزاد نے انیسویں صدی کی متشرقین کی لسانی تحقیق سے استفادہ ضرور کیا مگر وہ اس کی تخلیق میں شریک نہ تھے۔وہ آزاد کے لسانی نظریات کی وجہ ان کی دو جذبیت کو قرار دیتے ہیں ۔جس کے تحت آزاد کے ہاں یورپی لسانی نظریات کے حوالے سے طلب و تردید کے جذبات بیک وقت پیدا ہو رہے تھے۔ڈاکٹر صاحب نے ان نتائج کا استخراج انیسویں صدی کے حالات متشرقین کے خطبوں اور آزاد کی تحریروں کے مطالعے سے کیا۔ڈاکٹر عباس نیر نے ڈپٹی نذیر احمد کی ادبی کاوشوں کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کے ہاں نوآبادیاتی دور کی ایک اہم خصوصیت ثنویت کی نشاندہی کی ہے ۔جو نذیر احمد کے ناولوں میں ہیئت اور مواد کی دوئی کی صورت میں موجود ہے۔انہوں نے توبتہ النصوح کے حوالے سے نہ صرف نوآبادیاتی مقاصد کی تکمیل میں معاونت کی نشاندہی کی ہے بلکہ متن کی آزادی کی علامتیں بھی نشان زد کی ہیں اس کے ساتھ انہوں نے اردو کے نقادوں کی تشکیل کردہ اس متھ کو بھی چیلنج کیا

ہے کہ اردو ناول کی صنف مغرب سے اردو مین آئی ہے بلکہ وہ کہتے ہیں کہ ناول کی صنف نوآبادیاتی مقاصد کی تکمیل کے لئے اردو میں حکمرانوں کی منشا کے مطابق تشکیل دی گئی اس حقیقت کا انکشاف انہوں نے کیمپسن اور ولیم میور کے خیالات و بیانات کے تجزیاتی مطالعے سے کیا۔ان کا کہنا ہے کہ نذیر احمد کے ناول انگریزوں کی اس پالیسی کا حصّہ تھے جو فلٹر تھیوری کے ذریعے ہندوستان میں رائج کی جا رہی تھی۔یعنی یورپی معیاروں کے مطابق نوآبادیاتی باشندوں کی اصلاح اسی اصلاحی منصوبے کا حصّہ تھا۔ڈاکٹر ناصر عباس نیر توجہ دلاتے ہیں کہ ناول کی صنف مشرقی کلاسیکل نثر بہارِ دانش جیسی نصابی کتابیں کو فحش قرار دے کر اس کی جگہ رائج کی گئی تھی۔ان کے مطابق یہ دراصل استعارے کی آزادی کے مقابل محدود اور واحد معنی کی غلامی کو رائج کرنا تھا۔ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ نذیر احمد نوآبادیاتی فکر کو پھیلانے میں ان کے معاون ہوئے تو اس کے پیچھے کچھ اس وقت کی علمیاتی فضا،غالب آئیڈیالوجی اور پھر دہلی کالج میں نذیر احمد کی تعلیم ع تربیت جس نے ان کے ہاں مذہب کے سلسلے میں تشکیک کو جنم دیا جیسے عناصر کارفرما رتھے۔ساتھ ہی ڈاکٹر صاحب توجہ دلاتے ہیں کہ یہ تشکیک نذیر احمد کے ہاں استعماری پالیسیوں اور نئی تعلیمی و ثقافتی صورت حال کے حوالے سے پیدا نہ ہوئی۔وہ توبتہ النصوح کو مفید ادب کے بیانیے کے بالکل مطابق اور اخلاقی و اصلاحی رنگ کا حامل قرار دیتے ہیں۔

ڈاکٹر ناصر عباس نیّر نصوح اور کلیم کے کرداروں کو معنی واحد اور معنی اضافی کی کشمکش قرار دیتے ہوئے نصوح کو نوآبادیاتی آئیڈیالوجی کی علامت اور کلیم کو مغل ہندوستان کا پروٹوٹائپ کہتے ہیں۔ان کے مطابق نصوح یورپی مقتدرہ کی متعین کردہ واحد مذہبی شناخت کی تائید کرتا ہے،جب کہ کلیم اس شناخت کے خلاف مزاحمت کا بیانیہ ہے۔وہ ان دو کرداروں کے تجزیے کے ذریعے نذیر احمد کے ہاں دوجذبیت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ ناول ایک تجرید ہے۔اس کی تجسیم کے لئے واقعات کے انتخاب کی آزادی ناول نگار کے پاس ہوتی ہے۔نذیر احمد نے اس آزادی سے کام لیتے ہوئے جہاں اصلاح کے جبر سے قدرے بچنے کی کوشش اور مقامی تشخص کو برقرار رکھنے کی کچھ صورتیں پیدا کیں وہیں مستعار استعماری منصوبے کو کہیں کہیں الٹ پلٹ دیا(۷۹)۔

اس تمام تجزیے کے دوران سب سے اہم یہ کہ ڈاکٹر صاحب نے مشرق کی کلاسیکل تہذیب میں

جدیدت کے نشانات دکھائے ۔ڈاکٹر ناصر عباس نیر دو جذبیت کی تین اقسام ،۱)مرتکز، ۲)منتشر،۳)متذبذب، کا ذکر کرتے ہوئے آخری دو کو دوہرے شعور کا نام دیتے ہیں۔ان کا تجزیے کے مطابق دوہرا شعور نوآبادیاتی باشندوں کا نصیب ہے۔سرسید احمد خان نوآبادیاتی دور کی اہم شخصیت ہیں جنہوں نے اردو زبان وادب پر دوررس اثرات مرتب کئے۔ڈاکٹر صاحب نے سرسید احمد خان کے ہاں موجود جدیدیت کے محرکات کا جائزہ لیا ہے۔جاننے کی کوشش کی ہے کہ انہوں نے دوہرے شعور کی کشمکش سے سے آزادی حاصل کرنے کے لئے کیا راستہ اختیار کیا۔سرسید مقامی ذہن کی حقیقی آزادی اور انگریز کی رضا جوئی دونوں چاہتے تھے۔

> ''مگر سرسید کی عملیت پسندی نے جلد ہی اس تذبذب پر قابو پالیا۔انہوں نے مصالحت کا راستہ اختیار کیا۔مصالحت مکمل ناکامی نہیں محدود کامیابی تھی۔۔۔حق تو یہ ہے کہ انہوں نے جدید تخیل کو نئی باتوں کے خوف سے آزاد کرایا۔''۸۰

ڈاکٹر ناصر عباس نیّر نے سرسید کی جس محدود کامیابی کا ذکر کیا ہے دراصل یہی محدود کامیابی،مکمل کامیابی کی عدم موجودگی میں ایسے خلا کو جنم دیتی ہے جس میں استعماری فکر اور نوآبادیاتی آئیڈیالوجی کو جگہ ملتی ہے۔تاہم ناصر عباس نیر نے ۱۸۸۴ء میں مسٹر بلنٹ کے لیے منعقدہ عشائیے میں کی گئی سرسید کی تقریر میں موجود 'ہم مسلمان'، اور 'انگلش نیشن' جیسے جداگانہ شناختوں پر مبنی الفاظ کی تہہ میں کارفرما سرسید احمد خان کی نوآبادیاتی آئیڈیالوجی سے انحراف کرتی ہوئی سوچ اور فکر کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ:

> ''واحد مذہبی شناخت پر اصرار کرتی ہوئی نوآبادیاتی فکر کے مقابل سرسید کے ہاں ہم مسلمان کی شناخت کا یہ تصور سر بسر مذہبی نہیں ثقافتی تھا۔مذہب اس کا ایک اہم حصّہ تھا مگر واحد اور مطلق بنیاد نہیں تھا۔''۸۱

ڈاکٹر ناصر عباس نیّر صاحب سرسید کی فکر میں دنیوی اور مذہبی زندگی، مادی کمالات اور دینی عقائد کا الگ الگ تصوّر دیکھتے ہیں۔دین اور دنیا کی یہ دوئی دوہرے شعور کی ایک صورت ہونے کے ساتھ ساتھ سرسید کی جدیدیت بھی ہے۔ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ اس تضاد کو حل کرنے کے لئے سرسید نے اخلاقی اور علمی جہت اختیار کی۔علمی جہت یہ ہے کہ خدا کے کام اور خدا کے کلام میں کوئی فرق نہیں۔سرسید

کے مذہبی معاملات میں اجتہاد کی بنیاد بھی یہی تصور تھا اور سرسید پر کفر کے فتوے کی وجہ سے بھی ڈاکٹر صاحب اسی تصور کو قرار دیتے ہیں۔مزید آگے بڑھتے ہوئے ڈاکٹر ناصر عباس نیر سرسید کی فکر میں فطری اور سماجی دنیا میں امتیاز کی نشاندہی کرتے ہیں۔ڈاکٹر ناصر عباس  نے اگر ایک طرف سرسید کے ہاں نو آبادیاتی دور کی واحد مرکزی شناخت کے خلاف مزاحمت دیکھی ہے تو دوسری طرف مذہبی اور ثقافتی سطح پر دوہرے شعور میں توازن قائم کرنے کی کوششوں کے دوران استعماری منصوبے کی تکمیل میں معاونت بھی دیکھی ہے ۔اس کا اظہار ان کے انگریزی زبان کو قومی اتحاد و ترقی کا ذریعہ سمجھنے میں ہوتا ہے۔ڈاکٹر صاحب نے سر سید کی جدیدیت کو پرومیتھیس کی اسطور کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کی ہے کہ سرسید نے پرومیتھیس کی طرح دیوتاؤں سے آگ تو چرالی مگر وہ اسے قوم کی فلاح کے لئے استعمال کرنے کی بجائے دیوتاؤں کی مرضی سے استعمال کرنے لگے۔

ناصر عباس نیّر نے اکبر الہٰ آبادی کی طنزیہ اور ظریفانہ شاعری کے تجزیے سے ان کی نو آبادیاتی فکر کی مختلف تہیں سطح پر لانے کی کوشش کی ہے۔وہ اکبر کو بھی دوہرے شعور کا حامل قرار دیتے ہیں کہ ایک طرف اکبر الہ آبادی  سرکاری ملازم ہونے کی حیثیت سے ملکہ وکٹوریہ کی شان جب قصیدہ لکھتے ہیں تو انگریزی تہذیب کی مدح سرائی کرتے ہیں جب کہ دوسری طرف اودھ پنچ کے پلیٹ فارم سے سرسید احمد خان اور ان کے رفقا کی جدیدیت کے ساتھ ساتھ جدید تہذیب کو بھی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ڈاکٹر ناصر عباس نیر کہتے ہیں کہ اکبر ثقافت کے خودمختار تصور کے قائل تھے اور اسی تصور پر ان کی ردِّ استعماریت مبنی ہے۔وہ اکبر الہٰ آبادی  کے ہاں استعماریت کی خارجی اور داخلی دونوں صورتوں سے آگاہی کا مشاہدہ کرتے ہیں۔وہ سرسید اور اکبر دونوں کو جدید قرار دیتے ہیں مگر سرسید مستقبل بیں ہیں جب کہ اکبر الہٰ آبادی  ماضی پرست اور پرانی فکر کا احیا چاہتے ہیں۔اکبر  الہٰ  آبادی  کے پاس یہی یورپی ثقافت سے بچنے کا حل تھا۔ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ اکبر اس بات کا شعور رکھتے تھے کہ موجودہ حالات میں تاریخ کے دھارے کا رخ موڑا نہیں جا سکتا مگر وہ اس جبر میں اپنی گزشتہ عظمت پر تفاخر کی آزادی کو کھونا نہیں چاہتے تھے۔اکبر الہ آبادی کے دوہرے شعور کے حوالے سے ان کا تجزیہ ہے کہ اکبر الہ آبادی

نے اپنے خطوط کے علاوہ ملکہ وکٹوریہ کے قصیدے میں بھی انگریزی نظام کے حاصلات کی تعریف کی تو اس کے پیچھے کوئی جبر نہیں تھا بلکہ اکبر کا دوہرا شعور تھا کہ ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے اکبرالہٰ آبادی کے اشعار کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کے تعلیمی نظریات تک رسائی حاصل کی ہے۔ان کے خیال میں اکبر الہٰ آبادی عام انگریزی تعلیم کے مخالف تھے مگر فنی تعلیم کے حق میں تھے۔ یہاں مصنف پھر تضاد کی نشان دہی کرتے ہیں کہ اکبرالہٰ آبادی جس فلسفہ اور سائنس کی تعلیم کے مخالف تھے اسی فلسفے کی پیدا کردہ ٹیکنالوجی کی تعلیم کو جائز سمجھتے تھے۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ اکبر سرسید کی اجتہادی فکر کے ناقد تھے ۔اوراس کو دین اور مذہب کے لیے خطرہ تصور کرتے تھے۔ ناصر صاحب نے اکبرالہ آبادی کے ضمن میں اپنے نظریات کی بنیادا کبرالہٰ آبادی کے اودھ پنچ کے حوالے سے خیالات، اکبر کی پیشہ ورانہ زندگی ،مذہب اور فلسفہ کا تقابل پیش کرتے ہوئے اشعار تعلیمی نظریات پر مبنی شاعری اور ملکہ وکٹوریہ کے قصیدے نیز مشرقی تہذیب وثقافت کے نوحے پر مبنی اشعار کے تجزیے کو بنایا ہے اور آخری تجزیے میں نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اکبرالہٰ آبادی کی فکر یورپی تہذیب کے برتر بیانیے کو رد کرتے ہوئے ماضی کے احیا میں اپنی تجارت کا راستہ تلاش کرتی ہے اور یہ دراصل نوآبادکار کی ہی مسلّط کردہ دوصورتوں میں سے ایک کا انتخاب ہے۔

ڈاکٹر ناصر عباس نیّر نے سرسید، آزاد، شبلی، حالی اور نذیر احمد سب کو یورپ کے حوالے سے کم یا زیادہ دوجذبی رجحان کا حامل بتایا ہے وہ یورپ کی آرزو بھی کرتے ہیں، یورپ کی نقل کی سعی بھی کرتے ہیں اور یورپ کی آرزو اور نقل کرنے والوں پر تنقید بھی کرتے ہیں (۸۲)۔

ڈاکٹر ناصر عباس نیّر شبلی کی دوجذبیت کے تناظر میں ان کے تنقیدی تصوّرات کا جائزہ لیتے ہوئے بتاتے ہیں کہ شبلی نے جہاں یورپ کی تنقیدی فکر سے استفادہ کیا وہیں گریز وکوشش کے متضاد جذبات کا شکار ہوئے؟ اس سلسلے میں وہ شعرالعجم کے دومختلف مقامات سے اقتباسات کا حوالہ دیتے ہیں جہاں شبلی نے شعر کی ماہیت کے بارے میں جان اسٹوراٹ مل کی ایک ہی رائے کی ایک جگہ تردید اور دوسری جگہ تائید کی ہے۔ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ شبلی کے تنقیدی نظریات میں شروع میں تو یہ معاملہ زیادہ نمایاں ہے مگر آہستہ

آہستہ وہ جدیدیت کے مقابلے میں رجعت پسندی کی جانب بڑھنے لگتے ہیں۔انہوں نے شبلی کے تصور شعر۔۔۔کہ تنہانشینی اور مطالعہ نفس کا نام شاعری ہے اور تخیل اور محاکات شاعری کے بنیادی عناصر ہیں ۔۔۔کی تفہیم سے شبلی کی فکر میں موجود تضادات تک رسائی حاصل کی ہے۔ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ شبلی نے ارسطوئی فکر کے حوالے سے فلسفے اور تخیل میں فاصلہ کم کر کے تخیل اور محاکات کے تضاد کے مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔مگر اس کوشش میں انہوں نے تخیل کی کارفرمائی کو محدود کر کے شاعری کا تعلق حسی تجربات اور مشاہدے سے جوڑا ہے۔مصنف نے شبلی کی تنقیدی فکر میں لفظ و معنی میں سے لفظ کو بنیادی جب کہ معنی کو ثانوی سطح پر دیکھا ہے۔اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ لفظ مستحکم اور معنی سیال ہے اس لیے نوآبادیاتی فکر معنی کے تحرک کی بجائے لفظ کے استحکام کی دلدادہ ہے۔ڈاکٹر صاحب شبلی کے تنقیدی نظریات کا جائزہ لیتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ شبلی دوراز کار تشبیہ اور استعارے کی بجائے قریب الماخذ تشبیہ کو شعر کی خوبی تصور کرتے ہیں۔یہاں بھی نوآبادیاتی آئیڈیالوجی کی کارفرمائی ہے۔وہ شبلی کی متکلمانہ فکر سے مثالیں دے کر شبلی کو معنی کی سیاست اور اہمیت سے آگاہ قرار دیتے ہیں۔یہی آگاہی شبلی کی تنقیدی فکر میں دوجذبیت کو جگہ دیتی ہے۔ناصر عباس شبلی کے تنقیدی تصورات کے جائزے سے رائے قائم کرتے ہیں کہ شبلی کی فکر کا رخ معنی کی بجائے لفظ،تخیل کی بجائے مشاہدے اور حسی تجربات،استعارے کی بجائے تشبیہ،فلسفہ کی بجائے علمِ کلام،باطن کی بجائے خارج کی طرف ہے۔اور شبلی کی ان ترجیحات کا محرک ریاستی آئیڈیالوجی اور نوآبادیاتی دور کی علمیاتی فضا ہے جو تخیل کے پر کترنے اور معنی کی آزادی کو محبوس کرنے کے لئے تشکیل دی جاتی ہے۔یہی حکمتِ عملی نوآبادیاتی دور کو طول بخشتی ہے۔

''مابعد نوآبادیات کے سب طالب علم جانتے ہیں کہ استعمار کاروں نے یہاں کے لوگوں (اور لکھنے والوں) کی ایک اسطوری تصویر بنائی تھی جس کے مطابق وہ سوچنے کی قوّت سے محروم ڈنگر تھے۔استعمار زدہ سماج کے کچھ طبقوں (کچھ لکھنے والوں) نے خود اس اسطوری شبیہہ میں ڈھال لیا تھا لیکن استعمار زدوں میں ہی ایسے لوگ بھی تھے جو اپنے متعلق اسطوری دعووں کو تہہ و بالا کرتے تھے۔نوآبادیات کے ابتدائی عہد میں تہہ و بالا کرنے کا ہمیں خاموش عمل ملتا ہے مگر بعد کے زمانوں میں یہ عمل واضح محسوس ہوتا ہے،ہم نے اس عمل کو ہی متبادل بیانیے کا نام دیا ہے۔'' ۸۳

ناصر عباس نیر تہ و بالا کرنے کے جس عمل کی طرف مذکورہ بالا اقتباس میں اشارہ کرتے ہیں ۔درحقیقت اکیسویں صدی کے آغاز سے ہی وہ خود بھی اس عمل میں شریک رہے۔اس بات سے قطع نظر کہ بیانیے کی علمیاتی تعریف کے مطابق اس عمل سے حاصل ہونے والے نتائج کو سیاسی طاقت ملیا نہیں مگر ثقافتی اداروں میں ان متبادل بیانیوں کو قبولیت حاصل ہوئی نہ صرف قبولیت بلکہ ان کے زیر اثر تاریخ کت روایتی نوآبادیاتی بیانیے سوال اور شکوک کی زد پر آئے ہیں ۔ناصر صاحب نے متبادل بیانیے کی جو خصوصیات بیان کی ہیں ان کے مطابق متبادل بیانیے دھیمے لہجے میں مقتدرہ کی آئیڈیالوجی اوراس کے زیر اثر اداروں پر سوال اٹھاتے ہیں اور وہ آزاد ہوتے ہیں۔بنیادی بیانیے کے متوازی چل رہے ہوتے ہیں ۔قوت اپنی زبان اور ثقافت سے حاصل کرتے ہیں۔

ناصر عباس نیّر نے منٹو کے افسانوں کی مابعد نوآبادیاتی فکر کی روشنی میں تفہیم کی ہے اور منٹو کے افسانوں کو مرکز کے مقابل حاشیے پر موجود ایسا بیانیہ قرار دیا ہے جو مسلسل مرکز پر اثر انداز ہوتا ہے۔وہ نہ صرف مرکز کی کلیت میں مداخلت کرتا ہے بلکہ مرکز کی ترتیب کو الٹ پلٹ کر استعماری قوتوں کو رد کرتا ہے ۔نوآبادیاتی فکر اور مرکزی مقتدرہ کے بنے بنائے نظاموں پر ضرب لگاتے ہوئے اپنی آزادی کا اعلان کرتا ہے ۔منٹو کے افسانے ''یزید'' کے حوالے سے کہتے ہیں کہ دادا نے بچے کا نام یزید رکھا تو اس میں ایک طرف نوزائیدہ بھارت کی یزیدیت کی طرف اشارہ ہے تو دوسری طرف ایک مردود کردار کی نئی شناخت قائم کی گئی ہے۔

> ''ہم ان کے افسانوں کے مطالعے سے نئی اجتماعی اور انفرادی شناختوں سے آگاہ ہوتے ہیں ۔خاطر جمع رہے کہ یہ شناختیں نہ صرف مانوس نہیں ہوتیں بلکہ مانوس شناختوں کے رائج تاریخی بیانیوں پر کہیں سوالیہ نشان ہوتی ہیں اور کہیں ان سے انحراف کا درجہ رکھتی ہیں۔'' ۸۴

منٹو کے افسانے کے کردار کریم دادا نے بیٹے کا نام یزید رکھ کر مرکزی اقتدار اصولوں سے انحراف کیا ہے۔یہی انحراف مابعد نوآبادیاتی فکر کی خصوصیات ہے۔ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے منٹو کے حاشیائی متن کو نئی فکر (ژاک دریدا) کی روشنی میں سمجھا ہے ۔جس میں حاشیہ بھی متن پر دباؤ رکھتا ہے ۔وہ منٹو کے

موضوعات کا ماخذ بیسویں صدی کے نصف اوّل کی سماجی اور سیاسی فضا کو قرار دیتے ہیں جس میں تمام لکھنے والے ہندوستانی اپنی قومی شناختوں کی حاشیائی اور استعمار کی مرکزی حیثیت سے واقف تھے۔ مصنف منٹو کے فسادات کے موضوع پر لکھے ہوئے افسانچوں کو استعماری مرکز کے حاشیے کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ مگر ایک ایسا حاشیہ جو استعمار کی مرکزیت پر دباؤ بڑھانے کے لیے حاشیائی باشندوں کے قتلِ عام کو ممکن بناتا ہے مگر سوال تو یہ ہے کہ کیا استعمار کے کبیری متن کا یہ حاشیہ خاک وخون سے گزر کر مرکز میں کچھ جگہ پانے میں کامیاب ہوتا ہے یا نہیں۔ اس کے لیے ۱۹۴۷ء کے بعد صورت حال کا جائزہ لینا پڑے گا۔ دیکھنا یہ ہوگا کہ استعماری قوتوں سے آزادی کے بعد ان کی جگہ پر ہمیں کون سے چہرے نظر آتے ہیں۔ یہ وہی چہرے ہیں جو ان کی موجودگی میں حاشیہ پر نہیں تھے بلکہ ایک وضاحتی جملے کی مانند قوسین میں درج تھے اور محفوظ تھے لہٰذا نوزائیدہ ممالک کے مستقبل میں مرکزی حیثیت کے حامل اقتدار کی مسند پر یہی چہرے بیٹھے جنھوں نے حاشیائی متن کی قطع و بُرید سے دور رہ کر اس وقت کو گزارا۔

> ''مرکز کی کوئی پہچان نہیں ہے۔ کہیں یہ ریاستی مشینری کی صورت میں ہے کہیں ریاستی آئیڈیالوجی کی صورت میں کہیں قومی، مذہبی، اخلاقی بیانیوں کے طور پر اور کہیں سماجی مقتدرہ کے روپ میں، کہیں صنفی امتیاز کے طور پر اور بعض اوقات تو یہ بیک وقت کئی صورتوں میں ملفوف ہو کر ظاہر ہوتا ہے۔'' ۸۵

ناصر عباس منٹو کے افسانوں 'نیا قانون' اور 'بو' کا تجزیہ بھی متن اور حاشیے کی اس کش مکش کی روشنی میں کرتے ہیں تو تفہیم یک سمتی نہیں رہتی بلکہ نئی جہتوں کو قاری کے سامنے روشن کرتی ہے۔ مابعد نوآبادیاتی تفہیم منٹو کے افسانے 'بو' کو جنسیت کے الزام سے بری کراتی ہے۔ اور اس کے کردار رندھیر کو مرکز سے گریزاں اور حاشیے سے قریب دکھاتی ہے۔ یوں منٹو کا افسانہ مرکز کے کبیری متن کے مقابل متبادل بیانیہ بن جاتا ہے جو حاشیے پر رہ کر مسلسل مرکزی بیانیے کو چیلنج کرتا ہے۔ مصنف نے منٹو کے حوالے سے مابعد نوآبادیاتی فکر کے ایک بنیادی مسئلے کی نشاندہی کی ہے کہ جس طرح نوآبادیات میں مشرق کو یورپ کی نظر اور اس کے معیارات کی مدد سے جانچا گیا۔ اسی طرح منٹو کے فحش قرار دیے جانے والے افسانوں کو بھی غیر کی یا دوسرے کے معیارات کی روشنی میں دیکھا کہ انھیں سماجی اور اخلاقی کینن میں پرکھا گیا ہے جبکہ

ادب کے ساتھ انصاف یہ ہے کہ ادب پارے کی تفہیم و تجزیہ ادبی جمالیات کی روشنی میں ہو۔ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے منٹو کے افسانوں بُو اور ٹھنڈا گوشت میں عورت اور مرد کے مراسم کو سماجی اور قومی شناخت کی تمثیل بتایا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ ایشر سنگھ کی پُرانی شناخت میں ناکامی ہندوستان کے رہنے والوں کی اس اصل شناخت کی طرف مراجعت میں ناکامی کی تمثیل ہے جو استعمار کی پیدا کردہ نئی شناختوں سے قبل تھی اور جس کا حصول تقسیمِ ہند اور فسادات نے ناممکن بنا دیا تھا۔

ڈاکٹر ناصر عباس نیّر میراجی کی شاعری میں متبادل بیانیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کے نظامِ شعر کی مختلف جہات کا ذکر کرتے ہیں۔میراجی کی گزشتہ تفہیم خواہ وہ نفسیاتی حوالے سے ہو یا جنسی حوالے سے، پر سوالیہ نشان لگاتے ہیں۔میراجی کی شاعری کو ان کی ظاہری شخصیت سے منسلک کرنے کو ایک مغالطہ قرار دیتے ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ میراجی زندگی کا جو تصور رکھتے تھے وہ کبیری بیانیوں اور ان نظریات سے جو عام تخلیق کار کی شعور سازی کرتے ہیں سے کوسوں دور تھا۔ان کا تصور زندگی لاشعوری طور پر ان کی شاعری کے پسِ پُشت موجود ہے۔مسلّمہ نظریات اور آدرشوں کو خاطر میں نہ لانا بجائے خود استعماریت اور اس کی زائیدہ شکلوں کا انکار ہے۔ڈاکٹر ناصر عباس نیّر میراجی کی شاعری کے حوالے سے کہتے ہیں:

> ''میراجی کی نظم شاعری کی جدید شعریات میں جڑیں رکھتی ہے۔جدید شعریات خود کو پرانی شعریات کے مقابل ظاہر کرتی ہے۔شاعری کی پرانی یا کلاسیکی شعریات خاص موضوعات اور مخصوص جمالیاتی اقدار کی پابند تھی مگر جدید شعریات پابندیوں سے بغاوت کرتی ہے۔'' ۸۶

مطلب یہ کہ میراجی کی شاعری کی جہات کسی نظریے یا کسی موضوع کی پابند نہیں ہیں۔جدید شعریات میں ہر موضوع خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، عالمی ہو یا مقامی، تاریخی ہو یا ثقافتی پر لکھنے کی آزادی ہوتی ہے۔اسی لیے جدید شاعر اپنے وجود سے باہر نظریات اور بیانیوں سے متاثر ہونے کی بجائے اپنے اندر سے تخلیقی قوت کشید کرتا ہے۔مصنف کی اس سے مراد ہرگز نہیں کہ میراجی یا جدید شعرا کی شاعری سماج سے لاتعلق رہی ہے۔بلکہ وہ سماج کے ساتھ رشتے اپنے بنائے ہوئے تصورات کی روشنی میں قائم کرتے ہیں۔یوں شعری سلطنت میں مقتدرہ کی حاکمیت سے انکار کیا جاتا ہے۔میراجی کے متکلم کا تجربہ متنوع

تجربات سے معانی کا حامل ہے وہ ایک ہی وقت میں ایک سے زیادہ معانی کا تخیل باندھ سکتا ہے (۸۷)۔اور یہی معنی کی کثرت استعمار کے مسلّط کردہ واحد معنی کا متبادل بیانیہ ہے۔میراجی کی نظم ''عکس کی حرکت'' کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایک ہی وقت میں ایک سے زیادہ حسی تمثالوں کا اجتماع دراصل جدید شاعر کی کثیر گرفتگی ہے۔ جواس واحد معنی کو رد کرنے کے مترادف ہے جس کے تحت استعماری نظام نے ہندوستانی قوموں کو اپنے ماضی میں واحد شناخت کا تصور دیا۔واحد مقتدرہ اور واحد قوت کے تصورات اس کے آگے مات ہیں۔ناصر صاحب کہتے ہیں کہ میراجی شاعری میں کثیر اور متضاد شخصیات کی نمائندگی کی نشاندہی کرتے ہیں۔ان کا وجود اس سے پھوٹتا ہے کہ کوئی حقیقت سادہ اور یک رُخی نہیں اسے جاننے اور اس سے معاملہ کرنے کے لیے ایک سے زیادہ تناظرات درکار ہیں (۸۸)۔

ان کا کہنا ہے کہ میراجی کی نظم کا متکلم سمت اور جہت سے وابستگی اور تنہائی سے نجات پا کر حرکت ِ ذات کی بحالی چاہتا ہے۔اس سلسلے میں جستجو کی حکمتِ عملی اختیار کرتا ہے۔وہ میراجی کی نظموں میں انسان کے آدرشی اور مثالی تصور کی بجائے مادی حقیقی وجود کا مشاہدہ کرتے ہیں اور یہ بات تو اظہر من الشّمس ہے کہ آدرش اور مثالیت استعماری نظام کی خصوصیات ہیں بلکہ ان کے مقابل حقیقی مادی وجود پر اصرار اس آدرش کا متبادل بیانیہ ہے جس کی نشاندہی ڈاکٹر صاحب نے میراجی کی شاعری میں کی ہے۔

ڈاکٹر عباس نیّر کے مابعد نوآبادیاتی تنقیدی نظام میں اگلا مرحلہ ان متبادل بیانیوں کا ذکر ہے جو نوآبادیاتی دور کے خاتمے کے بعد تخلیق ہونے والے فکشن میں ظاہر ہوئے۔یہ متبادل بیانیے استعماری بیانیے کو نہ تو رد کرتے ہیں اور نہ قبول کرتے ہیں کیونکہ دونوں صورتوں میں کبیری بیانیے پر انحصار ضروری ہے جبکہ یہ خود انحصاری رکھتے ہیں اور اپنے راستوں کا تعین خود کرتے ہیں۔نوآبادیاتی نظام کی فراہم کردہ قومی شناختوں کی بنیاد پر وہ قومیں اور وہ ملک آزادی کے بعد وجود میں آئے اور اکثریت نے نہ صرف اس ثنویت کو قبول کیا بلکہ اس میں شدت پسندی کا ثبوت دیا۔مگر کچھ خلّاق اذہان اس دائرے کو توڑنے میں کامیاب ہوئے۔نوآبادیاتی دور کے بیانیوں سے لبریز سماجی عرصے سے ماورا ہوئے۔تخلیقی آزادی کی طرف قدم بڑھایا۔ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے انھی خلّاق اذہان کی تخلیقات کا مابعد نوآبادیاتی تناظر میں مطالعہ کیا اور ان متبادل بیانیوں کی نشاندہی کی ہے جو نوآبادیاتی دور کی حقیقت پسندی سے الگ اپنی راہ

بنانے میں کامیاب ہوئے ۔انھوں نے منٹو،قرۃالعین حیدر اور انتظار حسین کے افسانوں میں جادوئی حقیقت نگاری کے نشانات نمایاں کیے ہیں ۔جو کہ ساٹھ کی دہائی کے بعد سے مابعدنوآبادیاتی ادب کی پہچان بن چکی ہے ۔وہ جادوئی حقیقت نگاری کی تکنیک کونوآبادیاتی دور کی واقعیت نگاری کا متبادل بیانیہ قرار دیتے ہیں۔پسِ نوآبادیاتی فکشن کی تعریف کرتے ہوئے ناصر صاحب کہتے ہیں:

''پسِ نوآبادیاتی فکشن اپنی شعریات سے پہچانا جاتا ہے۔جو دراصل میں آزادی بخش ہے ان ثقافتی جمالیاتی کینن کے استبداد سے جونوآبادیاتی چیرہ دستیوں کے جلو میں رائج ہوئے۔پس نوآبادیاتی فکشن ہمیں فکشن کی ایک متبادل صورت مہیا کرتا ہے۔جو سامنے کی یک رُخی حقیقت پر مبنی نہیں ہوتی بلکہ فراموش کردہ مطعون مگر مقامی عناصر سے ماخوذ ہوتی ہے۔یہ فکشن اس سب کی واپسی کوممکن بناتا ہے جسےنوآبادیاتی سیاسی اورعلمیاتی جبر نے حقارت سے حاشیے پر دھکیل رکھا ہوتا ہےاوراس سلسلے میں قسم قسم کی بدگمانیاں پیدا کی ہوتی ہیں۔'' ۸۹

مصنف نے پس نوآبادیاتی فکشن کوحقیقت پسندی کی علمیاتی سے انحراف قرار دیا ہے وہ کہتے ہیں کہ اس کا تعلق تاریخی طور پرنوآبادیاتی نظام کے خاتمے سے نہیں بلکہ اس شعریات سے گریز اور انحراف سے ہے جونوآبادیاتی عرصے میں موجود رہی ۔منٹو کے افسانوں ''فرشتہ'' اور ''پھندنے'' کوانھوں نے پسِ نوآبادیاتی فکشن کا نقیب بتایا ہے ۔ان کے خیال میں ان افسانوں کے کردار وحدانی شخصیت نہ رکھنے کا تجزیہ کرتے ہیں۔خواب و بیداری کے امتزاج سے یہ افسانے وجود میں آتے ہیں کسی واحد معنی کی طرف اشارہ نہیں کرتے بلکہ معنی کی امکانات کو پیش کرتے ہیں ۔ڈاکٹر ناصر عباس نیر اپنے تجزیے میں ان افسانوں کے کرداروں کی کثیر سمتیت اور کثیر جذبیت کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔یہ کثیر سمتیت ، یک سمتیت کی جبریت سے نجات دلاتی ہے ۔ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے جادوئی حقیقت نگاری پر مبنی افسانے کو مشرقی روایت کا مغربی ہیئت سے امتزاج قرار دیا ہے۔یہ افسانے مابعدنوآبادیاتی فکشن اس لیے ہیں کیونکہ ان میں خواب اور بیداری سے تشکیل دی گئی افسانوی حقیقت نوآبادیاتی دور کی حقیقت پسندی سے انحراف کرتی ہے ۔نوآبادیاتی دور کی حقیقت نگاری براہ راست سماج اور اپنے حال سے مواد حاصل کر کے کسی ایک واحد اور مستحکم معنی کا ابلاغ کرتی ہے۔جبکہ جادوئی حقیقت نگاری کسی ایک نقطے پر ٹھہراؤ نہیں کرتی ۔ڈاکٹر ناصر

عباس نیر پھندنے اور فرشتہ کے مرکزی کرداروں کے غیر (جوان کے لباس کی صورت میں ہے) سے نجات پانے کے عمل کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مابعدنوآبادیاتی فکشن کا مقصدنوآبادیاتی لاشعور کو غیر کے کلامیے (ڈسکورس) سے آزاد کرانا ہے اور یہ آزادی اپنی اصل ثقافتی علامتوں کو دریافت کرنے کا نام ہے(۹۰)۔ مابعدنوآبادیاتی جادوئی حقیقت نگاری تک رسائی کے عقل کے علاوہ دوسرے راستوں کی بھی نشاندہی کرتی ہے۔ جن میں تخیل کو اہمیت حاصل ہے۔ یہاں ناصر صاحب نے آفاقی صدارت تک رسائی کے ابنِ عربی کے بیان کردہ تین مراحل کا حوالہ دیا ہے۔ تجریدی یا عقلی صلاحیت جو اعلیٰ ترین صلاحیت ہے ۔احساس اور حواس جن کا مرتبہ کم ترین اور ان دونوں کے بیچ تخیل اور فنتاسی (۹۱)۔ وہ کہتے ہیں کہ جادوئی حقیقت نگاری عقل وتخیل کی جدلیات سے نہیں بلکہ ہم آہنگی سے وجود میں آتی ہے۔ جس سے متنوع معانی کی دنیا تخلیق ہوتی ہے۔

ڈاکٹر ناصر عباس نیّر آگ کا دریا کا مابعدنوآبادیاتی تناظر میں جائزہ لیتے ہوئے قرۃ العین حیدر کے اس ناول میں ردِّ استعماری پہلو کی نشاندہی کرتے ہیں وڈھائی ہزار سال کے عرصے پر محیط اس ناول میں وقت کی غارت گری اور تعمیر کی قوت کا نوآبادیاتی دور سے تقابل کرتے ہیں:

> ''قرۃ العین کے یہاں وقت ک غارت گری کا یہ عظیم الشان تصور ایک خاص ردِّ استعماری جہت رکھتا ہے۔ یہ تصوّرطاقت پراجارے اور طاقت کی نخوت کا متبادل تصوّر ہے۔'' ۹۲

نوآبادکاروں نے کثیر شناختوں کے ملک ہندوستان میں تصادم کی آرزو کی۔اس حوالے سے مصنف نے ناول میں رادھے چرن کے بیان کا حوالہ دیا ہے۔ جس میں یہ باور کرایا جاتا ہے کہ ہندوستان میں کثیر شناختیں تھیں مگر ان میں کوئی دشمنی یا تصادم نہیں تھا جبکہ پادری جو استعماریت کا نمائندہ ہے۔اس بیان کو اپنی آرزو کے مطابق لکھتا ہے کہ ان شناختوں میں تصادم تھا۔ناصر صاحب کہتے ہیں کہ یہ نوآبادکاروں کی طرف سے اپنا 'غیر' تخلیق کرنے اور اسے حقیقی صورت دینے کے مترادف تھا۔ناصر عباس نے ناول کے دو انگریز کردار سرل ایشلے اور پیٹر جیکسن کو ہندوستان میں محض طاقت کے مظاہرے سے منسلک اور انھیں تجربے کے تنوع، تخیل کی زرخیزی، محبت کی گرمی اور خیالات ک فراوانی سے خالی بتایا۔ان

کے مقابلے میں وہ ابوالمنصور کمال الدین کے کردار کا تجزیہ کرتے ہوئے اسے ایسا آخری کردار کہتے ہیں جو خود کو ہندوستانی ثقافتی روح کے سپرد کردے۔ یہ وہی فرق ہے جس کی نشاندہی ڈاکٹر صاحب نے مسلم ثقافتی اثرات اور نوآبادیاتی ثقافتی اثرات کے مابین کی ہے۔

ڈاکٹر ناصر عباس نیّر انتظار حسین کے افسانوں کا مابعد نوآبادیاتی تناظر میں تجزیہ کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ انھوں نے اپنے افسانے میں اس دنیا کو زبان دی جو نوآبادیاتی دور میں گم ہوگئی تھی۔ قرۃ العین حیدر کی طرح انتظار حسین نے بھی حال کے متوازی ماضی کی بازیافت کرتے ہوئے نوآبادیاتی کلامیے کو چیلنج کیا۔ نیز وہ ماضی سے کسی ایک عرصے یا کسی ایک جہت کا انتخاب نہیں کرتے بلکہ انسان کے وجودی سوالات کے لئے ہندی، عجمی اور سامی اساطیر سے بیک وقت استفادہ کرتے ہیں۔ انتظار حسین کے افسانوں میں غیر کو شناخت کرنے اسے الٹ دینے، اس سے مکالماتی رشتہ قائم کرنے کی متنوع صورتیں ملتی ہیں(۹۳)۔

مصنف انتظار حسین کے افسانوں میں غیر کے خلاف مسلسل جدوجہد کی دریافت کرتے ہیں۔ انھوں نے انتظار حسین کے افسانوں میں اصل سے دوری اور معزولی کو ان کا اہم موضوع قرار دیا ہے۔ اصل سے دوری پہچان کی گمشدگی ہے۔ شہرِ افسوس کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ اس افسانے کے تینوں کردار زندہ ہونے کے باوجود اپنی اپنی لاش کاندھے پر اٹھائے ہوئے ہیں اور اسے اپنا اپنا غیر تصوّر کرتے ہیں۔ افسانہ نرناری میں بھی غیر انتظار حسین کا موضوع بنا۔ اس افسانے میں مدن سندری دیوی کے وردان کے بعد اپنے خاوند اور بھائی کے سر دھڑ سے جوڑتی ہے مگر بوکھلاہٹ میں سر بدل دیتی ہے۔ یوں ان کو اپنے ہی دھڑ یا جسم کی صورت میں غیر کا سامنا کرنا پڑتا ہے(۹۴)۔ ناصر عباس نے غیر کے اس تصور کو مابعد نوآبادیاتی تناظر میں سمجھا ہے اور پاکستان کی صورت حال پر منطبق کیا ہے انھوں نے اردو میں مابعد تنقید کا تعیّن کرتے ہوئے آئندہ محققین کے لیے راہیں ہموار کی ہیں۔ انھوں نے مابعد نوآبادیاتی فکر میں ہندوستان کی نوآبادیاتی صورتِ حال کے تناظر میں اضافے کئے ہیں۔

## حوالہ جات


۱۔ جی ایم ٹرویلین، ہسٹری آف انگلینڈ۔ص ۵۲

۲۔ ابوالکلام قاسمی، نوآبادیاتی فکراوراردو کی ادبی وشعری نظریہ سازی۔ص ۲۱۸

۳۔ ڈاکٹر مبارک علی، آخری عہد کا مغلیہ ہندوستان۔ص ۱۳۱

۴۔ جیلانی کامران، انگریزی زبان اورادب کی تدریس میں قومی زبان کا کردار۔ص ۱۸

۵۔ ڈاکٹر عابد حسین، قومی تہذیب کا مسئلہ۔ص ۵۹

۶۔ ایضاً، ص ۱۶۱

۷۔ گستاوَلی بان، تمدنِ ہند، مترجم سید علی بلگرامی۔ص ۵۱۶

۸۔ ڈاکٹر اقبال، ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر۔ص ۳۹

۹۔ محمد صدیق قریشی مرتب کشاف اصطلاحاتِ تاریخ۔ص ۱۷

۱۰۔ Bill Ashcraft,Gareth Griffiths,Helen Tiffin,The Empire writes back, p: 2

۱۱۔ Susan Vanzanteri Gallaghar (ed), Postcolonial literature and the biblical call for justice ,p: 5

۱۲۔ پروفیسر ٹائن بی، دی ورلڈ اینڈ دی ویسٹ، دنیا اور مغرب مترجم ڈاکٹر حسین احمد پراچہ۔ص ۸۲

۱۳۔ اشفاق سلیم مرزا، فلسفۂ تاریخ، نوآبادیات اور جمہوریت۔ص ۱۱۹

۱۴۔ ڈاکٹر مبارک علی، تاریخ اور آج کی دنیا۔ص ۱۶۵

۱۵۔ پروفیسر ٹائن بی، دی ورلڈ اینڈ دی ویسٹ، دنیا اور مغرب مترجم ڈاکٹر حسین احمد پراچہ۔ص ۷۲۔۷۱

۱۶۔ شبنم سبحانی، ہندوستان کی تہذیبی ترقی میں اردو کا حصّہ۔ص ۸۷

۱۷۔ ڈاکٹر مبارک علی، برطانوی راج ایک تجزیہ۔ص ۵۹

۱۸۔امتیاز عالم،مقالہ ’’دوبیانیے‘‘ مشمولہ روزنامہ ایکسپریس۔ص ۸

۱۹۔ابوالکلام قاسمی،نوآبادیاتی فکراور اردو کی ادبی وشعری نظریہ سازی۔ص ۲۷

۲۰۔ Ania loomba,Colonialism,Postcolonialism,p:1

۲۱۔ Bill Ashcraft,Gareth Griffiths,Helen Tiffin,key concept in postcolonial studies,P: 31

۲۲۔ڈاکٹر روش ندیم مقدمہ،اردو غزل کا مابعد نوآبادیاتی مطالعہ۔ص ۱۷

۲۳۔ محمد روف،اردو غزل کا مابعد نوآبادیاتی مطالعہ۔ص ۳۲

۲۴۔باری علیگ،کمپنی کی حکومت۔ص ۷

۲۵۔ناصر عباس نیرّ،لسانیات اور تنقید۔ص ۲۳

۲۶۔ناصر عباس نیّر،مابعد نوآبادیات اردو کے تناظر میں۔ص ۶

۲۷۔ڈاکٹر مبارک علی،برطانوی راج۔ص ۲۲

۲۸۔ناصر عباس نیّر،ثقافتی شناخت اور استعماری اجارہ داری۔ص ۱۳

۲۹۔ ناصر عباس نیّر،مابعد نوآبادیات اردو کے تناظر میں۔ص ۱۱

۳۰۔ایضاً،ص ۱۴

۳۱۔محمد مسعود خالد،نوآبادیاتی انتظامی ڈھانچے کا تسلسل۔ص ۳۰

۳۲۔ایضاً،ص ۳۳

۳۴۔بیورے نکولس،برطانوی ہند کا مستقبل مترجم ثمینہ راجہ،عظیم الرحمٰن فرقان۔ص ۲۳

۳۵۔ناصر عباس نیّر،مابعد نوآبادیات اردو کے تناظر میں۔ص ۲۶

۳۶۔مظہر مہدی،اردو دانشوروں کے سیاسی میلانات۔ص ۸۷

۳۷۔عبادت بریلوی،اردو تنقید کا ارتقاء۔ص ۱۸۶

۳۸۔ایضاً،ص ۳۰۱ ۳۹۔ ایضاً،ص ۴۰۴

۴۰۔ Pramod K Nayar,Postcolonialism A Guide for the

perplexed,p: 1


۴۱۔منوررانا،شعری مجموعہ جنگلی کبوتر۔ص ۱۰۔۹

۴۲۔شمس الرحمٰن فاروقی،شعر شور انگیز،جلد سوم۔ص ۲۰

۴۳۔وہاب اشرفی،مابعد جدیدیت،مضمرات وممکنات۔ص ۴۳۷

۴۴۔ ڈاکٹر الطاف انجم،''شعر العجم'' کا مابعد نوآبادیاتی مطالعہ۔ص ۷

۴۵۔ڈاکٹر الطاف انجم،''شعر العجم'' کا مابعد نوآبادیاتی مطالعہ۔ص ۸

۴۶۔ڈاکٹر الطاف انجم''حالؔی کی فکری تشکیل میں نوآبادیاتی کردار''ص ۴

۴۷۔ڈاکٹر الطاف انجم''حالؔی کی فکری تشکیل میں نوآبادیاتی کردار''ص ۵

۴۸۔مولانا الطاف حسین حالؔی،مجموعہ حالؔی۔ص:۵۶

۴۹۔علامہ محمد اقبال،جاوید نامہ۔ص ۱۶۶

۵۰۔شبلی نعمانی،کلیات ص ۶۲

۵۱۔پروفیسر انور رومان،اقبال اور مغربی استعمار۔ص ۴۵

۵۲۔علامہ محمد اقبال،کلیات بانگ درا۔ص ۱۵۱

۵۳۔ایضاً،بانگ درا۔ص ۲۲۲۔ ۵۴۔ ایضاً،بال جبریل۔ص ۱۱۱

۵۵۔ایضاً،بانگ درا۔ص ۲۷۲۔ ۵۶۔ ایضاً،ص:۳۰۷

۵۷۔ایضاً،ص:۲۸۱۔ ۵۸۔ ایضاً،ص:۱۹۴

۵۹۔احمد سہیل،ردنوآبادیاتی تنقید،مشمولہ تسطیر۔ص ۱۲۲

۶۰۔ریاض صدیقی،نوآبادیاتی اور مابعد نوآبادیاتی تناظر میں سرسید تحریک کا مطالعہ۔ص ۱۴

۶۱۔وہاب اشرفی،مابعد جدیدیت:مضمرات وممکنات۔ص ۱۳۲

۶۲۔ناصر عباس نیّر،مابعد جدیدیت:اطلاقی جہات۔ص ۵۹

۶۳۔شمس الرحمٰن فاروقی،مشمولہ:شب خون۔ص ۳۷

۶۴۔شمس الرحمٰن فاروقی،صورت ومعنی سخن۔ص ۱۶۴

۶۵۔ مابعد نوآبادیات: اردو کے تناظر میں، ص۴۶

۶۶، ۶۷۔ ایضاً، ص۱۰۰

۶۸۔ ایضاً، ص۱۰۴

۶۹۔ ایضاً، ص۱۲۹

۷۰۔ ایضاً، ص۵۰

۷۱۔ ایضاً، ص۳۵

۷۲۔ ایضاً، ص۶۰

۷۳۔ ایضاً، ص۶۱

۷۴۔ ایضاً، ص۷۱

۷۵۔ ناصر عباس نیّر، اردو ادب کی تشکیل جدید۔ ص۴۶

۷۶۔ ایضاً، ص۶۳

۷۷۔ ایضاً، ص۷۰

۷۸۔ ناصر عباس نیّر، مابعد نوآبادیات: اردو کے تناظر میں، ص۱۴۱

۷۹۔ ایضاً، ص۱۴۷

۸۰۔ ناصر عباس نیّر، اردو ادب کی تشکیل جدید۔ ص۱۱۹

۸۱۔ ایضاً، ص۱۴۰

۸۲۔ ایضاً، ص۱۴۱

۸۳۔ ایضاً، ص۳۲۶

۸۴۔ ایضاً، ص، ۳۲۷

۸۵۔ ایضاً، ص۲۰۶

۸۶۔ ایضاً، ص۲۱۲

۸۷۔ ایضاً، ص۲۳۹

۸۸۔ ایضاً، ص۲۴۲

۸۹۔ ایضاً، ص۲۴۳

۹۰۔ ایضاً، ص۱۶۲

۹۱۔ ایضاً، ص۲۶۸

۹۲۔ ایضاً، ص۲۷۳

۹۳۔ ایضاً، ص۲۸۲

۹۴۔ ایضاً، ص۳۰۱

۹۵۔ ایضاً، ص۳۱۱

# باب دوم

# ڈپٹی نذیر احمد کے عہد کا سماجی اور تہذیبی پس منظر

## تخلیق کار پر عہد اور ماحول کے اثرات

نقادانِ فن اس امر پر متفق ہیں کہ کسی بھی تخلیق کار، فنکار، شاعر اور ادیب کی شخصیت پر اس کے عہد اور سماج کی گہری چھاپ ہوتی ہے۔ اور یہ ایک فطری عمل بھی ہے کہ ہر فرد بشر جس ماحول اور عہد میں نشو نما پاتا ہے اس کی شخصیت، اس کی ذات، اس کی فکر، اس کی سوچ اور اس کے فن پر اس کا گہرا عکس ثبت ہوتا ہے۔ اس کی شخصیت اور اس کے کلام کو صحیح طریقہ سے سمجھنے کے لیے اس عہد کی تاریخ سے واقفیت ضروری ہے۔ کسی بھی تخلیق کار کی شخصیت اور اس کے ذریعہ تخلیق کردہ ادب یا فن پارے پر کچھ تبصرہ کرنے سے پہلے یہ ضروری ہوتا ہے کہ اس کے عہد اور ماحول کا سیاسی، سماجی، ادبی، تہذیبی اور ثقافتی تجزیہ پیش کیا جائے تاکہ اس کے فن پاروں میں موجود اس عہد کے نقوش ابھر کر سامنے آجائیں۔ تخلیق کار یا فن کار جس عہد میں پرورش پاتا ہے۔ اس کے سیاسی و معاشرتی اثرات کو قبول کرتا ہے۔ اور اس کے اردگرد اس کے افکار گردش کرتے ہیں۔ اور اسی دائرۂ عمل میں رہ کر وہ سماج یا معاشرے کو مثبت یا منفی انداز میں دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

یہ بات مسلم ہے کہ ہر دور اپنے سابقہ ادوار سے مربوط و منسلک ہوتا ہے۔ ایسا نہیں کہ یک بہ یک زمانہ تبدیل ہو جائے اور یکبارگی کوئی ناگفتہ بہ حالات پیدا ہو جائیں بلکہ تبدیلئ ادوار کے اثرات جستہ جستہ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ جسے ایک مفکر، ایک دانشور، دور اندیش، فنکار، مؤرخ و مبصر وغیرہ کی دوررس نگاہیں تاڑ جاتی ہیں۔ اس تبدز مانہ کے اثرات کو ایک فنکار بخوبی محسوس کرتا ہے۔ اور اپنے فن پاروں میں جابہ جا اس کا ذکر کرتا ہے۔

## ڈپٹی نذیر احمد کے عہد کا سماجی اور تہذیبی پس منظر

ڈپٹی نذیر احمد انیسوں صدی کے نصف کی چوتھی دہائی میں پیدا ہوئے۔ اس لیے اس وقت اور اس کے قبل کے حالات کو سمجھنے کے لیے انیسوں صدی کو اٹھارہویں صدی سے مربوط کر کے اس کا جائزہ لینا زیادہ مناسب ہے۔ اٹھارہویں صدی کی ابتداء ہندوستان کی تاریخ میں ایک اہم موڑ لیتی ہے اور یہاں سے تاریخ کا ایک نیا باب رقم ہوتا ہے۔ ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد خود سلطنت

مغلیہ کو کوئی ایسا لائق وفائق شہنشاہ میر نہ ہو سکا جو اس کی تقریباً ڈھائی سو سالہ عظیم وراثت کو سنبھال سکے۔

## نوآبادیاتی عہد میں ہندوستانیوں کا استحصال

۱۷۰۷ء کے بعد سلاطین مغلیہ کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ تخت نشینی کے لیے خود حکمران طبقہ برابر برسر پیکار رہا اور آپس میں اقتدار کے لیے خود مغل دربار میں ایک دوسرے پر سرداران وامراء چھینٹا کشی کرتے تھے۔ مغل شہزادے کبھی کسی امر کی طرف مائل دکھتے تھے تو کبھی دوسرے امیر کی طرف اور یہ امراء طبقہ ان مغل شہزادوں کو عیاشی، شراب نوشی، عیش وعشرت کا دلدادہ بنا چکے تھے اور ایک طرح سے انھیں حرم کی حسین وجمیل وادیوں میں مقید کر چکے تھے۔ ارکان سلطنت کی آپسی رسہ کشی سے سلطنت مغلیہ میں تزلزل پیدا ہو چکا تھا۔ حالات اتنے ناگفتہ بہ طور پر خراب ہو چکے تھے کہ الگ الگ علاقوں کو امراء اور حکمران اپنی آزادی کا اعلان کر چکے تھے اور مغل تسلط سے اپنے آپ کو باہر کر چکے تھے غرض کہ ایک طرح سے سلطنت مغلیہ کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیئے تھے۔ اس وقت تو مغل سلطنت کی بنیاد ہی ہل گئی تھی جب روہلے پٹھان نے خود مغل بادشاہ کو قید کر کے اس کی دونوں آنکھوں میں سلائی دیکر آنکھیں پھوڑ دی تھیں۔ جس جس علاقے میں جو جو حکمراں تھے وہ سب اپنی اپنی طاقت ایک دوسرے پر آزما رہے تھے۔ اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے مغل بادشاہ کو کٹھ پتلی بنائے ہوئے تھے۔ اور جس حکمراں قبضے میں مغل بادشاہ کٹھ پتلی بنے ہوتے تھے اسی کے حق میں فرمان شاہی جاری کرتے اور مہر مغل انھیں پر ثبت ہوتی۔ ملک کی اندرونی حالات کو دیکھتے ہوئے کئی بیرونی طاقتیں پہلے ہی سے اپنی نگاہیں اس ملک پر لگائے ہوئے تھیں۔ اور سبھی بیرونی اور فاشسٹی طاقتیں اس سونے کی چڑیا کو اپنے قفس میں قید کر لینا چاہتی تھیں۔ بغرض تجارت کئی ملک کی کمپنیاں اس سرزمین ہند میں اپنے پاؤں جمانے میں کامیاب ہو گئیں۔ جس میں اوروں کے ذکر سے قلم انداز کرتے ہوئے صرف ایسٹ انڈیا کمپنی کو سامنے رکھتا ہوں کیوں کہ ہندوستان کی نئی تاریخ کا باب اسی کمپنی سے شروع ہوتا ہے۔

رابرٹ کلائیو نے جب ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنیاد رکھی تبھی سے کچھ دانشوران ہند کو تشویش لاحق ہوئی اگر چہ اس کمپنی کا بنیادی مقصد تجارت تھا لیکن جب مغل سلطنت کی طاقتیں بتدریج زائل ہوتی گئیں اور کم وبیش پورے ہندوستان کے ہر خطہ کے حکمراں نے اپنی خودمختاری کا اعلان کیا تو یہ کمپنی تجارت سے

سیاست میں بھی چور دروازے سے داخل ہوئی اور سلطنت کے کاموں میں مداخلت کرنے لگی اسی کے پیش نظر اس کمپنی نے بہت ساری ایسی دفعات پر جو خود ان کے مفاد میں تھیں مغل بادشاہ سے پروان اجازت لے لی اور اپنی مرضی کے موجب حکمنامہ جاری کرالیا کمپنی کی طاقتیں اور اس کے ذمہ داروں کے اشارے پر الگ الگ ریاستوں کی حکومتیں بننے اور بگڑنے لگیں آہستہ آہستہ کم وبیش پورے ہندوستان پر انھوں نے اپنا قبضہ کرلیا۔ علمائے دین اور ارباب دانش نے جب یہ صورت حال دیکھی تو ان کے خلاف جہاد کا فتویٰ جاری کیا۔

۱۸۵۷ء سے سو سال قبل ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی جنگ اس سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے اس جنگ کے بعد ریاست بنگال پر ایسٹ انڈیا کمپنی پوری ریاست پر قابض ہوگئی۔ ۱۷۹۹ء میں ریاست میسور کے شہنشاہ شیر میسور کہے جانے والے ٹیپو سلطان کی شہادت انگیریزوں کے لیے فال نیک ثابت ہوئی۔ اور مزید ان کو اپنی طاقتیں دکھلانے کا موقع ملا شیر میسور کی شہادت کی خوشی میں انگریزوں نے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کی بنیاد ڈالی۔ ۱۸۰۰ء سے لے کر ۱۸۵۷ء کا ہندوستان ہر اعتبار سے چاہے وہ سیاسی ہو، سماجی ہو، معاشرتی ہو، تہذیبی ہو نہایت ہی بدحالی کا شکار تھا۔ اور اس کی حالت ابتر سے ابتر تھی۔ ۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری سے مغل سلطنت کا ٹمٹماتا ہوا یہ چراغ اپنی آخری روشنی دکھا کر گل ہوگیا۔ اور مشرقی تہذیب وتمدن کا حامل یہ عظیم ملک بلا واسطہ انگریزوں کے زیر تسلط ہوگیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد یہ ہندوستان بلا واسطہ برطانوی سامراج کا ایک حصہ بن گیا اور یہاں پر برطانوی قانون نافذ ہوگئے۔ اگرچہ برطانوی قانون کے نفاذ سے یہ ملک غلام دیش بن چکا تھا۔ انیسوں صدی کے نصف تک مختصراً یہ سیاسی حالات تھے۔ اب اس وقت کے کچھ ثقافتی اور تمدنی حالات کا بھی جائزہ لیتے ہیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ فاتح قومیں اپنے مملوک پر اپنی زبانیں، اپنی تہذیبیں اور اپنے طرز معاشرت کی چھاپ چھوڑتی ہیں اور صرف وہ سیاسی طور پر اپنی فوجی طاقت وقوت کے بل پر کسی علاقے کو فتح نہیں کرتیں بلکہ اپنی تہذیب وثقافت اور تمدن کے اثرات کو بھی نافذ کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اور مفتوح قومیں ان اثرات کو بہ آسانی قبول نہیں کرلیتیں اس لیے کہ صدیوں سے وہ اس تہذیبی وثقافتی روایت کی پابند ہوتی ہیں۔ اور یکسر اپنے اسلاف کے نقوش قدم کو دھندلا نہیں کرسکتیں۔

اس وقت کے ہندوستان میں قدیم وجدید تہذیب وکلچر کا تصادم نمایاں طور پر دیکھنے کو ملتا ہے۔ آٹھ سو سالہ ہندوستان تہذیب وثقافت کی تشکیل میں دو بڑے مذہبوں کے معتقدین کی کارفرمائی ہے جسے بعد میں گنگا جمنی تہذیب کا نام بھی دیا گیا۔ ہر دو مذہب کے ماننے والے اپنی اپنی روش اور طرز معاشرت اپنا ئے ہوئے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ کچھ رسوم ورواج ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔ دونوں مذہب کے ماننے والے مضبوطی کے ساتھ اس روایت کی بقا کے لیے مصروف عمل تھے۔

ہندوستان پر انگریزوں کے تسلط کے ساتھ یہاں پر ایک نئی زبان اور تہذیب نے اپنے بال وپر پھیلانا شروع کیا۔ اس ملک میں انگریز اپنی تہذیب وثقافت اور اپنی زبان اپنے ساتھ لے کر آئے تھے ۔حکمران طبقے کی تہذیب وثقافت اور زبان کو اپنانا یہاں کے لوگوں کے لیے آسان نہیں تھا۔ کیوں کہ صدیوں سے جس تہذیب وثقافت اور زبان کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے تھے اسے ترک کر کے ایک نئی تہذیب اور زبان کو اپنا لینا اور باپ دادا کی وراثت کو اپنے ہاتھوں سے مٹی میں ملا دینا سخت ترین عمل تھا۔ لیکن اس کے بغیر ترقی اور آسودگی ناممکن تھی۔

انگریزوں کی آمد اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام کی وجہ سے یہاں کی سیاسی، سماجی، اقتصادی اور تعلیمی حالت بری طرح متاثر ہوئی، معاشی اور اقتصادی حالت اس قدر خراب ہوگئی کہ یہاں کا متوسط طبقہ اسی میں الجھ کر رہ گیا۔ لوگوں کو اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کے لالے پڑ گئے۔ اقتصادی بحران کے دلدل میں پھنسے ہوئے لوگوں کے لیے حصول تعلیم جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ نتیجتاً متوسط طبقہ تعلیم سے دور ہوتا چلا گیا۔ نوبت یہاں تک آ گئی کہ تعلیم صرف اشرافیہ طبقہ میں سمٹ کر رہ گئی۔ دونوں مذاہب کے لوگوں اپنے مذہبی پیشواؤں کے اوپر تکیہ کیے ہوئے تھے۔ جس کی وجہ سے وہ ان کا جم کر استحصال کر رہے تھے۔ تعلیم کے فقدان کی وجہ سے بے راہ روی عام ہوگئی تھی۔ اور سماج میں بہت ساری برائیوں نے جنم لیا۔ بدعقیدگی اور توہم پرستی نے سماج کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ سماج کے سربرآوردہ اور دور اندیش لوگ اس کے تدارک کی تدبیریں سوچنے لگے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ جدید تعلیم اور حکمراں طبقہ کی تہذیب وثقافت اپنا ئے بغیر اس کا حل ممکن نہیں لیکن مذہبی رہنماؤں نے اس کی جم کر مخالفت کی اس طرح وہ دو گروہوں میں منقسم ہوگئے۔ روشن خیال اور دور اندیش لوگ جدید تعلیم کے حصول کے حق میں تھے جب کہ علماء اور برہمن

حضرات تمام مسائل کا حل صرف مذہب میں تلاش کرتے تھے وہ کسی طرح مشرقی تہذیب اور روایتی تعلیم کو چھوڑنے کے لیے آمادہ نہیں تھے۔

ڈپٹی نذیر احمد نے ایسے ہی عہد اور ماحول کی پستی اور زبوں حالی میں آنکھیں کھولیں۔ یہ زمانہ سیاسی، سماجی اور تہذیبی نقطہ نظر سے انتہائی خلفشار، پرآشوب اور انحطاط اور پستی کا دور تھا۔ اخلاقی قدریں پا مال ہو رہی تھیں ملک پر پوری طرح سے انگریز قابض ہو چکے تھے۔ ہندوستان مکمل طور پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی گرفت میں آ چکا تھا۔ انگریزوں نے مختلف جابرانہ قوانین نافذ کر کے عوام کی معاشی، سیاسی، سماجی اور تہذیبی برتری کو ختم کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ نتیجتاً عوام تیزی کے ساتھ مفلسی کا شکار ہونے لگی۔ لوگوں کے اندر قوت عمل سرد پڑنے لگا اور وہ عیش پرستی، گروہ بندی، خودغرضی اور تنگ نظری کا شکار ہونے لگے۔ معاشرے میں قدریں زوال پذیر ہونے لگیں اور لوگوں کے طرز عمل میں فرض شناسی کے بجائے خود غرضی آ گئی۔ عمل کی جگہ خواب، تعویذ گنڈوں اور جھاڑ پھونک نے لے لی۔ بے یقینی فرد کے مزاج کا حصہ بن گئی اس طرح مفلسی اور جہالت نے پورے معاشرے کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ حتیٰ کہ وہ اچھے اور برے کے درمیان تفریق کرنے سے قاصر ہو گئے۔

## سماجی حالت

سماج کی اصل تعریف سے متعلق غور و فکر اور اس کی اہمیت وافادیت کا اعتراف کرنا بہت وسیع موضوع ہے لیکن چند ماہرین کی رائے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سماج کیا ہے اور اس کی ممکنہ تعریف کیا ہو سکتی ہے۔ بقول جارج سمبل:

> ''سماج کو ان لوگوں کا گروہ مانا ہے جو آپس میں باہمی طور پر ایک دوسرے سے
> وابستہ ہوں'' ١

اسی طرح رالف لینٹین کے مطابق:

> ''سماج کو اسی جماعت کی شکل میں شامل کیا ہے جس میں انسان اپنے کو یکجا
> کرنے اور سماجی اکائی کی شکل میں سوچنے کے لیے کافی لمبے وقت کے ساتھ
> رہتے اور کام کرتے رہے ہوں۔'' ٢

فیئر چائلڈ نے سماج کی تعریف کچھ اس طرح کی ہے:

''سماج انسانوں کا ایک ایسا گروہ ہے جو اپنے بہت سے ضروری مقاصد جن میں لازمی طور پر خود کی حفاظت یا پیٹ بھرنا، کپڑا پہننا اور خود کو اس میں شامل کرنا ہے۔ اور ان سب چیزوں کو پورا کرنے میں مدد کرتا ہے۔'' ۳

کہا جاسکتا ہے کہ انسان سماج میں رہ کر ہی زندگی گذارتا ہے اور سماج میں رونما ہونے والی تبدیلیوں اور ضرورتوں سے بارآور رہتا ہے۔ اپنے تجربوں کی بنیاد پر وہ اپنے سماج کا حال بیان ہی کرتا رہتا ہے جو شعری یا نثری شکل میں موجود تھے۔ غرض یہ کہ سماج سے ادب کا رشتہ بہت گہرا ہے ہر فن کار و قلم کار، شاعر و ادیب اپنے اردگرد کے ماحول و حادثات سے متاثر ہو کر اپنے فن کے ذریعہ اس کا اظہار کرتا ہے۔ اس لیے ادب میں بھی انسانی زندگی کی تہذیب اور کلچر کی عکاسی ہوتی ہے جو کہ ایک سماجی عمل بھی ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ایک اچھا ادب وہی ہوتا ہے جس میں سماجی زندگی کے مسائل کی اچھی اور بہترین عکاسی کی گئی ہو۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ زندگی کو سمجھنے کے لیے سماج کے حالات کا جائزہ لینا ہی پڑتا ہے۔ کیونکہ ادیب یا شاعر کی زندگی سماج سے گھری رہتی ہے۔ اور آئے دن سماج میں ہونے والی تبدیلیوں سے وہی سب سے زیادہ متاثر بھی ہوتا ہے۔ ادب اور سماج سے متعلق احتشام حسین کا کہنا ہے کہ:

''ادب، ادیب کی شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے۔ ادب زندگی کی از سر نو تخلیق ہے۔ ادب انسان کی مادی کشمکش کا دلکش عکس ہے۔ ادب صرف لفظوں کی خوبصورت موتیوں کو فن کی لڑی میں پرونے کا نام نہیں درحقیقت ادب وہ ہے جس میں زندگی کے تجربات اور مشاہدات بیان کیے گئے ہوں۔'' ۴

کہا جاسکتا ہے کہ ادب ایک طرح سے ہماری زندگی کا آئینہ بھی اور ہماری تہذیب و تمدن کا عکس بھی، ہماری زندگی جن حالات سے نبرد آزما ہوگی بالکل اسی طرح کا ادب بھی ہوگا۔ کیوں کہ ادیب اپنی تخلیقات کے لیے زندگی کے وسیع وعریض کینوس پر اپنی سوچ و فکر کے ساتھ مختلف صورتیں مثلاً سماجی، اخلاقی، اقتصادی آزادی اور فتح و شکست کو منعکس کرتا ہے۔

زندگی ہو یا ادب ان کا محور انسان اور انسانی ممکنات ہی ہوتے ہیں۔ انسان مختلف جذبات اور

احساسات کے سہارے زندگی جیتا ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جذبوں کے اظہار کو ادبی شکل وصورت عطا کرنے والے شاعر یا ادیب کہلائے گئے ہیں۔ ہمارے ملک کے ادیبوں اور شاعروں نے بھی ادب کے ذریعے سماج میں ایک نئی روح پھونکی اور ادب کے حوالے سے قوم پرستی، وطن دوستی، آزادی، مساوات بھائی چارگی اور اخوت کو فروغ دیا۔

ادب براہ راست زندگی اور اس کے مسائل سے روبہ رو ہوکر مستقبل کی راہیں ہموار کرتا ہے۔ سماج کی ترقی اور بہتری کا بہترین وسیلہ بھی ادب ہی ہے کیوں کہ وہ سماج سے فیضان حاصل کرتا ہے۔ اور پھر اسی زندگی اور سماج کو فیضیاب بھی کرتا ہے۔ ادب چاہے شاعری کی شکل میں یا نثر کی صورت میں ہو کہیں نہ کہیں سماج سے جڑا ہوتا ہے۔ شاعری کی مختلف اصناف چاہے وہ موضوعاتی ہوں، مرثیہ یا قصیدہ، رباعی یا پھر جدید نظم یا غزل سبھی سماج کے عقائد، رسوم اور روایتوں کے غماز ہیں۔ وہیں نثری اصناف میں مضمون ہو یا داستان، ناول ہو یا افسانے، انشائیہ ہو یا خطوط یا پھر سفرنامے ہر صنف میں سماج کا عکس نظر آتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہیں کہ ادب اور سماج ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ ادب کی تعمیر وتشکیل میں ہر دور کے تقاضوں، ضرورتوں، بدلتی ہوئی سماجی، ادبی ولسانی، تہذیب کی جھلکیاں جلوہ گر ہوتی ہیں۔

نثری ادب کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکایتوں میں پندونصائح اور اخلاقی درس کی باتیں مختلف طریقوں سے بیان کی گئی ہیں۔ حکایت بیان کرنے والوں کا طریقہ تھا کہ وہ مذہبی باتوں کو اور اصلاح معاشرہ کی غرض سے کوئی قصہ بیان کر دیتے تاکہ لوگ اس قصے سے کوئی مثبت درس حاصل کر سکیں یعنی سماج اور معاشرے میں پھیلی ہوئی بے قاعدگیوں کو دور کرنے کے لیے حکایتوں سے کام لیا جاتا تھا۔

جب داستانوں کا دور شروع ہوا تو ان میں بھی اعلیٰ طبقہ کی شان وشوکت، ان کے آداب مجلس، لباس، وضع قطع کے ساتھ ساتھ بادشاہ، امراء، وزرا، شہزادیاں، کنیزیں اور غلام کے علاوہ جادوگر، جادوگر نیاں، جن پریاں یہاں تک کہ مافوق الفطرت کرداروں کے ذریعے سماج کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کی جاتی رہی۔ ان ادبی تخلیقات میں سماج کا روایتی انداز پورے آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہے لیکن وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ نثری ادب کے اوصاف میں تبدیلی آتی گئی اور ۱۸۵۷ء تک آتے داستانیں کم ہوکر ایک نئی صنف ادب ناول کا وجود عمل میں آیا۔ اردو میں ڈپٹی نذیر احمد نے بدلتے ہوئے سماجی حالات

کی ضرورتوں کے پیش نظر ناول کی بنیا د رکھی۔

ادب اور سماج کا یہ رشتہ اٹوٹ ہے۔ دونوں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں جس طرح سماج ادب پر اثر انداز ہوتا ہے اسی طرح ایک اچھا ادب بھی سماج کو متاثر کرتا ہے۔ ادب سماج سے مواد حاصل کرتا ہے اور زبان کو وسیلۂ اظہار بناتا ہے۔ زبان ایک سماجی ضرورت ہے۔ زبان کے توسط سے سماج ترقی کی منزلیں طے کرتا ہے۔

سماج اور ادب کے باہمی رشتے کے تعلق سے ناقدین ادب میں قدرے اختلاف ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ ہر دور کا ادب یکساں ہوتا ہے۔ اور زمانے یا حالات کی تبدیلی اس پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ زندگی اور سماجی حالات کا تغیر ادب پر اپنا کوئی اثر نہیں چھوڑتے۔ لیکن یہ خیال درست نہیں ہے کیوں کہ ایک دور کے لوگ جن باتوں سے محظوظ ہوتے ہیں، دوسرے عہد کے افراد کا ردعمل اس کے متعلق کچھ اور ہوتا ہے۔ ہر دور کا ادبی مزاج اپنے زمانے کے اعتبار سے تشکیل پاتا ہے۔ قدیم داستانوں میں مافوق الفطرت عناصر ہوتے تھے جس میں دیو، پری اور طلسمات کے قصے سنائے جاتے تھے۔ ان سے اس عہد کے لوگ بہت متاثر ہوتے تھے۔ لیکن آج پرستانوں، جن اور جادوگرنی، گھوڑے وغیرہ کی شماتی کہانی سن کر نہ تو لوگ ان سے محظوظ ہوتے ہیں اور نہ ہی انھیں صحیح تصور کرتے ہیں۔ اس لیے یہ کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہر دردکا ادبی مذاق و مزاج اس کے سماجی ماحول کا پروردہ ہوتا ہے۔

ناقدین و ماہرین کا دوسرا گروہ اس بات کا قائل ہے کہ اگر ہم عصری رجحانات پر بہت زیادہ زور دیں تو ادب کی آفاقیت کے نظر انداز ہونے کا اندیشہ ہے۔ آفاقیت سے مراد ادب کی یہ خصوصیت کہ وہ ہر دور سے متعلق ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر عہد کا فن کارا اپنے دور کی تہذیبی، سماجی اور سیاسی کشاکش اور اتھل پتھل سے اپنے آپ کو علیٰحدہ نہیں رکھ سکتا۔ دراصل ہر ادیب و فن کار اپنے عہد کے خیالات و تصورات کو تو پیش کرتا ہے لیکن عصری رجحانات میں ایسے عناصر کا اضافہ کرنا جو ہر دور سے متعلق ہوں صرف بڑے فن کار کا کام ہے اور ایسا ادب پارہ جس میں عصریت اور آفاقیت موجود ہوا اپنے دور کی نمائندگی تو کرتا ہی ہے ساتھ ہی ہر درد کی ترجمانی بھی کرتا ہے۔

فن کار اپنے گرد و پیش کے ماحول اور خارجی زندگی کے تجربات سے جو مواد حاصل کرتا ہے

اسے جوں کا توں ادب میں پیش نہیں کرتا بلکہ اپنے جذبے کی آنچ اور اپنی شخصیت کی بھٹی میں تپا کر اسے موثر اور دلنشیں بنا دیتا ہے۔ اور موزوں و مناسب پیرائے میں پیش کرتا ہے۔ درحقیقت فن کار اپنے عہد اور زمان و مکان میں اسیر ہو کر نہیں رہ جاتا بلکہ اس کی تخلیقات ایک مخصوص عہد کی پیداوار ہونے کے باوجود ہر عہد سے اپنا فنی رشتہ استوار رکھتی ہیں۔ ادب کا دائرہ اتنا وسیع ہوتا ہے۔ کہ ماضی، حال اور مستقبل سب اس کی زد میں ہوتے ہیں۔ ادب مستقبل کے لیے مشعل راہ بھی ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ادب اور سماج کا چولی دامن کا رشتہ ہے۔ انھیں ایک دوسرے سے الگ کرنا ایسا ہی ہوگا جیسے بدن سے لباس۔

۱۸۵۷ء کے بعد حالات تیزی کے ساتھ تبدیل ہوئے۔ تمام شعبۂ ہائے زندگی میں زبردست انقلاب آیا اور ادب کی تمام اصناف پر ان تبدیلیوں کے اثرات نمایاں طور پر ظاہر ہوئے۔ شعری رویوں میں تبدیلی آئی۔ سرسید احمد خان، شبلی نعمانی، الطاف حسین حالی۔ محمد حسین آزاد اور ڈپٹی نذ احمد کی کاوشوں سے نظم و نثر ایک نئی جہت سے دوچار ہوئیں۔ مغرب سے آئی ہوئی نئی تہذیب اور نئے ادب نے اردو ادب پر اپنے اثرات مرتب کیے جس کی وجہ سے سوچ اور فکر میں تبدیلی آنے لگی۔ سرسید نے تو باقاعدہ اصلاحی تحریک کی بنیاد ڈالی۔ حالی نے شعر وادب کا احساس دلایا اور مقدمۂ شعر و شاعری' لکھ کر اردو تنقید کی بنیاد رکھی۔

ظاہر ہے ایسی صورت میں داستانوں کی فرضی، خیالی اور غیر حقیقی کہانیوں میں تبدیلی آنا ناگزیر تھا۔ چنانچہ کہانی کا سفر بھی ایک نئے موڑ پر آ گیا اور اصلاح معاشرہ کے خیال کے تحت کہانیاں ناول کا روپ اختیار کرنے لگیں۔ کیوں کہ ناول کا موضوع انسانی زندگی ہے۔ اس لیے یہ واحد صنف ہے جس میں انسانی زندگی کی حقیقی تصویر پیش کی جانے لگی۔ مغربی ادب اور بدلتے ہوئے ادبی ماحول نے ڈپٹی نذیر احمد کو فن ناول نگاری کی جانب متوجہ کیا اور انھوں نے اردو ادب کو کئی اہم ناول دیے جن کا ذکر آگے آئے گا۔

ڈپٹی نذیر احمد جس وقت برسرعمل تھے اس وقت ملک کی سماجی، اقتصادی، سیاسی، تہذیبی اور مذہبی شکست و ریخت سے دوچار تھی۔ تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جب انگریز ہندوستان میں داخل ہوئے تو انھوں نے نہ صرف سیاسی طور پر اپنا تسلط قائم کیا بلکہ تمام شعبہ ہائے زندگی کو بھی متاثر کیا۔ سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد سماج تہذیبی تعطل کا شکار ہو گیا۔ بدعقیدگی، چھوا چھوت اور توہم پرستی

نے پورے سماج کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیا تھا۔عورتوں کی حالت بد سے بدتر ہو چکی تھی۔کم عمری میں شادی کا رواج عام تھا۔ بیواؤں کو شادی کی اجازت نہیں تھی بلکہ ان سے شادی کی اجازت نہیں تھی بلکہ ان سے شادی کرنا معیوب و معتوب تصور کیا جاتا تھا۔ ہندو عورتیں وراثت محروم تھیں جب کہ مسلم عورتیں اس سے شرعی طور پر تو محروم نہیں تھیں مگر عملی طور پر محروم رہ جایا کرتی تھیں۔عورتوں کو علم حاصل کرنے کی ممانعت تو نہیں تھی مگر سن بلوغت کے بعد گھر کی دہلیز سے باہر قدم نکالنا جرم تھا۔

انگریزوں کے جور و ظلم اور ریشہ دوانیوں کو کچلنے نیز ان سے مقابلہ کرنے کی غرض سے سیاسی، ادبی اور مذہبی طور پر بہت سی انجمنوں اور تحریکوں کا وجود عمل میں آیا اور تقریباً تمام تحریکوں نے آزادی کی جنگ میں اپنی بساط بھر کوشش بھی کی چوں کہ ان تحریکوں کا آغاز مغربی تہذیب کی مخالفت کے پیش نظر ہوا تھا۔ لہذا مغربی تہذیب کے ساتھ ساتھ برطانوی حکومت سے بھی نفرت ہونا لازمی تھی لیکن اس کو عملی جامہ پہنانے سے قاصر تھے۔کیوں کہ کوئی ایسا رہنما نہیں تھا جو اس مہم کو کامیابی دلانے میں مددگار ہو۔انگریزی تعلیم یافتہ ان کا ساتھ دینے کو تیار نہ تھے۔مگر مسلسل مظالم کو دیکھتے ہوئے ان کے دل و دماغ میں برطانوی حکومت کے خلاف جذبات بھڑکے تو انھوں نے تمام تحریکوں کو باہمی اختلاف کے باوجود کانگریس میں جمع کر دیا اور ان کے اندر اتحاد و اتفاق کا جذبہ پیدا کر دیا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ زبردستی ہندوستان کو مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کیا جارہا تھا۔انگریز افسروں اور عیسائی پیشوا، شہروں، بازاروں اور فوجوں میں گھوم گھوم کر لوگوں کو عیسائیت قبول کرنے پر مجبور کر رہے تھے۔ساتھ ہی ہندوؤں اور مسلمانوں کے رہنما کے خلاف سخت اور نازیبا الفاظ استعمال کر رہے تھے جس سے ان کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی۔اسی درمیان چربی کے کارتوس کا واقعہ بھی منظر عام پر آیا۔جس نے لوگوں کے اندر نفرت کا زہر بھر دیا۔اور لوگ بغاوت پر اتر آئے۔اس جنگ میں گرچہ شکست کا سامنا کرنا پڑا مگر ہندوستانیوں نے باہم اتحاد و اتفاق اور یکجہتی کا مظاہرہ کیا جو یقیناً قابل فخر اور لائق ستائش بات ہے۔ ہندوستانیوں کے اندر سماجی اصلاح کے ساتھ ساتھ مذہبی اصلاح کا جذبہ بھی پیدا ہوا۔سماج کو جدید عالمی تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کی کوشش شروع ہوئی، مذہب سے روایتی اور فرسودہ چیزوں کو ختم کرنے کی مہم چلائی گئی۔ارجن دیو لکھتے ہیں:

''ہندوستانی عوام کے تمام طبقوں میں سماجی اور مذہبی اصلاحی تحریکیں شروع ہوئیں۔ مذہبی سطح پر تعصب وتنگ نظری، توہمات ومفروضات نیز برہمن اور پجاری طبقے کی برتری کو خاص نشانہ بنایا گیا۔ جبکہ سماجی زندگی کی سطح پر ذاتوں کی اونچ نیچ بچپن کی شادی اور دیگر قانونی وسماجی عدم مساوات کے خاتمے کو ان تحریکوں کا مقصد بنایا گیا''۔۵

مذہب کو لے کر سماج دو حصوں میں منقسم ہو گیا تھا۔ سماج کا ایک بڑا طبقہ مذہب سے بڑا والہانہ لگاؤ رکھتا تھا۔ وہ مذہب میں اس قدر یقین رکھتا تھا کہ ہر چیز کا جواز مذہب میں تلاش کرتا تھا۔ مذہب میں فرسودہ روایات اس قدر سرایت کر گئی تھی کہ لوگوں کی ذہنیت اس میں کسی طرح کی مداخلت برداشت کرنا پسند نہیں کرتی تھی یہاں تک کہ مذہب کے نام پر بہت ساری فرسودہ اور غیر یقینی چیزوں کو بھی اپنانے میں کوئی جھجھک اور عار محسوس نہیں کرتے تھے۔ جبکہ سماج کا دوسرا طبقہ دانشمندوں اور روشن خیالوں کا تھا جو اندھی تقلید کے سخت مخالف تھے۔ مذہب سے فرسودہ اور متروک باتوں، توہم پرستی نیز غیر یقینی چیزوں کو دور رکھنے کے حق میں تھے۔

اس لیے دونوں طبقوں کے درمیان ٹکراؤ کا پیدا ہونا ناگزیر ہو گیا۔ ان حالات میں دانشور طبقے کے لیے ملک اور قوم کی فلاح و بہبود کے لیے لوگوں کو نئے خیالات سے روشناس کرانا لوہے کے چنے چبانے کے مترادف تھا۔ لیکن انھوں نے ہمت اور حوصلے سے کام لیا اور ہزار دشواریوں کے باوجود جمہوری خیالات کو فروغ دیا اور عقلیت اور انسان دوستی کو بنیاد بنا کر ذہنی اور فکری انقلاب کے لیے خطوط متعین کئے اور اس کی پاداش میں ہر طرح کے طعن وتشنیع اور مشکلات کا سامنا کرنے کے لیے خود کو آمادہ کیا۔

## تحریکات کا تعارف

ڈپٹی نذیر احمد کے سن شعور کو پہنچنے سے قبل اور اس کے بعد کئی اصلاحی، سیاسی، سماجی اور مذہبی تحریکیں وجود میں آ چکی تھیں۔ ان تحریکات نے اس وقت کے سیاسیات اور سماجیات پر بہت حد تک اپنا اثر چھوڑا۔ نذیر احمد کے فکر وفن اور شعور کی بالیدگی ہمیں کہیں نہ کہیں جزوی یا کلی طور پر ان تحریکات کے اثرات مرتب ہیں۔ کیوں کہ نذیر احمد بھی اس وقت کے سماج کا ایک فرد ہے اور سماج پر ان کے اثرات نمایاں طور پر

دیکھنے کو ملتے ہیں اسی لیے یہ ضروری بھی ہو گیا کہ ان تحریکات کا مختصر طور پر تعارف پیش کیا جائے جو کہ حسب ذیل ہیں۔

## ولی اللہی تحریک

ہندوستان میں جب مسلمان سیاسی طور پر کمزور ہوتے گئے اور ان کے ہاتھ سے اقتدار جاتا رہا تو اس صورت حال کے اثرات ان کے مذہب اور عقیدے پر بھی پڑا چنانچہ وہ بدعقیدگی اور بداعمالی کے شکار ہو گئے۔ اور ان کا اخلاق و کردار کسی بھی طرح لائق تحسین نہ رہا۔ احکام الٰہی اور سنت رسول سے انحراف و غفلت عام ہو گئی تھی۔ مشرکانہ عقائد و رسوم کو اس طرح اپنا چکے تھے۔ جس کے لیے مشرکین مکہ عہد رسالت میں بدنام تھے۔ مسلم امراء عیش و عشرت میں مگن تھے تو عوام بھی ان ہی کی دیکھا دیکھی اسی راہ پر چل پڑی۔ ان حالات میں شاہ ولی اللہ نے عہد آفریں کارنامہ انجام دیا اور تجدید و احیائے دین کی تحریک کے ذریعہ قوم کی اصلاح کا کام کیا۔ بادی النظر میں شاہ صاحب کے کارہائے نمایاں کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ علمی کارنامے

۲۔ اصلاحی کارنامے

۳۔ سیاسی کارنامے

## علمی کارنامے

شاہ صاحب کے علمی کارناموں کی فہرست بہت طویل ہے۔ انھوں نے درس و تدریس، وعظ و ارشاد اور تصنیف و تالیف کے ذریعے دعوت و تبلیغ اور اشاعت دین کا فریضہ سرانجام دیا۔ لیکن ان کا سب سے بڑا اور زندہ جاوید کارنامہ ترجمۂ قرآن ہے۔ علم حدیث کی اشاعت اور حدیث و فقہ میں تطبیق بھی ان کا زبردست کارنامہ ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے فقہی مسلک میں اعتدال کی راہ بھی تلاش کی۔ موصوف شیعہ اور سنی کے درمیان اختلاف کے مخالف تھے اور ان کے درمیان اعتدال کا رویہ اپنانے پر زور دیتے تھے۔

## اصلاحی خدمات

شاہ صاحب ایک عظیم مصلح امت تھے۔ ان کی اصلاحی کوششوں کا دائرہ صرف عقائد و اعمال تک

محدود نہیں تھا بلکہ اصلاح رسوم و عادات، غیر مسلموں سے اختلاط سے پرہیز اور احیاء اسلام کے لیے جہاد اور تمام شعبہ ہائے زندگی مثلاً اقتصادیات، معاشرت اور عمرانیات کے باب میں وہ صحیح معنوں میں ایک ریفارمر تھے۔ انھوں نے عجمی نظریات و عقائد کے ساتھ ساتھ عجمی رسومات پر بھی کڑی تنقید کی اور مسلمانوں میں احیائے سنت کو رواج دینے کی کوشش کی۔

## اصلاح رسوم و رواج

ہندوستان کے ساتھ مسلمانوں کے اختلاط کی وجہ سے بہت سارے ہندوؤں کے عقائد و رسوم مسلمانوں نے اپنا لیے تھے۔ مثلاً بیوہ کے نکاح کو بھی مسلمان معیوب سمجھنے لگے تھے۔ شاہ صاحب نے اس نظریے کو خلاف سنت قرار دیا اور بیوہ کی جواز کی دلیلیں پیش کیں۔ کہ اگر بیوہ سے نکاح پیغمبر ﷺ اسلام اور صحابہؓ کے نزدیک عیب نہیں تو دوسروں مسلمانوں کے لیے کیوں عیب ہوسکتا ہے۔ آپ نے حق مہر کی رقم زیادہ کرنے اور شادی بیاہ اور دیگر خوشی کے مواقع پر فضول خرچی کی مخالفت کی۔ کسی کی موت کے بعد چہلم اور برسی وغیرہ رسوم کی سختی سے مذمت کی اور تین دن سے زیادہ شوق منانے سے بھی منع کیا۔ مسلمانوں کو اس بات کی ہدایت کی کہ بحیثیت مسلمان ہماری تہذیب و تمدن، اخلاق و عادات اور رسومات و عبادات وہی ہونی چاہئے جو دین سے قریب کریں نہ خلاف سنت کام کریں۔

## سیاسی خدمات

شاہ صاحب نے جہاد میں کامیابی کے بعد ایک سیاسی نظام تجویز کیا وہ ہر تین چار روز کی مسافت پر ایک ایسے حاکم کی تقرری کی تجویز دیتے ہیں جو مسلم کردار کا نمونہ اور عدل وانصاف کا پیکر ہو۔ ساتھ ہی طاقت ور بھی ہو تا کہ ظالم سے مظلوم کا حق وصول کر سکے۔ حدود اللہ قائم کر سکے اور انتظامی امور میں ایسا پختہ ہو کہ کہ لوگ اس کے خلاف سرکشی اور بغاوت کی ہمت نہ کر سکیں۔

شاہ ولی اللہ تحریک صرف کفار و مشرقین کا زور توڑنے کے لیے نہ تھیں بلکہ وہ ہندوستان ہی نہیں پورے عالم اسلام میں دین اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور تعمیر ملت کا جامع پروگرام رکھتے تھے۔ انھوں نے اسلام کو ایک مکمل نظام حیات کے طور پر پیش کیا۔ انھوں نے اسلام کے پورے فکری، اخلاقی، شرعی، تمدنی،

اقتصادی اور عمرانی نظام کو مرتب صورت میں پیش کیا۔ اور زندگی کے تمام شعبوں کو اسلامی قالب میں ڈھالنے کی تجویز پیش کی وہ ایک جامع کمالات شخصیت کے مالک تھے اور صحیح معنوں میں ایک ریفارمر، ایک مجدد، اور مجتہد تھے۔ کاش مسلمانان ہندان کے پیش کردہ فلسفہ حیات کو اپنا لیتے تو انھیں یہ دن نہ دیکھنے پڑتے۔

حقیقت یہ ہے کہ شاہ صاحب کے ہمہ جہت تجددی کام نے ہندوستان میں اٹھنے والی تمام تحریکوں کو متاثر کیا۔ سید عابد حسین ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

> ''شاہ ولی اللہ صاحب کی تحریک کے بلاواسطہ اور ترک تقلید کے بالواسطہ اثر سے دیو بند کا مدرسہ جو غدر کے کوئی دس سال بعد قائم ہوا اصلاح مذہب کا مرکز بن گیا۔ مولانا قاسم نانوتوی اور چند جید علماء کی بدولت اس مدرسہ کو نہایت غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ اوران کے حلقۂ درس سے بڑے بڑے قابل شاگرد نکلے جو اپنے استادوں کے سچے جانشین ثابت ہوئے''۔٦

شاہ ولی اللہ کی تحریک اصل میں شہنشاہیت اور ملوکیت کے خلاف تھی لیکن اس سے مذہب کو بھی فائدہ پہنچا کہ وہ بے جا رسومات کے شکنجے سے نکل کر حقیقت کے دائرے میں آ گیا کیوں کہ شاہ صاحب کا زور مذہب کی رسموں پر نہیں بلکہ اس کی روح پر تھا۔

## برہمو سماج تحریک

راجہ رام موہن رائے عظیم مصلح تھے۔ آپ پہلے ایسے ہندوستانی ہیں جنھوں نے سماجی اصلاحات کے ضمن میں پیش رفت کی۔ آپ ''بابائے ہندوستان'' کے لقب سے ملقب ہوئے۔ آپ مذہب اور سماج کی اصلاح کے تئیں کافی سنجیدہ تھے۔ سماج میں مروجہ بے بنیاد رواجوں اور رسوم کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ ذات پات کے نظام کو غلط ٹھہرایا اور ''ستی'' اور ''بچپن کی شادی'' کے رواج کو ختم کرنے پر زور دیا۔ وہ عورتوں کے مساوی حقوق کے حامی تھے۔ بیواؤں کی شادی کو صحیح اور درست قرار دیا۔ تعدداز دواج کے خلاف آواز اٹھائی اور وراثت میں عورتوں کے حقوق کی پاسداری کی۔ مورتی پوجا کی مخالفت کی۔ مذہبی علوم کو سیکھنے پر زور دیا۔ لوگوں کو اپنے ان خیالات سے روشناس کرانے کی غرض سے ١٨٢٨ء میں برہمو سماج کی

بنیاد رکھی۔

راجہ رام موہن کے دوران قیام کلکتہ وہاں چند طالب علموں کی مدد سے ''آتمیا سبھا'' (Atmiya Sabha) کی بنیاد رکھی۔ انھوں نے بہت سے دیوتاؤں کی پوجا اور خاص کر مورتی پوجا غلط قرار دیا۔ اور مذہب کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے پر زور دیا۔ عوام کو مشورہ دیا کہ خود اس لائق بنیں کہ انھیں مذہبی کتابوں اور دھارمک شاستروں کو پڑھنے اور سمجھنے کے لیے مذہب کے ٹھیکیداروں پر منحصر نہ ہونا پڑے۔ ارجن دیو کے مطابق:

> ''آپ نے مذہب کے تئیں عقلی انداز فکر اختیار کرنے پر زور دیا اور لوگوں کو صلاح دی کہ وہ خود مذہبی کتابوں اور دھارمک شاستروں کا مطالعہ کریں اور مذہب کے ٹھیکیدار اور برہمنو پر تکیہ کرنا چھوڑ دیں۔ آپ نے عوام سے کہا کہ وہ اپنے مذہبی عقائد کو اپنے اخلاقی اصولوں نیز عقل و استدلال کی کسوٹی پر پرکھیں''۔ ۷

راجہ رام موہن رائے جدید علوم کے حامی تھے۔ انھوں نے کہا کہ انسانوں کو اپنی عقل کا استعمال کرنا چاہئے اور ایسی چیزیں جو سماج کی خوشیوں کے منافی ہوں یا انسانی عقل و دانش کی گراوٹ کا سبب بنتی ہوں ان کے خلاف آواز اٹھانا حق بجانب ہے۔ وہ مغربی تہذیب سے متاثر تعلیم یافتہ ہندوؤں کے نمائندہ تھے۔ ضرورت کے تحت وہ ہندومت کے اصولوں میں ترمیم کے قائل تھے۔ اس پر انھیں تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ کیوں کہ کچھ تعلیم یافتہ لوگوں کا ماننا تھا کہ روایتی ہندو مذہب اور تہذیب میں کوئی ردو بدل کی گنجائش نہیں اور یہ ہر عہد کی ضرورتوں کے لیے مکمل ہے۔

رونددرناتھ ٹیگور کے والد دیوندر ناتھ ٹیگور نے راجہ رام موہن رائے کی اس کوشش کو سراہا اور ۱۸۴۳ء میں انھوں نے برہموسماج میں دوبارہ روح ڈال کر اس کے ذریعہ سماج میں مروجہ برائیوں کو ختم کرنے کی مہم تیز کر دی۔

۱۸۶۶ء میں کشیب چندر سین کی رہنمائی میں برہموسماج کا کام عروج پر تھا۔ پورے مالک میں اس کام کی تبلیغ کے لیے ایک سو چوبیس ادارے قائم کیے گئے۔ نتیجتاً ۱۸۷۲ء میں ایک ایکٹ وجود میں آیا جس کے تحت کثرت ازدواج اور بچپن کی شادی پر پابندی عائد کر دی گئی۔ اس کے علاوہ مختلف ذاتوں کے

درمیان شادی بیاہ کی شروعات ہوئی۔ اور بیواؤں کی شادیوں کو بھی جائز قرار دیا گیا۔ ارجن دیو لکھتے ہیں:

> ''برہموسماج کا ایک اہم کارنامہ ۱۸۷۲ء میں برہموشادی ایکٹ کا نفاذ تھا۔ اس قانون کی رو سے کثرت ازدواج اور بچپن کی شادی پر پابندی لگا دی گئی۔ نیز مختلف ذاتوں کے درمیان شادی بیاہ اور بیواؤں کی شادی کو تسلیم کر لیا گیا۔ حالانکہ اس ایکٹ کا نفاذ ایک چھوٹے سے گروہ تک ہی محدود تھا تاہم یہ سماجی اصلاح کی سمت ایک اہم قدم تھا''۔۸

ایشور چندو ودیا ساگر کا نام بھی اس دور کے مصلحین میں اہمیت کا حامل ہے۔ مغربی تہذیب سے لگاؤ ہونے کے باوجود مشرقی تہذیب کی اچھائیوں کو بہ نظر استحسان دیکھتے تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ مشرقی اور مغربی دونوں ہی تہذیبیں خامیوں سے پاک نہیں ہیں۔ ان خامیوں سے قطع نظر ان کی اچھائیوں کو اپنی زندگی میں اپنانا چاہیئے۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ انسانیت دیگر تمام چیزوں سے بالاتر رہے۔ انھوں نے ذات پات کو بھی بے بنیاد قرار دیا ہے۔ سنسکرت جس پر صرف برہمنوں کا قبضہ تھا۔ اسے عام لوگوں میں رائج کیا۔ ۱۸۵۵ء میں انھوں نے عورتوں کی فلاح و بہبود کے لیے آواز اٹھائی۔ بیوہ عورتوں کی شادی کا جشن کلکتہ میں ان کی سرپرستی میں منعقد ہوا۔ بچپن کی شادی اور تعدد ازدواج کے خلاف نعرہ دیا۔ لڑکیوں کو جدید تعلیم سے مزین کرنے کی غرض سے انھوں نے ایک اسکول کھولا جس کا نام ( Bethune School ) تھا۔ شروع میں تو لوگوں نے بڑا واویلا مچایا اور جم کر اس کی مخالفت کی مگر بعد میں جیسے جیسے تعلیم کی اہمیت اور اس کے فوائد کا احساس ہوا تو لوگ خود ہی اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

اس دور کے ایک اور مصلح رام کرشن پرم ہنس بھی ہیں انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ خدا کی ذات کا عرفان حاصل کرنے کے بہت سے طریقے ہیں۔ انسان خدا کی ذات کا مظہر ہے۔ لہٰذا ایک انسان اگر دوسرے انسان کی خدمت کرتا ہے تو ایک طرح سے وہ خدا کی خدمت ہے یعنی ایک دوسرے کی خدمت کرنا خدا کی خدمت کے مترادف ہے۔ ان کے سب سے اہم اور خاص شاگرد وویکانند تھے جو ۱۸۶۱ء میں پیدا ہوئے۔ سوامی وویکانند ویدوں کے علاوہ ہندو مذہب کی تمام بہترین روایات کے احیاء میں یقین رکھتے تھے۔ رام کرشن پرم ہنس کی وفات کے بعد وویکانند نے استاد کی تعلیمات کے فروغ کے لیے ''رام کرشن مشن'' قائم کیا اور اس کے ذریعے اپنے استاد کی فکر کو لوگوں تک پہنچانے کا کام انجام دیا سوامی

وویکانند ایک مفکر، مدبر اور دانشور شخص تھے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ مصلح قوم بھی تھے۔ انھوں نے کہا کہ ہندو دھرم کوئی دھرم نہیں بلکہ اصل سناتن دھرم ہے۔ انھوں نے ''ویدانت'' کا فلسفہ پیش کیا جس کی رو سے وہ بت پرستی اور ہزار مخلوقات کو بھگوان اور ایشور ماننے کے زبردست مخالف تھے۔

ویدانت کے پس منظر میں وہ ہر ایک شئے میں خدا کے وجود کو دیکھتے ہیں اور سارے وجود میں وہ خدا کا تصور کرتے ہیں۔ جسے اہل تصوف وحدۃ الوجود کا نام دیتے ہیں۔ اسی لیے انھوں نے انسان دوستی پر زور دیا۔ علم کے متعلق ان کا ماننا تھا کہ ایسا علم جو عمل سے خالی ہو اس کا کوئی مطلب نہیں یعنی عمل کے بغیر علم کی تکمیل نہیں ہوسکتی۔ اس زمانے میں کچھ مذہبی پیشواؤں نے ملک سے باہر جانے پر پابندی لگادی تھی۔ وویکانند اس کے حق میں نہیں تھے بلکہ پرزور لفظوں میں اس کی مخالفت کی۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح کی پابندی سے انسان کا ذہن کند ہو جائے گا۔ لہذا ہمیں اپنے فکری جمود و تعطل کو توڑنا ہوگا اور دنیا کے دیگر ممالک سے رابطہ کر کے ایک دوسرے کو اپنی فکر اور خیالات سے واقف کرنا ہوگا تب جا کر ہم دنیا کے شانہ بہ شانہ چل سکیں گے۔ اس کے لیے خود انھوں نے بہت سارے ترقی یافتہ ملکوں کا دورہ کیا اور کہا کہ ویدانیت صرف ہندوؤں کا ہی نہیں بلکہ تمام انسانوں کا مذہب ہے۔ مغرب کی اقتصادی خوشحالی اور وہاں کی عورتوں کے مقام و مرتبہ کو دیکھ کر وہ کافی متاثر ہوئے تھے۔ آپ کی شخصیت قوم پرستی اور قوت عمل کا مجموعہ تھی جو لوگوں لے لیے مشعل راہ ہے۔

## آریہ سماج تحریک

''آریہ سماج تحریک'' کا شمار اس وقت کی اہم اور مقبول ترین تحریکوں میں ہوتا ہے یوں تو یہ ایک مذہبی تحریک تھی اور ہندو مذہب کی ترویج و اشاعت میں اس تحریک کا رول رہا ہے ''ویدوں کی اور لوٹو!'' اس نعرہ سے اس تحریک نے سناتن دھرم نشاۃ ثانیہ کی کوشش کی اور سناتن دھرم کو پھیلانے کی کوشش کی۔ ۱۸۷۵ء میں سوامی دیانند سرسوتی نے اس تحریک کا آغاز کیا تھا۔ جب انھوں نے دیکھا کہ ہندو مذہب اور ہندو تہذیب کو کچھ خود غرض اور جاہل برہمنوں نے اپنے ذاتی مفاد کے لیے مسخ کر دیا ہے تو انھیں بہت تکلیف ہوئی۔ وہ وید کو ایک الہامی کتاب تصور کرتے تھے اور ساتھ ہی اس بات کے قائل بھی تھے کہ اس میں مختلف علوم کا ذخیرہ ہے مگر پران کو جھوٹی تعلیمات کا مجموعہ سمجھتے تھے۔ اس تحریک کے ذریعے انھوں نے ہندو

مذہب میں درآئیں مختلف خامیوں کی طرف نشاندہی کی اور انھیں مذہب سے دور کرنے کی کوشش کی۔ بت پرستی کو چھوڑ کر ایک خدا کی پرستش کو صحیح قرار دیا۔ ذات پات کی تفریق کو ختم کر کے تمام ہندوؤں کو متحد کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ دیگر مذاہب کے متعلق جانکاری حاصل کرنے اور مغربی علوم سیکھنے پر زور دیا۔ کیوں کہ اس کے بغیر دوسروں کو سمجھنا اور سمجھانا ناممکن ہے۔ ڈاکٹر طیبہ خاتون آریہ سماج کے کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتی ہیں:

''آریہ سماج کی تعلیمات چند اصولوں پر مبنی ہیں جن میں سماج کے عام مفاد کو مقدم سمجھا گیا اور اس طرح تحریکات انگریزی تعلیم اور نئے خیالات کی اشاعت سے مذہبی جوش وخرش کو اعتدال پر بھی لے آئیں اور سماج کے سدھار کے لیے بہتر سے بہتر حکمت عملی وضع ہوسکی''۔۹

سید عابد حسین آریہ سماج کی اہمیت وافادیت اور مقصدیت کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

''اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ ہندومت سے پورانک عہد کی دوراز کار روایات پیچیدہ معاشرتی ادارات اور ویدانت کے دقیق اور نازک خیالات کو خارج کر کے صرف ویدک عہد کے سیدھے سادے عقائد اور رسوم کو رہنے دیا جائے اور ان کی بنیاد پر ایک نئی تہذیب قائم کی جائے جو حتی الامکان قدیم ترین ویدک تہذیب کا نمونہ ہو''۔۱۰

## تحریکِ دلّی کالج

فورٹ ولیم کالج کی طرح دلی کالج کا قیام کرنے والے بھی انگریز تھے۔ دلی کالج نے تعلیمی بیداری کے سلسلے میں اہم کارنامہ انجام دیا۔ اس کالج کا بنیادی مقصد فورٹ ولیم کالج کے بنیادی مقصد سے بالکل برعکس تھا۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام کا مقصد انگریزوں کو ہندوستانی زبان سکھنا تھا جب کہ اس کالج کا بنیادی مقصد ہندوستانی طلباء کو انگریزی تعلیم سے روشناس کرانا تھا اس سلسلہ میں علی احمد فاطمی یوں رقم طراز ہیں:

''لیکن بنیادی طور پر دونوں میں یہ فرق تھا کہ فورٹ ولیم کالج انگریزی طلباء کو ہندوستانی زبان سکھانے کے لیے قائم کیا گیا تھا اور دہلی کالج ہندوستانی طلباء کو

انگریزی تعلیم سے واقف کرانے کے لیے قائم کیا تھا۔''۱۱

اس کالج کی بنیاد ۱۸۲۵ء میں پڑی۔ مسٹر ٹیلر اس کے سکریٹری اور پرنسپل مقرر ہوئے ابتداء میں اس کالج میں مشرقی تعلیم کے طرز پر عربی، فارسی نحوصرف، فقہ وحدیث وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی ساتھ ہی ساتھ علوم مفیدہ جدیدہ ریاضی، تاریخ اور سائنس جیسے مضامین پر بھی خاص توجہ دی جاتی تھی۔ تین سال کے بعد اس میں انگریزی شعبہ بھی کھل گیا۔ اعتمادالدولہ نے وقف کے نام سے ایک خطیر رقم ایک لاکھ ستر ہزار روپئے اس کالج کو عطا کی جس سے کالج کے تمام شعبوں نے منظّم ہو کر اپنا کام انجام دینا شروع کیا۔ اس کالج میں جب انگریزی شعبہ قائم کیا گیا۔ تو مشرقی علوم وفنون کے ماہرین نے اس پر سخت نقطہ چینی بھی کی اور کہیں نہ کہیں وہ مقصد بھی فوت ہوتے دیکھا جس کے لیے اتنی لمبی رقم کالج لے لیے وقف کی گئی تھی۔ جس کا مقصد محض علوم مشرقی کو فروغ دینا تھا۔ لیکن کہیں نہ کہیں یہ نیک فال ثابت ہوا جس کے نتیجہ میں کالج میں مشرقی ومغربی تعلیم دونوں نہایت ہی زور وشور کے ساتھ آگے بڑھنے لگیں۔ دونوں زبانوں کی خصوصیات ابھر کر سامنا آنے لگیں۔

کالج کو اپنے قیام سے لے کر ۱۸۵۷ء تک مختلف نشیب وفراز سے گزرنا پڑا۔ ۱۸۵۷ء میں کالج بری طرح متاثر ہوا۔ اس کے بعد تقریباً ۱۸۶۴ء میں پھر قائم ہوا۔

دلی کالج ہندوستانیوں کی تعلیم کے لیے ایک اہم کالج تھا اس کالج کی سب سے اہم خصوصیت یہ رہی ہے کہ اس کالج میں ہر طرح کے مضامین چاہے وہ فلسفہ ہو یا سائنس، ریاضی ہو یا تاریخ سب کی تدریس بذریعہ اردو (Urdu Medium) دی جاتی تھی اس طرح سے اردو نثر کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا جب مشرقی ومغربی علوم وفنون ایک دوسرے سے تبادلہ کر رہے تھے۔ اور ایک دوسرے کی جزیات وکلیات اور خصوصیات کا لین دین کر رہے تھے۔ اس کالج میں علوم وفنون کے اعلیٰ اور روشن دماغ اساتذہ تھے جن میں سے ماسٹر رام چندر، پیارے لال آشوبؔ، مولوی کریم الدین، امام بخش صہبائی وغیرہ کے نام خصوصیت کے حامل ہیں۔ اور اس کالج سے مولوی ذکاءاللہ مولانا محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد جیسے ذہین و فطین ادب اور سماج کا رُخ موڑنے والے طلباء نکلے۔

دلی کالج نے اس وقت کے علمی، ادبی اور سماجی فضا کو ہموار کرنے میں ایک اہم کارنامہ انجام دیا۔

اور بہت حد تک ہندوستانیوں کی سوچ وفکر کو نئی روشنی عطاء کی۔ دلی کالج کی خصوصیت اور اس کی مقبولیت کو تسلیم کرتے ہوئے ڈاکٹر منظر اعظمی لکھتے ہیں کہ:

''دلی کالج کی ان خصوصیات کے باوجود یہ دہلی میں انگریزی اثرات کا سب سے بڑا منبع تھا جو تھوڑے ہی عرصے میں ایک علمی اور تعلیمی ادارے سے ایک تہذیبی اور ثقافتی مرکز بن گیا۔''۱۲

۱۸۴۱ء میں کالج کے پرنسپل اور دلی کی مجلس تعلیمات عامہ کے سکریٹری فلیکس بوتر ومقرر ہوئے۔ ان کی سوچ تھی کہ دیسی زبان ہی کے ذریعہ تعلیم دینی چاہیے۔ مگر انھیں نصابی کتب کی ضرورت کا احساس ہوا اس لیے ان کی کوشش سے ۱۸۸۳ء میں دلی ٹرانسلیشن سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا۔ جیسا کہ منظر اعظمی تحریر کرتے ہیں:

''اس کا اصل نام تھا دی سوسائٹی فار دی پرموشن آف نالج آف ورنا کولر لینگویجز The Society for the Promotion of Knowledge of Vernacular Languages اس سوسائٹی نے مغربی علوم وفنون سے اردو دنیا کو روشناس کرایا۔ مختلف سماجی اور سائنسی علوم کی درس وتدریس میں جو کام کالج انجام دے رہا تھا اس میں سہولت ملی زبان، شعر وشاعری، نثر اور دوسرے علوم مثلاً تاریخ، سائنس، جغرافیہ، معاشیات فلسفہ اور ریاضی وغیرہ علوم کو حاصل کر کے ہندوستانیوں خصوصاً اہل اردو کا ذہنی افق وسیع ہوا اور اردو زبان میں وہ اہل علم سامنے آئے جنھوں نے انشائیہ، تمثیل نگاری، ناول، صحافت، فن ترجمہ، تنقید وتحقیق جیسے علوم کی ابتداء کی اور ایسے معیاری کام سامنے آ گئے جس سے اردو کو ذریعہ تعلیم کے طور پر استعمال کرنے میں بڑی آسانی ہو گئی''۔۱۳

اس طرح دلی کالج کا قیام ہندوستانیوں کی جدید تعلیم کے لیے پیش خیمہ ثابت ہوا اور اس میں پڑھنے والے بہت سارے ہندوستانیوں نے مغربی علوم وفنون سے استفادہ کیا اور ان کو بھی اپنی ترقی وترویج کا ہلکا سا اشارہ دیکھنے لگا۔

## سرسید تحریک

ہندوستان کی تعلیمی، سماجی اور ادبی تاریخ میں سرسید تحریک کی حیثیت سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ سرسید کی یہ تحریک صرف ادبی تحریک نہیں بلکہ سیاسی، مذہبی، سماجی، تہذیبی اور تعلیمی تحریک تھی۔ سرسید نے بھی جس زمانہ میں شعور کی آنکھیں کھولی تھیں وہ بھی ایسا ہی پرآشوب زمانہ تھا۔ انھوں نے مسلمانوں کی موجودہ صورت حال کا بغور مطالعہ و مشاہدہ کیا اور ان کی نشاۃ الثانیہ کے لیے فکرمند ہوئے۔ سرسید ایک ذہین و فطین اور حساس طبیعت کے مالک تھے آپ کی  دوررس نگاہیں ماضی اور ماحول کے تناظر میں مستقبل میں بھی دور تک دیکھتی تھیں۔ ان کو اپنے ملک اور قوم وملت کی ترقی کا راز انگریزی تعلیم میں دکھتا تھا۔ انھوں نے نہایت ہی دوراندیشی کے ساتھ انگریزوں کے تصادم کے بجائے مفاہمت کا راستہ اختیار کیا۔ انھوں نے غازی پور میں انگریزی اسکول اور سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی جو بعد میں علی گڑھ منتقل ہوگئی۔ سرسید مغربی اقوام کی ترقی اور عروج کا راز جاننے کے لیے اپنے بیٹے کے ہمراہ انگلستان بھی گئے۔ اور وہاں بغور ان سبھی چیزوں کا مشاہدہ کیا جو قوموں کے عروج وترقی کا سبب بنتی ہیں۔

> ''ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے سیاسی مفاہمت، جدید تعلیم اور مذہبی اصلاح کو علی گڑھ تحریک کے بنیادی مقاصد میں شامل کیا ہے۔ اور ڈاکٹر انور سدید نے لکھا ہے کہ حقیقت یہ ہے کہ علی گڑھ تحریک کا اہم تریں مقصد ہندوؤں اور انگریزوں کی سیاسی مفاہمت کے دور میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا احیاء اور نئے تقاضوں کے مطابق مسلمانوں کی ترقی، بقا اور سربلندی کے لئے مثبت راستے کا تعیّن تھا۔''[14]

سرسید نے مسلمانوں کی تعلیمی بیداری کے لیے ''تہذیب الاخلاق'' نامی رسالہ جاری کیا۔ جس نے زمانہ سے سوئی ہوئی قوم کو بیدار کرنے کے لیے جھنجھوڑنے کا کام کیا۔ ''تہذیب الاخلاق'' میں ہر طرح کے سیاسی، سماجی، مذہبی، معاشرتی اور علمی مضامین کو جگہ دی گئی۔ اس رسالہ کے ذریعہ سرسید نے اپنے نظریات وافکار کو عوام الناس کے سامنے پیش کیا۔ جس سے اس زمانہ کے اہل علم کے درمیان ایک بھوچال سا آ گیا۔ بہت سارے اہل علم ان کے افکار سے متفق ہوئے تو بہت سارے مذہبی رہنماؤں نے ان کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ حتٰی کہ ان پر کفر کے فتوے بھی جاری کیے گئے۔

سرسید کے بہت سارے ہم خیال وہم افکار علماء اور دانشور حضرات بھی تھے جو رفقائے سرسید کے نام سے مشہور معروف ہیں۔ جن میں مولانا الطاف حیسن حالی، مولانا شبلی نعمانی، ڈپٹی نذیر احمد، مولوی ذکاء اللہ، مولوی چراغ علی، نواب محسن الملک کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ یہ سبھی صاحب تصانیف ہیں۔ ان لوگوں نے سرسید کے افکار ونظریات کی تشہیر کی اور ہندوستانی سماج کو بہت حد تک تبدیل بھی کیا۔ ان کے مابین غرض کہ کچھ جزوی ونظریاتی اختلافات تھے لیکن یہ سبھی لوگ قوم کی تعلیم اور اس کے عروج وترقی کے خواہاں تھے اور دردمند بھی۔ نذیر احمد بھی سرسید تحریک کے ایک اہم رکن تھے۔ اس لیے اس تحریک کا اثر ان کی حیات، تصنیفات وتالیفات میں دیکھنے کو ملتا ہے۔

تحریک کے سبھی ارکان مسلمانوں کی زبوں حالی، تعلیمی پستی، اخلاقی اقدار کی نیستی، معاشی بدحالی سے کافی متفکر تھے۔ سرسید اس اصول پر کاربند تھے کہ فاتح اور ترقی پسند قوموں سے مخالفت نہ کرکے ان کے ساتھ باہمی ربط وضبط بڑھا کر ان سے ان کے علوم وفنون سیکھے جائیں اور ان علوم وفنون کو حاصل کرکے خود کو ان کے ہم پلہ بننے کی کوشش کی جائے۔ چنانچہ اسی کو مدنظر رکھتے ہوئے انھوں نے اپنی اس تحریک کے ذریعے مسلمانوں کی تعلیمی، سیاسی اور سماجی صورت حال کو بدلنے کی کوشش کی جس کا اثر آج تک دیکھنے کو ملتا ہے۔ سرسید نے اپنی سوچ اور فکر سے جو بیج بویا تھا۔ ہزار آندھیوں اور بادمخالف کی تیزی وتندہی کے باوجود وہ ایک تناور درخت کی صورت میں قائم ودائم رہا۔ اور آج تک اس درخت کے پھل کے ذائقے محسوس کیے جارہے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید سرسید تحریک کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''سرسید احمد خاں کی تحریک اس لئے اہم ہے کہ اس کا آغاز محکومی کا دائرہ مکمل ہوجانے کے بعد ہوا اور اس تحریک نے مسلمانوں کا جمود اور غلامی کا حصار توڑ کر مستقبل کی تعمیر کی ذمہ داری قبول کی۔ اس لحاظ سے علی گڑھ تحریک مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کی فکری تحریک تھی۔''۱۵

## حوالہ جات


۱۔سماج شاستر،ایس پی گپت،ڈاکٹر گوپال کرشن اگروال۔ص:۲

۲۔سماج شاستر،ایس پی گپت،ڈاکٹر گوپال کرشن اگروال۔ص:۲

۳۔سماج شاستر،ایس پی گپت،ڈاکٹر گوپال کرشن اگروال۔ص:۴۳

۴۔ادب اور سماج،احتشام حیسن۔ص:۲۰

۵۔تہذیب کی کہانی جلد دوم،ارجن دیو۔ص:۱۷۱

۶۔قومی تہذیب کا مسئلہ،سید عابد حیسن۔ص:۱۶۳

۷۔تہذیب کی کہانی جلد دوم،ارجن دیو۔ص:۱۷۲

۸۔تہذیب کی کہانی جلد دوم،ارجن دیو۔ص:۱۷۳

۹۔اردو میں ادبی نثر کی تاریخ ۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء،ڈاکٹر طیبہ خاتون۔ص:۷۳۔۷۴

۱۰۔قومی تہذیب کا مسئلہ،سید عابد حسین۔ص:۱۷۴

۱۱۔عبدالحلیم شرر بحثیت ناول نگار،پروفیسر علی احمد فاطمی۔ص:۱۷

۱۲۔اردو ادب کے ارتقاء میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ،منظر اعظمی۔ص:۱۰۵

۱۳۔اردو ادب کے ارتقاء میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ،منظر اعظمی۔ص:۱۰۴

۱۴۔اردو ادب کی تحریکیں ابتدا تا ۱۹۷۵ء،ڈاکٹر انور سدید۔ص:۳۰۹

۱۵۔اردو ادب کی تحریکیں ابتدا تا ۱۹۷۵ء،ڈاکٹر انور سدید۔ص:۲۶۰

# باب سوم

# اُردو ناول میں ڈپٹی نذیر احمد کی انفرادیت

## نوآبادیاتی ہندوستان کا منفرد ناول نگار: ڈپٹی نذیر احمد

شمس العلماء مولوی ڈپٹی نذیر احمد کا شمار سر سید کے اربابِ خمسہ میں ہوتا ہے۔ان کی شخصیت بڑی پہلو دار تھی۔وہ عالم دین تھے، مترجم قرآن تھے، قانونی کتابوں کے کامیاب مترجم، اردو کے ادیب، ناول نگار اور اپنے زمانے کے بلند پایہ خطیب اور مقرر تھے۔انہوں نے جس محنت، ہمت، لگن اور پامردی سے سر سید کے منصوبوں کو آگے بڑھایا۔خواجہ الطاف حسین حالؔی کے علاوہ سر سید کے دوستوں میں شاید ہی کسی اور نے اتنی لگن سے کام کیا ہو۔

اردو ناول میں ڈپٹی نذیر احمد کا منفرد مقام ان کے ناولوں کی وجہ سے ہے۔انہوں نے اپنے ناولوں کے ذریعے ادب اور سماج کا رخ موڑ دیا۔انہوں نے پہلی بار داستانی ادب لکھنے کا ارادہ ترک کیا اور ناول لکھنے کی ابتدا کی۔اس طرح وہ اردو ناول کے بانی مانے جاتے ہیں۔انہوں نے حقیقی زندگی کے مسائل اپنے ناول میں پیش کئے۔اور اپنے عہد کے سماجی مسائل اپنے ناولوں کا مواد بنایا۔ڈپٹی نذیر احمد نے تعلیم کو اردو ناول کا پہلا موضوع بنایا۔یعنی اردو ناول کی ابتدا تعلیم کے موضوع سے ہوئی۔ڈپٹی نذیر احمد تعلیم کے ذریعے مثبت سماجی تبدیلی لانے کے خواہشمند تھے اور تعلیم کے ذریعے ہی فکری انقلاب لانا چاہتے تھے۔کیونکہ وہ قوم کی ترقی کے لیے تعلیم کو بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے۔انہوں نے تانیثیت کا منشور مرتب کیا۔ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کی عصری معنویت ہمیشہ قائم و دائم رہی گئی۔ڈپٹی نذیر احمد کی تقلید میں ناول نگاروں کی ایک بڑی کھیپ سامنے آئی جنھوں نے نذیر احمد کے نقش قدم پر چل کر ناول لکھے جن میں حالؔی، راشد الخیری، شاد عظیم آبادی، رشیدۃ النساء بیگم وغیرہ شامل ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد کا عہد نوآبادیات کا عہد تھا جب انگریزوں نے ہندوستان کو اپنی نوآبادی یا کالونی بنایا تھا اور نوآباد کار کی حیثیت سے یہاں کی عوام کو اپنا غلام بنایا یوں استعمار کار اور استعمار زدہ، حاکم اور محکوم ، فاتح اور مفتوح، آقا اور غلام کا رشتہ مظبوط کیا۔

جنگ پلاسی ۱۷۵۷ء کے بعد نوآبادیاتی حکمران پورے برصغیر پر قابض ہونا شروع ہو گئے لیکن برصغیر کی عوام کے دلوں میں نفرت کی چنگاریاں مسلسل بھڑکتی رہیں، ان چنگاریوں نے آہستہ آہستہ شعلوں

میں تبدیل ہونا شروع کر دیا اور استعماری یا نوآبادیاتی نظام کے خلاف نفرت کا یہ لاوا ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی صورت میں نمودار ہوا لیکن یہاں بھی ناکامی کا سامنا پڑا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد انتقامی کارروائیوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا جن کا سامنا صرف مسلمانوں کو ہی کرنا پڑا۔ اس کے بعد سرسید احمد خان نے رسالہ 'اسباب بغاوت ہند' لکھ کر مسلمانوں کے لیے انگریزوں کے دلوں میں مفاہمت پیدا کرنے کی کوشش کی جو کافی حد تک کامیاب رہی۔ آزادی کی تحریک برصغیر تک ہی محدود رہی بلکہ افریقہ تک اس کی گونج سنائی دینے لگی۔ اس وقت افریقہ بھی برطانوی استعماری نظام یعنی ایک نوآبادی کی صورت میں زیر تسلط تھا۔ افریقہ میں آزادی کی تحریک نے اس وقت زور پکڑا جب مہاتما گاندھی کو ڈربن سے پری ٹوریو جاتے ہوئے آدھی رات کے وقت ٹرین کے فرسٹ کلاس ڈبے سے Pieter Maritzburg کے اسٹیشن پر یہ کہہ کر اتار دیا گیا کہ کوئی ہندوستانی فرسٹ کلاس ڈبے میں سفر نہیں کر سکتا۔ مہاتما گاندھی نے افریقہ میں آزادی کی تحریک کی ابتدا کی اور اس تحریک نے برصغیر میں شروع ہونی آزادی کی تحریک میں مزید شدت پیدا کی اس کے بعد برصغیر سیاسی انتشار کا شکار ہوا اور استعماری حکمرانوں کے ظلم کے ساتھ ساتھ برصغیر میں سیاسی ہلچل شروع ہوگئی۔ سیاسی رہنماؤں کی گرفتاریاں، ہنگامہ آرائی، جلاؤ گھیراؤ، استعماری نظام حکومت کے خلاف جلسے اور جلسوں پر پابندیاں، ۱۹۱۹ء کی تحریک خلافت اور ۱۹۱۹ء میں ہی ناقابلِ فراموش سانحہ جلیانوالہ باغ وغیرہ نے برصغیر کی سیاسی تاریخ کا رخ موڑ دیا لہذا ان حادثات نے سماج، صحافت، ادب پر اپنے گہرے اثرات ثبت کیے۔

اردو ادب میں نوآبادیاتی نظام کے خلاف بھرپور آواز اٹھانے والوں میں اردو فکشن نگاروں کا کردار انتہائی اہم اور نمایاں رہا ہے۔ خاص کر ترقی پسند فکشن نگاروں کا رول سب سے اہم رہا ہے۔ اردو فکشن نگاروں نے برصغیر کی عوام کے جذبات واحساسات کی بھرپور اور خوبصورت انداز سے عکاسی کی ہے۔ ان فکشن نگاروں میں ایک نام ڈپٹی نذیر احمد کا ہے جن کے لکھنے کی ابتدا ہی نوآبادیاتی نظام کے زیر اثر ہوئی۔ یہاں اس بات کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ افسانوں میں استعماریت کے خلاف بغاوت کا موضوع کوئی نیا نہیں ہے بلکہ اردو افسانے کی ابتدا ہی نوآبادیات کے خلاف لکھے جانے والے افسانوں سے ہوئی اور پھر اردو افسانہ ۴۵ سے ۵۰ سال تک استعماریت کے دور میں ہی لکھا جاتا رہا۔ پریم چند کا پہلا افسانوی مجموعہ"

سوز وطن'' نوآبادیات کے خلاف کھلم کھلا بغاوت تھی۔البتہ دوسری اصناف ادب کا معاملہ اس کے برعکس ہے وہاں نوآبادیاتی نظام کے خلاف آواز نہیں اٹھائی گئی یا اس کے خلاف اظہار مبہم طریقے سے کیا گیا۔افسانے سے پہلے دوسری اصناف موجود تھیں جیسے ڈراما، داستان، ناول۔غزل، مضمون نگاری وغیرہ لیکن ان میں نوآبادیات کے خلاف آزادانہ اظہار نہیں کیا گیا بلکہ پیچیدہ اور مشکل علامتی اور استعاراتی انداز اپنایا گیا ہے۔

نذیر احمد کا دور اصلاحی تحریکوں کا دور تھا۔مسلمانوں کی مذہبی، اخلاقی، سماجی، سیاسی اور تعلیمی زندگی میں جو خرابیاں پیدا ہوگئیں تھیں۔ان کے خلاف ہندوستان میں کئی تحریکیں وجود میں آئیں۔۱۸۵۷ء کے واقعہ نے ہندوستان کے مسلمانوں کو جھنجوڑ کے رکھ دیا۔مغلیہ سلطنت کے اختتام کے بعد انہیں اس بات کا احساس ہوا کہ ان کے فیصلوں کا مالک اب کوئی دوسری حکمران قوت ہے۔اس دوسری قوت نے ظلم کی انتہا کی۔یوں تو انیسویں صدی شروع ہونے سے پہلے ہی ہندوستان کے مختلف علاقوں پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکمرانی کا پرچم لہرانے لگا۔لیکن ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی ایک فیصلہ کن جنگ تھی۔اس سے نہ صرف مرکز تک پیش قدمی کے لئے دروازے کھل گئے تھے بلکہ انگریزی حکومت کے تسلط کے حدود وسیع ہوئے اور جڑیں بھی مظبوط ہوئیں۔۱۸۶۴ء کی بکسر کی لڑائی نے رہا سہا بھرم بھی ختم کر دیا۔کمپنی اب ایک تجارتی ادارہ سے بڑھ کر سیاسی قوت بن گئی تھی۔اس نے اپنے سیاسی عزئم کو پورا کرنے کے لیے ہر طرح کی تدبیر اختیار کی یہاں تک کہ ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک فاتحانہ شان سے دہلی میں داخل ہوگیا۔غرض سیاسی یلغار کے ساتھ مذہبی، تہذیبی اور علمی و تعلیمی اثرات بھی مرتسم ہوتے جا رہے تھے۔اس دور میں جہاں دوسرے لوگوں نے علم کے میدان میں عوام کی رہنمائی کی، وہیں ڈپٹی نذیر احمد بھی پیچھے نہ رہے۔انھوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے لوگوں کو جدید تعلیم کے حصول پر زوردار طریقے سے ابھارا تاکہ اس ترقی یافتہ دور میں وہ پیچھے نہ رہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد اردو ناول نگاری کی تاریخ میں ایک اہم نام مانا جاتا ہے۔وہ اردو ناول کے موجد بھی کہلاتے ہیں۔اردو زبان میں ان ہی کے مبارک ہاتھوں سے ناول کی داغ بیل پڑی ہیں۔اردو میں ناول کی سنگِ بنیاد ڈالنے کی وجہ سے ڈپٹی نذیر احمد کا نام ہمیشہ اردو ادب میں یاد رکھا جائے گا۔مولوی نذیر احمد

جنھیں بعض لوگ ڈپٹی نذیر احمد کہنا پسند کرتے ہیں ،ایک ایسے ادیب تھے جن کی شخصیت اور جن کا رنگِ تصنیف دوسروں سے منفرد تھا۔ یہ انفرادیت ان کے اکثر ناولوں کی روح میں مضمر ہے۔نذیر احمد نے سر سید کے بعد شاید سب سے زیادہ عام زندگی اور عام مسائل سے رابطہ رکھا۔انہوں نے اردو کو کل سات ناول دیے ہیں۔ان ناولوں کے موضوعات کا تعلق کسی نہ کسی سماجی مسئلے سے ہے اور سماجی مسائل نذیر احمد کی اپنی زندگی اور ہم سب کی زندگی ،زندگی کے تجربوں،نظریوں اور اصلاحی اعمال و افکار سے متعلق ہیں۔ان ناولوں میں نذیر احمد کی شخصیت اور انفرادیت کی چھاپ صاف صاف نمایاں ہے۔اور شخصیت کی تعمیر میں بچپن سے لے کر بڑھاپے تک کے تمام عوامل و محرکات کا عکس نظر آتا ہے۔ ہر ناول کوئی نہ کوئی اصلاحی مقصد رکھتا ہے اور ساتھ ہی ان ناولوں میں نذیر احمد کی ذاتی زندگی کے تجربات و مشاہدات ،دہلی کالج کی تعلیمی زندگی کے اثرات ،علی گڑھ کی تحریک اصلاح ،سر سیّد سے رفاقت اور نظریاتی اختلاف مگر اصلاحی پروگرام میں اتحاد و اتفاق یہ سب مل کر ناولوں کی تشکیل کرتے ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد کی ادبی زندگی کا آغاز ''مرأۃ العروس'' سے ہوا۔ یہ ناول انہوں نے ۱۸۶۹ء میں تصنیف کی۔اس وقت وہ ضلع جالون میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔اس کے بعد ۱۸۷۲ء میں ''بنات النعش'' اور پھر ۱۸۷۷ء میں ''توبۃ النصوح'' لکھی جس پر انہیں حکومت وقت سے انعامات بھی ملے۔یہ دونوں تصانیف انہوں نے گورکھپور اور اعظم گڑھ کی ملازمت کے زمانے میں تحریر کی تھیں۔ پھر ۱۸۷۷ء میں حیدر آباد چلے گئے۔حیدر آباد کی ملازمت کے دنوں میں نذیر احمد کو تصنیف و تالیف کا وقت نہیں ملا۔لیکن امیر کبیر کی فرمائش پر اعلیٰ حضرت کے لیے سات رسالے تصنیف کیے جو مال گزاری،عدالت،تعلیمات اور پولیس وغیرہ سے متعلق تھے۔ یہ رسالے نظام الملک بہادر کو امور انتظام ریاست سے آگاہی کے لیے لکھے گئے یہ سب رسالے حضور کو ایک ایک کر کے پڑھائے گئے۔اعلیٰ حضرت کو پڑھانے سے قبل یہ تمام رسالے انگریزی میں ترجمہ ہو کر ریزیڈنٹ کے سامنے پیش کئے گئے جسے انہوں نے بہت پسند کیا تھا۔

پنشن ملنے کے بعد جب انہوں نے دلی میں مستقل سکونت اختیاری کی تو انہوں نے ۱۸۸۵ء میں ''فسانۂ مبتلا'' اور ۱۸۸۸ء ''ابن الوقت'' ۱۸۹۱ء میں ''ایامیٰ'' اور ۱۸۹۴ء میں ''رویائے صادقہ'' لکھی۔ان تمام ناولوں میں انہوں نے تعلیم نسواں کی اہمیت، مذہب اور معاشرہ کی اصلاح اور علوم جدیدہ کی ضرورتوں

پر زور دیا ہے۔

ادبی کتابوں کے علاوہ مولانا نے بہت سی مذہبی کتابیں بھی تحریر کی ہیں۔انہوں نے ترجمۃ القرآن ،ادعیۃ القرآن ،دہ سورہ ،الحقوق والفرائض ،الاجتہاد اورامہات الامہ جیسی کتابیں بھی تحریر کی ہیں۔ان کی زیادہ تر کتابیں مثلاً مایغنیک فی الصرف ،منتخب الحکایات ،مبادی الحکمت اوررسم الخط خاص تعلیمی مقاصد سے لکھی گئیں جوطلباء کے لیے مفید ثابت ہوئیں۔

## داستان سے ناول تک

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی لکھتے ہیں:

''ناول داستان یا فسانے کی ایک زیادہ ترقی یافتہ نوعیت ہے۔اور اردو میں اس فن کو مستقل حیثیت دینے میں انگریزوں کا قابل قدر حصّہ رہا۔'' ۱

داستان جاگیردارانہ نظام کی دین ہے۔ناول نوآبادیاتی نظام اور سرمایہ دارانہ سماج کی پُر پیچ زندگی کی عکاس ہے۔داستان میں عموماً اخلاقی تعلیم وتربیت کا خیال رہاہے جبکہ ناول میں آج کے موجودہ سماج کے پُر پیچ مسائل کی مکمل عکاسی ہوتی ہے۔داستان میں واقعات کا بیان اور پلاٹ ہمیشہ بہت ڈھیلا دکھائی پڑتا ہے اس میں کوئی خاص تنظیم نہیں نظر آتی ۔اس کے برخلاف ناول کا پلاٹ بہت ہی منظّم اور مربوط ہوتا ہے۔ناول کا پلاٹ اسی دنیا کے جیتے جاگتے ، چلتے پھرتے انسانوں کی زندگی سے وابستہ ہوتا ہے۔داستان کا قصہ کسی ایسی دنیا کی کہانی ہوتی ہے جس میں زیادہ تر نہ تو انسانوں کے کردار ہوتے ہیں اور نہ انسانی حالات وواقعات،اس کا انحصار بیش تر خیالی اور فرضی دنیا پر ہوتا ہے جس میں غیر انسانی کردار اور غیر فطری واقعات کی بھرمار ہوتی ہے۔داستان میں جن، پری کے مافوق الفطرت کرداروں کے ذریعہ کام لیا جاتا ہے ۔جو داستان نویس کی مرضی اور خواہش کے مطابق کام کرتے ہیں جس میں انسانی زندگی کی عکاسی اور فطری آئینہ داری کا سوال ہی نہیں ہوتا۔

اردو میں ناول نوآبادیاتی عہد کی دین ہے۔ناول یہاں نوآبادکاروں کے ساتھ آئی اور ڈپٹی نذیر احمد نے پہلی بار ناول کو اردو ادب میں متعارف کروایا۔ڈپٹی نذیر احمد نے داستانی فضا کو توڑا اور معاشرہ کے ذہنی جمود کو حرکت بخشی ۔انہوں نے اپنے ناولوں میں معاشرتی مسائل کی طرف اشارہ کیا۔نذیر احمد نے

لوگوں کا ذہن سماجی مسائل کی طرف منتقل کیا۔ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی سماجی بصیرت ہے۔نذیر احمد کا قاری محسوس کرتا ہے کہ ان کے ناولوں کے ذریعہ اس دور کے ہندوستانی معاشرت کے بعض اہم پہلوؤں کی نقاب کشائی کی گئی۔ڈپٹی نذیر احمد نے انسانی زندگی کے مسائل کو اپنا موضوع بنایا ہے اور اُسے بڑی حُسن وخوبی سے پیش کر کے اردو میں صنف ناول کی بنیاد ڈالی۔سید علی عباس حسینی لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر نذیر احمد کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انھوں نے تمام قصّوں میں ہماری معاشرتی زندگی کی بالکل سچّی تصویر کشی کی ہے۔انھوں نے جن، پری، بھوت پریت ،جادو طلسم کے سے غیر انسانی عناصر کو ترک کر کے اپنے گرد وپیش کے لوگوں اور اپنی ہی طرح کے معمولی انسانوں کے حالات بیان کیے ہیں۔'' ۲

یہ ڈپٹی نذیر احمد کی خصوصیت ہے کہ انھوں نے اردو میں مروجہ غیر انسانی قصّوں، کہانیوں کو ترک کر کے انسانی زندگی کی سچّی تصویر پیش کی کیونکہ اُن کے ناولوں کا مقصد انسانی زندگی کی اصلاح تھا۔وہ اردو کے پہلے ناول نگار ہیں جس نے وقت اور زمانے کی رفتار کو سمجھ کر نئے حالات کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کی۔وہ نہ صرف سماجی زندگی کی اہمیت کے قائل تھے بلکہ وہ سماج کے فرد کی حیثیت سے سماجی ذمہ داری کو ادب کا مقصد قرار دیتے تھے۔انھوں نے اپنے ناولوں کی تخلیق مقصدی نقطۂ نظر سے کی ہے بلکہ بعض اوقات مقصدیت کے اثرات فنّی ضرورتوں پر غالب آ گئے ہیں چناچہ بسا اوقات اُن کا انداز بیان اور ادبی رویّہ واعظانہ ہو جاتا ہے۔مگر اس سے ان کی مقبولیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

### اردو کا پہلا ناول نگار: ڈپٹی نذیر احمد

ڈپٹی نذیر احمد سے قبل اردو میں ناول کے نقوش نہیں ملتے یہ بات اب تک کی تحقیق نے ثابت کی ہے۔اس لیے زیادہ تر ناقدیں نذیر احمد کو ہی پہلا ناول نگار تسلیم کرتے ہیں۔اگر چہ کچھ ناقدین نے اس سے اختلاف کیا ہے۔ڈاکٹر محمود الٰہی مولوی کریم الدین کی کتاب ''خطِ تقدیر'' کو(۱۸۶۲ء) اردو کا پہلا ناول کہتے ہیں جو مرأۃ العروس سے سات سال پہلے ۱۸۶۲ء میں شائع ہوا لیکن زیادہ تر ناقدین ڈاکٹر محمود الٰہی کی اس بات سے متفق نظر نہیں آتے کہ خطِ تقدیر اردو کا پہلا ناول ہے۔خط تقدیر ناول نہیں بلکہ ایک

تمثیلی قصہ ہے، تمثیلی قصہ کو ناول کے زمرے میں شامل نہیں کیا جاسکتا اس لئے کہ تمثیل ادب کے کسی ایک صنف سے مخصوص نہیں ہے تمثیلی قصے اور ناول کے فرق کو واضح کرتے ہوئے ڈاکٹر یوسف سرمست لکھتے ہیں:

''تمثیلی قصے اور ناول میں ایک بہت ہی اہم فرق ہے وہ یہ ہے کہ تمثیلی قصے کے زمان و مکان مطلق ہوتے ہیں اس لئے ان کا اطلاق کسی بھی زمانے اور کسی بھی مقام پر ہوسکتا ہے اس کے برخلاف ناول کے زمان و مکان حقیقی ہوتے ہیں اور ان کی نشاندہی آسانی سے کی جاسکتی ہے یہی وہ بنیادی فرق ہے جس کی وجہ سے تمثیلی قصے سے ناول الگ اور مختلف ہوجاتا ہے۔'' ۳

اکثر ناقدین ادب نے دلائل کے ذریعے سے اس بات کو واضح کیا ہے کہ اردو کا پہلا ناول ''خط تقدیر'' نہیں بلکہ ڈپٹی نذیر احمد کی تصنیف ''مرأۃ العروس'' اردو کا پہلا ناول اور نذیر احمد اردو کے پہلے ناول نگار ہیں۔ مظہر امام لکھتے ہیں:

''ڈپٹی نذیر احمد کے ناول ''مرأۃ العروس'' ۱۸۶۹ء کو عام طور پر اردو کا پہلا ناول قرار دیا گیا ہے۔'' ۴

اور اسی طرح ڈاکٹر وشنو گوپال سرشار کے فسانۂ آزاد کو اولیت دیتے ہیں۔ لیکن ان کے دعوے غلط ثابت ہوئے اور زیادہ تر ڈپٹی نذیر احمد کے حق میں ہے لہذا اختلافی رائے تحقیق و تنقید کی روشنی میں رد ہو جاتی ہے اور بالاتفاق نذیر احمد اردو ناول کے امام مانے جاتے ہیں اور اردو کا پہلا ناول مراۃ العروس (۱۸۶۹ء) قرار پایا۔ ڈاکٹر سہیل بخاری لکھتے ہیں:

''اردو میں ناول کی ابتدا مولوی نذیر احمد سے ہوتی ہے۔ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو افسانہ نگاری میں ایک نئی روشنی کی بنیاد ڈالی۔'' ۵

اس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اردو ناول نگاری میں نذیر احمد کی حیثیت ایک روشن مینارہ کی مانند ہے۔ وہ اردو ناول کے بنیاد گذار ہیں انہوں نے اردو میں ناول کی بنیاد رکھی ہے۔

## اردو ناول کا پہلا سماجی حقیقت نگار: ڈپٹی نذیر احمد

ڈپٹی نذیر احمد کا دُور داستانوں کا تھا لیکن ڈپٹی نذیر احمد کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے قصوں

میں داستان کے مافوق الفطرت عناصر کو یک لخت ختم کر دیا اور زندگی کے حقیقی واقعات کو جگہ دی۔ بعید از قیاس داستانوں کی جگہ اصلی واقعات اور صحیح معاشرت کو ناول کی صورت میں پیش کیا۔ داستان نگاری کی امتیازی خصوصیات یعنی حقیقت فراموشی اور اس کے فوق الفطرت عنصر کے حصار کو توڑ کر ناول کے امتیازی وصف یعنی حقیقت نگاری کو پہلی بار ہمارے سامنے پیش کیا۔اور لوگوں کو فرضی قصے سنائے اور حقیقی معاشرت کی جیتی جاگتی تصویر دکھائی جو ان کے گرد موجود تھی۔ حقیقی زندگی کی اسی پیش کش نے انہیں داستان گو سے ناول نگار بنا دیا۔ جب کہ انہیں کے عہد میں سرشار داستان لکھ رہے تھے۔

ڈپٹی نذیر احمد نے اس صنف کی ابتداء کرنے کے باوجود اردو ناول نگاری کو بعض ایسی صحت منداور مستحکم روایات دی ہیں کہ آج بھی اردو ناول نگاری ان سے کسی نہ کسی حد تک فائدہ اٹھا رہی ہے۔اردو کا پہلا ناول نگار ہوتے ہوئے بھی وہ ناول کے مغربی نقاد کے مطالبوں کو بہت حد تک پورا کرتے نظر آتے ہیں ۔اندرا مورا رقم طراز ہیں:

> ''حقیقی ناول کبھی صرف رومانی نہیں ہوتا۔ اس کے لیے حقائق کا سہارااور حقیقی سوسائٹی کا پس منظر ضروری ہے۔'' ۶

ڈپٹی نذیر احمد کے تمام ناول اپنے زمانے کے مختلف سماجی حقیقتوں کو پیش کرتے ہیں اور اپنے زمانے کے سماجی مسائل پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ایک ناول بھی ایسا نہیں جس میں انیسویں صدی کی سماجی زندگی اور اس زمانے کے مسلمان گھرانوں کی حقیقت پسندانہ اور ہو بہو تصویر کشی نہیں کی گئی ہو۔نذیر احمد کا مقصد دراصل معاشرے کی اصلاح کرنا تھالہذا انہوں نے زندگی کے حقائق اور اس کے ٹھوس پہلوؤں کو ہمیشہ سامنے رکھا۔خرابیوں کو اجاگر کیے بغیر سماج کو صحیح راہ دکھا ناممکن نہیں۔ حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد ہی اصلاح ممکن ہے۔

اردو ناول نوآبادیاتی نظام کی دین ہے۔اس سے پہلے اردو میں داستان کی صنف موجود تھی لیکن ڈپٹی نذیر احمد ایسی صنف کی تلاش میں تھے جو ان کی فکر اور خیالات کو لوگوں تک پہنچائیں۔ داستان لوگوں کو تو محظوظ تو کرتی تھی لیکن اس صنف کے اندر وہ توانائی نہیں تھی جو لوگوں کے ذہنوں کو بدلے، ان کے خیالات کو تبدیل کریں، ان کو جھنجھوڑ دے، لوگوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرے، لوگوں کو کاہلی کے بجائے

عمل پر مجبور کرے اور سماجی تبدیلی لانے میں راستہ ہموار کرے،لوگوں کوقوم کی ترقی اور فلاح و بہبود پر اکسائے،لوگوں میں ایک فکری انقلاب لائے ،مثبت سماجی تبدیلی کے لیےقوم کےضمیر کو جگائے ۔یہ کارنامہ ڈپٹی نذیر احمد نے ناول کی صنف سے لیا کیونکہ اس صنف میں یہ توانائی تھی اس نے قوموں کی تقدیر کوتبدیل کیا۔نذیر احمد کا مقصد اپنے ناولوں کے ذریعہ انسان اور سماج دونوں کا تبدیل کرنا تھا کیوں کہ:

''تمام اچھے ناولوں کا مقصد انسان کوتبدیل کرنا اور انسان کے ذریعے سماج کوتبدیل کرنا ہے۔'' ۷

ڈپٹی نذیر احمد نے یہ کارنامہ اپنے ناولوں کے ذریعے اس وقت کے معاشرے میں انجام دیا۔جس کے واضح اثرات انہی دنوں دیکھنے میں آئے۔ناول بے حد مقبول ہوئے اور گھر گھر پڑھے جانے لگے۔ان کے ناولوں کی تاثیر یہ تھی کہ اس زمانے میں لڑکیوں کی شادی کے وقت دلہن کو قرآن کے ساتھ ساتھ مرأۃ العروس بھی تحفے کے طور پر دیئے جاتے تھے کیونکہ قرآن کی ابتدا اقراء لفظ سے ہوئی اور مرأۃ العروس ناول کا موضوع بھی تعلیم ہی ہے اور لوگ ایک عرصے تک اصغری اور اکبری کے گھروں کو تلاش کرتے تھے۔ یہاں تک کہ حکومت وقت کے نصاب کا حصہ بنے اور انعام و اکرام کے مستحق بھی قرار پائے۔آئے نذیر احمد کے ناولوں کا جائزہ لیں۔

## عصری معنویت اور ڈپٹی نذیر احمد کے ناول

ڈپٹی نذیر احمد کے تمام ناولوں کا جائزہ لینے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ان کے تمام ناول اصلاحی اور مقصدی ہیں۔ چوں کہ نذیر احمد اردو ادب میں فن ناول نگاری کے موجد ہیں لہذا انہیں یہ آزادی حاصل تھی کہ وہ اس فن کو اپنی فہم وفکر کے مطابق ایک مخصوص سمت عطا کریں اور انہوں نے جس زاویے کو اپنایا وہ وقت کی سب سے اہم ضرورت تھی ۔ان کے ناولوں کی ضرورت آج بھی ہمارے معاشرہ کو ہے ۔آج اکیسویں صدی میں جب ہمارا معاشرہ تیزی سے اخلاقی بے راہ راوی کا شکار ہوتا جارہا ہے،تعلیم کے معنی ومفاہیم میں تبدیلی آتی جارہی ہے، مذہب سے دوری بڑھتی چلی جارہی ہے،مغرب کی اندھی تقلید کے چکر میں نئی نسل اپنی مشرقی پہچان کو پس پشت ڈالتی جارہی ہے تو ایسے میں ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کی ضرورت آج بھی ہماری سوسائٹی کو ہے۔ان کے ناولوں کی عصری معنویت اور بھی زیادہ بڑھ چکی ہے۔آج

پھر ہمارے سماج کو اصغری کی ضرورت ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کے ناول کی دنیا میں ''مراۃ العروس'' کی اکبری خانم، ''توبتہ النصوح'' کا کلیم اور ''فسانۂ مبتلا'' کا مبتلا ایسے کردار ہیں جن سے آج کی نئی نسل عبرت حاصل کرسکتی ہے اور ان کے کرداروں کے افعال و انجام سے سبق حاصل کر کے اپنے اخلاق و کردار کو درست کرسکتی ہے۔ ساتھ ہی ''توبتہ النصوح'' میں عصر حاضر کے والدین کے لئے بھی بڑا پیغام پوشیدہ ہے کہ اگر وہ فرائض پدری سے روگردانی کریں گے تو سوائے پشیمانی اور افسوس کے انہیں کچھ بھی حاصل نہ ہو پائے گا۔ لہذا ہم بلا شبہ کہہ سکتے ہیں کہ عصر حاضر میں ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کی ضرورت آج بھی ہمارے سماج کو ہے اور ان کی عصری معنویت ہر گذرتے دن کے ساتھ بڑھتی ہی چلی جارہی ہے۔ یہی انفرادیت اور خصوصیت ایک بڑے فن کار اور ادیب اور ناول نگار کی ہوتی ہے کہ وہ ہر دور میں پڑھا جارہا ہے۔ بڑا تخلیق کار وقت کی چار دیواری سے پھلانگ لگا کر ادب کے افق پر ایک روشن ستارے کی مانند اپنی روشنی بکھیرتا ہے، یہی انفرادیت، شناخت اور پہچان ایک بڑے ناول نگار کی ہوتی ہے جو ڈپٹی نذیر احمد کے حصہ میں آئی ہے۔

## ڈپٹی نذیر احمد کی ناول نگاری

ڈپٹی نذیر احمد نے کُل سات ناول تحریر کئے ہیں۔ ان ناولوں کا مواد نذیر احمد نے انیسویں صدی کے عہد سے لیا ہے۔ انیسویں صدی کا دور بہت ساری سماجی برائیوں کا شکار بنا تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد نے انہی سماجی مسائل کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا اور قصّے کے صورت میں لوگوں تک پہنچایا اور انہیں ان مسائل سے نکلنے کا راستہ بھی دکھایا۔ ڈپٹی نذیر احمد کا مقصد اور مشن مسلمانوں کی اصلاح، جدید تعلیم کا حصول، قوم کی ترقی اور فلاح بہبود تھا۔ ان کا پہلا ناول مرأۃ العروس ہے۔

## مرأۃ العروس

یہ ڈپٹی نذیر احمد کا ہی نہیں بلکہ اردو ادب کا بھی پہلا ناول ہے۔ اس ناول کا تخلیق کا سبب یہ ہے کہ یہ باضابطہ کسی منصوبے کے تحت نہیں لکھا گیا۔ نہ ہی ایک نشست یا چند نشستوں میں سلسلے وار لکھ کر ختم کی گیا۔ بلکہ جستہ جستہ، وقفے وقفے سے لکھا گیا وہ بھی ایسے کہ جب ان کی اولادیں پڑھنے کے قابل ہوئیں تو نذیر احمد کو ان کی تعلیم کی فکر ہوئی۔ نذیر احمد جو مدرسے کی تعلیم اور اس کے نصاب سے خود مطمئن نہیں تھے وہ

بھلا اپنے بچوں کو مدرسے کیوں کر بھیجتے۔لہذا انہوں نے بچوں کو خود سے پڑھانے کا فیصلہ کیا۔اب کتابوں کے انتخاب کا مسئلہ تھا۔جو کتابیں بازار میں موجود تھیں وہ نذیر احمد کے مزاج سے میل نہیں کھاتی تھیں۔نذیر احمد ایسی کتابیں چاہتے تھے جو اخلاق اور نصائح سے بھری ہوئی ہوں اور مفید ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہوں تاکہ بچہ دلچسپی لے اور اس میں تعلیم کی طرف خود بخود رغبت پیدا ہو۔تمام کتب خانہ چھان مارا مگر بے سود۔ایسی کتابیں اردو میں تھیں ہی نہیں۔نذیر احمد چوں کہ خود بھی ڈپٹی انسپکٹر مدارس رہ چکے تھے اور اس سلسلے میں ان کا تجربہ بہت تلخ تھا۔ان کا ماننا تھا کہ اردو میں چھوٹے بچوں کے لیے جتنی بھی کتابیں قاعدے اور دوسری کتابیں موجود ہیں وہ سب غیر دلچسپ ہیں اور بچوں کی ذہنی افتادِ طبع کے لیے بھی مفید نہیں ہیں۔نذیر احمد نے اپنے بچوں کے لئے خود ہی کتابیں لکھنے کا فیصلہ کیا۔جس کے نتیجے میں مرأۃ العروس جیسی کتاب وجود میں آئی۔

جب ان کی دونوں بیٹیاں پڑھنے کے قابل ہوئیں تو نذیر احمد نے بڑی بیٹی سکینہ کے لئے کتاب لکھنی شروع کی۔وہ بھی اس طرح کہ دو چار صفحے لکھ کر دے دیتے جب دو چار دنوں میں وہ یہ صفحات پڑھ لیتیں تو پھر آگے لکھ کر دیتے۔اور یہی معمول بن گیا اور یہ سلسلہ چلتا رہا یہاں تک کہ ایک ناول پورا ہو گیا۔نذیر احمد نے اس کے لیے نہ پہلے سے کوئی منصوبہ بندی کی تھی نہ ہی کوئی خاکہ تیار کیا تھا البتہ یہ طے کر لیا تھا کہ کتاب سبق آموز ہو اور ان کے خیالات کی اصلاح اور ان کی عادات کی تہذیب کرے اور کتاب خشک، روکھی پھیکی نہ ہو، بلکہ دلچسپ پیرائے میں ہو جس سے نہ صرف ان کا جی نہ اکتائے بلکہ پڑھنے کو جی چاہے۔لہذا قصے کا انداز اختیار کیا۔پہلے ایک لڑکی اکبری کا قصہ لکھا جسے ماں اور نانی کے لاڈ پیار نے بالکل بگاڑ کے رکھ دیا تھا ساتھ ساتھ نکما بھی بنا دیا تھا۔کھیل کود کے علاوہ اسے امور خانہ داری اور گھر کے دوسرے کاموں سے کائی واسطہ نہیں تھا۔اس پر طرہ یہ کہ بے حد ضدی، بدمزاج، بے ادب اور بدسلیقہ بھی تھی۔دین و مذہب سے بھی دور کا لگاؤ نہیں تھا۔بدمزاجی کی وجہ سے کسی سے نباہ بھی نہیں ہوتی تھی۔نتیجتاً ازدواجی زندگی بھی تلخ بن کر رہ گئی تھی۔

لکھے گئے اسباق دلچسپ تھے کہ بڑی بیٹی سکینہ نے اسے تیزی کے ساتھ پڑھ ڈالا۔اور لگی تقاضا کرنے۔اس کے تقاضے پر نذیر احمد لکھتے چلے گئے اس طرح اکبری کا قصہ مکمل ہوا۔اکبری کے قصے کے

بعد پھر اصغری کا قصہ شروع ہوا۔ اصغری اپنی بڑی بہن اکبری سے بالکل مختلف تھی بلکہ اس کی ضد تھی۔ نماز، روزے کی پابند، امور خانہ داری میں ماہر، گھریلو کام کاج میں مشتاق، باادب، خوش مزاج، عقل مند، سگھڑ اور سلیقہ شعار واقع ہوئی تھی۔ اس نے اپنی سوج بوجھ اور فہم وفراست سے شادی کے بعد اپنے گھر جنت کا نمونہ بنا دیا تھا اور سب کی نظروں میں محترم بن گئی۔ اس طرح دوسری کا قصہ بھی مکمل ہوا اور دیکھتے دیکھتے امور خانہ داری اور لڑکیوں کی تربیت کے موضوع پر ایک دلچسپ اصلاحی ناول تیار ہو گیا۔ اس ناول کو نذیر احمد کی بیٹیوں نے پڑھا۔ بقول نذیر احمد لڑکیوں کو تو اس کا وظیفہ ہو گیا۔ پھر پاس پڑوس کی عورتوں نے پڑھا جو نہ پڑھ سکتی تھیں انہوں نے پڑھوا کر سنا۔ جنہوں نے سنا ریجھ گئیں۔ اونچے اونچے گھروں میں کتابیں منگوائی گئیں۔ لوگوں نے اس کی نقلیں تیار کرا کے اپنے رشتے داروں میں بھجوائیں اس طرح یہ دور دور پہنچیں۔ یہ بات ۱۸۶۸ء کی ہے۔ پھر نذیر احمد نے چھوٹی بیٹی کے لیے ''منتخب الحکایات'' اور اپنے بیٹے بشیر الدین کے لیے ''چند پند'' دو کتابیں تیار کیں۔

مرأۃ العروس ۱۸۶۹ء میں شائع ہوئی۔ وہ بھی اس طرح کہ ڈائریکٹر ایجوکیشن نے ان تینوں کتابوں کے مسوّدے دیکھے تو بہت پسند کیے۔ خاص طور پر مرأۃ العروس سے بہت خوش ہوئے۔ کیوں کہ تعلیم نسواں کے راستے میں سب سے بڑی مشکل یہی تھی کہ ان کے لیے مناسب کتابیں نہیں ملتی تھیں۔ انہوں نے مرأۃ العروس کو تعلیمی نصاب میں شامل کر لیا۔ حکومت سے مرأۃ العروس کی سفارش کی جس پر نذیر احمد کو ایک ہزار روپئے کا نقد انعام عطا ہوا اور حکومت نے اس کی دو ہزار جلدیں بھی خریدیں۔ اس طرح اس کے چھپنے کی سبیل پیدا ہوئی۔ بقول نذیر احمد ''سرکار کی قدر دانی نے تو میری آبرو اور اس کتاب کی قدر و قیمت کو ایسا بڑھایا کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ میں نے خاطر خواہ اپنی مراد اور محنت کی داد پائی۔''

کتاب کو زبردست مقبولیت حاصل ہوئی۔ اور ایڈیشن پر ایڈیشن شائع ہونے لگے۔ اصغری اور اکبری کے قصے کی وجہ سے نذیر احمد کا نام ہی اکبری اصغری والے مولوی صاحب مشہور ہو گیا۔ اس ناول میں متوسط طبقے کے مسلم گھرانے کی کہانی اس انداز سے بیان کی گئی ہے کہ اس خاندان کے طرز معاشرت کی ہو بہو تصویر کھینچ گئی ہے۔ اس کا موضوع امورِ خانہ داری یا مستورات کی اصلاحِ معاشرت کہا جا سکتا ہے۔

مصنف حیاۃ النذیر کے مطابق یہ ناول ہندوستان کی چھ زبانوں میں ترجمہ کیا گیا اور مسٹر ایم کمپیشن نے خود انگریزی میں اس کا ترجمہ کیا۔اس کتاب کا ایک مقصد اردو میں ایک طرز جدید کو رواج دینا تھا۔

**بنات النعش**

یہ نذیر احمد کا دوسرا ناول ہے جو مرأۃ العروس کے چار سال بعد ۱۸۷۳ء میں شائع ہوا۔اس کا موضوع بھی تعلیم ،اخلاق اور تربیت خانہ داری ہے۔اسے مرأۃ العروس کی توسیع کہا جا سکتا ہے۔نذیر احمد عورتوں کی اخلاقی تربیت کے لیے تعلیم نسواں کو عام کرنا چاہتے تھے اور جدید علوم کی تعلیم اس طرح دینا چاہتے تھے کہ وہ نقائص سے پاک ہو۔چناچہ بنات النعش میں معاشرتی زندگی سے متعلق معلومات عامہ کے مختلف پہلوؤں کو نہایت آسان اور دلچسپ انداز میں پیش کیا۔خاص طور پر زندگی سے متعلق سائنسی مضامین کو بڑے دل کش پیرائے میں بیان کیا ہے۔علم جر ثقیل،زمین کی کشش،ہوا کا دباؤ،کشش اتصال، خرد بین،زمین گول ہے،رنگوں کی تبدیلی،تاریخ،جغرافیہ،سمندر،بادل،برسات،بجلی،روشنی،اجرام فلکی وغیرہ سے متعلق معلومات کو قصے کے روپ میں پیش کر کے بچے اور بچیوں کو نئی تہذب اور نئی روشنی کی حقیقی بنیادوں سے روشناس کرایا ہے۔

اس ناول کی نسبت پہلے ناول سے یوں قائم کی گئی ہے کہ مرأۃ العروس میں دکھایا گیا ہے کہ اصغری خانم نے تعلیم نسواں کو عام کرنے کے لئے ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔بنات النعش کا مرکزی کردار حسن آرا ہے جو اصغری خانم کے قائم کردہ اسی مدرسے میں تعلیم پاتی ہے۔تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس میں نمایاں تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔پہلے وہ بہت خودسر،بدزبان اور بدسلیقہ لڑکی تھی۔عام معلومات کے معاملے میں بھی بالکل کوری تھی لیکن اس کی کایا پلٹ ہوگئی۔اصغری سے باتوں باتوں میں اس نے دنیا بھر کی معلومات حاصل کر لیں۔تمام سائنسی مضامین جن کا ذکر اوپر ہوا ہے پڑھ ڈالے اور آخر کار وہ یہاں سے دین و دنیا کے تمام آگاہی سے ذہن لبریز ہو کر باہر نکلتی ہے اور اس کی شخصیت پر کشش، جاذب نظر بن جاتی ہے اس طرح ایک نئے اور صحت مند ذہن کی تعمیر کی کوشش کی گئی ہے۔نذیر احمد نے اس ناول کا موضوع ،مضمون اور نفسِ مضمون تھامس ڈے کے قصے ''سینڈفورڈ اینڈ مرٹن'' سے اخذ کیے ہیں۔اور اسے اپنے ماحول اور معاشرے کے مطابق ڈھال لیا ہے۔نذیر احمد نے یہ کتاب بھی سرکار کو پیش کی اور اس پر بھی پانچ

سوروپئے کا انعام ملا۔

## توبتہ النصوح

توبتہ النصوح نذیر احمد کا تیسرا ناول ہے۔ یہ ۱۸۷۷ء میں شائع ہوا۔ پلاٹ کردار نگاری، مکالمے اورزبان وبیان کے لحاظ سے یہ بہت دلچسپ ناول ہے۔اس ناول کو نذیر احمد کے ناولوں کے مقابلے زیادہ شہرت ملی۔ مذہبی رنگ کے باوجود اپنی خوبیوں کی بنا پر یہ ناول آج بھی اسکول اورکالجوں کے نصاب میں داخل ہے۔اس ناول کا موضوع تربیت اولاد ہے۔نذیر احمد نے اولاد کی پرورش کے ساتھ ساتھ اس کی اچھی تربیت کی ذمہ داری بھی والدین پرڈالی ہے۔اس کے لیے ضروری ہے کہ والدین اپنی زندگی کو ایسا نمونہ بنا کر پیش کریں جو اولاد کے قابل تقلید ہو اور اس کے اخلاق و کردار کو متاثر کر سکے۔ جب تک ایسا نہیں ہوگا اولاد کی صحیح تربیت ممکن نہیں۔

توبتہ النصوح کے تین اہم کردار ہیں،نصوح،کلیم اور ظاہر دار بیگ اور انہی کے گرد ناول کی ساری کہانی گھومتی ہے۔نصوح دہلی کے اعلیٰ متوسط خاندان کا غیر ذمہ دار اور بے پروا فرد ہے۔ جسے اپنے گھر بیوی بچوں اور گھریلو ذمہ داریوں سے کچھ زیادہ تعلق نہیں ہے وہ اپنی دنیا میں مگن رہتا ہے۔ایک بار دہلی میں ہیضہ کی وبا پھیلی۔ وبا کی تباہ کاریوں سے سارے شہر میں خوف وہراس طاری ہے۔ ہر گھر میں موت کا سناٹا پھیلا ہے۔نصوح کا خاندان بھی اس وبا کی زد میں آتا ہے۔اوراس کے خاندان میں بھی تین موتیں ہوتی ہیں۔

نصوح بھی اس وبا میں مبتلا ہوتا ہے۔اوراس کی حالت ابتر ہو جاتی ہے۔ڈاکٹر اسے خواب آور دوا دے کر سلا دیتا ہے۔نیند آنے پر وہ ایک طویل اور خوف ناک خواب دیکھتا ہے۔موت کے خوف کی وجہ میں وہ حشر کے میدان کا نظارہ کرتا ہے جسے دیکھ کر وہ کانپ اٹھتا ہے۔خوف آخرت کی وجہ سے اس کے اندازفکر میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے اور وہ اصلاح کے ارادے کے ساتھ نیند سے بیدار ہوتا ہے۔نصوح کا یہ خواب ہی قصے کی جان ہے۔ یہ خواب اس کی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔خواب سے بیدار ہونے کے بعد وہ طے کر لیتا ہے کہ وہ اپنی اور اپنے خاندان کی اصلاح کرے گا۔ بیوی اور بچے نصوح کی بات مانتے ہیں اوراس کے کہنے پر عمل کرتے ہیں مگر بڑا بیٹا کلیم کسی طرح راہ راست پر نہیں آتا۔ بلکہ

والدین سے ناراض ہو کر گھر چھوڑ دیتا ہے اور اپنے دوست ظاہر دار بیگ کے گھر جاتا، ظاہر دار بیگ کے مکروفریب کی وجہ سے اسے خفت اٹھانی پڑتی ہے۔ ظاہر دار بیگ اس پر چوری کا الزام لگا کر اسے پولیس کے حوالے کر دیتا ہے اور اسے بہت ذلیل ہونا پڑتا ہے۔ آخر فوج میں بھرتی ہو کے زخمی ہوتا ہے اور مر جاتا ہے لیکن سدھرتا نہیں۔ کلیم اور ظاہر دار بیگ لافی کردار ہیں۔ قصہ دلچسپ اور عبرت آموز ہے۔ قاری کی دلچسپی شروع سے آخر تک برقرار رہتی ہے۔ نذیر احمد مقبول ترین ناولوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔

ہیضے کی وبا اور انسانی زندگی پر اس کے اثرات اور دل ودماغ کا ایسی حالتوں میں مفلوج ہو جانے کا بیان اتنا مکمل اور دلکش ہے کہ اردو میں ایسی مثال آج بھی ملنی مشکل ہے۔ اسکا انداز تحریر جدید اور دلچسپ ہے۔ اس میں نذیر احمد نے انسانی نفسیات سے واقفیت کا ثبوت دیا ہے اور بہت ہی عمدہ پیرائے میں اس کو بیان کیا ہے۔ اپنی اس تصنیف میں نذیر احمد نے خواب سے حقیقت کی طرف سفر کیا ہے۔

**فسانۂ مبتلا**

فسانۂ مبتلا کا دوسرا نام محصنات بھی ہے۔ یہ نذیر احمد کا اچھوتا ناول ہے جو ۱۸۸۵ء میں شائع ہوا۔ موضوع کے اعتبار سے اس ناول کو خالص معاشرتی اور سماجی کہا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ یہ ناول مسلم سماج کی ایک بہت بڑی خرابی پر توجہ دلانے کے لیے لکھا گیا تھا۔ اس ناول میں نذیر احمد نے مذہب کے واضح حکم واجازت کے خلاف اپنے نقطۂ نظر کی پرزور تائید کی ہے۔ تعداد ازدواج اس کا موضوع ہے۔ ایک سے زائد شادی کی خامیوں کو اس میں اجاگر کیا گیا ہے۔ نذیر احمد چونکہ خود بھی عالم تھے اور دینی مسائل میں اچھا درک رکھتے تھے۔ عقد ثانی کی شرعی اجازت کے باوجود اس کو ہندوستانی مسلمانوں کے حق میں اچھا نہیں سمجھتے تھے اور اس بات کو وہ دلائل کے ذریعے واضح بھی کرتے ہیں۔ اس ناول کا موضوع بھی اصلاح ہے ۔ چناچہ وہ دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں:

> ’’ان ہی دنوں مجھے یہ خیال ہوا تھا کہ مسلمانوں کی معاشرت میں عورتوں کی جہالت اور نکاح کے بارے میں آزادی، دو بہت بڑے نقص ہیں۔ میں نے ایک نقص کے رفع کرنے میں کوشش کی ہے تو دوسرے نقص کے دفع میں بھی کچھ کرنا ضروری ہے۔‘‘ ۸

محصنات کا مقصد اگر چہ نکاح کے بارے میں آزادی ہے لیکن ضمناً تعلیم اور اولاد کی تربیت کو بھی موضوع بنایا گیا ہے اور یہ بتلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ تعلیم سے لاپروائی اور اولاد کی تربیت سے والدین کی غفلت کے نتائج برے ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ بچوں کی زندگی برباد ہو جاتی ہے۔ چناچہ تعلیم کے تعلق سے جو خیالات انہوں نے ظاہر کیے ہیں ان میں اخلاق کی درستی پر خاص زور دیا ہے۔ انہوں نے ناول کے ہیرو مبتلا کا کیریکٹر بیان کرتے وقت اس خیال کو اس طرح ادا کیا ہے:

> ''دنیا میں سارے لوگ پڑھے لکھے نہیں ہوتے اور نہ پڑھے لکھنے پر زندگی یا معاش کا انحصار ہے۔ اصل چیز ہے عادات کی درستی، مزاج کی شائستگی، طبیعت کی اصلاح ۔۔۔'' ۹

اگر اس میں کمی رہ جائے تو پھر انسان کو بگڑتے دیر نہیں لگتی اور اس بات کو مبتلا کے کردار کے ذریعے واضح کیا ہے کہ تربیت کی کمی کی وجہ سے وہ کیسے بے راہ رو ہو گیا۔ غلط عادتوں اور غلط صحبتوں کی وجہ سے کس طرح اس کی زندگی تباہ، برباد ہوئی ہے۔ اس کی دوسری شادی نے بھی اس کے گھر میں کیا تباہی مچائی اس کا عبرت ناک انجام بھی دوسروں کے لیے نصیحت آموز ہے۔ ناول کی ہیروئن ہریالی کی زندگی کی دردناکی اور اس کا خوف ناک انجام بھی کم عبرت ناک نہیں ہے۔ سماج کو اس ناول سے بہت سے پیغام ملتے ہیں۔ ایک بڑا پیغام تو یہی ملتا ہے جو ناول کا اختتامیہ ہے۔

دو بیویاں نہ کی جیوز نہار بھول کر

### ابن الوقت

ابن الوقت نذیر احمد کا مشہور ناول ہے یہ ایک معاشرتی ناول ہے۔ جسے نذیر احمد نے آخری زمانے میں لکھا جب وہ حیدر آباد سے پینشن لے کر مستقل طور پر دہلی آ چکے تھے۔ اس وقت تک ان کے سیاسی اور سماجی تصورات پختہ ہو چکے تھے۔ مغربی اور مشرقی تہذیب کی آمیزش، اس کی خوبیوں اور خرابیوں پر نذیر احمد کی گہری نظر تھی۔ وہ نئی روشنی کو خوش آمدید تو کہتے ہیں مگر اسی حد تک جس حد تک وہ ہمارے سماج کے لئے مفید ہے۔ یعنی اپنی اچھی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے نہ کہ اپنی اچھی روایات اور طریقۂ زندگی کو چھوڑ کر۔ نذیر احمد مغربی تمدن کی اندھی تقلید کے سخت خلاف تھے۔ ایسی تبدیلیوں کے

مخالف تھے جو انسان کو سماج سے علاحدہ کر دیں ۔ دوسرے اپنی جڑوں سے کٹ جانے کے جو نقصانات ہوتے ہیں اوراس کے برے نتائج بھگتنے پڑتے ہیں دراصل اس ناول میں اسی کو پیش کیا گیا ہے۔

ابن الوقت جواس ناول کا ہیرو ہے اپنی پرانی وضع کو چھوڑ کرانگریزی طرز اختیار کر لیتا ہے جو مشرقی طرز زندگی کے مقابلے میں بہت مہنگا ہے۔ کچھ دنوں تک یہ معاملہ چلتا ہے۔لیکن رفتہ رفتہ اخراجات زندگی میں اس قدر اضافہ ہوجاتا ہے کہ وہ مقروض ہوجاتا ہے۔ دوسرے مغربی تمدن کی پیروی میں غلو کرنے کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان مذہب سے بے گانہ ہونے لگتا ہے۔ابن الوقت کے عقائد میں بھی خلل پڑنے لگا یعنی ہر دینی مسئلہ اسے عقل کے خلاف نظر آنے لگا اوراس نے دینی مسائل کی تاویلیں شروع کردیں۔ حجتہ الاسلام کے سمجھانے کے باوجود کہ وہ غلط راستے پر چل رہا ہے مگر وہ باز نہیں آیا اوراپنے مذہب سے دور ہوتا چلا گیا جس سے یگانے، بیگانے اور بے زار ہو گئے۔انگریز جن کی پیروی میں اس نے اپنے سماج اوراپنوں کو ٹھکرایا تھا۔ وہ بھی ان کی بناوٹی روچ کو پسند کرنے لگے۔آخر کار ابن الوقت کو اپنے کیے پر بے حد پچھتانا یعنی سب کچھ لٹا کر بھی کچھ ہاتھ نہیں لگا۔

دراصل نذیر احمد نے اس ناول میں یہ بتلانے کی کوشش کی ہے کہ انسان کو ہمیشہ اپنی جڑوں سے منسلک رہنا چاہئے جو لوگ ایسا نہیں کرتے ان کا انجام عبرت ناک ہوتا ہے۔انہوں نے مثال کے طور پر حجتہ الاسلام کا کردار پیش کیا ہے جو اپنی روایات سے پورے طور پر جڑا ہوا ہے۔اپنی وضع کو قائم رکھتا ہے اور کسی قیمت پر بھی اپنی مذہبی اور مشرقی وضع کو چھوڑنے پر تیار نہیں تھے۔جس کی وجہ سے اسے سماجی طور پر عزت واحترام حاصل تھا۔نذیر احمد نے ان دونوں کرداروں کے ذریعہ انیسویں صدی کے مسلمانوں کی سماجی اورنفسیاتی زندگی کے تضاد کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔مغربی تہذیب وتمدن کی نقالی نے جو ذہنی انتشار کی کیفیت پیدا کی تھی اس کی بھی عکاسی کی گئی ہے۔ساتھ ساتھ اس زمانے کے سیاسی اور سماجی حالات کی تصویر کشی بھی۔ یہ ناول ایک معاشرتی دستاویز بھی ہے۔جس سے اس زمانے کی زندگی کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

یہ ناول جب شائع ہوا تو لوگوں نے کہا کہ نذیر احمد نے ابن الوقت کے پردے میں سرسید کو طنز کا

نشانہ بنایا ہے کیوں کہ انہوں نے انگریزی طرز معاشرت کو اختیار کر لیا تھا۔ حیات النذیر کے مصنف سید افتخار عالم نے لکھا ہے کہ سر سید احمد خان کے صاحب زادے سید محمود کو مولانا نذیر احمد سے یہ شکوہ تھا کہ انہوں نے ابن الوقت سر سید پر لکھی ہے۔ جس کا جواب نذیر احمد نے یہ دیا کہ ''میں نے تو انگریزی وضع کے مقلدوں کو ملاحی گالیاں دی ہیں جو چاہے گالیاں اپنے اوپر لے۔''

میرا خیال یہ ہے کہ نذیر احمد پر اس طرح کا الزام لگانا درست نہیں وہ سر سید کا بے حد احترام کرتے تھے۔ ان کے اصلاحی مشن میں ان کے شانہ بشانہ تھے۔ انہیں مالی اعانت فراہم کراتے تھے جس کے لئے دور دراز کا سفر کرتے تھے عوامی جلسے میں ان کی خاطر تقریریں کرتے تھے ان کی موت کا انہیں اس قدر دکھ ہوا کہ انہوں نے تقریر کرنا چھوڑ دیا۔ جو شخص سر سید کو اس قدر چاہتا تھا وہ کیوں ان کو نشانہ بناتا۔ نذیر احمد نے جس طرز معاشرت پر تنقید کی اگر اس کی کچھ جھلک سر سید کے یہاں ملتی ہے تو اس کا قطعی یہ مطلب نہیں کہ انہوں نے سر سید کو نشانہ بنایا ہے۔ ایسا سمجھنا میرے خیال میں غلط ہے۔ اس ناول میں حجتہ الاسلام کا کردار خود نذیر احمد سے مماثلت رکھتا ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے ابن الوقت کے متعلق کہا ہے کہ یہ اردو کا پہلا ناول ہے جس میں اپنے دور کی سیاست، تہذیبی و معاشرتی کش مکش، مذہبی رجحانات، برطانوی حکومت کے موافقین اور مخالفین کے سیاسی عقائد، حاکم اور محکوم کے رشتے اور فرد کی خارجی اور سماجی زندگی کو تاریخی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔

### ایامیٰ

یہ نذیر احمد کا چھٹا ناول ہے۔ ۱۸۹۱ء میں شائع ہوا۔ اس میں ایک شرعی مسئلے عقد بیوگان یعنی بیوہ عورتوں کی دوسری شادی کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ اس مسئلہ پر سماج کی بے رخی اور عورتوں پر ہونے والے ظلم و ستم کو اجاگر کیا گیا ہے۔

آزادی بیگم ناول کا مرکزی کردار ہے۔ اس کے والد ایک روشن خیال انسان ہیں اور والدہ بے حد قدامت پسند واقع ہوئی ہیں۔ ماں باپ کے نظریات الگ الگ ہیں جس سے آزادی ہمیشہ کشمکش میں مبتلا رہتی ہے۔ چاہے معاملہ تعلیم کا ہو یا شادی کا۔ باپ انگریزی تعلیم اور مغربی تہذیب کا دل دادہ ہے تو ماں اس کے برعکس۔ آزادی بڑی ذہین اور سمجھ دار تھی وہ ماں کی تربیت کے بجائے باپ کی تعلیم کا اثر قبول کرتی

ہے۔لیکن اس کی ماں جو کہ ایک مولوی خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔آزادی کی مرضی جانے بغیر اس کی شادی ایک مولوی مستجاب سے کر دیتی ہے۔جس کو آزادی اپنی طبیعت کے مطابق ڈھال لیتی ہے۔کچھ دنوں بعد اس کے شوہر کا انتقال ہو جاتا ہے۔اس کے بعد آزادی کی زندگی میں ایک خلاء پیدا ہو جاتا ہے جو کسی طرح بھی پُر ہوتا نظر نہیں آتا۔آزادی شوہر کے انتقال کے صدمے کو بڑی شدت سے محسوس کرتی ہے اس صدمے سے ابھرنے کے بعد آزادی اپنی دوسری شادی کے متعلق بھی غور کرتی ہے لیکن کوئی فیصلہ نہیں کر پاتی کہ شدید بیمار ہو جاتی ہے اور اسی بیماری کی حالت میں ایک وصیت کر کے ختم ہو جاتی ہے۔یہ وصیت ہی پورے ناول کا نچوڑ ہے۔جس سے عقد ثانی کی اہمیت اور ضرورت پر روشنی پڑتی ہے۔دوسری شادی کی ضرورت کے سلسلے میں اس کا کہنا ہے کہ:

> ''ان بے چاریوں کے شوہر فوت ہوئے ہیں نہ کہ وہ ضرورت فوت ہوئی ہے جس کی وجہ سے دنیا جہاں میں نکاح ہوتے ہیں اور جس کی وجہ سے خود ان کے پہلے نکاح ہوئے تھے۔''۱۰

اس وصیت کا اثر سننے والوں پر اس قدر پڑتا ہے کہ وہ دل میں یہ فیصلہ کر کے اٹھتے ہیں کہ بیواؤں کے ساتھ ناانصافی اور ظلم وستم نہیں ہونے دیں گے خدا اور رسول کے حکم کے مطابق بیواؤں کی دوسری شادی کو ممکن بنائیں گے اور ان کی تکلیف دہ اور اذیت ناک زندگی سے چھٹکارا دلائیں گے۔

ڈپٹی نذیر احمد نے اس ناول میں ایک عورت کی کہانی کنوارپن سے بیوگی تک اس انداز سے بیان کی ہے کہ اس کی زندگی کے تمام نشیب وفراز،احساسات وجذبات کی حقیقی تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے اور معاشرے کے دوسرے غیر متوازن پہلوؤں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔آزادی بیگم کے کردار کو نمایاں کرنے میں نذیر احمد نے جو طریقہ اختیار کیا ہے اس کی وجہ سے یہ ناول نہ صرف نذیر احمد کے ناولوں میں بلکہ اردو ناول کی تاریخ میں بھی اہم مقام کا مستحق بن جاتا ہے۔

### رویائے صادقہ

یہ نذیر احمد کا ساتواں اور آخری ناول ہے۔یہ ناول ۱۸۹۴ء میں شائع ہوا۔اس ناول میں نذیر احمد نے اپنے مذہبی عقائد کا کھل کر اظہار کیا ہے۔ناول کی ہیروئن صادقہ ہے۔وہ بچپن سے سچے خواب دیکھتی

اوراسے بیان بھی کرتی ہے۔اس بناپر وہ ایک ایسی لڑکی مشہور ہوچکی تھی کہ جس پر جن بھوت کا سایہ سمجھا جاتا تھا۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی دونوں چھوٹی بہنوں کی شادی تو ہوجاتی ہے لیکن اس کا رشتہ کہیں سے نہیں آتا۔

ایک دن علی گڑھ کے ایک طالب علم سید صادق کا ایک خط صادقہ کے والد کو رشتے کے سلسلے میں موصول ہوتا ہے۔صادقہ کے والد پیغام منظور کر لیتے ہیں۔انجام کار شادی ہوجاتی ہے۔

سید صادق عقلی مذہب کا قائل ہے۔اور زندگی کے ہر مسئلے کو عقل سے حل کرنا چہتا ہے اور سجھ نہیں پاتا جب یہ مسئلہ کسی طرح سلجھتا نظر نہیں آتا تو پھر خدا سے رجوع کرتا اور مدد مانگتا ہے اس کے منہ سے بے ساختہ یہ کلمات ادا ہوتے ہیں۔

’’ اے خدا اگر واقع میں تو خدا ہے جیسا کہ تمام اہل مذاہب تجھ کو مانتے ہیں تو مجھ کو ورطہ حیرت سے نکال اور حق بات میرے دل میں ڈال دے۔‘‘ ۱۱

ادھر یہ جملہ پورا ہوتا ہے اُدھر صادقہ نیند سے بے دار ہوتی ہے اس نے خواب دیکھا ہے کہ ایک بزرگ صادق کی الجھنوں کو سلجھا تا رہے ہیں اور اس کے سوال کے نہایت تشفی بخش جواب دے رہے ہیں۔صادق کے کہنے پر وہ خواب کا سارا ماجرا سوال وجواب کی شکل میں لکھ دیتی ہے۔

صادقہ کا یہ خواب ہی دراصل ناول کا اصلی مقصد کہا جا سکتا ہے۔نذیر احمد نے ایک بزرگ کے ذریعے سید صادق کی ذہنی کشمکش اور شک وشبہات کو دور کرنے کی کوشش میں زور قلم صرف کر دیا ہے اور اپنے مذہبی عقائد استدلالی انداز میں پیش کر دیئے ہیں۔مغربی تعلیم کے اثرات نے مسلمانوں کی نوجوان نسل میں جو وسوسے پیدا کر دئے تھے ان سب کو دلیلوں سے رفع کرتے ہیں۔یہی اس ناول کا مقصد بھی ہے۔آخر کار راہ راست سے بھٹکا ہوا صادق اپنے سیدھے سچے رستے پر واپس لوٹ آتا ہے اور پوری مضبوطی سے اس پر قائم رہتا ہے۔

## فنّی خصوصیات

ڈپٹی نذیر احمد کو اردو کا پہلا ناول نگار تسلیم کیا گیا ہے۔نذیر احمد سے قبل اردو میں ناول نگاری کا کوئی وجود نہیں تھا۔ان سے پہلے داستانیں تھیں۔انہوں نے داستانوں اور قصے کہانیوں کے عہد میں جنم لیا

تھا۔ داستانوں میں انسان کی حقیقی زندگی سے پرے ایک خیالی دنیا دکھائی دیتی تھی جس میں انسان کم، پریاں، جن، بھوت، دیو، شہزادے، شہزادیاں اور درویش زیادہ بستے تھے یعنی غیر انسانی ماحول کی نقشہ کشی کی جاتی تھی جس میں مافوق الفطرت کردار و واقعات اور طلسماتی فضا طاری رہتی تھی۔ حادثات واتفاقات کی کثرت سے لطف اندوزی میں اضافہ کیا جاتا تھا۔ ایک واقعہ یا قصے سے دوسرا قصہ بغیر کسی منطقی ربط کے پیدا کیا جاتا تھا اور طرزِ انشا میں بھی حقیقت نگاری کے بجائے رومانی انداز ہوتا تھا۔ اس دنیا میں قدم قدم پر ایسے واقعات پیش آتے تھے جنہیں آج عقل انسانی تسلیم نہیں کرسکتی۔ حیوان انسان کی بان میں گفتگو کرتے تھے، پریاں شہزادوں کو لے اڑتی تھیں۔ یعنی ناممکن کو ممکن کر دکھانا داستانوں کا خاص فن شمار کیا جاتا تھا۔ یہاں صرف خیالی دنیا کی سیر کرائی جاتی تھی۔ حقیقی دنیا سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ یہ قصے کہانیاں فارغ انسانوں کے لیے وقت کاٹنے کا ایک بڑا ذریعہ تھیں۔ لیکن جب دنیا نے ترقی کی، انسان کی مصروفیت بڑھی اور اس کی عقل خیالی اور اصلی دنیا کے فرق کو سمجھنے کے قابل ہوئی تو پھر اس طرح کے قصے کہانیوں سے لوگوں کی طبیعت اوبنے لگی اور یہ احساس بھی پیدا ہونے لگا کہ اصل ادب وہ ہے جو زندگی کی حقیقی پیش کش پر مبنی ہو اور جس کے ذریعے اسے اپنے اردگرد بکھری زندگی بخوبی دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملے اس سے مسرت بھی حاصل ہو اور بصیرت بھی اور اس کا مطالعہ باعث انبساط بھی ہو۔ جب یہ خیال بدلتے سماج میں عام ہوا تو پھر نئی صنف ناول وجود میں آیا۔

ڈپٹی نذیر احمد نے اگرچہ داستانی دور میں جنم لیا لیکن ایک صاحب بصیرت اور صاحب طرز فن کار ہونے کے ناطے ان کا ذہن وشعور اپنے دور سے کچھ آگے ہی تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ ایک مصلح قوم اور معلم اخلاق بھی تھے ان کا تعلق اور رابطہ حقیقی دنیا اور اس انسانی سماج سے تھا جو زوال پذیر تھا اور جسے ترقی کی راہ پر گامزن کرنا ان کا مقصد خاص تھا۔ لہذا انہیں داستانوں کی فرضی اور خیالی دنیا کس طرح راس آسکتی تھی۔ وہ کہاں بحر ظلمات میں غوطہ زن ہوسکتے تھے۔ لہذا انہیں ایک ایسی صنف کی تلاش تھی جو حقیقی دنیا کی عکاسی کرسکے اور وہ صنف ناول تھا لہذا نذیر احمد نے داستان کو ناول سے بدل دیا اور یہی نذیر احمد کے خلاقانہ ذہن کا کمال تھا۔

چنانچہ انہوں نے داستان کی فضا سے نکل کر ناول کی بنیاد رکھی۔ ناول اور داستان کا بنیادی فرق

کہانی اور پلاٹ کا فرق ہے۔ ناول کا امتیازی وصف اس کے پلاٹ کی تنظیم میں مختلف واقعات کا منطقی ربط ہے یعنی تمہید، وسط اور خاتمے میں داخلی تسلسل شروع سے آخر تک قائم رہتا ہے۔ نذیر احمد کے یہاں ہمیں پہلی بار ان کے قصوں میں منطقی ترتیب و تنظیم نظر آتا ہے۔ بیان واقعہ، کردار، مکالمہ، منظر نگاری، زندگی سے متعلق ایک مخصوص نقطۂ نظر جو ناول کے عناصر خصوصی ہیں نظر آتے ہیں۔ ان کے ناولوں میں حقیقی دنیا کے عام انسانوں کو ہم چلتے پھرتے اور سانس لیتے ہوئے دیکھتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں یہ ہماری اپنی ہی دنیا ہے۔ ناول کو اس آئینے سے تشبیہ دی گئی ہے جس میں حقیقی زندگی کا عکس نظر آئے گویا ناول نام ہے زندگی کی تصویر کشی کا۔ نذیر احمد کے ناول اس کسوٹی پر پورے اترتے ہیں۔ نذیر احمد کے ناولوں سے پہلی بار ہمیں ان کی سوسائٹی کے متوسط طبقے کی معاشرتی، مذہبی، تہذیبی اور اخلاقی حالتوں، ذہنی اور نفسیاتی کیفیتوں کا احوال معلوم ہوتا ہے۔ زندگی کی تصویر کشی وہ اس کامیابی سے کرتے ہیں کہ پڑھنے والوں کو یہ ماحول اپنے گھر اور سماج کا معلوم پڑتا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کے سوانح نگار افتخار عالم نے لکھا ہے کہ اکبری اصغری کے قصے کو لوگ سچا واقعہ خیال کرتے تھے کتنے تو ان بہنوں کے گھروں کا پتہ پوچھتے پھرتے تھے بہتوں کو یہ شبہ بھی ہوا کہ کہیں اس ناول میں ان کے اپنے خاندان کو تو بے نقاب نہیں کیا گیا۔ اسی طرح ان کے تمام ناولوں میں کسی نہ کسی کے عکس کو تلاش کرنے کی کوشش کی گئی۔ وہ صرف اس لیے کہ ان کے تمام ناول حقیقت نگاری کے مرقعے نظر آتے ہیں۔ یعنی حقیقی زندگی کی حقیقی پیش کش اور تصویر کشی ان کے ناولوں کی سب سے بڑا وصف ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے ناولوں میں زیادہ تر جس تکنیک کا استعمال کیا ہے وہ خواب، خطوط اور خود کلامی کی تکنیک ہے۔ ان تکنیک کو ڈپٹی نذیر احمد نے خوب استعمال کیا ہے، کیونکہ وہ کہانی کہنے میں ماہر تھے اور وہ قاری کے ذہن کو متاثر کرنا چہتے تھے۔ جس سے وہ قاری کا ذہن بدلنے کے ساتھ ساتھ سماج کا بھی مزاج بدلنا چہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خواب اور خود کلامی کی تکنیک کو اپنے فن میں جگہ دیتے ہیں۔

## پلاٹ

پہلا ناول نگار ہونے کے ناطے نذیر احمد کے یہاں پلاٹ کی وہ تمام فنی خوبیاں تلاش کرنا جن کا آج کے کسی ناول پر انطباق ہوتا ہے میرے خیال میں مناسب نہیں ہے۔ لیکن ہاں کسی فن کے خدوخال کا

بننا اور اجاگر ہونا ہی اولین نقوش مانا جاتا ہے۔ ان کے ناولوں میں داستانوں سے الگ قصے کی ترتیب و تنظیم کا واضح شعور دیکھنے کو ملتا ہے۔ ایسا شاید اس وجہ سے ممکن ہوسکا کہ نذیر احمد انگریزی زبان میں بھی مہارت رکھتے تھے مغربی ادب بھی ان کی نظر کے سامنے تھا اور انہوں نے مغربی ناول سے بھی استفادہ کیا تھا۔ لہذا پلاٹ کا صحیح تصّور ان مطالعوں سے ان کے ذہن میں کسی نہ کسی حد تک ضرور موجود تھا۔ اور خود وہ اپنی زندگی میں ترتیب و تنظیم کے بے حد قائل تھے۔ شعوری طور پر کھلا ذہن رکھتے تھے نئے علوم سے انہیں پر ہیز نہیں تھا۔ بلکہ وہ علم جو انسان کے لیے مفید ہو اور جو انسانی زندگی پر خوش گوار اثرات مرتب کرے، اس کے اندر مثبت تبدیلی لائے، اس کی فکر کو نئی سمت عطا کرے وہ ایسے علوم کو سیکھنے کا مشورہ دیتے تھے اور خود انہوں نے اس پر عمل کر کے دکھایا۔ یہاں بھی انہوں نے مغربی ادب اور مغربی فکر سے استفادہ کیا اور داستان اور ناول کے درمیان خط امتیاز کھینچ دیا۔

کسی بھی ابتدائی تجربے میں جو خوبیاں اور خامیاں ہوتی ہیں وہ نذیر احمد کے ناولوں کے پلاٹ میں بھی پائی جاتی ہیں۔ ابتدائی دو ناولوں کے پلاٹ کمزور ہیں۔ لیکن جیسے جیسے تجربہ بڑھتا گیا خامیوں اور کمزوریوں پر قابو پاتے گئے اور آگے چل کر فنی نقطۂ نظر سے بے عیب پلاٹ پیش کرنے میں کامیاب ہوئے۔ ان کا فن رفتہ رفتہ مائل بہ ارتقاء نظر آتا ہے۔ نذیر احمد کے تمام ناولوں کے پلاٹ سادہ ہیں۔ مرأۃ العروس، اکبری اور اصغری دو بہنوں کی زندگی پر مبنی ہے۔ اگرچہ دونوں کی زندگی کے واقعات الگ الگ بیان ہوئے ہیں لیکن دونوں کا تعلق ایک دوسرے سے قائم و دائم ہے۔ اگر یہ دونوں آپس میں گتھ جاتے تو ایک مرکب پلاٹ وجود میں آسکتا تھا۔ لیکن ابتدا میں نذیر احمد کے لئے ایسا کرنا شاید ممکن نہیں ہوسکا۔ پھر بھی دونوں بہنوں کے الگ الگ قصے کو جس خوبی اور فن کارانہ طریقے سے بیان کیا ہے کہ وہ لوگوں پر ایک اثر چھوڑتا ہے۔ اور پہلی تحریر ہونے کے باوجود ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فن کار اس فن پر دسترس رکھتا ہے۔

بنات النعش کا پلاٹ بھی سادہ اور سپاٹ ہے کہانی خط مستقیم پر رہتی ہے۔ ایک جاہل اور بدسلیقہ لڑکی کو علم سے بہرہ مند کرایا جاتا ہے۔ پھر اس کے اندر علم کی روشنی کی وجہ سے ایک مثبت تبدیلی پیدا ہوئی ہے اور وہ بد اطوار لڑکی سدھر جاتی ہے۔ یہ ناول تھامس ڈے کے سینڈفورڈ اینڈ مرٹن کے انداز پر لکھا گیا ہے۔ گویا اس پر انگریزی ناول کے اسلوب کا اثر ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کے تین ناول توبتہ النصوح ،فسانۂ مبتلا اور ابن ال وقت ایسے ناول ہیں جن میں دوسرے ناولوں کے مقابلے فن کارانہ طور پر پلاٹ کی ترتیب و تنظیم کا واضح احساس ہوتا ہے۔یعنی دھیرے دھیرے فن پر ان کی گرفت مضبوط ہوتی دکھائی دیتی ہے ۔ان کے تیسرے ناول توبتہ النصوح کو ان کا شاہکار ناول قرار دیا جاتا ہے۔اس ناول کے پلاٹ میں ترتیب وتوازن کا وہ حسن موجود ہے جوایک ناول میں ہونا چاہئے ۔واقعات مربوط ہیں ۔ایک کڑی دوسری کڑی سے بالکل نیچرل طریقے سے جڑتی چلی جاتی ہے ۔ یہاں ہمیں پلاٹ کی تعمیر کا سلیقہ ضرور ملتا ہے ۔کیوں کہ نصوح کا کردار واقعات کے قدرتی بہاؤ کا جزو ہے ۔ یہاں پر جو تسلسل اور واقعات کا دوسرے سے تعلق ہمیں نظر آتا ہے وہ کے کسی اور ناول میں اس طرح سے نہیں ملتا۔

پلاٹ کی تعمیر کے لحاظ سے ابن الوقت بھی نذیر احمد کا ایک کامیاب ناول مانا جاتا ہے ۔اس ناول میں دو تہذیبوں کے ٹکراؤ کی تصویر کشی چند کرداروں کی کش مکش سے کی گئی ہے ۔ یہاں پلاٹ کی تعمیر بالکل فطری اور حقیقی معلوم ہوتی ہے ۔ناول نگار نذیر احمد کبھی اپنی تخلیق کو گرفت سے باہر نہیں ہونے دیتے ۔وہ پلاٹ اور کردار دونوں کو قابو میں رکھتے ہیں ۔اور ان سے حسب منشا کام لیتے ہیں ۔ یہاں ناول نگار غیر جانب دار نظر آتا ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ نیکی و بدی کی فتح وشکست سے اسے کوئی سروکار نہیں چناچہ ناول فطری انداز میں آگے بڑھتا ہے اور اختتام کو پہنچتا ہے ۔اس میں شروع سے آخر تک ایک ہی کہانی بیان کی گئی ہے ۔اس میں مرکب قصہ گوئی کا سلیقہ ملتا ہے ۔اس ناول کے پلاٹ کو نوبل صاحب اور ابن الوقت کے مکالموں سے آراستہ کی گیا ہے۔

رویائے صادقہ کا پلاٹ کوئی خاص نہیں ہے ۔صادقہ کے خواب کی طوالت نے پلاٹ میں جھول پیدا کر دیا ہے۔شروع کے ۱۵۰صفحات کے قریب انسانی واقعات اور حالات سے عبارت ہے اور صادقہ کی شادی سے پہلے تک اس میں تجسس اور انتظار کی کیفیت بدرجۂ اتم ملتی ہے ۔

فسانۂ مبتلا میں نذیر احمد نے فن پر مکمل گرفت حاصل کر لی ہے ۔حسن ترتیب اور پلاٹ کی تعمیر کے لحاظ سے یہ ناول ابن الوقت سے بھی آگے بڑھ جاتا ہے ۔ یہاں جزئیات نگاری اور ظرافت نگاری بھی بھر پور ہے ۔اس ناول میں ناول نگار نے تجسس بھی پیدا کیا ہے جو آخر تک برقرار رہتا ہے اور دلچسپی میں اضافہ

کرتا ہے۔ پلاٹ اکہرا ہونے کے باوجود گھٹا ہوا ہے۔ہمیں ڈاکٹر سید عبداللہ کی اس رائے سے مکمل اتفاق ہے کہ:

''فسانۂ مبتلا میں مقصد سے دل بستگی کا وہی عالم ہے جو مصنف کے اور ناولوں میں ہے ۔مگر فن کے اسرار و رموز پر عبور کے معاملے میں اس کو ہم نذیر احمد کا شاید مکمل ترین قصہ کہہ سکتے ہیں۔'' ۱۲

گویا فسانۂ مبتلا کو اردو کا پہلا مکمل ناول کہا جا سکتا ہے۔ایامیٰ نذیر احمد کا آخری ناول ہے۔اس کا پلاٹ بھی گتھا ہوا ہے مگر وہ حسن کہاں جو فسانۂ مبتلا میں ہے۔آزادی بیگم کی تقریر نے اس کے پلاٹ کے توازن کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ورنہ پلاٹ کے لحاظ سے یہ بھی انتہائی کامیاب ناول ہوتا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ نذیر احمد کے فکر و فن میں تجربہ کے ساتھ ساتھ بتدریج ارتقا ہوتا ہے اور اول ناول سے آخری ناول تک کے سفر میں نذیر احمد نے ارتقاء کی کئی منزلیں سر کی ہیں اور فن میں مہارت پیدا کی ہے۔ بعد کے ناول میں ہیئت اور ناول کے دیگر اجزائے ترکیبی کے اعتبار سے آہستہ آہستہ ارتقاء ہوتا چلا جاتا ہے۔ پلاٹ کے اعتبار سے فسانۂ مبتلا اور ابن الوقت ان کے بہترین ناول کہے جا سکتے ہیں ۔توبتہ النصوح اور ایامیٰ کے پلاٹ بھی کامیاب ہیں مگر ان دونوں کے مقابلے میں کم۔ بنات النعش پلاٹ اور ادبیت کے لحاظ سے مرأۃ العروس سے بہتر ہے تو توبتہ النصوح ان دونوں ناولوں کو بہت پیچھے چھوڑتا ہے ۔توبتہ النصوح کا پلاٹ ان دونوں ناولوں سے زیادہ گھٹا ہوا ہے اور متوازن ہے اس میں کش مکش اور تصادم کو پیش کیا گیا ہے۔اسی طرح بنات النعش میں حسن آرا کا ارتقاء اس کے پلاٹ میں بہت عمدگی سے رفتہ رفتہ پیش کیا گیا ہے۔اصلاحی مقصد کے ہوتے ہوئے بھی اس میں پلاٹ کی بالیدگی منطقی انداز سے ہوئی ہے۔ بقیہ ناولوں کے پلاٹ میں کمیاں اور خامیاں ہیں ۔لیکن نذیر احمد کی ایک بڑی کامیابی یہی ہے کہ انہوں نے اردو میں ناول کی بنیاد ڈالی اور اس کے خدوخال واضح کیے۔لہذا ابتدائی نقوش کے لحاظ سے یہ بے حد کامیاب کوشش ہے۔

### کردارنگاری

نذیر احمد نے جس ماحول اور معاشرے میں آنکھ کھولی، پرورش پائی، تعلیم حاصل کی اور ملازمت

کے اعلیٰ سے اعلیٰ منصب تک پہنچے وہ سب مشکلات کے ساتھ ساتھ تجربوں سے پُر تھا۔تعلیم کے زمانے میں جو مشقتیں اٹھائیں اور دردر کی ٹھوکریں اور گھر گھر کے کھانے کھائے ، بھانت بھانت کے لوگوں سے ان کا واسطہ پڑا۔ ہرقسم کے لوگوں کو دیکھنے اور برتنے کا موقع ملا۔انہوں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا۔اور مشاہدہ کیا جس سے ان کو بہت سے تجربے حاصل ہوئے اور انسان لفظ کو سمجھنے کے مواقع دیئے۔انہوں نے خود طرح طرح کی زندگی گزاری تھی اس بنا پر وہ انسانی زندگی کے مختلف گوشوں اور نفسیاتی پہلوؤں پر غور کرنے اور سمجھنے کی بھر پور صلاحیت بھی رکھتے تھے۔مردم شناس ایسے تھے کہ ذہن انسانی کے پیچ وخم سے پوری طرح واقف اور انسانی نفسیاتی سے بخوبی آشنا تھے۔لہذا نذیر احمد نے کردار نگاری میں اپنے تمام تجربوں اور اپنی ساری صلاحیتوں سے بھر پور فائدہ اٹھایا اور کردار نگاری میں بڑی فنی مہارت کا ثبوت دیا ہے اور ہمارے افسانوی ادب میں کئی زندہ جاوید کرداروں کا اضافہ کر دیا۔مرزا ظاہر دار بیگ ،کلیم ،ابن الوقت ،مبتلا اور ہریالی بڑے جاندار اور اردو ادب کے لافانی کردار ہیں۔ان کے سبھی کردار ایک مخصوص معاشرے اور اس کے مخصوص طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں اور اپنی زندگی اور سماجی ماحول کے نمائندے بھی ہیں۔سبھی کردار جانے پہچانے کردار ہیں۔ہمیں ان کرداروں میں حرکت وحرارت ملتی ہے۔اور مختلف صورتوں میں اسی طرح ارتقائی مدارج طے کرتے معلوم ہوتے ہیں جیسے حقیقی زندگی میں عام انسان۔مثلاً نعیمہ،مبتلا اور ابن الوقت کے کردار جاندار ہیں۔مبتلا کی مختلف ذہنی کیفیتوں اور نفسیاتی کمزوریوں کا بیان بڑے فن کارانہ انداز میں کیا گیا ہے۔اسی طرح ہریالی اور غیرت بیگم کی نفسیاتی کیفیتوں کا بیان اور ایامیٰ میں آزادی کے ذہنی کش مکش کا تجربہ بھی نذیر احمد کی فن کارانہ عظمت کی دلیل ہے۔ان نفسیاتی تجزیوں کی مثال ہمیں اردو میں سب سے پہلے نذیر احمد کے یہاں ملتی ہے۔

کردار کی پیش کش کے مختلف طریقے ہیں۔مثلاً کبھی مصنف خود ہی کرداروں کا تفصیلی تعارف کراتا ہے۔کبھی کرداروں کے حرکات وسکنات سے ان کی حالتوں کا پتہ چلتا ہے اور کبھی ان کی آپسی بات چیت ان کی خوبیوں پر روشنی ڈالتی ہے۔نذیر احمد نے ان تمام فنی طریقوں کو برتا ہے۔جیسے مبتلا میں انہوں نے مبتلا کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیتوں کا بیان خود ہی کیا ہے۔لیکن ہریالی ،غیرت بیگم اور سید ناظر کو ان کے عمل اور براہ راست مکالموں کے ذریعے ہمارے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔یعنی حسب موقع توصیفی اور

ڈرامائی دونوں انداز اختیار کیا ہے اور اپنے کرداروں کے متعلق معمولی سے معمولی بات کو نظر انداز نہیں ہوتے اور ایک ایک کردار پر مختلف زاویوں سے اس طرح روشنی ڈالتے ہیں کہ اس کے اصلی اور جاندار ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا۔

ایسا بھی نہیں ہے کہ نذیر احمد کے تمام کردار ہی جاندار ہیں کسی بھی ناول نگار کے سارے کے سارے کردار لافانی نہیں ہوتے۔ اگر چہ کچھ خوبیاں ہوتی ہیں تو کچھ خامیاں بھی ہوتی۔ نذیر احمد کی کردار نگاری بھی یکسر خامیوں سے پاک نہیں ہے۔ بعض کردار نیچرل معلوم نہیں ہوتے بلکہ مصنوعی معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی کردار نگاری کا ایک بڑا عیب یہ ہے کہ ہر کردار یا تو صرف خوبیوں کا مجموعہ یا محض بدی کا مجسمہ۔ جب کہ انسان خیر وشر کا مجموعہ ہے۔ کوئی انسان نہ صرف فرشتہ ہوتا ہے نہ شیطان۔ مگر ان کے یہاں کردار یا تو فرشتہ ہوتے ہیں یا شیطان۔ اصلی انسان نہیں ہوتے۔ اصلی انسان میں کم وبیش دونوں چیزیں ہوتی ہیں۔ ظاہر دار بیگ میں خود غرضی مکاری اور نمائش کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ حجت الاسلام اور میر متقی میں کوئی عیب ہی نہیں۔ اصغری اور فہمیدہ نیکیوں کا مجموعہ ہیں۔ اور اکبری میں کوئی نیکی ہی نظر نہیں آتی۔ اس کے علاوہ ان کی کردار نگاری کی ایک خرابی یہ بھی ہے کہ ان کے کردار اسم بامسمیٰ ہیں۔ اور کرداروں کے نام ان کی شخصیت کی بنا پر رکھتے ہیں جس سے ان کی جملہ خصوصیات واضح ہو جاتی ہیں۔ نصوح کا کام نصیحت کرنا ہوگا، ظاہر دار بیگ میں ظاہر داری ملے گی، ابن الوقت، حجتہ الاسلام، جاں نثار، مسٹر ویل اور مسٹر شارپ، فہمیدہ، مبتلا سبھی نام کے نمائندہ ہیں۔

ان کی کردار نگاری کی دوسری خامی یہ ہے کہ ان کے کرداروں میں ارتقاء کم نظر آتا ہے۔ بیش تر کردار شروع سے آخر تک یکساں رہتے ہیں۔ جب کہ انسانی زندگی میں وقت کے ساتھ تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ کبھی حالات اس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ کبھی وہ حالات سے اثر انداز ہوتا ہے اور دونوں صورتوں میں تبدیلی آتی ہے۔ ہر انسان کی زندگی میں نشیب وفراز کا ہونا ضروری ہے۔ اور اچھی کردار نگاری کے لئے یہ ضروری ہے اس میں بھی وقت اور حالات کے تحت تبدیلی آئے۔ زندگی ہمیشہ یکسان نہیں رہتی۔ مگر نذیر احمد کے کرداروں میں یہ بات نہیں ہے۔ وہ شروع سے آخر تک یکسان رہتے ہیں۔ ان کی یک رنگی

اچھائی یا برائی ہمیشہ ایک ہی رہتی ہے جیسے اصغری اور اکبری کو دیکھئے یہ دونوں کردار نمو پذیر نہیں ہے ۔ اصغری کا کردار سادہ ہے پیچیدہ یا ندور نہیں ہے ۔ بنات النعش کے بعض کرداروں میں ارتقا نظر آتا ہے مگر ظاہر دار بیگ میں بھی ذرا سی تبدیلی نہیں آتی ۔ابن الوقت اور ہر یالی بھی اپنے آپ کو نہیں بدلتے ۔ کچھ کردار میں تبدیلی آتی ہے جیسے کلیم کے کردار میں آخری وقت میں تبدیلی آتی ہے ۔ جسے فطری نہیں کہا جا سکتا ۔مگر مبتلا کے کردار میں فطری تبدیلی آتی ہے جو حقیقی معلوم ہوتی ہے ۔بعض ضمنی کردار جیسے ماما عظمت ،سیٹھ ہزاری مل ، تماشا خانم وغیرہ بھی خاصے توانا ہیں جو اپنے ماحول کی مختلف حالتوں اور حیثیتوں کی نمایندگی کرتے ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد کردار نگاری میں بیانیہ اسلوب کو خاص طور سے اپنایا ہے اور ملبوسات کے ذریعے بھی کردار نگاری کی ہے ۔فسانہ مبتلا میں مبتلا کا کردار بیانی تمہید سے اس طرح شروع ہوتا ہے:

نور کا پتلا ہے، بڑی بڑی غلافی آنکھیں،اونچی اور ستی ہوئی ناک پتلے ہونٹ۔۔۔''

میر متقی کا کیریکٹر ملبوسات کے ذریعے بہت کچھ پیش کیا گیا ہے ۔توبتہ النصوح میں مرزا ظاہر دار بیگ کا کردار اس کی بہترین مثال ہے۔

ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ نذیر احمد اردو کے پہلے ناول نگار ہیں ۔ چوں کہ وہ ناول کے فن سے پورے طور پر واقف نہیں تھے اس بنا پر ان کے کرداروں میں خامیوں کا ہونا کوئی بعید از قیاس نہیں ۔ دوسری بات یہ کہ وہ داستانوں کی روایت کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں ۔ لہذا ان کے بعض کرداروں پر داستانوں کی روایت کا اثر ملتا ہے اور اس پر سے وہ ہمیں مثالی نظر آتے ہیں ۔ اس مثالیت سے وہ خود کو بچا بھی نہیں سکتے تھے اس لیے کہ ان کا مقصد اصلاحی تھا ۔ اصلاحی مقصد اور معاشرتی حالات وشعور کا تقاضا ہی یہی تھا کہ نیکی کو ہی آخر تک کامیاب و کامران ثابت کیا جائے ۔ چناچہ نذیر احمد کو اپنے معاشرتی اصلاح کے مقصد کی خاطر کہیں کہیں فن کی نزاکتوں کے تقاضوں کو دانستہ یا نادانستہ طور نظر انداز کرنا پڑا۔اور وہ مقصد سے والہانہ لگاؤ کی خاطر فن کو مقصد پر قربان کرتے رہے ۔ان سب مجبوریوں اور کوتاہیوں کے باوجود نذیر

احمد کا یہ کمال ہے کہ انہوں نے اپنے کرداروں کو تخیل اور تصور کی دنیا سے نکال کر حقیقت کی دنیا میں بسایا ۔ان کے ایسے کردار جو جامد یا مثالی کہے جاتے ہیں۔ وہ کہانی کے تسلسل میں، مکالمے کی قوت اور زور بیان کی بنا پر ہمیں اجنبی نہیں معلوم ہوتے۔ نذیر احمد کو کرداروں کی حرکات وسکنات اور ہر قسم کے احساسات جزوی تفصیلات کے ساتھ رقم کرنے پر قدرت حاصل ہے۔جس کی مثال کلیم، ابن الوقت، مبتلا، ہریالی اور ماما عظمت کے کرداروں سے پیش کی جاسکتی ہے۔ ابن الوقت کی جذباتی کشمکش اور نفسیاتی پیچیدگی کو جس سلیقے سے پیش کیا ہے یہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ نذیر احمد انسانی نفسیات کی گہری بصیرت رکھتے تھے اور ان کی نظر چھوٹی سے چھوٹی باتوں پر بھی یہی وجہ ہے کہ ان کے قلم سے کئی لافانی کردار وجود میں آئے۔ جو یقیناً نذیر احمد کی کردار نگاری کے فن میں اولین نقش کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں اور نذیر احمد کی عظمت کو بیان کرتے ہیں۔ جب تک ادب زندہ رہے گا یہ کردار زندہ رہیں گے اور کرداروں کا خالق بھی۔

ڈپٹی نذیر احمد نے خواب اور خود کلامی کی تکنیک کو زیادہ تر استعمال کیا۔اپنے نقطۂ نظر کو بیان کرنے کے لئے کرداروں کو وہ کبھی خود کلامی یا خواب کی دنیا میں لے آتا ہے۔

## مکالمہ نگاری

مکالمہ نگاری میں نذیر احمد کو بڑی مہارت حاصل ہے۔ان کے ہر کردار کی زبان سے وہی مکالمے ادا ہوتے ہیں جو اس کی شخصیت سے مطابقت رکھتے ہوں اور موقع محل کے عین مطابق ہوں۔ ان کے کرداروں کی گفتگو سننے والا محض اس گفتگو سے ان کرداروں کے بارے میں بہت کچھ جان سکتا ہے۔ان کے بیشتر مکالموں سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ ان کا ادا کرنے والا کون ہے، کس مزاج کا ہے، اور اس کی پرورش کس ماحول میں ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی اس کی عمر کا بھی اندازہ ہوجاتا ہے، مکالمہ نگاری میں نذیر احمد کی اس کامیابی کے کئی اسباب ہیں۔اوّل تو نذیر احمد ایک کثیر المطالعہ انسان تھے اور زبان پر انھیں پوری قدرت حاصل تھی۔ وہ مشکل سے مشکل بات اور پیچیدہ سے پیچیدہ خیال کو سہل بنا کے بات چیت کی زبان میں ادا کرنے کا گُر جانتے تھے۔ دوسرے وہ انسانی نفسیات کے رمز شناس تھے اور تیسرے یہ کہ عملی زندگی کے وسیع تجربے سے انھوں نے بہت کچھ سیکھا تھا۔انھوں نے ہر قسم اور طبقے کے لوگوں کو نزدیک سے دیکھا تھا۔اس لیے خوب جانتے تھے کہ کس شخص کی زبان سے کس موقعے پر کیا الفاظ ہوں گے۔

ڈپٹی نذیر احمد اپنے کرداروں کا تفصیلی تعارف بھی کراتے ہیں، کرداروں کے عمل سے بھی ان کی شخصیتوں کو نمایاں کرتے ہیں لیکن جو چیز نذیر احمد کے کرداروں کے سمجھنے میں سب سے زیادہ معاون ہوتی ہے وہ ان کے اپنے مکالمے ہیں۔ مرأۃ العروس اور بنات النعش ان کے ابتدائی ناول ہیں۔ ان میں متعدد خامیاں موجود ہیں لیکن مکالمہ نگاری میں مولوی صاحب کو جو قدرت حاصل ہے اس کا اظہار یہیں سے ہونے لگا ہے۔ اکبری اور اصغری کی سیرت کا اندازہ ان کی اپنی گفتگو سے ہی ہوتا ہے ان کی گفتگو اور اس کا انداز ہو بہو ویسا ہی ہے جیسا متوسط طبقے کے مسلمان گھرانوں میں ہوسکتا ہے۔ حسن آرا بنات النعش کا مرکزی کردار ہے۔ محمودہ سے اس کی گفتگو یوں ہوتی ہے:

> محمودہ۔ محتاج کے سر میں کیا سینگ ہوتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر محتاجی اور کیا ہوگی کہ آپ کا ایک دن بھی بے نوکروں کے نہیں کٹ سکتا۔ بھلا میں پوچھتی ہوں ماما نہ ہو تو کھانا کون پکائے، لونڈیاں نہ ہوں تو پانی کون پلائے، منہ کون دھلائے، پنکھا کون جھلے، چیز کون اٹھا کر دے، چارپائی کون بچھائے بچھونے کون کرے، گھر میں جھاڑو کون دے۔ یہ تو روز مرّہ کے کام ہیں۔ کھانا، کپڑا، برتن، زیور اور ضرورت کی کُل چیزیں چھوٹی یا بڑی یہاں تک کہ پانی پینے کا مٹی کا آبخورہ، کنگھی، سوئی، سلائی کیا آپ نے اپنے ہاتھوں بنائی ہیں؟
>
> حسن آرا۔ بے شک ضرورت کی سب چیزیں اور لوگ بناتے اور ٹہل خدمت بھی کرتے ہیں۔ مگر کیا کوئی چیز ہم کو مفت دی جاتی ہے اور کیا بے لیے کوئی ٹہل خدمت کرتا ہے۔ ہر چیز اور ہر کام کے لیے ہم روپیہ خرچ کرتے ہیں۔ روپے کے لالچ سے لوگ خود بخود چیزیں لیے دوڑ سے چلے آتے ہیں۔ بے بلائے ٹہل خدمت کرنے کو حاضر ہوتے ہیں۔ روپیہ ہو تو گھر بیٹھے دنیا بھر کا سامان لے لو اور نوکر تو ایک صبح رکھو ایک شام۔

توبۃ النصوح میں کلیم کی ادبی اور شاعرانہ گفتگو، مرزا ظاہر دار بیگ کی جھوٹ اور مکاری سے بھری باتیں، نعیمہ کی اپنی ماں سے بے ادبی سے بات چیت، ان کرداروں کے مزاج کو پوری طرح نمایاں کرتی ہے۔ ابن الوقت اور حجت الاسلام کے مکالمے طویل ہونے کے باوجود بہت دل چسپ ہیں۔ ایامیٰ میں

آزادی بیگم کی خود کلامی اس کی ذہنی تہوں کو کھولتی اور اس کے باطن کو بے نقاب کرتی ہے۔اس زیرلب گفتگو سے اس کی ذہنی کشمکش کا پتہ چلتا ہے۔فسانۂ مبتلا میں مکالمہ نگاری کے عمدہ نمونے نظر آتے ہیں۔مبتلا کے چچا میر متقی کی آمد پر بھانڈ آپس میں جو طنزیہ گفتگو کرتے ہیں وہ دل چسپ بھی ہے اور اس عہد کے افکار پر روشنی بھی ڈالتی ہے۔ہریالی کی مبتلا سے گفتگو، غیرت بیگم کی ماما سے بات چیت، مبتلا کی عارف سے بحث، نذیر احمد کی مکالمہ نگاری کی عمدہ مثالیں ہیں۔مبتلا ہریالی سے نکاح کرکے اسے خادمہ کے بھیس میں گھر لے آتا ہے لیکن آخر کار ایک روز یہ راز افشا ہوجاتا ہے۔غیرت بیگم اس صدمے کو برداشت نہیں کر پاتی۔اس کی حالت متغیر ہوجاتی ہے۔غصّے کے عالم میں اس کی زبان سے بے ربط فقرے نکلتے ہیں جن سے اس کی ذہنی حالت کا اندازہ ہوتا ہے۔غصّے میں کہتی ہے:

غیرت بیگم۔''یہ ہریالی نہیں گھر والی ہے۔یہ بی بی ہے۔یہ میری سوکن ہے، میں رانڈ ہوں۔یہ سہاگن ہے۔میں لونڈی ہوں یہ بیگم ہے، میں چڑیل ہوں یہ حور ہے۔یہ میاں کی لاڈو ہے۔یہ میاں کی چہیتی ہے۔یہ میاں کے کلیجے کی ٹھنڈک ہے۔''

نذیر احمد کے پہلے ناول سے ہی ان کی مکالمہ نگاری کا قائل ہونا پڑتا ہے لیکن اس فن میں مسلسل ارتقا نظر آتا ہے۔بعد کے ناولوں کے مکالمے اور بھی زیادہ کامیاب ہیں۔ان کے مکالموں کی خامیاں کہیں کہیں کھٹکتی ہیں۔بعض جگہ ان کے مکالمے ضرورت سے زیادہ طویل ہوجاتے ہیں۔یہ بالعموم ان موقعوں پر ہوتا ہے جہاں مذہبی امور زیر بحث آتے ہیں۔اس کا سبب نذیر احمد کا اصلاحی مشن اور مذہبی ذہن ہے۔ثقیل الفاظ کا ستعمال بھی کہیں کہیں ناگوار گزرتا ہے۔ابتدائی ناولوں میں یہ عیب زیادہ نمایاں ہے۔محاوروں اور کہاوتوں کی بھرمار نے بھی ان کے مکالموں کو داغدار کیا ہے لیکن تینوں خامیاں ہر جگہ نہیں بلکہ کہیں کہیں نظر آتی ہیں۔مجموعی طور پر نذیر احمد مکالمہ نگاری کے فن میں کامیاب ہیں۔ان کی مکالمہ نگاری کے سلسلے میں سید علی عباس حسینی فرماتے ہیں:

> ''بے شک وشبہ مولانا عورتوں کے مکالمے کے بادشاہ ہیں۔صنف نازک کے انداز تکلم، طرز گفتگو، نشست الفاظ اور روزمرہ کے محاورے پر جیسا انہیں عبور ہے۔ویسا سرشارؔ، ہوشؔ، مرزا رسواؔ کے علاوہ کسی کو نصیب نہیں۔''۱۳

## حقیقت نگاری

ناول کو اس آئینے سے تشبیہ دی گئی ہے جس میں جیتی جاگتی دنیا کا عکس نظر آئے۔ گویا ناول نام ہے زندگی کی تصویر کشی کا اور نذیر احمد کے ناول اس کسوٹی پر پورے اترتے ہیں۔ زندگی کی تصویر کشی وہ اس کامیابی سے کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کو اس پر اکثر اپنے گھر اور اپنے ماحول کا گمان گزرتا ہے اور ان کے کردار جانے پہچانے سے لگتے ہیں۔ افتخار عالم نے لکھا ہے کہ اکبری اصغری کے قصّے کو لوگ سچّا واقعہ خیال کرتے تھے اور کتنے تو ان بہنوں کے گھروں کا پتہ پوچھتے پھرتے تھے۔ بہتوں کو یہ شبہ بھی ہوا کہ کہیں اس ناول میں ان کے اپنے خاندان کو تو بے نقاب نہیں کیا گیا۔ ابن الوقت کو سرسید کا چربہ کہا گیا، حجۃ الاسلام کو مولوی نذیر احمد کا عکس بتایا گیا اور آزادی بیگم میں مولوی صاحب کی ایک بیاہ سالی کا عکس ڈھونڈھ نکالا گیا۔ مختصر یہ کہ نذیر احمد کے ناولوں میں حقیقی زندگی کے مرقعے نظر آتے ہیں۔ ان کی نظر گہری ہے اور معمولی سے معمولی تفصیل بھی ان کی نظر سے اوجھل نہیں ہو پاتی۔ ایک ماہر فنکار کی طرح وہ زندگی کے کسی قابلِ ذکر حصّے کو منتخب کر لیتے ہیں اور قاش کی طرح تراش کر گویا محدّب شیشے کے نیچے رکھ دیتے ہیں کہ اس کا ایک ایک حصّہ پوری طرح نمایاں ہو جائے۔

## افادی نقطۂ نظر

ڈپٹی نذیر احمد کے عہد کو دو تہذیبوں کے تصادم کا عہد بھی کہا جا سکتا ہے اور اسے دورِ اصلاح کے نام سے بھی یاد کرنا بھی مناسب ہے۔ دراصل یہ دونوں باتیں الگ نہیں بلکہ ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ قوم کے باشعور افراد نے جب مشرقی تہذیب کا مغرب کے نئے حکمرانوں سے موازنہ کیا تو اپنی تہذیب کی بہت سی خامیاں ان پر روشن ہو گئیں اور وہ ان کی اصلاح پر کمر بستہ ہو گئے۔ مصلحین کے اس کارواں کے سالار بلاشبہ سرسید تھے لیکن بعض معاملات میں نذیر احمد کو ان پر فوقیت حاصل ہے۔ وہ چونکہ عربی زبان کے ماہر اور عالمِ دین بھی تھے اس لیے مذہبی مسائل میں افراط و تفریط سے محفوظ ہے۔ دوسرے یہ کہ طبیعت میں سرسید کی بہ نسبت زیادہ اعتدال و توازن تھا اور تیسری بات یہ کہ بعض امور میں وہ سرسید سے بھی آگے تھے مثلاً تعلیم و تربیتِ نسواں کی طرف انھوں نے سرسید سے زیادہ توجہ کی۔ بیواؤں کے عقدِ ثانی کی ضرورت کو انھوں نے پہلی بار دل نشین پیرائے میں بیان کیا۔

ڈپٹی نذیر احمد ادب کو محض وقت گزاری اور تفننِ طبع کا ذریعہ نہیں خیال کرتے تھے بلکہ اسے زندگی سنوارنے کا وسیلہ قرار دیتے تھے۔ان کے تمام ناول اصلاحی نوعیت کے ہیں اور ایک واضح اصلاحی پروگرام کے تحت وجود میں آئے۔مرأۃ العروس اور بنات النعش لڑکیوں کی تربیت کے لیے لکھے گئے۔توبتہ النصوح میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ اولاد کی اصلاح والدین کا فرضِ اوّلین ہے۔ابن الوقت کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اپنی تہذیب پر شرمانا اور بغیر سوچے سمجھے دوسروں کی نقالی کرنے کا انجام ذلّت و رسوائی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔فسانۂ مبتلا میں ایک سے زیادہ شادیوں کی خرابیاں بیان کی گئی ہیں، ایامیٰ میں بیواؤں کے عقدِ ثانی کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔رویائے صادقہ میں مذہبی مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔مقصد یہ ہے کہ کہیں نئی تعلیم حاصل کرنے والے نوجوان مذہب سے برگشتہ نہ ہو جائیں۔غرض یہ کہ ان کے تمام ناول مقصدی اور اصلاحی ناول ہیں۔ عالمی ادب کے مطالعے سے انداز ہوتا ہے کہ تقریباً ساری زبانوں میں یہی صورتحال رہی ہے اور بیشتر ابتدائی ناولوں پر مقصدیت کا غلبہ رہا ہے۔نذیر احمد کا دور تو انقلاب و اصلاح کا دور تھا۔ان کے ناول مقصدیت سے دامن کس طرح بچا سکتے تھے۔

## زبان وبیان

ڈپٹی نذیر احمد عربی زبان کے عالم تھے۔اس کے علاوہ دیندار آدمی تھے اور قرآن و حدیث سے خاص شغف رکھتے تھے۔اس لیے ان کی تحریروں پر عربیت کا غلبہ ہے۔ان کے قلم سے عربی کے ثقیل اور نامانوس الفاظ بے اختیار نکل جاتے ہیں۔اور یہ صورت ناولوں میں بھی پیش آتی ہے جبکہ ناول کے ناقدین نے اس پر زور دیا ہے کہ ناول نگار کو اس سے احتراز کرنا چاہیے۔ناول نگار کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی زبان کو ناول کے موضوع اور قاری کے درمیان حائل نہ ہونے دے۔ناول کی زبان کھڑکی میں لگے ہوئے شیشے کے مانند ہوتی ہے جس سے آر پار صاف نظر آتا ہے اور ایک ناقد کے الفاظ میں ناول نگار کا کام یہ ہے کہ وہ اس شیشے کو شفاف رکھے تا کہ اس کے پار نظر آنے والا منظر صاف نظر آئے۔نذیر احمد کی زبان اکثر قاری کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے جو ایک ناول نگار کا عیب ہے۔لیکن تیسرے ناول میں یہ عیب کم ہو جاتا ہے۔یعنی توبتہ النصوح کی زبان زیادہ صاف اور شگفتہ ہے۔مولوی صاحب عربی کے اثر سے اپنا دامن بالکل تو نہ بچا سکے لیکن رفتہ رفتہ ان کے ناولوں کی زبان زیادہ صاف اور شگفتہ ہوتی گئی۔

محاورات کی کثرت سے نذیر احمد کی زبان کبھی آزاد نہ ہوسکی ،ان کی تحریروں میں جو محاورے اور کہاوتیں استعمال ہوئی ہیں انھیں یکجا کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہوسکتی ہے۔کبھی کبھی تو وہ ایک ایک سطر میں کئی کئی محاورے استعمال کر جاتے ہیں۔ یہ شوق اس حد کو پہنچا ہوا ہے کہ کبھی کبھی محاورات کا بے محل استعمال کر جاتے ہیں۔امہات الامہ میں بعض محاورے اس طرح استعمال ہوئے کہ بزرگانِ دین کی شان میں گستاخی کا پہلو پیدا ہو گیا اور اس کتاب کو نذرِ آتش کر دینا پڑا۔

ڈپٹی نذیر احمد بڑے ظریف آدمی تھے۔ان کی تحریریں چٹکلوں ،لطیفوں اور دل چسپ قصوں سے بہت پُرکشش ہوگئی ہیں ۔ان کے ناولوں کے بعض کردار ظرافت کا کافی مواد فراہم کر دیتے ہیں ۔توبۃ النصوح کے مرزا ظاہر دار بیگ اور فسانۂ مبتلا کے بھانڈ اس کی اچھی مثالیں ہیں ۔ظرافت مولوی صاحب کی ایسی کمزوری ہے کہ سنجیدہ موقعوں پر بھی اس سے احتراز نہیں کر پاتے۔

## نقطۂ نظر

ناول کے جو اصول متعین کیے گئے تھے ان میں نقطۂ نظر کو بھی ضروری قرار دیا گیا تھا۔نذیر احمد کے ناول اس کسوٹی پر پورا اُترتے ہیں ۔وہ ایک واضح نقطۂ نظر کے حامل تھے۔وہ مشرقی اقدار کے حامی اور اسلامی روایات کے علمبردار تھے۔انھوں نے اپنے ناولوں کو اصلاحِ معاشرت اور استحکامِ دین کا وسیلہ بنایا گویا وہ افادی ادب کے قائل تھے اور اس سے زندگی سنوارنے کا کام لینا چاہتے تھے۔

## دل چسپی کا عنصر

ہمارا دور ادبی روایات کی شکست و ریخت کا دور ہے۔روایت سے انحراف تو ہر زمانے میں ہوتا رہا ہے لیکن اب روایت سے مکمل بغاوت کا زمانہ ہے۔عہدِ حاضر کے ناول نے تمام مسلّمہ اصولوں سے کنارا کر لیا ہے۔اب ناول کے لیے نہ پلاٹ ضروری ہے نہ روایتی کردار اور نہ نقطۂ نظر لیکن یہ عام طور پر آج بھی محسوس کیا جاتا ہے کہ ناول میں دل چسپی کا عنصر بہر حال موجود ہونا چاہئے جو قاری کی توجہ کو پوری طرح گرفت میں لیے رہے۔نذیر احمد کے تمام ناول اس شرط کو پورا کرتے ہیں۔

## اصلاحی جذبہ

ڈپٹی نذیر احمد کے تمام ناولوں میں اصلاحی جذبہ کارفرما ہے۔ان کا ہر ناول کسی نہ کسی مقصد کے

تحت لکھا گیا اور سر ورق پر اس مقصد کا بالعموم اعلان بھی کر دیا گیا ۔انہوں نے ادب کی افادیت اور مقصدیت پر زور دیا۔انہوں نے خواتین کی اصلاح میں زیادہ دلچسپی دکھائی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ سماج میں عورت کا پست مقام تمام معاشرتی برائیوں کی جڑ ہے۔حالانکہ ڈپٹی نذیر احمد کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ادب برائے خواتین کا نظریہ پیش کیا ہے۔مرد جو سماج کی ایک اکائی ہے اس کی تمام زندگی اس مرکز و محور کے گرد گھومتی ہے۔چناچہ نذیر احمد نے سماج کے اس مرکز و محور کی اصلاح کے لئے اپنا پہلا ناول مراۃ العروس تصنیف کیا۔

## اسلوب

ہر ادیب و فن کار کا اپنا جداگانہ اسلوب ہوتا ہے۔اسلوب سے مراد کسی مصنف یا ادیب کے انداز فکر، طرز بیان اور اس کے تخلیقی کارناموں کی وہ خصوصیات ہیں جو اسے دوسرے سے ممیّز و ممتاز کرتی ہیں ۔اسلوب کی تعریف مختلف مغربی مفکرین نے مختلف طریقے سے کی ہے ۔اٹھارہویں صدی کے مشہور فرانسیسی ادیب بوفون (Buffon) اسلوب کو مصنف کی شخصیت کا پرتو قرار دیتا۔اس کے مطابق اسلوب ایک ایسا آئینہ ہے جس میں مصنف کی شخصیت صاف نظر آتی ہے۔ہم کسی صاحب طرز مصنف کی تحریر کو دیکھ کر بہ آسانی پہچان سکتے ہیں کہ تحریر کس مصنف کی ہے۔آج محمد حسین آزاد، ابوالکلام آزاد، مولوی نذیر احمد، شبلی اور سر سید کی تحریر ان کی مخصوص انفرادیت کی وجہ سے پہچانی جاتی ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کا شمار بھی ایک صاحب طرز ادیب کی حیثیت سے ہوتا ہے ۔انھوں نے مختلف موضوعات پر بہت کچھ لکھا ہے۔جس کا دائرہ بے حد وسیع ہے۔یہ مولانا کے طرز تحریر کی انفرادیت ہے کہ ان کی تحریر خود ان کا پتہ بتاتی ہے۔ہر جگہ ان کی شخصیت جلوہ فگن نظر آتی ہے۔ان کے ناول کے منفرد لب و لہجہ اور پیرایۂ اظہار نے انہیں اردو ادب میں زندہ جاوید کر دیا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے اپنے روزمرہ کی رواں دواں برجستہ اور بے تکلف زبان میں پہلی بار اپنے کرداروں کو گفتگو کرنا سکھایا۔کردار جس ماحول کے ہیں وہ اسی طرح زبان بولتے ہیں ۔نذیر احمد کے ناولوں کا کینوس چوں کہ گھر کی چار دیواری تک محدود ہے اور ان کے کردار بھی متوسط طبقے کے مسلمان گھرانوں سے لیے گئے ہیں لہذا یہ کردار بالکل فطری زبان میں گفتگو کرتے ہیں

۔ان کرداروں کی گفتگوسن کر آپ ان کرداروں کے بارے میں بخوبی جان سکتے ہیں کہ یہ کس طبقے اور کس عمر کے کردار ہوں گے علاوہ ازیں ان کے ناولوں میں مختلف پیشوں کے لوگ نظر آتے ہیں ان میں سے ہر ایک ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جو اس پیشے کے لوگوں میں بولے جاتے ہیں۔ بوڑھے، بچے، مولوی سب کی گفتگو کا انداز الگ الگ ہے۔اسی طرح متوسط درجے کی خواتین کی زبان خادماؤں کی زبان سے جداگانہ ہے۔ گویا سب کی زبان وہی ہوگی جو دراصل ان لوگوں کی ہوتی ہے۔ نذیر احمد کو ان سب کی زبان لکھنے پر پوری قدرت حاصل ہے۔ بالخصوص عورتوں کی زبان اور بیگمات کے محاورے اور ضرب الامثال کے بیان پر تو ان کو خاصی قدرت حاصل ہے۔اس میں وہ اپنی مثال آپ سمجھے جاتے ہیں۔یعنی ان کے غم و غصّے کی حالتوں اور نوک جھونک کی کیفیتوں کو ان ہی کی زبان، لب و لہجے اور مقامی محاورے میں ادا کرنے میں انہیں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ مروجہ شاعری سے لگاؤ نہ ہوتے ہوئے بھی انہوں نے اپنے مکالموں میں کہیں کہیں ذہنی اور جذباتی کیفیات کی شاعرانہ سطح پر مصوری کی ہے اور تشبیہات و استعارات صنائع لفظی اور معنوی، قافیہ بندی اور رعایت لفظی سے کہانیوں کی عبارت میں حسن پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔کلیم کے مکالموں میں شعریت غالب ہے۔ حجت الاسلام قرآن و حدیث کے حوالوں سے عالمانہ گفتگو کرتے ہیں۔مبتلا کی باتوں میں سادگی ہے۔نسوانی کردار عام طور پر دلی کی بامحاورہ زبان بولتے ہیں۔ بھانڈ کی اپنی الگ زبان ہے وہ کبھی مسخرا پن سے باز نہیں آتا۔ گویا جتنے لوگ اتنی زبان۔

ڈپٹی نذیر احمد کو دلی کی زبان پر اہل زبان کی سی قدرت حاصل ہوگئی تھی لیکن اس کے باوجود ان کی تحریر کی دو خصوصیتیں جو ان کے تحریر کی خرابی بھی سمجھی جاتی ہے، خاص طور پر نمایاں ہیں۔ وہ اپنی تحریروں میں عربی فارسی کے خاصے مشکل الفاظ اور ترکیبیں، قرآن کی آیات اور حدیث کے جملے، فقرے بے تکلف لکھ جاتے ہیں۔ چوں کہ ان کے ناولوں کا مقصد اصلاح ہے۔ اصلاح بھی کس کی ؟ مسلمان خاندانوں کی ۔اس لئے لازمی طور پر ان کو دلائل میں قرآن مجید اور احادیث سے حوالے دینے پڑے۔سینکڑوں عربی الفاظ فقرے اور ضرب الامثال استعمال کر گئے جو اپنی اپنی جگہ پر نہایت موزوں ہیں۔ اگر چہ بادی النظر میں کھٹکتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔شاید اسی قسم کے جملوں کو پڑھ کر رام بابو سکسینہ نے مولانا کی تحریر کے متعلق یہ رائے قائم کی ہے:

''البتہ کبھی کبھی بڑے بڑے عربی فارسی کے غیر مانوس الفاظ لے آتے ہیں جس سے
کہیں کہیں رنگیں عبارت میں بجائے چستی اور خوب صورتی کے بھونڈا پن اور خرابی پیدا
ہو جاتی ہے۔''۱۴

بلاشبہ عربی فارسی کے ثقیل الفاظ سے ان کی نثر کو نقصان ضرور پہنچا لیکن تبلیغ دین اور اصلاح معاشرت کے لیے ایسا کرنا ان کے لیے ناگزیر تھا کہ یہ ان کے کرداروں اور ماحول اور موضوع کی قدرتی زبان ہے۔

ان کے اسلوب کی دوسری خصوصیت محاوروں کا استعمال ہے۔اس کی وجہ سے جہاں ان کی تحریر میں زور پیدا ہوا ہے وہیں محاوروں کی کثرت سے ایسا لگتا ہے کہ جتنے محاورے یاد ہیں انہیں کہیں نہ کہیں کھپا دیں۔جس سے تحریر میں بوجھل پن پیدا ہوا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کے مزاج میں ظرافت بے پناہ تھی وہ اپنی تحریر و تقریر میں اس سے خوب کام لیتے تھے ۔تقریر کے دوران سامعین کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کے لیے کبھی کوئی پر لطف قصہ سناتے تھے ۔کہیں چٹکلے اور لطیفے سے کام لیتے تو کہیں زبان کے چٹخارے سے لطف دوبالا کرتے تھے۔ناولوں میں بھی انہوں نے اپنی حسن ظرافت سے کام لے کر اسے زیادہ پرکشش بنا دیا ہے ۔ظرافت آمیز زبان کے استعمال پر بھی پوری قدرت حاصل ہے۔ان کے اسلوب کی اس خصوصیت کو بعض ناقدین نے بطورِ خاص سراہا ہے۔سر عبدالقادر نے توبۃ النصوح کے مزاج کے لحاظ سے نذیر احمد کو امریکی مزاح نگار مارک ٹوین کا ہم پلہ قرار دیا ہے۔ڈاکٹر محمد صادق کے مطابق'' نذیر احمد کے زندہ رہ جانے کا باعث ہی مزاح کا قومی تناظر ہے''۔ان کی نثر میں ڈرامائیت کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔کہیں کہیں سادگی اور سلاست اس درجہ بڑھ گئی ہے کہ معلوم ہوتا ہے لوگ آپس میں بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔نذیر احمد اپنی سادگی، بے تکلفی، بے ساختگی ،شوخی اور تمسخر سے تھکن کا احساس پیدا نہیں ہونے دیتے یہ ان کے فن کا کمال ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کے نثر کی ایک اہم خوبی زور بیان ہے۔ان کے یہاں شوکت الفاظ اور عبادت کی شان خاص طور پر دیکھنے کے لائق ہے۔ان کا لہجہ پر جوش اور اثر انگیز ہے۔چناچہ وہ خشک مضامین کو بھی اپنے زور بیان اور بلند آہنگ الفاظ کی مدد سے اس طرح پُر کیف اور شگفتہ بنا

کر پیش کیا ہے۔ مقصد کی تکمیل ہو سکے اس خصوصیت میں وہ منفرد ہیں اور بہ آسانی پہچانے جاتے ہیں۔ خطیب ہونے کی وجہ سے بعض مقامات پر ان کے لب ولہجہ میں ایک مخصوص قسم کا جلال پیدا ہوتا ہے بالخصوص جب وہ خطیبانہ انداز میں شدید غم وغصے کا اظہار کرتے ہیں یہاں ان کی شخصیت کا بھرپور اظہار ہوتا ہے۔

ان تمام باتوں کے پیش نظر ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ نذیر احمد کا ایک منفرد اور مخصوص اسلوب ہے۔ جو اپنی بہت واضح شناخت رکھتا ہے۔ اور اس کو پہچان لینا قاری کے لئے زیادہ دشوار نہیں۔ اس اسلوب کے پیچھے ان کی قدآور اور توانا شخصیت کارفرما ہے جو فن کار ہونے کے ساتھ ساتھ واعظ بھی ہے۔ ان کی گفتگو کا انداز وہی ہے جو ایک واعظ اور ناصح کا ہونا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے جملے، فقرے بالعموم ترشے ہوئے اور رواں دواں ہوتے ہیں۔ قوت توانائی، تیزی طراری، صلابت اور شگفتگی سے عبارت ہوتے ہیں اور یہی ان کی خاص پہچان ہے۔

## ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کا معیار

ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں مراۃ العروس، بنات النعش، توبتہ النصوح اور ابن الوقت بہت اہم اور ہر دلعزیز ہیں۔ ان میں ہر ایک تخلیق میں ناول کی مکمل خصوصیات موجود ہیں۔ اُن میں واقعات کی ترتیب و تنظیم ہے جو پلاٹ کے مطالبات کو پورا کرتا ہے۔ ان کے پلاٹ میں تاثیر اور تجسس کی فراوانی ہے۔ نذیر احمد کے ناول کردار نگاری کے اعتبار سے بھی دلچسپ ہیں۔ عام طور پر اُن کے کردار انسانی زندگی کے جیتے جاگتے نمونے ہیں مگر کہیں کہیں مثالیت کا پرتو بھی نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر اصغری کا کردار ایک نیک اور سعادت مند لڑکی کا مثالی کردار ہے اور اس کی بڑی بہن اکبری اس کی ضد ہے۔ یہ کردار اپنا اپنا کام پوری طرح سے انجام دیتے ہیں۔ توبتہ النصوح کا نصوح اور اس کا لڑکا کلیم بھی کردار نگاری کے بہترین نمونے ہیں۔ مکالمے بھی مولانا کے یہاں بہت ہی برمحل اور برجستہ ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد کے مکالموں کا ذکر کرتے ہوئے سید عباس حسینی لکھتے ہیں:

''اب رہا مکالمہ تو بے شک وشبہ مولانا عورتوں کے مکالمے کے بادشاہ ہیں۔'' ۱۵

ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے معاشرے کے تمام پہلوؤں کا عمیق نظر سے مشاہدہ کیا تھا۔ ان کے ناولوں

میں ناول نگاری کے ذاتی مشاہدے کی مثالیں کثرت سے تلاش کی جاسکتی ہیں ۔انھوں نے زندگی کے مسائل کا تجربہ کرنے میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے،جس کی بنا پراُن کے ناول زندۂ جاوید ہوگئے ہیں بلاشبہ ماحول کی تصویرکشی میں نذیراحمد کا ثانی مشکل سے ملے گا۔

ڈپٹی نذیراحمد سے پہلے اردو کا ادبی سرمایہ داستان اور قصے کی شکل میں ملتا ہے۔نذیراحمد نے قصے اورداستان کی مافوق الفطرت دنیا کوحقیقت سے روشناس کرایااور ناول کوروزمرہ زندگی سے قریب تر لانے کی کوشش کی ۔نذیر احمد کی ناول نگاری کا آغاز اس وقت ہوا جب ۱۸۶۹ء میں ان کا پہلا ناول ''مرأۃالعروس'' شائع ہوا جس کے بارے میں مولوی عبدالحق نے لکھا ہے:

> ''اگر نذیراحمد ''مرأۃالعروس'' کے سوا کوئی دوسری کتاب نہ لکھتے تو بھی وہ اردو کے باکمال انشاپرداز مانے جاتے اوران کی حیات جاوید کے لئے صرف یہی ایک کتاب کافی ہے''۔ ۱۶

ان کے تمام ناولوں کا موضوع تعلیم نسواں اوراصلاح معاشرہ ہے نذیراحمد نے عورتوں کی اصلاح اورسماج کے نمایاں نقائص کواجاگرکرنے کے لئے ناول لکھےاورانہوں نے اخوت اسلامی کا سبق پڑھایا۔

ڈپٹی نذیراحمد ایک غریب مگر علمی خانوادے کے چشم و چراغ تھے انہوں نے جو کچھ کیا وہ اپنی صلاحیتوں کی بنیاد پر کیا ایک غریب شخص سے امیر اورایک ادنیٰ طالب علم سے اعلیٰ درجے کے عالم و فاضل مصنف کا درجہ حاصل کیا ان کی زندگی اپنی مدد آپ کی روشن مثال ہے ان کا بڑا کارنامہ اصلاح معاشرہ ہے ان کی ناول نگاری کا بڑا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اسلامی سوسائٹی اور خاص کر مسلم معاشرت کی تصویر ایسی سچی اور بے لاگ کھینچی ہے کہ آنکھوں کے سامنے اس کا نقشہ پھر جاتا ہے۔انہوں نے اپنی تصانیف کے ذریعے لڑکیوں کے دل ودماغ کوتعلیم یافتہ بنانے کی کوشش کی ان کے ناولوں کی دوسری خوبی یہ ہے کہ انہوں نے عورتوں کی زبان اوران کے حالات کی ایسی ہوبہو عکاسی کی ہے کہ ان کے کردار منھ بولتی تصویر نظر آتے ہیں یہ خصوصیت نذیراحمد کے سوا کسی دوسرے مصنف کو حاصل نہیں۔

ڈپٹی نذیراحمد کے فن کا جائزہ لیتے ہوئے علی عباس حسینی لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر نذیر احمد کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انہوں نے تمام قصوں میں ہماری معاشرتی زندگی کی بالکل سچی تصویر کشی کی ہے۔''۱۷

غرض کہ ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے ناولوں سے ایک آلئہ کار کا کام لیا اور انہوں نے فن سے زیادہ مقصد پر زور دیا اور یہ ان کے ناولوں کی سب سے بڑی کمزوری ہے اسی لئے نذیر احمد کے بارے میں کہا جاتا ہے جب ان کا فن جاگتا ہے تو مقصد سو جاتا ہے اور جب مقصد بیدار ہوتا ہے تو فن کو نیند آجاتی ہے۔

وہ فن اور مقصد کے درمیان توازن برقرار نہیں رکھ سکتے تھے انہوں نے جب فن کے تقاضوں کو پورا کرنا چاہا تو مقصد کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا اور جب مقصد کی طرف توجہ دی تو فن کے تقاضے کو پورا نہ کرسکے یہ ان کے ناول کا سب سے بڑا نقص ہے کسی فن پارے کو کسی مقصد کے حصول کے لئے کس حد تک استعمال کیا جاسکتا ہے اس کی طرف متوجہ کرتے ہوئے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں:

''ناول کے مقصدی ہونے میں کوئی قباحت نہیں ہے اور نہ اس میں کوئی اعتراض ہوسکتا ہے کہ ناول سے کسی خاص سیاسی مسئلے کے پروپیگنڈے یا اور کسی قسم کی ترغیب کا کام لیا جائے لیکن اس مقصد کو حاصل کرنے سے پہلے ناول کو اگر وہ ناول ہے تو ناول ہونا پڑے گا اور پھر کسی تحریک کا آلئہ کار۔''۱۸

اس اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فن پارے کو مقصد کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے لیکن مقصد سے پہلے فن پارے کو فن کے اصول پر پورا اترنا چاہیے اسی مقصد کا ظاہر کرتے ہوئے ابواللث صدیقی ایک دوسری جگہ تحریر کرتے ہیں:

''میرے خیال میں ناول کی سب سے پہلی حیثیت ایک ادبی شہکار کی ہے۔ثانوی حیثیت ایک آلئہ ترغیب کی''۔۱۹

ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کی سب سے بڑی کمی یہی ہے کہ ان کے یہاں مقصد فن پر غالب آجاتا ہے نذیر احمد کے یہاں اور بھی بہت سے نقائص پائے جاتے ہیں لیکن نذیر احمد کے ان نقائص کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے اس لئے کہ نذیر احمد اردو کے اولین ناول نگار ہیں ان کے سامنے ناول کی شکل میں کوئی ایسا نمونہ نہیں تھا جس کو سامنے رکھ کر وہ اپنی تخلیقات کو سامنے لاتے یا جدید ناولوں کو پرکھنے کے لئے جو اصول وضع نہیں لئے گئے تھے۔لہذا جدید اصول پر قدیم ناولوں کو پرکھنا کہاں تک صحیح ہے یہ فیصلہ تنقید نگاروں کے

ہاتھ میں ہے۔ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

''نذیر احمد کے ناول اردو کے اولین ناول تھے اس لحاظ سے اس میں ترقی یافتہ ناولوں کی سب خوبیوں کی تلاش بیکار ہے ان میں ہندوستانی مسلمانوں کے اہم دور کی معاشرت کی تصویریں ملتی ہیں اس عہد کی ذہنیت، سماجی تصورات، معاشرتی نظریات، کے بہترین مرقعے جتنے نذیر احمد کے ناولوں میں ہیں اور کہاں دستیاب ہوں گے۔''

۲۰

ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں کچھ خامیوں کے باوجود ان کے ناول زندہ رہیں گے اس لئے کہ اردو ناول نگاری کی تاریخ میں اولیت کا سہرا نذیر احمد ہی کے سر باندھا گیا ہے۔نذیر احمد کے ناولوں کا معیار جانچنے کے لئے مختلف پیمانے ہیں جن میں واقعیت نگاری ،فن، ناول یا تمثیل کے بارے میں جاننے کی کوشش کی جائے گی۔

## تعلیمِ نسواں: ڈپٹی نذیر احمد کی زندگی کا مشن

اردو ناول کی ابتدا تعلیم کے موضوع سے ہوئی۔نذیر احمد کے مکتب میں تعلیمِ نسواں کی اہمیت پر بہت زور دیا گیا اور اردو ناول میں پہلی بار اس موضوع پر لکھنے والے ڈپٹی نذیر احمد ہیں۔ان کا سب سے پہلا ناول مرأۃ العروس ہے جو ۱۸۶۹ء میں لکھا گیا اس ناول کو انہوں نے اپنی بڑی لڑکی کے لئے لکھا تھا۔ اس ناول میں دہلی کے شریف خاندانوں کی معاشرت کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔قصے کا ماحصل صرف یہ ہے کہ ایک جاہل بے پڑھی لکھی لڑکی ایک شریف گھرانے کی تعلیم وتربیت کے ذریعے کیونکر بدل گئی۔

مرأۃ العروس جب منظر عام پر آیا تو اس کی تاثیر کا عالم یہ تھا کہ حیات النذیر کے مصنف کے بقول:

''لوگ ایک عرصہ تک اصغری اور اکبری کے گھروں کا پتہ پوچھتے پھرتے تھے''۔۲۱

مرأۃ لعروس امور خانہ داری اور تعلیم نسواں جیسے اہم موضوعات کے گرد گھومتا ہے اس ناول میں دو بہنیں اصغری اور اکبری کردار ہیں یہ دونوں عادات واطوار میں ایک دوسرے کی ضد ہیں اصغری جو کہ چھوٹی بہن ہے جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اچھے اخلاق کی نمائندہ ہے دوسرا کردار اکبری ہے جو بڑی ہے یہ اپنی نانی اور ماں کی لاڑلی بیٹی تھی اور امور خانہ داری سے ہمیشہ بے نیازی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے مزاج میں کجی اور ضد پیدا ہوگئی۔

مختصر یہ کہ مرأۃ العروس میں مسلمان شرفاء کی خاندانی زندگی امور خانہ داری، حسن معاشرت اور تہذیب ومعاشرت کی تصویر کشی کی گئی ہے اور جو موضوعات اس ناول میں بیان کئے گئے ہیں ان کی اہمیت وافادیت کی تائید خود اس ناول کے ایک اقتباس میں بیان سے ہوتی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد لکھتے ہیں:

''لیکن اس بات سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ عورتوں سے کھانے اور سونے کے سوا دنیا کا کوئی کام متعلق نہیں بلکہ خانہ داری کے تمام کام عورتیں کرتی ہیں مرد اپنی کمائی عورتوں کے آگے لاکر رکھ دیتے ہیں اور عورتیں اپنی عقل سے اس کو بندوبست اور سلیقے کے ساتھ اٹھاتی ہیں پس اگر غور سے دیکھا جائے تو دنیا کی گاڑی جب تک ایک پہیہ مرد اور دوسرا عورت کا نہ ہو چل نہیں سکتی''۔ ۲۲

ڈپٹی نذیر احمد نے مرأۃ العروس کے ذریعے قاری کو سماج کے اہم موضوعات کی طرف متوجہ کیا ہے مرأۃ العروس کے چار سال بعد ۱۸۷۳ء میں نذیر احمد کا دوسرا ناول ''بنات النعش'' سامنے آیا دراصل یہ مرأۃ العروس کا دوسرا حصہ اس میں لڑکیوں کو دستکاری اور عملی زندگی کی ترغیب دی گئی ہے۔ امور خانہ داری اور تعلیم کے جو نظریات مرأۃ العروس میں بیان کئے گئے ہیں اس کی عملی صورت گری کے لئے انہوں نے بنات النعش کی تخلیق نذیر احمد بنات النعش میں معلومات عامہ سے بھی آگاہ کرتے ہیں لیکن سب سے زیادہ امور خانہ داری پر زور دیا گیا ہے۔ بنات النعش کے بارے میں اشفاق محمد خاں لکھتے ہیں:

''بنات النعش میں اخلاقی تعلیم وتربیت کے ساتھ کچھ دلچسپ معلوماتی باتیں بھی ملتی ہیں جو بچیوں کی دلچسپی کو قائم رکھتی ہیں۔ علاوہ ازیں سینڈفورڈ کی طرح بنات النعش میں بھی نذیر احمد نے سائنسی تعلیم بڑے اچھے ڈھنگ سے دی ہے اس تعلیم میں علم جرثقیل ریاضی، وزن، زمین، سمندر کے فوائد، علم تاریخ اور رسومات، اجرام فلکی اور علم ہیئت وغیرہ کے سلسلے میں معلامات عامہ بہم پہنچائی گئی ہے۔'' ۲۳

مختصر یہ ہے کہ بنات النعش میں امور خانہ داری اور معلومات عامہ کی تعلیم کو قصے کے پیرائے میں پیش کیا گیا ہے اس ناول کے ذریعے سے نذیر احمد نے لڑکیوں کی تعلیم کی پرزور حمایت کی ہے وہ چاہتے تھے کہ سماج میں عورت کا درجہ بلند ہو مرد اس کی قدر کریں اور اس کو وہ مقام حاصل ہو جس کی وہ مستحق ہے انہوں نے اس ناول میں جو طریقۂ تعلیم پیش کیا ہے اسکا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر احسن فاروقی لکھتے ہیں:

''اس میں جو طرز تعلیم دکھا گیا ہے اس کو play way کہتے ہیں مولانا اس سے بخوبی واقف نظر آتے ہیں اس وقت جب کہ تعلیم نسواں کافی رائج ہوگئی ہے اس کتاب کی اہمیت زیادہ محسوس نہیں کی جائے گی لیکن مولانا کے زمانے میں جب کہ لڑکیوں کو اسکول بھیجنا گناہ عظیم سمجھا جاتا تھا یہ کتاب ایک گھریلو لڑکی کو عام تعلیم و تربیت بہم پہنچانے کا مکمل نسخہ ضرور تھی اس وقت بھی اسکولی تعلیم کی خامیوں کو یہ کتاب شاید پورا کر سکے۔''۲۴

تعلیم نسواں پر ڈپٹی نذیر احمد نے بہت زور دیا۔شاید ہی کسی اور نے اس زمانے میں تعلیم نسواں کو اتنی اہمیت دی جتنی نذیر احمد نے دی۔انھوں نے تعلیم نسواں کو خوشگوار گھریلو زندگی کے لئے ہر مرض کی دوا قرار دی۔تعلیم نسواں میں نذیر احمد کی دلچسپی دلی کالج میں تعلیم کے دوران اپنے استاد ماسٹر رام چندر کی تعلیمات کے ذریعے پیدا ہوئی۔ ماسٹر رام چندر تعلیم نسواں کے زبردست حامی تھے۔انھوں نے اپنے رسالوں میں عورتوں کی تعلیم کی حمایت میں مضامین لکھے۔اس زمانے میں جب کہ لوگ عورتوں کی تعلیم کے سخت مخالف تھے۔ماسٹر رام چندر نے مخالفوں کو بھی اپنی سخت تنقید کا نشانہ بنایا اور عورتوں کی تعلیم کو مذہب اسلام کے عین موافق قرار دیا۔نذیر احمد ماسٹر رام چندر کے ان خیالات کا کافی اثر ہوا اور آگے چل کر انھوں نے اس کو اپنی زندگی کا مشن بنالیا۔

ڈپٹی نذیر احمد ان چند اولین لوگوں میں ایک ہیں جنھوں نے اصلاح معاشرہ کے لئے عورتوں کی تعلیم کو ضروری قرار دیا۔ان کا ماننا تھا کہ جب تک عورتیں زیور تعلیم سے آراستہ نہیں ہوں گی ملک اور معاشرے کی اصلاح و ترقی ناممکن ہے۔وہ آغوش مادر کو اولین درس گاہ مانتے تھے۔ان کا خیال تھا کہ آئندہ نسل کے افراد میں کسی عقیدے یا خیال کو جزو فطرت بنا دینے والی تعلیم گاہ کالجوں کے لکچر ہال اور یونی ورسٹی میں نہیں بلکہ آغوش مادر میں ہے اور بچے کی صحیح نشو و نما اسی وقت بہتر طریقے پر ہو سکتی ہے جب اس کی ماں تعلیم یافتہ ہو۔

نذیر احمد سے پہلے کسی نے بھی تعلیم نسواں کی اہمیت کو محسوس نہیں کیا تھا۔اور نہ لڑکیوں کے لئے اعلیٰ نصاب تعلیم تیار کیا تھا جب کہ نذیر احمد اس دور کے سماجی رویوں سے مطمئن نہیں تھے ان کو سب سے زیادہ ترس عورتوں کی جہالت،فرسودہ خیالی اور پس ماندگی پر آتا تھا۔وہ عورتوں کو ان کے جائز حقوق دلانا چاہتے

تھے۔ان کا خیال تھا کہ صحت منداور مہذب معاشرے کے لیے عورتوں کا تعلیم یافتہ ہونا نہایت ضروری ہے یہی وہ مدرسہ ہے جہاں زندگی کے تمام پہلوؤں کی اصلاح ہوسکتی ہے۔جیسے تربیت اولاد،عورت اور مرد کی سماجی اہمیت،ان کی ذمہ داریاں اور فرائض، بے جا رسموں کا انسداد، کفایت شعاری،سادگی،مروّت وغیرہ ۔

ڈپٹی نذیر احمد پہلے شخص ہیں جنہوں نے عورتوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے اچھی اور نصیحت آموز کتابیں لکھیں اور وہ بھی قصے کہانیوں کی شکل میں۔اس کے لیے انہوں نے ناول جیسی صنف کا سہارا لیا ان کے ابتدائی ناولوں کا مقصد ہی لڑکیوں کو تعلیم دینا تھا۔انہوں نے اپنے ناولوں کے ذریعے اس اہم مسئلے کی طرف لوگوں کی توجہ مرکوز کرائی اور حصول مقصد کے لیے عورتوں سے عورتوں کی زبان میں کلام کیا۔تعلیم کے فوائد بیان کیے۔مرأۃ العروس میں اس کی اہمیت اجاگر کی۔خوش گوار ازدواجی زندگی کے لیے تعلیم کو ضروری قرار دیا۔عورتوں کے اخلاق وکردار اور حسن سیرت کے لیے اچھی تعلیم کی ضرورت پر زور دیا۔ان کا ماننا تھا کہ تعلیم یافتہ افراد سے ہی بہتر معاشرہ وجود میں آئے گا۔

ڈپٹی نذیر احمد کی کوشش رنگ لائیں۔ان کے ناولوں کا اثر مسلم متوسط گھرانوں پر غیر معمولی پڑا۔ ان کے نسوانی کردار ناول سے نکل کر ہماری زندگی میں وارد ہوئے۔جس کا اثر لڑکیوں کی تعلیم وتربیت پر پڑا۔نذیر احمد کے ناولوں کو ایسی مقبولیت حاصل ہوئی کہ اس زمانے میں لڑکیوں کو قرآن شریف کے ساتھ ساتھ جہیز میں مرأۃ العروس بھی دینا اشد ضروری سمجھا جاتا تھا۔

> ''نذیر احمد کے ناولوں کا ہی اثر تھا کہ معزز حضرات نے تعلیم نسواں کے مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرنا شروع کیا اور اس کے لیے جدوجہد کی آخر کار مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ۱۸۹۸ء کے بارہواں سالانہ لاہور اجلاس میں باقاعدہ ''شعبۂ نسواں'' کا وجود عمل میں آیا اور کانفرنس کے تیرہویں اجلاس کلکتہ منعقدہ دسمبر ۱۸۹۹ء زیر صدارت سید امیر علی تعلیم نسواں سے متعلق تجویز منظور ہوئی۔کہ ہر صوبہ کے دار الخلافہ اور دوسرے علمی مراکز میں زنانہ مدارس احکام اسلام اور شریف خاندانوں کے رسم ورواج کے مطابق کھولے جائیں اور یہ کام تین برسوں میں مکمل ہو جانا چاہئے اور ہر صوبہ میں کمیٹی زنانہ مدارس اور مستند علما کی مدد سے نصاب تیار کیے جائیں۔'' ۲۵

اگلے جلسے بمقام رام پور میں لڑکیوں کی ترقی اور توسیع معلومات کے لیے حساب، طبیعات، جغرافیہ، تاریخ اور اخلاقیات کے موضوعات پر سہل کتابیں تصنیف کیے جانے کی تجویز منظور ہوئی۔ سولہویں اجلاس دسمبر ۱۹۰۲ء منعقدہ دہلی بہ صدارت سر آغا خاں میں تعلیم نسواں سیکشن کے معتمد شیخ عبداللہ نامزد ہوئے۔ سرسید احمد خاں کے اس شاگرد نے تحریک نسواں کو زیادہ فعال بنا دیا۔ اور سرسید کی امیدوں پر کھرے اترے۔ سرسید اپنی حیات میں لڑکیوں کی تعلیم کی طرف توجہ اس لیے نہیں دے سکے کہ مسلمان قوم ابھی ذہنی طور پر اپنے لڑکوں کو جدید تعلیم دلانے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اور انگریزی تعلیم دلانے کی وکالت کرنے پر سرسید کی مخالفت بھی ہورہی تھی۔ ایسی صورت میں لڑکیوں کی تعلیم کے سوال کو اٹھانا بادمخالف کو مزید ہوا دینا تھا۔ سرسید قوم کے نباض تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ جب مردوں کے اندر تعلیم آئے گی تو پھر عورتوں کی تعلیم کی راہ بھی خود بخود ہموار ہو جائے گی اور یہ کام بھی علی گڑھ سے فارغ کوئی طالب علم کرے گا انہوں نے ایک موقع پر یہ کہا تھا کہ ہمارے لڑکے خود تعلیم حاصل کر کے اپنی عورتوں کو پڑھائیں گے اور ہوا بھی ایسا ہی سرسید کے اس خواب کی تکمیل علی گڑھ کالج سے فارغ ایک طالب علم شیخ عبداللہ کے ذریعے ہوئی۔ انہوں نے چند نوجواں ایسے جمع کیے جو لڑکیوں کی تعلیم کے حق میں تھے ان کے ذریعے نوجوان حمایتوں کا ایک گروہ اٹھ کھڑا ہوا جو عورتوں کے مختلف مسائل پر کھل کر اظہار خیال کرنے لگا۔ مثلاً علی گڑھ منتھلی نومبر ۱۹۰۳ء کا شمارہ ''ہم اور ہماری خواتین'' کے لیے مخصوص تھا۔

۱۹۰۵ء کا جلسہ منعقدہ علی گڑھ تاریخی اہمیت کا حامل تھا کیوں کہ اسٹیریچی ہال میں تعلیم نسواں کے سیشن کی صدارت زہرہ فیضی نے کی اور موافقین اور مخالفین دونوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ صدر اجلاس مسلم ایجوکیشنل کانفرنس خلیفہ محمد حسین وزیر ریاست پٹیالہ کی صدارتی تقریر نے تعلیم نسواں کے بہت سے مسائل کو حل کر دیا۔ مثلاً انہوں نے پردۂ شرعی کی پابندی کے ساتھ تعلیم کو جاری رکھنے کی تجویز پیش کی تاکہ روشن خیال افراد کے ساتھ قدامت پرست بھی متفق ہوسکیں۔ یہ ایک محصور تعلیم گاہ کی تجویز تھی جس میں اسکول، بورڈنگ ہاؤس ہو اور نگرانی کے لیے سن رسیدہ استانیاں مقرر کی جائیں اور وہیں طالبات کے لیے کھیلوں کا بھی انتظام ہو۔

''تعلیم نسواں کا ایک وفد شیخ عبداللہ کی قیادت میں ۱۹۰۶ء میں لیفٹیننٹ گورنر یوپی سے

جا کر ملا جس کے نتیجے میں ۱۹؍ اکتوبر ۱۹۰۶ء کو لڑکیوں کا پہلا مدرسہ بالائے قلعہ علی
گڑھ کے ایک مکان میں استانی اختری بیگم کی نگرانی میں قائم ہوا۔''۲۶

شیخ عبداللہ نے ۱۹۰۸ء میں چودہ بیگھا زمین خریدی جو نانک رائے باغ کے نام سے موسوم تھی اور مدرسہ کی عمارت کا سنگ بنیاد ۷؍ نومبر ۱۹۱۱ء کو یو پی کے لیفٹینینٹ گوورنر کی اہلیہ لیڈی پوٹر نے رکھا۔ اس تقریب میں مسلمان ہندو، سکھ، عیسائی سبھی مذہب کے لوگوں نے شرکت کی۔

گرلس اسکول ۱۹۲۹ء میں انٹر میڈیٹ ہوگیا۔ ۱۹۳۰ء میں ڈاکٹر ضیائالدین وائس چانسلر کی سفارش پر اس کا الحاق سو روپے ماہانہ امداد کے ساتھ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے کر دیا گیا۔ ۱۹۳۳ء میں یونیورسٹی کورٹ کی میٹنگ میں شیخ عبداللہ کی ایما پر لڑکیوں کے لئے بی۔اے کلاسوں کے انتظام کی تجویز رکھی گئی۔ جسے آگے چل کر منظوری مل گئی۔ اس طرح نذیر احمد کی پہلی جدوجہد رنگ لائی۔ اور چند برسوں میں ہی انفرادی کوشش اجتماعی جدوجہد میں تبدیل ہوگئی اور نذیر احمد کے مقصد کو حیات جاودانی مل گئی۔

جیسا کہ اس سے پہلے بھی عرض کیا گیا کہ ڈپٹی نذیر احمد کا عہد اصلاحی تحریکوں کا عہد تھا۔ مسلمانوں کی مذہبی، اخلاقی، سماجی، سیاسی اور تعلیمی زندگی میں جو خرابیاں پیدا ہوگئیں تھیں ان کے خلاف ہندوستان میں کئی تحریکیں وجود میں آئیں۔ نذیر احمد نے جب دہلی کے متوسط مسلمان گھرانوں کی عورتوں کی زبوں حالی کا نقشہ دیکھا تو انہوں نے اپنی ساری توجہ ان عورتوں کی طرف کر دی جو جہالت کی تاریکیوں میں سانس لے رہی تھیں۔ عورتوں کی جدید تعلیم کو انہوں نے اپنی زندگی کا مقصد بنایا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے عورتوں کی روحانی، مذہبی اور اخلاقی تعلیم کے ساتھ ان کو علوم جدید سے متعارف کرانے کی کوشش کی۔ نذیر احمد کا خیال تھا کہ بچوں کی نشو نما ماں کی گود میں ہوتی ہے اور اچھی تعلیم کسی بچے کی سب سے پہلے گھر سے ہی حاصل ہوسکتی ہے۔ اگر ماں تعلیم یافتہ ہوگی تو بچے کی تعلیم کی بنیاد بھی مستحکم ہوگی اور وہ آگے چل کر اچھا انسان ثابت ہوگا۔

ڈپٹی نذیر احمد لڑکیوں کو صرف گھر کی چار دیواری میں محصور نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ پردے کے حدود کو برقرار رکھتے ہوئے وہ معاشرے میں ان کو باوقار مقام دلانا چاہتے تھے اور اس کے لیے لڑکیوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنا نے حد ضروری خیال کرتے تھے۔ وہ عقل کی غذا علم کو قرار دیتے تھے اور جہل کی

تاریکی کو علم کی روشنی سے دور کرنا چاہتے تھے۔علم سے معلومات میں وسعت پیدا ہوگی اس سے عقل بھی روشن ہوگئی اور دماغ کے دریچے بھی وا ہوں گے پھر حقائق کی تہ تک پہنچنے کی صلاحیت پیدا ہوگی اور دنیا کی بہت سی باتیں اس کی بدولت ان کی سمجھ میں آنے لگیں گی اور نذیر احمد نے اپنی فہم و تدبر سے عورتوں میں علم کی وہ شمع روشن کی جس سے معاشرے کی تاریکی میں کمی واقع ہوئی۔اور گھروں میں علم کے چراغ جلنے سے توہمات دور ہوئی۔عورتوں میں سلیقہ مندی، ہنر مندی اور فہم و فراست پیدا ہوئی۔اور کل تک جن باتوں کی سمجھ ان کے اندر نہیں تھی، جن چیزوں سے ان کی آگاہی نہیں تھی جن مسائل سے وہ ناواقف تھیں۔آج علم کی بدولت زندگی کے وہ تمام گوشے ان پر روشن ہو چکے تھے۔اور پھر انہی سے ایسی عورتیں پیدا ہوئیں جنہوں نے تعلیم نسواں کی تحریک کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔

ڈپٹی نذیر احمد کا شمار سر سید کے ان رفقاء میں ہوتا ہے جنہوں نے مسلمانوں میں مغربی تعلیم کی اہمیت کو فروغ دینے میں نہایت ہی اہم خدمات انجام دی۔مسلمان عورتوں کو مشرقی و مغربی تہذیب و تمدن اور علم و ہنر کی خوبیوں سے آراستہ کر کے ان کے اندر ایک نیا تصور حیات، ایک نیا انداز نظر، نئی بصیرت پیدا کی اور انہیں چمکنے اور نکھرنے کا موقع عطا کیا۔

## سماجی مسائل کا عکّاس: ڈپٹی نذیر احمد

ڈپٹی نذیر احمد اردو ناول کا پہلا سماجی مسائل کا عکّاس ہے جنھوں نے اپنے دُور کے سماجی مسائل کی طرف اشارہ کیا ہے جیسا کہ اس سے پہلے بھی ذکر کیا گیا ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد کے ابتدائی ناول مرأۃ العروس اور بنات النعش تعلیمِ نسواں سے متعلق ہیں۔یہ اس عہد کے سماج کا ایک ایسا پیچیدہ مسئلہ تھا جس سے پورے معاشرے کی تہذیبی اور تمدّنی بنیادیں متزلزل ہو رہی تھیں۔عورتوں کی جہالت اور بے ہُنری سے معاشرہ طرح طرح کے عیوب اور انتشار کا شکار تھا۔اس زمانے میں قدامت پسند طبقہ تعلیمِ نسواں کا سخت مخالف تھا۔لیکن ایک روشن خیال طبقہ ایسا ضرور پیدا ہو گیا تھا جو تعلیمِ نسواں کی اہمیت کو سمجھتا تھا۔نذیر احمد اسی طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اور وہ تعلیمِ نسواں کے پُر زور حامی تھے۔اور اس کی ترویج و اشاعت کے لیے انھوں نے سخت جدوجہد کی۔انھوں نے اس کا آغاز اپنے گھر ہی سے کیا اور اپنی بچیوں کی تعلیم کی طرف پوری توجہ کی۔انھوں نے اس کی حمایت میں مضامین بھی لکھے اور یہ ثابت کیا کہ اسلام عورتوں کی تعلیم

کے خلاف ہرگز نہیں ہے۔ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی لکھتے ہیں:

''انھوں (نذیر احمد) نے عام مسلم گھروں کے تعلیمی نظام میں انقلاب برپا کر کے بورڈنگ اسکول کی جگہ لڑکیوں کے لیے نئے گھریلو تعلیمی نظام کا تصور پیش کیا اور سماج کی قدامت پسندی کو دور کرنے کے لئے نئے طریقۂ زندگی کو اپنانے کی پُر زور تائید کی۔اس قسم کی تبدیلیاں وہ سب سے پہلے طبقۂ نسواں کے درمیاں لانا چاہتے تھے۔تا کہ ان کے ذریعہ گھروں میں نئی روشنیاں جگمگا اٹھیں اور اس سے زندگی کا ایک نیا نظام کامیابی کے ساتھ شروع ہو۔''۲۷

تعلیمِ نسواں کے بعد ہی وہ دیگر امور کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کیونکہ تعلیم کے بعد ہی امورِ خانہ داری وغیرہ کی صحیح صلاحیت عورتوں میں پیدا ہو سکتی تھی۔اسی وجہ سے ان کے ابتدائی ناولوں میں تعلیمِ نسواں کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کا تیسرا ناول توبتہ النصوح ہے جو ۱۸۷۷ء میں شائع ہوا یہ ناول نذیر احمد کا شاہکار ناول سمجھا جاتا ہے جو آج بھی خاص و عام میں بے حد مقبول ہے۔مذہبی رنگ کے باوجود یہ ناول اپنی ادبی خوبیوں کی بنا پر عرصے تک لوگوں کے ذہن پر چھایا رہا۔اس ناول میں سچی اسلامی زندگی کو پیش کیا گیا ہے اور زندگی کی صحت منداخلاقی قدروں کو اجاگر کیا گیا ہے۔اس میں ایک فاسق و فاجر کا قصہ ہے جو سخت ہیضے میں مبتلا ہوتا ہے اس کے بعد ایک خواب دیکھتا ہے اور خواب سے بے دار ہو کر وہ خوف خدا سے لرز جاتا ہے اور پابند شرع ہو کر منہیات سے توبہ کر لیتا ہے لیکن اس کا بڑا لڑکا اس کی راہ پر نہیں آتا اور مصائب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اس ناول کے ذریعے نذیر احمد نے اپنے دور کے مسلم خاندانوں کی تربیتی،اخلاقی،اور دینی مسائل سے بحث کی ہے اس کے علاوہ اس ناول میں باپ اور بیٹے کی کشمکش کو بڑے اچھے پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد نے اس ناول کے ذریعے سے تربیت اولاد جیسے اہم مسئلے کو اجاگر کیا ہے۔ڈاکٹر اشفاق محمد خاں اس ناول کی غرض و غایت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس ناول کی غرض و غایت یہ ہے کہ بچوں کی اخلاقی اور دینی تربیت کے سلسلے میں

والدین استاد پر کم بھروسہ کریں اور پہلے اپنی نیک اطواری سے ان کے اعمال و کردار کو
روشنی بخشیں۔ نذیر احمد کے اس ناول کو مذہب اور اصول تعلیم کی روشنی میں سماجی زندگی
کو بہتر بنانے کی کامیاب کوشش کہا جا سکتا ہے''۔ ۲۸

محسنات یا فسانۂ مبتلا نذیر احمد کا اچھوتا ناول ہے جو ۱۸۸۵ء میں شائع ہوا یہ بھی ایک نصیحت آموز ناول ہے اس میں تعداد ازدواج کے نقصانات کو بخوبی بیان کیا گیا ہے اور اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ دو بیویاں کرنے سے گھر کا سکون اور زندگی کس طرح خلل پذیر ہو جاتے ہیں۔ فسانۂ مبتلا میں ایک ایسے شخص کے حالات بیان کئے گئے ہیں جو اپنی بیوی سے غیر مطمئن ہوتے ہوئے ایک بازاری عورت سے شادی کر لیتا ہے اور آخر میں مصائب اور پریشانیوں سے عاجز آ کر اس دار فانی سے کوچ کر جاتا ہے اور اس کی دوسری بیوی ہریالی بھاگ جاتی ہے۔ تعداد ازدواج سے کس طرح ایک گھر تباہ ہو جاتا ہے نذیر احمد نے اس خرابی کو دین کی روشنی میں حل کرنے کی کاشش کی ہے۔ اس ناول میں نذیر احمد نے تعداد ازدواج کی خرابی اور اس کی خامیوں کو بخوبی واضح کیا ہے فسانۂ مبتلا کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے وقار عظیم لکھتے ہیں:

''یوں فسانۂ مبتلا اردو کا پہلا ناول ہے جس میں صحیح معنوں میں زندگی اور فن دونوں کی
انفرادی اہمیت اور باہمی رشتے کے احساس کی داغ بیل ڈالی''۔ ۲۹

ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں ابن الوقت ایک معرکہ آرا ناول ہے جو ۱۸۸۱ء میں شائع ہوا اس میں ایک ایسے ہندوستانی شخص کا حال بیان کیا گیا ہے جو غدر کے زمانے میں اپنی خدمات کے صلے میں ایک بڑے عہدے تک پہنچ جاتا ہے اور انگریزوں کے ساتھ میل جول کی وجہ سے انہیں کی طرز معاشرت اختیار کر لیتا ہے بعض ناقدین کا خیال ہے کہ ناول کے اہم کردار ابن الوقت کے ذریعہ نذیر احمد نے سرسید کا خاکہ اڑایا ہے لیکن اس بات کی تردید کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

''یہ کتاب مولانا شبلی کی ہوتی تو ہم تسلیم بھی کر لیتے کیونکہ شبلی تو آخری دور میں صاف
صاف سرسید کے خلاف طنز و تعریض کر دیتے تھے مگر غریب نذیر احمد پر تو یہ الزام محض
اتہام ہے اس لئے کہ نذیر احمد آخری عمر تک سرسید مرحوم کے مشن کے لئے تبلیغی اور
واعظانہ دورے کرتے رہے ایسی صورت میں ابن الوقت کو خواہ مخواہ سرسید کی تصویر

قرار دینا خود سید صاحب کی ذات ستودہ صفات پر ناروا حملہ ہے''۔۳۰

ڈپٹی نذیر احمد نے اس ناول کے ذریعے مغربی طرز معاشرت پر زبردست چوٹ کی ہے اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسان اپنی طرز معاشرت بھول کے دوسروں کی طرز معاشرت اختیار کرتا ہے تو وہ نہ گھر کا رہتا ہے اور نہ گھاٹ کا رہتا ہے جیسا کہ ڈاکٹر یوسف سرمست لکھتے ہیں:

''انسان جب غیر فطری زندگی گذارنے لگتا ہے تو پھر زندگی اس کے لئے مصیبت بن جاتی ہے کیونکہ وہ اپنے سماج سے کٹ جاتا ہے۔ابن الوقت ایسی زندگی بسر کرنے کی کوشش کر رہا تھا جس کا وہ فطری عادی نہ تھا''۔۳۱

ابن الوقت کے بارے میں مختصراً یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس ناول میں مشرق و مغرب کی تہذیبوں کا ٹکراؤ پیش کیا گیا ہے اور انگریزوں کی اندھی تقلید پر طنز کیا گیا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں ایامیٰ ہے جو ۱۸۹۱ء میں شائع ہوا ہے۔نذیر احمد نے اس ناول میں سماج کی ایک بڑی برائی کی طرف اشارہ کیا ہے اور ان لوگوں کے خلاف قلم اٹھایا ہے جو بیواؤں کی شادی کو عیب سمجھتے ہیں انہوں نے اس ناول کے ذریعے سے بیواؤں کی شادی پر زور دیا ہے اور ان کے افسوس ناک حالات کو دیکھ کر شرعی طور پر نکاح ثانی کا جواز پیش کیا ہے۔ہندو سماج میں یہ بات رائج تھی کہ بیواؤں کی شادی نہیں ہو سکتی لیکن انیسویں صدی کے نصف اول میں اس رجحان کے خلاف ایک زبردست تحریک چل رہی تھی راجہ رام موہن رائے نے برہمو سماج کی بنیاد رکھی اور مذہبی اصول وقوانین کی کھل کر مخالفت کی راجہ رام موہن رائے کی کوشش ہندو سماج میں خاص کر عورتوں پر ہو رہے ظلم و جبر کے خلاف ایک مکمل تحریک تھی نذیر احمد کا یہ ناول بظاہر اسی تحریک سے متاثر نظر آتا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کا آخری ناول رویائے صادقہ ہے جو ۱۸۹۲ء میں شائع ہوا۔اس میں دہلی کے اشراف خاندان کی مذہبی زندگی کی عکاسی کی گئی ہے اور مذہبی عقائد کی بحث کو ایک دلچسپ مکالمے کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔نذیر احمد نے اس ناول میں سماج اور مذہب سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار واضح کیا ہے۔رویائے صادقہ کے موضوع کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر اشفاق محمد خان لکھتے ہیں:

''رویائے صادقہ میں قدیم شرفاء کی زندگی کے حالات اور ان کے عقائد میں اصلاح

کی کوشش نظر آتی ہے اس میں نذیر احمد کی دہلی کالج کی اس زندگی کی جھلک بھی نظر آتی ہے جب وہ اپنی ذہنی اور مذہبی کشمکش میں مبتلا تھے۔ بحیثیت مجموعی اس ناول کا موضوع مذہب ہے''۔۳۲

یہ تھا ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کا مختصر جائزہ ڈپٹی نذیر احمد کے سارے ناولوں کو ہم اصلاحی ناول کے زمرے میں رکھ سکتے ہیں۔اس لئے کہ نذیر احمد نے اپنے ناولوں کے ذریعے سے اصلاح کا کام لیا ہے۔ان کے سارے ناولوں میں کسی نہ کسی سماجی مسئلے کو موضوع بنایا گیا ہے۔اس لئے نذیر احمد کے یہاں مقصدیت غالب آ گئی ہے۔لیکن کوئی بھی فن بغیر مقصد کے وجود میں نہیں آتا اور یہ بھی سچ ہے کی مقصدیت فن کو مجروح بھی کرتی ہے۔اسی لئے کچھ ناقدین نذیر احمد کو ناول نگار نہیں مانتے اس کا جواب دیتے ہوئے ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

'' بہرحال ان کو کوئی ناول نگار نہیں کہتا نہ کہے مگر ناول کی کوئی تاریخ ان کے ذکر سے بے نیاز نہیں ہوسکتی۔''۳۳

یہ صحیح ہے کہ نذیر احمد کے یہاں مقصدیت فن پر غالب آ گئی ہے اس غالب مقصدیت کو نذیر احمد کا نقص کہا جاسکتا ہے لیکن ان کو ایک سرے سے ناول نگار ہی تسلیم نہ کرنا یہ نذیر احمد اور ان کے فن کے ساتھ انصاف نہیں ہے۔ جو لوگ نذیر احمد کو ناول نگار تسلیم نہیں کرتے ان کے جواب میں اردو ادب کے قابل قدر نقاد پروفیسر احتشام حسین لکھتے ہیں:

''بہت سے نقاد نذیر احمد کو ناول نگار نہیں مانتے لیکن یہ محض اصلاح کا چکر ہے ان کی سماجی بصیرت اور تاریخی شعور پر نظر رکھ کر انہیں اردو کا پہلا اور بہت اہم ناول نگار تسلیم کرتا ہوں''۔۳۴

اب یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ نذیر احمد کے ناول آج کے جدید ناول کے اصول پر پورے نہ اترتے ہوں لیکن نذیر احمد کے ناولوں سے چشم پوشی بھی نہیں کی جاسکتی اس لئے کہ وہ اردو کے اولیں ناول نگار ہیں ان کے سامنے کوئی ایسا نمونہ نہ تھا ۔جس کے سہارے وہ آگے بڑھتے لہذا جتنی آگئے بڑھتے اس میں انہیں کا خون جگر شامل ہے۔

## ڈپٹی نذیر احمد کے مقلدین

ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کی شہرت و مقبولیت کے زیر اثر امور خانہ داری، تعلیمِ نسواں، اور سماجی مسائل سے متعلق ناولوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ نذیر احمد کے ہم عصروں اور مقلدین میں مولانا الطاف حسین حالی، سید علی محمد شاد عظیم آبادی، نواب افضل الدین احمد، غلام حیدر، ظہیر بلگرامی، عبد الحامد، سید احمد دہلوی، سید علی سجاد عظیم آبادی، نادر جہاں، قاری سرفراز حسین عزمی، راشد الخیری، ہادی حسین ہادی، منشی پیارے مرزا، افضل الدین، محمد ضمیر الدین اور رشیدۃ النساء بیگم وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ لیکن بقول علی عباس حسینی ان ناول نگاروں نے اردو ناول نگاری کو کسی نئی روایت سے روشناس نہیں کرایا ان کی تمام تر کوششیں تقلیدی ہیں۔

کچھ ناقدین نذیر احمد کی ان تصانیف کو ناول ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ کچھ انہیں داستانی عناصر سے مملو ناول سے ملتے جلتے اخلاقی حقیقی قصے بتاتے ہیں۔ چند نے انہیں تمثیل کا نام دیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ نذیر احمد کی یہ تصنیف اپنی خوبیوں اور خامیوں کے باوجود ناول کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔ انہیں کس بنیاد پر ناول کہہ سکتے ہیں وہ ذیل کی بحث سے معلوم ہو جائے گا۔

### انسان دوستی اور ڈپٹی نذیر احمد

ڈپٹی نذیر احمد نے یہ قصّے داستانوں کی طرح دل بہلانے یا وقت گزارنے کے لئے نہیں لکھے بلکہ ان کی تصنیف میں ایک خاص علم و تجربہ کی آگاہی ایک مخصوص فکر اور جذبہ کی آنچ اور ایک خاص زاویہ نگاہ اور مقصد سے وابستگی کو دخل ہے۔ جس کا ثبوت نذیر احمد کے پہلے ناول مراۃ العروس کی ابتدائی چند سطور میں موجود ہے وہ اس ناول کی ابتدا ان الفاظ سے کرتے ہیں۔

> ''جو آدمی دنیا کے حالات پر کبھی غور نہیں کرتا اس سے زیادہ کوئی بے وقوف نہیں ہے اور غور کرنے کے واسطے دنیا میں ہزاروں طرح کی باتیں ہیں لیکن سب سے عمدہ اور ضروری آدمی کا حال ہے۔'' ۳۵

ایک انسان کی حیثیت سے انسانوں کے بارے میں سوچنا اس کے بارے میں غور کرنے کو ضروری سمجھنا اور اس کی بدلتی زندگی کا جائزہ لینا وہ عمل ہے جسے انسان دوستی کے علاوہ دوسرا کوئی نام نہیں دیا

جا سکتا ہے۔اس جذبہ کے تحت وہ حق کی تلاش، محرکات کا سراغ اور زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔اس طرح وہ زندگی کی تنقید، تفسیر اور تعمیر کا فرض انجام دیتے ہیں۔اردو ادب میں اس شعور کا مبہم اظہار پہلی مرتبہ تمثیلوں میں ہوا تھا جو انیسویں صدی کے ربع دوم وسوم میں لکھی گئی تھیں لیکن اس شعور کی واضح تصویر پہلی مرتبہ نذیر احمد کے ناولوں میں ملتی ہے۔ یہ تصویر ناقص اور نامکمل سہی لیکن اسے داستان نگار کا تصور نہیں کہہ سکتے بلکہ اس شعور کی توقع کسی ناول نگار سے ہی کی جا سکتی ہے۔اس اعتبار سے وہ پہلے ادیب ہیں جو فن ناول نگاری کے شعور کے ساتھ قصّہ کا آغاز کرتے ہیں اور مرأۃ العروس لکھ کر جدید کی روایت قائم کرتے ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد کا پہلا ناول مرأۃ العروس اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں امور خانہ داری کے گُر سکھائے گئے ہیں بلکہ اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس میں پہلی مرتبہ قصّہ کی افادیت اور ادب برائے ادب کے بجائے ادب برائے زندگی کا تصور ملتا ہے۔ادب کا یہ معروضی نقطۂ نگاہ انسان دوستی کے تصور سے ہی پیدا ہوتا ہے۔اور انسان دوستی ناول کی بنیادی خصوصیت ہے چنانچہ ناول کی اس بنیادی شرط کا ثبوت ان کے پہلے ناول مرأۃ العروس میں ہی مل جاتا ہے۔

جب ایک مرتبہ انسان دوستی شرط زندگی اور شرط ادب قرار پائے جائے تو مشکل آسان ہو جاتی ہے۔اس کو اپنے موضوع مواد کے لئے ادھر اُدھر بھٹکنا یا تخیّل کی مدد سے ایک جہاں تازہ آباد کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔اس کی اپنی زندگی اور اس گرد پھیلی ہوئی کائنات ہی اس کا موضوع ومواد بن جاتی ہے۔ چنانچہ نذیر احمد بھی داستان نگار کے برعکس اپنی زندگی کے تجربات اور اپنے اردگرد پھیلی ہوئی زندگی سے اپنے ناولوں کی دنیا آباد کرتے ہیں اس اعتبار سے وہ پہلے واقعیت نگار ہیں جو افسانہ کو حقیقت نگاری سے روشناس کراتے ہیں۔نذیر احمد کی اس واقعیت نگاری اور اوران کے ناولوں کی اس خصوصیت کو تقریباً تمام ناقدین نے تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ علی عباس حسینی جو نذیر احمد کے ناولوں کو ’’ملایاں مسجد کا جہاد یا تعلیم‘‘ کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ان کے قصّوں میں حقیقت نگاری کے اس وصف کو تسلیم کرنے کے لئے مجبور ہیں۔وہ رقم طراز ہیں:

> ’’نذیر احمد کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انہوں نے تمام قصّوں میں ہماری معاشرتی زندگی کی بالکل سچّی تصّویر کشی کی ہے۔‘‘۳۶

قصّوں میں معاشرتی زندگی کا حقیقی عکس اس وقت نظر آتا ہے جب اس کی فضا ارضی اور اس کی روح حقیقی ہو۔ ارضی فضا زندگی کی حقیقتوں کے ادراک کا نتیجہ ہوتی ہے اور اس میں حقیقی روح اور آفاقیت اس وقت آتی ہے جب زندگی کے وقتی اور ہنگامی پہلوؤں کے بجائے بنیادی اور ٹھوس اقدار پر توجہ مرکوز کی جاتی ہے افسانہ کی دنیا میں پہلی مرتبہ نذیر احمد کے ناولوں میں ان حقیقتوں کے ادراک اور زندگی کے بنیادی اور ٹھوس اقدار پر غور و فکر کا احساس بھی پایا جاتا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کی یہ ارضی فضا دوسری خصوصیت ہے جو ان کو داستانوں سے ممتاز کرتی ہے۔ ناول کے ایک اور نقاد نے نذیر احمد کے ناولوں کی اس خصوصیت کا تجزیہ اس طرح کیا ہے۔

> ''داستان کی خیالی دنیا کی جگہ ان قصّوں میں زندگی کی ٹھوس حقیقتیں۔ ان ٹھوس حقیقتوں سے دو چار ہونے والے ہم سے اور آپ سے ملتے جلتے کردار نظر آتے ہیں تو وہ محسوس کر کے خوش ہوتے ہیں کہ یہ قصّے قصّہ گوئی کے ایک نئے اسلوب اور فن کے ایک نئے دور کی آمد کا پیش خیمہ ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ نذیر احمد کے قصّے اس مفہوم میں ناول نہیں ہیں جو ہم نے مغرب سے لیا ہے۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ناول کی داغ بیل انہیں قصّوں نے ڈالی۔ مرأۃ العروس اور بنات النعش میں اس سے بھی زیادہ توبتہ النصوح اور ابن الوقت میں اور پھر ان سب سے بڑھ کر فسانہ مبتلا میں ہمیں آہستہ آہستہ وہ سارے نقوش وہ سارے خدو خال دکھائی دیتے ہیں جن سے ناول کے پیکر کی تخلیق و تعمیر ہوتی ہے۔'' ۳۷

ڈپٹی نذیر احمد کی واقعیت نگاری کے بارے میں فیض احمد فیض انھیں اس طرح خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

> ''ایک خاص نوع کی واقعیت نگاری میں ہم نے ابھی تک نذیر احمد کا جواب پیدا نہیں کیا۔'' ۳۸

ڈپٹی نذیر احمد کے قصّوں میں حقیقت نگاری کا یہ جذبہ زندگی کی تصویر کشی کا رجحان اس کی ارضی اور حقیقی فضا ٹھوس حقیقتوں کا معروضی بیان اور ہم اور آپ سے ملتے جلتے کردار پیش کرنے کا احساس کسی اتفاقی حادثہ کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ایک طویل عمل اور ان کے فنی شعور کا مرہون منّت ہے افسانہ کی دنیا یہ شعور پہلی

مرتبہ نذیر احمد کے ناولوں میں سامنے آیا تھا اس اعتبار سے نذیر احمد اردو کے پہلے ناول نگار ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد کا کمال فن یہ نہیں ہے کہ وہ پہلے واقعاتی قصّہ گو ہیں بلکہ ان کے یہاں ناول کی دوسری خصوصیت موجود ہے ان کے ناولوں میں داستانوں کی طرح واقعات اتفاقی طور پر ظہور میں نہیں آتے بلکہ ان کے لئے پہلے سے فضا تیار کی جاتی ہے اور یہ خصوصیت ان کے پہلے ناول مرأۃ العروس میں بھی موجود ہے حلانکہ واقعاتاً کے بیان کے اعتبار سے یہ ناول ان کے فن کا کم تر نمونہ ہے لیکن یہاں بھی وہ اکبری کو اس لئے پیش کرتے ہیں تا کہ اصغری کے لئے میدان ہموار کیا جا سکے۔

ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں داستانوں کی طرح قسمت کو فتح حاصل نہیں ہوتی بلکہ یہاں ناول کی طرح کردار اپنے مزاج تعلیم و تربیت کا ماحول ، خواہشوں ،آرزوں اور عمل سے بنتے بگڑتے ہیں ۔ یہاں داستانوں کی طرح خیر ہی ہمیشہ فتح یاب نہیں ہوتا بلکہ اکثر شر بھی غالب آتا ہے ۔ ناظر ،فطرت ،شارپ اس شر کی فتح کا ثبوت ہیں ۔ نذیر احمد اپنے ناولوں کی طرح پلاٹ کے لئے قصّہ درقصّہ کی ٹیکنیک اختیار نہیں کرتے بلکہ وہ ناول کی طرح سادہ مرکب پلاٹ ترتیب دیتے ہیں اور تحیّر کے بجائے وہ ناول نگار کی طرح انسانی زندگی کے کسی داخلی یا خارجی پہلو کو سامنے لاکر دلچسپی پیدا کرتے ہیں ان کے یہاں داستانوں کی سی یکسانیت کے بجائے ناول کا تنوع ہے ان کا ہر ناول کسی نئی حقیقت کی تلاش کرتا ہے اور نئے انداز سے شروع ہوتا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد اپنے ناولوں میں داستانوں کی طرح طبقہ اعلیٰ کی زندگی کو پیش نہیں کرتے بلکہ وہ اپنے ناولوں میں اعلیٰ اور ادنیٰ اور متوسط تینوں ہی طبقوں کی زندگی کا احاطہ کرتے ہیں ۔ متوسط طبقہ ان کے ناولوں کا خاص مرکز و محور ہے ۔ کیونکہ یہی طبقہ اس وقت زندگی کی کٹھن منزلوں سے گزر رہا تھا اور اپنی بقا کے لیے جدوجہد میں ہمہ تن مصروف تھا۔ اس طرح نذیر احمد خاص طور پر متوسط طبقہ کی زندگی کو اپنے ناولوں میں پیش کر کے اپنی انسان دوستی کا ثبوت دیا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کے کردار بھی اپنے افعال اور اقوال کے مطابق جزا اور سزا کو پہنچے ہیں ۔ ان کے اعمال و اقوال میں مافوق الفطرت خصوصیت کے بجائے عمومیت پائی جاتی ہے وہ انسانی فطرت کے مطابق ہی عمل کرتے ہیں ان میں اگر کسی طرح کی مثالیت بھی پائی جاتی ہے تو وہ داستانوں کی طرح انتہا پسندانہ

خیالات اور تخیل کا نتیجہ نہیں ہے۔ جہاں ہیرو کی ذات مجموعہ الصفات اور خلاصۂ کائنات ہوتی ہے بلکہ نذیر احمد کے کرداروں میں یہ مثالیت قابل یقین تک عمومیت لئے ہوتی ہے۔

داستانوں میں مکالمہ نگاری کا بھی کوئی تصوّر نہیں تھا۔ نذیر احمد پہلی مرتبہ مکالموں سے کام لیتے ہیں ۔فطری مکالموں کو قصّے کا جز بناتے ہیں اور واقعیت کی فضا کو گہرا کرنے میں ان سے مدد لیتے ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد کا اسلوب بیان بھی داستانوں کی طرح تخّیلی ،مرصع اور مسجع نہیں ہے بلکہ وہ سلیس سادہ حقیقت پسندانہ معروضی اسلوب میں اپنے قصّے لکھتے ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں یہ وہ خصوصیت ہیں جو انہیں داستانوں سے ممتاز کرتی ہیں اور ناول کے دائرے میں لے آتی ہیں چونکہ ان کے عہد اور داستانوں کے زمانے میں کوئی طویل زمانی بُعد نہیں ہے اس لئے فطری طور پر وہ اپنے عہد کے میلانات سے بھی متاثر نظر آتے ہیں اور ان کے یہاں داستانی اثر کی اصل وجہ بھی یہی ہے۔ ان میں جو دوسری فنّی خامیاں ہیں وہ نذیر احمد کے فن کا عجز نہیں ہے بلکہ ان کے عہد کا عجز ہے جبکہ فن ناول نگاری کو پوری طرح فروغ حاصل نہیں ہوا تھا۔ چونکہ یہ ناول نگاری کے ابتدائی عہد کا اوّلین نمونہ ہیں اس لئے ان کی خامیوں کی گرفت کرنا یا وہ فنی لوازم تلاش کرنا جن سے آج کا ناول عبارت ہے مناسب نہ ہوگا۔

ڈپٹی نذیر احمد کے ان ناولوں کو اب تک کسی ناقد نے داستانوں کے زمرہ میں تو شامل نہیں کیا البتہ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی نے انہیں تمثیل کا نام دیا ہے۔ اپنے دعویٰ کے ثبوت میں انہوں نے یہ دلیل پیش کی ہے۔

> ''ان میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہر ایک میں کسی نہ کسی مسئلہ پر زور دیا گیا ہے جس کا درس مصنف کا مقصد اولیٰ ہے۔ اس قسم کا مقصد ہر قسم کی تصنیف کا ہوسکتا ہے۔ اس لئے مقصد ہی کی وجہ سے ان کو تمثیل کہنا درست نہیں ہے۔ دراصل اس مقصد کو کسی فرضی قصہ کے ذریعہ ادا کیا گیا ہے۔ جس کے واقعات مصنف کے اخلاقی مقصد کے بالکل موافق ظہور میں آتے ہیں یہی امر ان کی تمثیلی صفت کے سلسلہ میں زیادہ اہم ہے۔''۳۹

اس اقتباس سے دو باتیں سامنے آتی ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ نذیر احمد کے ناولوں میں مقصد پر

زور دیا گیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ واقعات مقصد کے مطابق ظہور میں آتے ہیں۔ اس میں سے پہلی خصوصیت کوتو وہ کسی حد تک ناول میں جائز قرار دیتے ہیں۔ البتہ دوسری خصوصیت ناول میں واقعات کا مقصد کے مطابق ظہور میں آنا تمثیل کی صفت بتاتے ہیں۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ کسی مقصد پر زور دینا اور اس کے موافق واقعات کا ظہور میں آنا ڈاکٹر صاحب کی نظر میں دو متضاد باتیں ہیں حلانکہ منطقی اعتبار سے یہ دونوں باتیں لازم وملزوم ہیں۔ واقعات مقصد کے مطابق اس وقت ظہور میں آئیں گے جبکہ مصنف کو اپنے مقصد سے شدید لگاؤ ہوگا۔ اور کسی مقصد سے شدید لگاؤ ہی کسی تخلیق کا سبب بنتا ہے البتہ مقصد کو فن کے سانچوں میں ڈھال کر پیش کرنا ہی فن اور خصوصاً ناول کے فن کا اصل جوہر ہے۔ نذیر احمد کے ناولوں میں مقصد اور فن شیر وشکر ہو کر سامنے نہیں آتے ہیں۔ جو ان کے فن کی کمزوری ہے۔ لیکن اس کی وجہ سے ان کے ناولوں کو ناول کے دائرے سے خارج تو نہیں کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی واقعات کا مقصد کے مطابق ظہور میں آنا اس بات کی علامت ہے کہ وہ ناول نہیں ہے کیونکہ ناول نگار پر نہ تو مؤرّخ کی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اور نہ ہی وہ روز نامچہ نویس ہوتا ہے جس کیلئے ہر واقعہ کا تذکرہ کرنا ضروری ہو۔ بلکہ ناول نگار کسی مقصد کے پیش نظر زندگی کے کسی ایک پہلو یا مختلف پہلوؤں یا سماج کے کسی ایک طبقہ متعدد طبقات یا کسی خاص مقصد کے پیش نظر مواد اکٹھا کرتا ہے واقعات کا انتخاب کرتا ہے۔ کردار تخلیق کرتا ہے اس تمام عمل کے بعد وہ انہیں اس طرح ترتیب دیتا ہے کہ قصّہ ختم ہونے پر جو نتائج برآمد ہوں وہ اس کے مقصد کے عین مطابق ہوں۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا ہے تو اسے نہ صرف فن کی خامی کہا جائے گا بلکہ نقطۂ نظر کا عجز بھی تصور کیا جائے گا اور جسے شعور کی خام کاری سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے ناول میں مقصد کے مطابق واقعات کا ظہور میں آنا کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جو کسی کو ناول کے دائرہ سے خارج کر کے تمثیل کے دائرہ میں لے آتا ہو البتہ مقصد کا براہِ راست اظہار ناول کے حسن وتاثر کو ضرور متاثر کرتا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد اپنے ناولوں میں مقصد کی بصیرت اور فنّی شعور کا ثبوت دیتے ہیں۔ البتہ وہ جس مقصد کو لے کر قلم اٹھاتے ہیں اس کا اظہار ناول کے ابتدا میں ہی کر دیتے ہیں۔ جس کے باعث قصّہ کی دلچسپی کسی حد تک کم ہو جاتی ہے لیکن قلم اٹھانے سے قبل وہ اپنے مقصد کے جملہ عوامل پس منظر و پیش منظر اس کے روشن وتاریک پہلوؤں پر اچھی طرح غور کر لیتے ہیں۔ وہ ایک اعلیٰ فن کار کی طرح سماجی برائیوں کے

سلسلے میں پہلے مرض کی تشخیص کرتے ہیں پھراس کے محرکات تلاش کرتے ہیں ۔اس کے بعداس کا علاج ڈھونڈ ھتے ہیں جس کا واضح ثبوت ان کا ناول محصنات ہے۔اس ناول کا موضوع ''نکاح کے بارے میں مردوں کی آزادی''اوراس کا مقصد کثرت ازدواج کے مضر نتائج کا اظہار ہےجس میں وہ کامیاب نظر آتے ہیں اگرنذیر احمد صرف مقصد کے اظہار کو ہی ضروری سمجھتے تو ہریالی اور مبتلا کے معاشقہ سے قبل کے واقعات غیرضروری تھے اور قصّہ بھی معاشقہ کے بعد ہی تیزی سے آگے بڑھتا ہےاس کے علاوہ مبتلا کے حسن پرست ہونے کی صورت میں غیرت بیگم کے پھوہڑ پن کے واقعات پیش کرنا بھی بظاہر غیرضروری سا معلوم ہوتا ہے۔لیکن اگر بنظر غائر مطالعہ کیا جائےتو یہ ابتدائی حالات اورواقعات اور غیرت بیگم کا پھوہڑ پن اس قدر ضروری تھا جس قدر مبتلا کا حسن پرستی کے مرض میں مبتلا ہوکر دوسری شادی کرنا اور مصیبت میں گرفتار ہونا ۔کیونکہ یہ ابتدائی حالات ، واقعات ،محرکات اور غیرت بیگم کا پھوہڑ پن ایسے عناصر ہیں جو عمل اور ردِعمل کی صورت میں قصّہ کو آگے بڑھاتے ہیں ۔کرداروں کی تعمیر میں مدد دیتے ہیں اور آئندہ پیش آنے والے واقعات کے لیے میدان ہموار کر کے قصّہ کو منطقی انجام کی راہ پر لگاتے ہیں۔اس طرح یہ سارا عمل ناول کا عمل بن جاتا ہے۔ان کے بیان میں کہیں بھی مصنف نے تمثیل نگار کی طرح کام نہیں لیا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں پرڈاکٹر احسن فاروقی کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ ان کے ناولوں کے جملہ واقعات اخلاقی مقصد کے مطابق ہیں ۔ڈاکٹر موصوف کا یہ اعتراض بھی ان کے پہلے اعتراض کی طرح حقیقت سے بعید ہے ۔کیونکہ ناولوں کے جملہ واقعات اخلاقی ہی نہیں ہیں بلکہ زندگی کی بنیادی حقیقتوں کو پیش کرتے ہیں ۔جیسے امور خانہ داری، تعلیم وتربیت یا ابن الوقت کے حالات جن کی حیثیت سماجی ،سیاسی اور تہذیبی ہے ۔انہیں کسی طرح بھی اخلاقی واقعات کا نام نہیں دیا جاسکتا یا پھر مذہبی معاملات یا بیوہ کی شادی جس کا تعلق جنسی آسودگی سے ہے اخلاق سے نہیں ہے۔ڈاکٹر موصوف کا ایک اعتراض نذیر احمد کے ناولوں کے کرداران کے ناموں پر ہے وہ تحریر کرتے ہیں:

> ''مولانا کی تمثیل کا کوئی فرد ایسا نہیں جس کا تمثیلی (Allegorical) نام نہ ہو اور جو ان تمام خصوصیتوں کا مجموعہ نہ ہو جو اس کے نام سے منسوب صفت کے مطابق نہ ہوں اوران کی بابت بیانات ان کی حرکات اوران کی بات چیت تمام تر اس مخصوص صفت کو

نمایاں نہ کرتی ہوں''۔۴۰

نام کے مطابق صفات کا ظاہر ہونا گو تمثیل کی ایک خصوصیت ہے لیکن اسے کلیہ نہیں بنایا جا سکتا کیونکہ عام طور پر لوگ اس عقیدہ پر ایمان رکھتے ہیں کہ نام کا اثر کردار پر ہوتا ہے لیکن ناول کی منطق میں اس عقیدہ کو دخل نہیں ہے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ ''مولانا کی تمثیل کا کوئی فرد ایسا نہیں جس کا تمثیلی نام نہ ہو'' تو یہ درست نہیں ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں چند ناموں مثلاً نصوح، مبتلا، ابن الوقت ،حجتہ الاسلام کے علاوہ باقی نام اکبری، اصغری، حسن آرا، محمودہ، کامل، عاقل، سلیم، علیم، کلیم، فہمیدہ، حمیدہ، نعیمہ، سید ناظر، عارف، سید صادق، مس میری، مولوی مستجاب اور خواجہ مشتاق وغیرہ ایسے نام ہیں جو عام طور پر رکھے جاتے ہیں۔ انہیں تمثیلی کہنا درست نہ ہوگا۔

اب رہا یہ سوال کہ نذیر احمد کے ناولوں کے کرداروں میں نام و عمل کی مطابقت پائی جاتی ہے تو یہ اعتراض بھی درست نہیں ہے۔ اکبری اصغری محمودہ کو تو چھوڑئے۔ حسن آرا کو لیجئے اگر یہ تمثیل کا صفاتی نام ہوتا تو اسے ہر وقت آرائش حسن اور خیال حسن میں مبتلا دکھانا چاہئے تھا لیکن یہ بدسلیقہ اور بدمزاج لڑکی ہے اس کی پہلی تصویر جو قارئین کے سامنے آتی ہے۔ یہ ہے:

> ''حسن آرا کی افتاد ایسی پڑی تھی کہ اپنے گھر میں سب سے بگاڑ تھا نہ ماں کا لحاظ نہ آپا کا ادب نہ باپ کا ڈر نوکر ہیں کہ آپ نالاں ہیں لونڈیاں ہیں کہ الگ پناہ مانگتی ہیں۔۔۔۔۔ ماما نے دوہائی دی کہ دیکھئے کہ سالن کی پتیلوں میں مٹھیاں بھر بھر کر راکھ جھونک رہی ہیں۔۔۔۔۔ شاہ زمانی بیگم نے آواز دی کہ حسنا یہاں آؤ خالہ کی آواز پہچان بارے حسن آرا چلی تو آئی نہ سلام نہ دعا ہاتھوں میں راکھ پاؤں میں کیچڑ اسی حالت میں دوڑ خالہ سے لپٹ گئی''۔۴۱

آئندہ تمام قصّہ میں بھی حسن آرا کو کہیں بھی مبتلائے حسن و آرائش میں گرفتار نہیں دکھا گیا ہے۔ یہ ایک امیر گھرانے کی ایسی شوخ بدتمیز اور نٹ کھٹ لڑکی ہے اور اس زمانے کے طبقہ اعلیٰ کا حقیقی کردار ہے جہاں تعلیم و تربیت کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ اس طرح کلیم اور نعیمہ کے کردار روزمرہ کی زندگی میں پیش آنے والے ہم اور آپ سے ملتے جلتے معاشرے کے نمائندہ کردار ہیں جو اپنی ایک انفرادی خصوصیت بھی رکھتے ہیں اور یہ فن ناول نگاری کے اس معیار پر پورے اترتے ہیں جس کا اظہار ڈاکٹر موصوف نے

آئندہ صفحات میں اس طرح کیا ہے۔

> ''تمثیل میں اخلاقی صفات کے مجسمے پیش کئے جاتے ہیں۔ اول میں ایسے انسانی کردار ہمارے سامنے لائے جاتے ہیں جو ہم کو روزمرہ کی زندگی میں ملتے ہیں۔اس طرح ناول نگار کا بہترین کردار وہ ہوگا جو کچھ انفرادی صفتیں رکھتا ہو اور ساتھ ہی ساتھ کچھ عام انسانی صفتیں بھی اس میں نمایاں ہوں برخلاف اس کے تمثیل کا کردار کسی ایسی اخلاقی صفت کا ایسا مجسمہ ہوگا جیسا کسی انسان کا ہونا ممکن ہی نہیں۔''۴۲

چنانچہ نذیر احمد کے صرف مذکورہ کردار ایسے ہیں جو ناول اور تمثیل کے درمیان اس امتیازی ،انفرادی اور اجتماعی صفات کے حامل ہیں بلکہ ان کے علاوہ بھی ایسے بہت سے کردار ان کے یہاں مل جائیں گے۔

اب ان کرداروں کو لیجئے جن کے نام تمثیلی ہیں۔مثلاً نصوح کو لیجئے۔جس کو نام کے اعتبار سے تقویٰ اور دینداری کا پتلا ہونا چاہئے لیکن اس میں گہری سنجیدگی پائی جاتی ہے۔بیدار ہونے سے پہلے اس کی یہ حالت تھی کہ گھر والے اس کو ہوا سمجھتے تھے اور شعروشاعری شطرنج گنجفہ چوسر جیسے مشاغل لایعنی سے دلچسپی رکھتا تھا لیکن خواب نے اس کی دنیا بدل دی ایسے موڑ زندگی میں اکثر آتے رہتے ہیں جو انسانی زندگی کے دھارے کو یکسر موڑ دیتے ہیں۔وہ دینداری کا مجسمہ بن جاتا ہے۔نصوح جذبہ دینی کے زیرِ اثر اپنی اولاد کی اصلاح کرنا چاہتا ہے لیکن شدت جذبہ سے مغلوب ہو کر وہ بے سوچے سمجھے قدم نہیں اٹھاتا بلکہ وہ تمام معاملات پر صبر وسکون سے غور کرتا ہے اکثر عفو درگزر سے کام لیتا ہے اس کے سینہ میں باپ کا دل ہے ۔جو بیٹے کی خستہ حالی سے بے چین ہو جاتا ہے لیکن وہ غیر معتدل جذباتیت ،اضطراب اور جاہلانہ حرکات کا مظاہرہ نہیں کرتا وہ اپنے نام کی رعایت سے اس حد تک عمل کرتا ہے کہ مشاغل لایعنی اور خلاف دین خیالات سے تائب ہو جاتا ہے باقی اس کے تمام اعمال اور خیالات اس زمانے کے ان عام مسلمانوں جیسے ہیں جو بیدار ہو جانے کے بعد معاشرے کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس سلسلہ میں سختی اور جذباتیت کے بجائے افہام وتفہیم سے کام لیتا ہے۔اس طرح نصوح کے کردار میں انفرادی و اجتماعی دونوں خصوصیت پائی جاتی ہیں۔

دوسرے میر متقی ہیں جن کے نام کو تمثیلی کہا جا سکتا ہے لیکن ان کے اعمال اور اقوال ان کی ہوشمندی پر دلالت کرتے ہیں۔ میر متقی اپنے نام کی رعایت سے صرف متقی ہی نہیں ہیں بلکہ وہ علم فضل ،قول وعمل دینداری ،اخلاص وایثار جیسی گوناگوں صفات کے حامل ہیں وہ مبتلا کو سمجھانے کے لئے بے وقت کی راگنی نہیں الاپتے بلکہ مبتلا کے مزاج ،حالات اور نفسیات کا گہرا مطالعہ کے بعد کوئی قدم اٹھاتے ہیں۔ان کی گفتگو مدلل اور موثر ہوتی ہے۔ وہ مبتلا کی اقتصادی حالت سدھارنے اور دینوی معاملات کو درست کرنے میں نہایت جزرسی اور معاملہ فہمی تجربہ کاری کا ثبوت دیتے ہیں چناچہ تمثیلی نام ہونے کے باوجود اس کردار کو بھی تمثیلی نہیں کہا جا سکتا۔

تیسرا کردار ابن الوقت کا ہے جو اپنے نام کے لحاظ سے خالص علامتی ہے لیکن اس کے اعمال اس کے روایتی ابن الوقتی سے بالکل مختلف ہیں۔ وہ اپنے کو صرف قوم کا مصلح بہی خواہ سمجھتے ہے بلکہ تقاضائے وقت کے برخلاف نیک دل، دلیر، دردمند، حق گو، حق پرست ،فرض شناس اور اصول پسند بھی ہے اور یہ وہ خوبیاں ہیں جن کی کسی ابن الوقت سے توقع نہیں کی جا سکتی وہ ضرورت یا خیالات کے تحت طرز معاشرت ضرور تبدیل کر لیتا ہے لیکن اپنے ذاتی جوہر کو فراموش نہیں کرتا ہے۔ابن الوقت ایسا نمائندہ کردار ہے جس کی شخصیت کے آئینہ میں اس عہد کے تعلیم یافتہ افراد کو ذہنی ،سماجی ،تہذیبی ،معاشی اور سیاسی کشمکش میں مبتلا دیکھا جا سکتا ہے۔نذیر احمد کے کرداروں کی ان ہی خصوصیت کے پیش نظر ایک نقاد نے انہیں ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

> ’’کردار نگاری میں حافظ نذیر احمد کو ید طولیٰ حاصل ہے۔اردو افسانہ نگاروں میں سے کوئی بھی ان کے عمیق مشاہدے فطرت انسانی کے وسیع مطالعہ اور دلچسپ بیانات تک نہیں پہنچ سکا۔حافظ نذیر احمد کے قصوں کا سب سے زیادہ اہم عنصر ان کی کردار نگاری ہے۔‘‘۴۳

اس طرح مرزا ظاہر دار بیگ کو لیجئے جسے اس کے نام اور عمل کے لحاظ سے خالص علامتی کردار کہہ سکتے ہیں لیکن اس میں انفرادیت اور افادیت کی ایسی خصوصیات پائی جاتی ہیں جنہوں نے اسے زندہ جاوید بنا دیا ہے اور کسی تمثیلی کردار کو حیات جاوید حاصل نہیں ہوتی۔

لکھنؤ کے بانکے تو مشہور ہیں لیکن اس طرح کے ظاہر دار بیگ بھی ہر جگہ مل جائیں گے جو اپنی وضع قطع، سج دھج، چال ڈھال، لسانی سخن سازی بے حیائی کے سبب ہر جگہ دور سے پہچانے جا سکتے ہیں اور ایک خاص قسم کی ذہنیت کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔ اس کردار پر سماجی پس منظر سے بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر تاثیر فرماتے ہیں:

''ظاہر دار بیگ کی انفرادی حیثیت کوئی نہیں وہ محض صفت کی تجسیم ہے۔ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ مگر اس کی یہ صفت یوں ہی خیالی چیز نہیں ہے یہ صفت ایک خاص طبقہ کا خاصہ ہے وہ طبقہ جو امیر ہے نہ غریب، سفید پوش طبقہ جسے غریبوں سے الگ رہنے کے لئے اپنی حالت چھپانے کے لئے امیروں میں شامل ہونے کی کوشش میں ظاہر داری کرنی پڑتی ہے۔'' ۴۴

ان خصوصیات کی موجودگی میں مرزا ظاہر دار بیگ اپنے تمثیلی نام کے باوجود کسی اخلاقی صفت کا مجسمہ نہیں رہ جاتا بلکہ ایک خاص طبقہ اور معاشرے کا نمائندہ اور جیتا جاگتا کردار بن جاتا ہے اسے تمثیلی کردار کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ چناچہ نذیر احمد کے ناولوں میں چند علامتی نام ہونے کے باوجود ان میں غیر علامتی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ جس کا اعتراف ڈاکٹر احسن فاروقی بھی دبے الفاظ میں جیتے جاگتے کردار کہہ کر کرنے پر مجبور ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد کے اس محدود علامتی رجحان کے بارے میں اگر غور کیا جائے تو اس کے اسباب بھی آسانی سے سمجھ میں آ جاتے ہیں۔ نذیر احمد جس عہد میں یہ ناول لکھ رہے تھے اس عہد میں رعایت لفظی کا عام مزاق تھا۔ نذیر احمد کس طرح اپنے عہد کے اس رجحان کو نظر انداز کر سکتے تھے۔ پھر اس زمانے کے معاشرے پر داستانوں کا گہرا اثر تھا جس کے باعث ان کے کرداروں میں کسی قدر علامتی رنگ اور مثالیت غالب آ گئی ہے لیکن یہ خصوصیت صرف نذیر احمد کے کرداروں کے ساتھ ہی وابستہ نہیں ہے بلکہ انیسویں صدی کے تقریباً تمام ناول نگاروں کے یہاں پائی جاتی ہے۔ عہد وکٹورین کے ناولوں میں بھی مثالیت کا رجحان غالب نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں جان لاچن لکھتے ہیں:

''وکٹورین عہد کے معیاری ناول نگار اخلاقی ضوابط ایک واضح تصور رکھتے تھے وہ جانتے تھے کہ ہم میں سے ہر ایک نیکی اور بدی کا پتلا ہے لیکن اس حقیقت کا یہی

ادراک تھا کہ ہم میں سے بعض مرداورعورتیں واضح صورت میں برائی کی طرف مائل ہوتے ہیں ۔جس طرح بعض نیکی کی طرف اور وہ اس حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے جھجک محسوس نہیں کرتے''۔۴۵

چناچہ عہد وکٹورین کی طرح نذیر احمد بھی اس قسم کے کردار پیش کرتے لیکن اس عمل میں وہ عمومیت کے تصور کو نظر انداز نہیں کرتے ۔ان کے کرداروں میں نیکی اور بدی دونوں صفات موجود ہیں لیکن وہ اپنے بیانات کے ذریعہ کرداروں میں جان ڈالنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ وہ اپنے اعمال اوراقوال کی بنا پر زندہ رہتے ہیں۔

کردار نگاری کے سلسلے میں نذیر کا فن پوری طرح فنی تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہے لیکن ان کے کردار ہم اور آپ سے ملتے جلتے زندہ کردار ہیں۔ جوناول کے ہی کردار ہوسکتے ہیں۔تمثیل کے نہیں ہوسکتے ایسی صورت میں نذیر احمد کے ناولوں کو تمثیلی کہنا کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔ان تمام نقائص اور خامیوں کے باوجودان میں ناول کی ایسی بنیادی خصوصیات موجود ہیں جس کی بنیاد پر ہم انہیں ناول کہنے پر مجبور ہیں ۔نذیر احمد کا صرف یہ کمال نہیں ہے کہ انھوں نے داستانوں کے طلسم وسحر کو توڑ کر کہانی کو حقیقت کے پیکر میں ڈھال کر اس کو ارضیت بخشی اور سماجی ومعاشرتی مسائل کو کہانی کا موضوع بنایا اور قصّہ کی افادیت کا احساس دلایا بلکہ انھوں نے کہانی میں ناول کے مختلف اجزا کو رشتہ حیات میں پروکر فسانہ کی دنیا میں حقیقی واقعات و کردار، روزمرہ کی بال چال میں بے تکلّف مکالمے اور سلیس وسادہ معروضی اسلوب بیان پیش کر کے ایک نئے باب ناول نگاری کا اضافہ کیا۔ چناچہ یہ تمام خصوصیات ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کو ناول اوران کو پہلا ناول نگار کہا جانے کا شرف بخشتا ہے۔

جیسا کہ اس سے پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ اردو ادب میں ناول کے ابتدائی نقوش نذیر احمد کے قصّوں میں نظر آتے ہیں جن کے خدوخال میں رچاؤ تو کم ہے اور زندگی کی ٹھوس قدروں کا احساس زیادہ ہے مگر قصّہ گوئی کی تکنیک میں ایک نیا پن ضرور ملتا ہے۔نذیر احمد کے قصّوں اور قدیم کہانیوں کے مابین ایک واضح حدِ فاصل قائم ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔

نقادوں نے کتاب مرأۃ العروس کو اردو کا پہلا ناول تسلیم کیا۔ ڈپٹی نذیر احمد کی یہ تصنیف ۱۸۶۹ءِ میں شائع ہوئی۔ اس کا شمار آج بھی نصابی کتابوں میں ہوتا ہے۔ اس سے قبل اردو میں بیشتر قصّے ایسے لکھے جاتے تھے جن کا اپنے زمانے سے کوئی خاص تعلق نہیں ہوتا تھا۔ ہم انہیں طریقۂ رسائی کے اعتبار سے قدیم قصّوں کی صدائے بازگشت کہہ سکتے ہیں۔ ان میں بہت سے قصّے یا تو قدیم داستانوں سے ماخوذ تھے۔ یا پھر اُن کا آزاد یا ملخص ترجمہ تھا۔ نذیر احمد نے جس دور میں اپنے افسانوی کارنامے پیش کئے ہیں۔ وہ دور ثقافتی اور تہذیبی اعتبار سے ہندوستان کی تاریخ کا ایک اہم اور فیصلہ کن دور تھا۔

کئی پہلوؤں سے پچھلی دوصدیوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچایا تھا۔ اور ۱۸۵۷ءِ کا انقلاب اس ہی کا نقطۂ آخر تھا۔ جن کے گھروں میں کبھی دولت کی فراوانی تھی اور عیش وعشرت کے تمام سامان مہیا تھے۔ ہر طرح کی آسائش سے محروم وہ اب غریب الوطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ ان کے خاندانی اور نسلی امتیازات اب صعف ماضی کی کہانی رہ گئے تھے۔ بڑے گھروں کی پردہ نشین خواتین جو کبھی گھروں سے باہر نہیں نکلی تھیں۔ وہ اب ننگے پاؤں اور کھلے سر ادھر اُدھر ٹھوکریں کھاتی نظر آتی تھیں۔

ہندوستان کی مسلمانوں کی اس تباہی اور بدحالی کے پیشِ نظر سر سید احمد خاں نے انگریزوں سے مفاہمت کا راستہ اختیار کیا۔ کیونکہ وہ مسلمانوں کو نئے حالات سے ہم آہنگ کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے قوم کو انگریزی تعلیم حاصل کرنے اور مغربی تہذیب وتمدن کو اپنانے پر زور دیا۔ تاکہ وہ انگریزوں کے قریب آسکیں اور مسلمانوں کے خلاف انگریزوں کے دلوں میں جو بُغض وعناد کا جذبہ پروان چڑھ رہا تھا وہ کم ہوسکے اور مفاہمت کی کوئی نئی صورت پیدا ہو۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ۱۸۵۷ءِ تاریخ ایک ایسا موڑ ہے جس نے صرف سیاسی، سماجی اور معاشی حیثیت سے مسلمانوں کو شدید نقصان پہچایا بلکہ فکری اور تہذیبی سطح پر بھی انہیں کشمکش میں مبتلا کر دیا۔ جس کا آغاز بہرحال بہت پہلے ہو چکا تھا۔ انگریزی اقتدار کے ساتھ ساتھ مغربی افکار کا سیلاب بھی آیا۔ جو برِ صغیر کے باشندوں کے طرزِ فکر، طرزِ احساس اور طرزِ عمل کو تیزی سے تبدیل کرنے لگا۔ چناچہ وہ لوگ جو سر سیّد احمد خاں کے مخالف تھے۔ ان میں کچھ افراد ایسے بھی موجود تھے جو رفتہ رفتہ سر سیّد کے حامی بن گئے۔

سرسیّداوران کے رفقاء کی کوشش کی بدولت زندگی اورمعاشرے کے ساتھ ساتھ شعروادب کی دنیا میں بھی اہم تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ادبی نقطۂ نظر سے اہم ترین بات یہ ہوئی کہ اب لکھنے والے شعوری طور پر ادب کا رشتہ اپنے عہد کے معاشرے سے جوڑ کر اجتماعی زندگی کو پیش کرنے اور نئے حالات کی روشنی میں اُن مسائل کو سلجھانے کی کوشش کرنے لگے جن کی وجہ سے سماجی اصلاحی کی تدابیر کی طرف ذہن متوجہ ہوئے اور عملی اقدامات کی بھی اہم مثالیں سامنے آئیں۔

ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں انیسویں صدی کے آواخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں پروان چڑھنے والے مسلم متوسط طبقے کی معاشرت کی عکاسی ملتی ہے۔نذیر احمد اگر چہ بجنور کے رہنے والے تھے مگر ان کی زندگی کا بیشتر حصّہ دلّی میں گزارا، مزید یہ کہ دلّی کالج میں تعلیم پائی۔اور وہ انقلاب اپنی آنکھوں سے دیکھا جس کی پیشنگوئی ایک زمانے سے تاریخ کرتی آرہی تھی۔خارجی ماحول کی حقیقتیں ایسی نہ تھیں کہ نذیر احمد اس سے متاثر نہ ہوتے۔انھوں نے بڑی جرأت اور بےباکی کے ساتھ اس دور کے معاشرتی حالات اور واقعات کی تصویر کشی کی ہے۔ان کے ناولوں میں اس دور کے کرب واضلال اور جہد وعمل کی تمام پرچھائیاں نمایاں ہیں۔نذیر احمد کا دور اصلاحی تحریکات کا دور ہے۔اس عہد میں مذہب، سیاست ،معاشرت اور تعلیم غرض یہ کہ ہر میدان میں اصلاح کے اقدامات کئے گئے۔نذیر احمد کی ناول نگاری ان ہی اصلاحی تحریکات کی پروردہ ہے۔احتشام حسین لکھتے ہیں۔

> ''جن کتابوں نے ان کو امر بنایا ہے وہ کچھ ناول ہیں جن میں زوال پذیر مسلمان متوسط طبقے کی اصلاح کے مسائل پر دلچسپ کہانیاں تخلیق کی ہیں ان کا سب سے پہلا ناول مرأۃ العروس ہے۔جو ۱۸۶۹ء میں لکھا گیا۔اگر چہ فنی نقطۂ نظر سے اس میں خامیاں ہیں۔لیکن پھر بھی اردو کے پہلے ناول نویس تسلیم کیے جاتے ہیں۔یہ کتاب لکھتے وقت انہیں اس کی اشاعت کا خیال نہ تھا بلکہ اپنی لڑکی کے پڑھنے کے لئے ذاتی طور پر ایک نصابی کتاب تیار کی تھی مگر اتفاقاً یہ کتاب ایک انگریز کلکٹر کے ہاتھ لگ گئی اُس نے اسے شائع کرنے پر زور دیا۔''۴۶

یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اس وقت ہندوستان میں متوسط طبقہ اقتصادی اور سماجی نقطۂ نظر سے اپنی کوئی شناخت نہیں بنا سکا تھا۔مغربی سوسائٹی میں صنعتی ترقی کے ساتھ متوسط طبقہ اس طرح نمایاں ہوا تھا

کہ معاشرے کو جا گیردارانہ قدامت پرستی اور ماضی کے فرسودہ مزاج سے نجات دلانا اس کا سب سے بنیادی نقطۂ فکر اور موثر سماجی حربہ بن گیا تھا۔ یہ تعلیمی اور ثقافتی ترقی میں تو سب سے آگے تھا ہی اور معاشرے میں احساس مساوات اور سماجی انصاف دلانے میں بھی اس کی کوشش پیش پیش تھی۔ ہندوستان میں یہ صورتِ حال پیدا ہونے میں ابھی نصف صدی باقی تھی۔لیکن مغربی علم وادب کے اثرات اور وہاں کی روشن خیالی اور اصلاح پسندی اخبارات و رسائل کے ذریعے پھیل رہی تھی ۔ اس طرح متوسط طبقے کی بیداری سرسید احمد خاں، ڈپٹی نذیر احمد، ذکا اللہ اور شیخ عبداللہ جیسے اصلاح پسند مسلم دانشوروں کے ذریعے بھی عام ہو رہی تھی۔ اور متوسط طبقہ خاص طور سے اس کا مخاطب تھا۔

ڈپٹی نذیر احمد نے جو ناول متوسط طبقے کو لے کر لکھے ہیں ان میں ''مرأۃ العروس''، ''توبتہ النصوح''،فسانۂ مبتلا اور ابن الوقت خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد کو اس بات کا احساس تھا کہ مسلمانوں کو اپنے روزگار کے لیے انگریزی تعلیم حاصل کرنی تھی۔ اسی کے ساتھ اپنے مذہب سے بھی دستبرداری کا کوئی سوال نہیں تھا۔ دوسری طرف وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ متوسط طبقے کی لڑکیاں تہذیب سے بالکل بے گانہ ہیں، تنگ نظری، قدامت پرستی اور جہالت کا شکار ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ اپنی اور گھر کی ذمہ داری کو حسن وخوبی کے ساتھ نئے ماحول میں ادا نہیں کر پاتی۔ اس لیے انھوں نے عورتوں اور لڑکیوں کی اصلاح کے مقصد کو سامنے رکھ کر مرأۃ العروس جیسے ناول لکھے۔ اس کے ساتھ ساتھ نوجوانوں کی تہذیب وتربیت کے لیے''ابن الوقت''،''فسانۂ مبتلا'' اور ''توبتہ النصوح'' ترتیب دیے۔

ناول مرأۃ العروس میں اصغری اپنی تعلیم کی وجہ سے پورے ناول پر چھائی ہوئی ہے۔ دیکھا جائے تو ایک اچھے خاندانی نظامِ زندگی کو نبھانے کے لیے باوفا شوہر، فرض شناس بیوی اور سعادت منداولاد کا ہونا ضروری ہے۔ ایک خاندان میں کشمکش اور المیہ کی شروعات اسی وقت ہوتی ہے جب ان میں سے کسی میں کوئی کسر رہ جائے یا پھر مطابقت کی صلاحیت نہ ہو۔

ناول میں کردار اصغری کے خیالات دراصل نذیر احمد کے خود کے اپنے خیالات ہیں۔ اصغری کا گھر پر مدرسہ کھول کر لڑکیوں کو تعلیم دینا نذیر احمد کے خود اپنے تجربے کا نتیجہ ہے۔

اس ناول کا کردار ''اکبری'' دراصل اس عہد کی جہالت اور بے ہنری کا نمونہ ہے۔اس کو سامنے لا کر نذیر احمد نے متوسط طبقے میں عورتوں کی تعلیم کی اہمیت اور ضرورت کو نمایاں کیا ہے۔ بقول ڈاکٹر ابوالیث صدیقی:

> ''عورتوں کی تعلیم سے انہیں (نذیر احمد) خاص دلچسپی تھی اس زمانے میں عورتوں کی تعلیم کا چرچہ کم تھا۔لیکن نذیر احمد سمجھتے تھے کہ تربیتِ اولاد اور اصلاح رسوم کا کام اس وقت تک انجام نہیں دیا جاسکتا جب تک عورتوں میں تعلیم عام نہ ہو۔''۴۷

سماج میں اصلاح رسوم کا مسئلہ ایک اہم مسئلہ تھا اور آج بھی اسی طرح ہے ہر ایک رسم جو پہلے سے چلی آ رہی ہے بدلنا ضروری نہیں دیکھا یہ ہے کہ وہ ہماری موجودہ معاشرت طبقاتی معیار اور نئے حد کے تقاضوں سے کسی حد تک مطابقت رکھتی ہے، بہت سی رسمیں توہم پرستی اور ماضی کے نیم مردہ ماحول میں سانس لینے کے برابر ہیں۔ان کی اصلاح یا تبدیلی عمل میں آنی چاہیے۔لیکن کچھ رسمیں زندگی میں حسن پیدا کرتی ہیں۔وہ شہری معاشرے کا حسن ہیں۔ان کو اس لیے تو ترک کیا جاسکتا ہے کہ معاشرے کے لیے سادگی اور بے تکلف زندگی پر زور دیا جائے۔لیکن بہت سی رسمیں رواجی ہوتی ہیں اور ان کے حسن سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

ڈپٹی نذیر احمد میں مذہبی جذبہ کچھ زیادہ تھا۔اور اس معاملے میں ان کا ذہن وہابی تحریک سے وابستہ تھا۔ان کے کرداروں کو اس نقطۂ نظر سے دیکھنا بھی ضروری ہے کہ وہ کیا چاہتے ہیں اور کیوں؟

ڈپٹی نذیر احمد کے ناول اپنے دور کے نمائندہ ناول ہیں۔جو صرف تعلیمی و اصلاحی مقصد کے پیش نظر لکھے گئے۔ڈپٹی نذیر احمد کا شمار سرسید کے اہم احباب میں کیا جاتا ہے۔لیکن ان کی ایک الگ تعلیمی فکر بھی تھی۔ان کے پیش نظر دہلی کا وہ معاشرہ تھا جس میں کئی اقسام کے توہمات اور خامیاں در آئی تھیں۔خواتین کے حقوق کی پامالی سے معاشرے کا توازن بگڑ رہا تھا۔ڈپٹی نذیر احمد نے ان کے حقوق کے لیے آواز اٹھائی۔ان کا خیال تھا کہ خواتین کا استحقاق اس وقت تک قائم نہیں ہوسکتا جب تک ان کی اخلاقی اور ذہنی حالت بہتر نہ ہو اور یہ بہتری مناسب تعلیم و تربیت کے ذریعے ہی پیدا ہوسکتی ہے۔

درج بالا کی بحث سے اردو ناول میں ڈپٹی نذیر احمد کی انفرادیت کے متعلق یہ نتائج نکالے جاسکتے

ہیں کہ وہ قصّہ نویس سے زیادہ واعظ، مصلح اور مبلغ تھے۔انھوں نے اپنے ناول دین داری، خداپرستی ،انسان دوستی، تعلیم، امور خانہ داری اور اصلاح معاشرت کے تحت لکھے ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد اردو کے پہلے ناول نگار ہیں اس لیے ان کے ناولوں میں فنّی اصول وشرائط کی تلاش مناسب نہیں۔فن کے بعض تقاضے ان کی مقصدیت سے پورے نہیں ہوتے اور ان ناولوں میں کمزوریاں تلاش کرنے والوں کو موقع دیتے ہیں کہ وہ انھیں ناول نگار ہی ماننے سے انکار کردیں لیکن انصاف یہ ہے کہ ہم انہیں، ان کی ساری فنّی کوتاہیوں کے باوجود اردو کا پہلا اور اہم ناول نگار تسلیم کریں۔

ان کے ناول ایک خاص سماجی پس منظر رکھتے ہیں۔وہ اپنے سماج کے تماشائی نہیں بلکہ اسکے ایک جزو تھے۔سماج کا گہرا مطالعہ اور اسکے سارے پہلوؤں کا تجزیہ اور پیش کش ہی ان کو ایک کامیاب ناول نگار بناتی ہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنی وقیع کتاب ''سرسید اور ان کے رفقائے کار'' میں ان کے ناولوں پر جو رائے ظاہر کی ہے اس سے مکمل اتفاق کرتے ہوئے اس بحث کو یہیں ختم کرتے ہیں:

> ''نذیر احمد کے ناولوں کی اس اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کے ذریعے ہندوستانی مسلمانوں کی معاشرت کے ایک اہم دور کی تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ان ناولوں میں اس عہد کی ذہنیت، سماجی تصورات اور معاشرت کے ایک اہم دور کے مرقعے دستیاب ہوتے ہیں اور ان کی وہی قدر و قیمت ہے جو ۱۸ویں، ۱۹ ویں صدی کے بعض انگریزی قصوں کی جن میں ڈکنز، تھیکرے اور ہارڈی کے احتجاجی قصے اور مذہبی افسانے شامل ہیں۔پس جس طرح انگریزی ناولوں کا یہ حصہ اپنے نقائص کے باوجود زندہ رہنے کے قابل ہے اسی طرح نذیر احمد کے قصّے بھی زندہ رہیں گے۔''۴۸

ڈپٹی نذیر احمد کے مزاج میں ظرافت رچی بسی ہوئی تھی۔اس ظرافت نے ان کے ناولوں کو حد درجہ دلچسپ بنا دیا۔اہل نظر کا ایک حلقہ ایسا ہے جو نذیر احمد کے ناولوں کی خامیوں کی نشاندہی کرتا ہے۔انہیں ناول تسلیم نہ کرتے ہوئے قصوں اور تمثیل کا نام دیتا ہے۔مگر بعض خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود نذیر احمد کے ناول اردو فکشن کا قیمتی سرمایہ ہیں اور انہی کی بنیاد پر آگے چل کر اردو ناول کا قصر بلند ہوا۔

ڈپٹی نذیر احمد کے اردو کے پہلے ناول نگار ہونے کی حیثیت مسلم بھی ہے اور مستند بھی۔ اس لیے کہ ان کے ناولوں میں زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کا احساس ہے اور ہیئت، معنویت اور تکنیک کی خصوصیات بھی جو صرف ناول نگاری کے زمرہ میں آتی ہیں۔ اسی بنیاد پر نذیر احمد کی تصانیف ناول کہلانے کی مستحق ہیں۔ اسی لحاظ سے ان کی حیثیت اس فن کے موجد کی ہے اور وہ اس میدان کے شہ سوار بھی ہیں۔ ''یہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو افسانہ نگاری میں ایک نئی روش کی بنیاد ڈالی۔'' [۴۹] اگر اردو ادب میں ناول نگاری کی تاریخ کا جائزہ لیں تو نذیر احمد کو حرفِ آغاز تسلیم کئے بغیر یہ جائزہ بہر صورت نامکمل ہوگا۔ اس طرح نذیر احمد نے آنے والوں کے لیے راستہ ہموار کر رکھا تھا۔ جس پر چل کر جدید ناول نگاروں نے ناول کے فن کو معراجِ کمال پر پہنچادیا جس کی بنیاد آج سے ایک سو پچاس سال یا ڈیڑھ صدی زیادہ قبل ڈپٹی نذیر احمد ڈال چکے ہیں۔

## حوالہ جات

۱۔محمد احسن فاروقی ،اردو ناول کی تنقیدی تاریخ۔ص ۸
۲۔علی عباس حسینی ، ناول کی تاریخ وتنقید۔ص ۱۷۶
۳۔ یوسف سرمست ،اردو کا پہلا ناول مشمولہ آجکل ،جنوری ۲۰۰۴ء
۴۔مظہر امام ،اردو میں اولیت کے سہرے مشمولہ آجکل ،فروری ۲۰۰۵ء
۵۔اردو ناول نگاری ، سہیل بخاری۔ص ۴۵
۶۔بیسویں صدی میں اردو ناول ، یوسف سرمست ۔ص ۲۹
۷۔بحوالہ بیسویں صدی میں اردو ناول ، یوسف سرمست ۔ص ۱۵
۸۔نذیر احمد ،محصنات ، دیباچہ
۹۔ایضاً ، دیباچہ
۱۰۔نذیر احمد ،ایامیٰ ۔ص: ۳۷
۱۱۔نذیر احمد ، رویائے صادقہ ۔ص: ۱۷
۱۲۔سید عبداللہ ،سر سید اوران کے نامور رفقاء۔ص: ۲۸۰
۱۳۔علی عباس حسینی ، ناول کی تاریخ وتنقید۔ص ۱۸۵
۱۴۔اظہر علی فاروقی ، ڈاکٹر نذیر احمد کا ایک ناول ۔ص ۴۶
۱۵۔ناول کی تاریخ وتنقید ،علی عباس حسینی ۔ص ۱۸۵
۱۶۔دیباچہ حیات النذیر ،افتخار عالم بلگرامی ۔ص ۷
۱۷۔اردو ناول کی تاریخ وتنقید ،علی عباس حسینی ۔ص ۱۵۴

۱۸۔اردو نثر کا فنّی ارتقاء، مرتب ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔ص ۷۹
۱۹۔اردو نثر کا فنّی ارتقاء، مرتب ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔ص ۸۳
۲۰۔سر سید اور ان کے نامور رفقاء، ڈاکٹر سید عبداللہ۔ص ۹۴
۲۱۔حیات النذیر، افتخار عالم بلگرامی۔ص ۶۷
۲۲۔مرأۃ العروس، نذیر احمد۔ص ۱۸
۲۳۔نذیر احمد کے ناول، اشفاق محمد خان۔ص ۱۵۲
۲۴۔اردو ناول کی تاریخ و تنقید، ڈاکٹر احسن فاروقی۔ص ۵۷
۲۵۔بحوالہ نذیر احمد، مونوگرام، نورالحسن نقوی۔ص ۱۲۸۔۱۲۹
۲۶۔بحوالہ نذیر احمد، مونوگرام، نورالحسن نقوی۔ص ۱۳۰
۲۷۔نذیر احمد شخصیت اور کارنامے، ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی۔ص ۱۵۱
۲۸۔نذیر احمد کے ناول، اشفاق محمد خان۔ص ۵۴
۲۹۔داستان سے افسانے تک، وقار عظیم۔ص ۱۶۴
۳۰۔سر سید اور ان کے نامور رفقاء، ڈاکٹر سید عبداللہ۔ص ۸۸
۳۱۔عرفان نظر، ڈاکٹر یوسف سرمست۔ص ۱۰۷
۳۲۔نذیر احمد کے ناول، اشفاق محمد خان۔ص ۵۶
۳۳۔سر سید اور ان کے نامور رفقاء، ڈاکٹر سید عبداللہ۔ص ۱۳۹
۳۴۔ذوق ادب اور شعور، پروفیسر احتشام حسین۔ص ۷۷
۳۵۔مراۃ العروس، ص ۱
۳۶۔ناول کی تاریخ اور تنقید، علی عباس حسینی۔ص ۱۷۶
۳۷۔داستان سے افسانے تک، وقار عظیم۔ص ۵۸
۳۸۔بحوالہ اردو ناول۔آغاز و ارتقاء، عظیم الشان صدیقی۔ص ۱۲۷
۳۹۔اردو ناول کی تنقیدی تاریخ، ڈاکٹر محمد احسن فاروقی۔ص ۲۴

۴۰۔اردو ناول کی تنقیدی تاریخ،ڈاکٹرمحمداحسن فاروقی۔ص ۲۶

۴۱۔مرأۃالعروس،ص۹۰

۴۲۔اردوناول کی تنقیدی تاریخ،ڈاکٹرمحمداحسن فاروقی۔ص ۲۷

۴۳۔دنیائے افسانہ حصّہ دوم،پروفیسرعبدالقادرسروری۔ص ۱۵۱

۴۴۔بحوالہ اردوناول۔آغازوارتقاء،عظیم الشان صدیقی۔ص ۱۲۷

۴۵۔بحوالہ اردوناول۔آغازوارتقاء،عظیم الشان صدیقی۔ص ۱۳۷

۴۶۔اردوادب کی تنقیدی تاریخ،سیداحتشام حسین۔ص ۱۹۴

۴۷۔آج کا اردوادب،انجمن ترقی اردوعلی گڑھ ۱۹۷۱ء۔ص ۱۶۷

۴۸۔سرسیداوران کے نامور رفقاء،سیدعبداللہ۔ص ۲۴۰

۴۹۔اردوناول نگاری،سہیل بخاری۔ص ۴۵


☆☆☆

# باب چہارم

# ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کا مابعد نوآبادیاتی مطالعہ

## ہندوستان میں نوآبادیاتی نظام

جب کوئی طاقتور ملک اپنی افواج کے زور پر کسی نسبتاً کمزور ملک / ریاست اور اس کے افراد پر غاصبانہ قبضہ کر لے اور وہاں کے قدرتی وسائل اور افراد کی قوت کو اپنی اقتصادی و معاشرتی ترقی کے لیے استعمال کرے تو وہ مقبوضہ ریاست اس قابض ریاست کی نوآبادی کہلائے گی۔ قابض حکومت کا غلبہ مقبوضہ ریاست کے قدرتی وسائل، تجارتی منڈیوں اور افرادی قوت پر ہوتا ہے جس کی مدد سے وہ اپنی معاشی اور اقتصادی ترقی یقینی بناتی ہے۔ تجارت، صنعت و حرفت اور دوسرے معاشی شعبوں کے علاوہ مقبوضہ ملک کے تمام تر شعبے یہاں تک کہ حکومتی انتظام و انصرام چلانے والے ادارے بھی غالب ریاست کے قبضے میں آ جاتے ہیں اور یہ ریاست اپنی نوآبادی پر قانونی بالادستی قائم کرتی ہے جس کے لیے وہ اپنی فوجی طاقت کا استعمال کرنے سے بھی گریز نہیں کرتی۔ غالب ریاست مغلوب ریاست سے معاشرتی، معاشی اور سائنسی میدان میں زیادہ ترقی یافتہ ہوتی ہے۔ اس لیے وہ خود کو بہتر نسل انسانی سمجھتی ہے یہی ترقی اسے دوسرے اقوام عالم کو زیر نگیں کرنے اور ان کے وسائل کو استعمال کر کے مزید ترقی یافتہ ہونے کی خواہش کو ہوا دیتی ہے۔ اٹھارویں، انیسویں اور بیسویں صدی میں برطانوی قوم نے دنیا کی مختلف اقوام کو زیر نگیں نوآبادی بنایا اور ایک مربوط نوآبادیاتی نظام قائم کر کے دنیا کے ایک چوتھائی حصے پر اپنا تسلط قائم رکھا۔ ہندوستان کی اہمیت اس کی زرخیزی، خام مال کی بہتات، معدنیات کی بکثرت موجودگی اور سب سے بڑھ کر ہندوستانی قیادت کی باہمی ناچاقی، افواج کی ناقص تربیت، جدید ٹیکنالوجی، تعلیمی پس ماندگی اور ہتھیاروں کا فقدان اور بحری بیڑے کی عدم موجودگی کی وجہ سے تھی۔ ہندوسان کے وسیع معدنی ذخائر اور قدرتی وسائل یورپی اقوام کے لئے لالچ کی سب سے بڑی وجہیں تھیں۔ کپاس، گنا، مصالحے، رم، تمباکو، چائے اور مختلف قیمتی دھاتیں اور قیمتی پتھر وہ اپنی نوآبادیوں سے لوٹ کھسوٹ کے لے جاتے۔ برطانیہ نے ہندوستان میں داخل ہونے کے لیے بحری راستے کا انتخاب کیا اور ساحلی علاقوں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ ہندوستان برطانیہ کی ایسی نوآبادی تھی جہاں افواج اور مبلغین سے پہلے تاجر آئے۔

## نوآبادیاتی عہد کے عظیم مفکّر اور مصلح: ڈپٹی نذیر احمد

ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے ناولوں میں پہلی بار دلچسپ اور تفریح طبع کے مقصد کو نظر انداز کر کے سماجی اور معاشرتی مسائل کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔انہوں نے مختلف موضوعات پر لکھا ہے۔۔انہوں نے تعلیمِ نسواں، ہُنر مندی، بچوں کی تربیت اور نگہداشت، صبر وقناعت، عفّت وعصمت، اخلاقی تعلیم، تعلیم کی اہمیت، خانہ داری ، مذہب کی اہمیت اور مذہبی تربیت، کثرتِ ازدواج کے مُضر اثرات، انگریزی معاشرت کی اندھی تقلید، بیوہ عورتوں کی دوسری شادی ، اولاد کی اصلاح اور خاندان کی اصلاح جیسے موضوعات اور مسائل کو فنکارانہ بصیرت کے ساتھ اپنی تخلیقات میں موضوع بحث بنا دیا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد ۱۸۳۶ء میں ضلع بجنور (اتر پردیش) میں پیدا ہوئے۔اور ۱۹۱۲ء میں دہلی میں اس دنیا سے انتقال کیا۔ان کی شخصیت بڑی پہلودار تھی۔اردو میں ناول کی داغ بیل نذیر احمد نے ہی ڈالی۔ انہوں نے پہلی بار ''مراۃ العروس'' (۱۸۶۹ء) کے نام سے ایک ناول لکھا جس سے اردو ادب میں ناول کی صنف کی بنیاد پڑی۔اس ناول کے بعد ڈپٹی نذیر احمد نے بہت سارے ناول لکھے۔ان میں بنات النعش (۱۸۷۲ء)، توبتہ النصوح (۱۸۷۷ء)، فسانہ مبتلا (۱۸۸۵ء)، ابن الوقت (۱۸۸۸ء)، ایامیٰ (۱۸۹۱ء)،اور رویائے صادقہ (۱۸۹۴ء) شامل ہیں۔

مابعد نوآبادیاتی ادب میں نوآبادیاتی دور میں تخلیق کئے گئے ادب کو زیرِ بحث لایا جاتا ہے۔مابعد نوآبادیات ایک ایسے طرزِ تحقیق اور مطالعہ کا نام ہے جس میں نوآبادیاتی دور کی تاریخ ،ثقافت ،معاشرت،نفسیات ،تہذیب اور زبان وادب کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔اس مابعد نوآبادیاتی تحقیق میں نوآبادیاتی دور کے سیاسی ،سماجی ،ثقافتی اور معاشی غرض ہر پہلو کی گہرائی میں جا کر نوآبادکاروں کے ظلم و تشدد، بربریت اور طاقت کے غلط استعمال اور کالے منصوبے اور قوانین سے پردہ ہٹایا جاتا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کا زمانہ نوآبادیات کا زمانہ ہے۔مابعد نوآبادیات کا زمانہ ظاہر ہے کہ اس کے بعد والا زمانہ ہے۔جہاں نوآبادیات کو استعماریت کہا جاتا ہے وہاں مابعد نوآبادیات کو لامحالہ مابعد استعماریت ہی کہا جائے گا۔یعنی استعماریت سے چھٹکارے کا دور۔یہ کون سا دور ہے؟ دراصل استعماریت کا آغاز اگر ہیلن آف ٹرائے سے ہوتا ہے تو مابعد استعماریت کا آغاز یقیناً اس وقت کو کہا جائے گا جب دنیا سے کشور

کشائی کا عملاً خاتمہ ہوگیا۔ غالباً یہ دوسری جنگ عظیم ہے جس کے بعد سے کسی ملک نے کسی دوسرے ملک پر ہمیشہ کے لیے زمینی قبضہ نہیں کیا، بلکہ پرانے قبضوں میں سے بھی اکثر ایک ایک کر کے چھوڑ دیے گئے ۔ چنا چہ مابعد نوآبادیات کا صحیح آغاز تو دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے کو ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کا عہد انیسویں صدی کا نوآبادیاتی عہد ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے ناولوں کا مواد اسی نوآبادیاتی دور کے شمالی ہند کے متوسط معاشرے سے حاصل کیا ہے۔ انیسویں صدی کا ہندوستان جن سیاسی، سماجی، علمی اور ادبی پیچ وخم سے گزر رہا تھا اور جس سمت اور رفتار کا حامل تھا اس کے باقاعدہ نقوش ہمیں نذیر احمد کے ناولوں میں واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ یہی بات ہے کہ نذیر احمد کے ناولوں کے تمام کرداروں کے حرکات وسکنات سے حقیقت کی بوآنے لگتی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کی ناول نگاری کا دور انیسویں صدی کے نصف دوّم پر محیط ہے اور نذیر احمد کے ناولوں کے کردار اس عہد کے ہندوستان بالخصوص شمالی ہند کے مسلم متوسط گھرانوں کی مستورات کی نفسیات، ان کے خیالات اور نظریات ور جحانات کی منہ بولتی تصویریں اور اس عہد کی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہیں۔ بایں وجہ نذیر احمد کے ناولوں کا مابعد نوآبادیاتی مطالعہ کرنے اور اس کا تنقیدی جائزہ لینے سے قبل اس عہد کے پس منظر پر بھی تھوڑی بہت روشنی ڈالنی مناسب ہے۔

انیسویں صدی کا دور نہ صرف ہندوستان، بلکہ عالمی تاریخ میں بھی ایک اہم تریں باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ تباہی وبربادی اور خونریزی کے لحاظ سے بھی ترقی اور کامرانی کے زاوئے سے بھی۔ اگر چہ یہ دور کرب وبلا سے دوچار رہا لیکن اس کرب نے کئی ایک مصلحین کو بھی جنم دیا۔ ایک طرف قدامت پرستی ،توہم پرستی ،کہنہ رسم ورواج اور قدیم قدروں کا خاتمہ ہو رہا تھا۔ تو دوسری طرف عقلیت پسندی، نئی قدریں اور نئی طرزِ زندگی کا آغاز ہو چکا تھا۔ ایک قدیم تہذیبی اقدار، ماضی کی تاریکی میں روپوش ہو رہی تھیں تو اس کی جگہ مغربی تہذیب غیر محسوس طور پر اُبھر کر ان تاریک گوشوں کو منور کرتی جارہی تھی۔ غرض یہ دور مشرقی تہذیب اور مغربی تہذیب کے سنگم اور تصادم کا دور تھا۔ جس نے ایک نئے طبقے کو جنم دیا تھا۔ گویا یہ دور تعلیمی ،صنعتی اور معاشرتی طور پر اصلاحی اور انقلابی دور تھا اور نذیر احمد نے اسی دور میں آنکھیں کھولی تھیں۔

۱۸۵۷ء کے واقعات نے مغلیہ سلطنت کے اقتدار کا مکمل خاتمہ کر دیا تھا۔ ہندوستانیوں کا سیاسی

اقتدار چھن چکا تھا۔اقتصادیات انگریزوں (نوآبادکاروں ) کے ہاتھوں میں آچکی تھیں اور وہ اب پوری طرح ہندوستان کے حکمران بنے ہوئے تھے۔نوآبادکاروں یا انگریزوں کا سیاسی اقتدار سرزمینِ ہند پر مشرق سے مغرب تک پھیلا ہوا تھا۔اورانہیں ہر شعبہ میں کامیابی حاصل ہوچکی تھی۔اختراعی ذہنیتوں کی بنا پر وہ جاہ وحشمت سے مالا مال تھے۔ان کی سلطنت دنیا کی وسعتوں میں نہایت تیز رفتاری کے ساتھ پھیلتی جارہی تھی جس کے اسباب علومِ جدیدہ ،سائنس ،ٹکنالوجی اور تجارت تھے۔انہوں نے وہ نئی ایجادات کی تھیں کہ جس کو دیکھ کر دنیا انگشت بدنداں تھی۔انگریزوں کے علم وہنر کی بنیاد عقلیت پسندی پر رکھی گئی تھی ۔اس کے برخلاف ہندوستانی احساس کمتری کا شکار تھے اور عجیب وغریب خوش فہمیوں میں مبتلا،اس لیے وہ بجائے اپنی ناکامی کا ماتم کرنے کے عیاشی میں پڑے ہوئے تھے۔''توبتہ النصوح'' کا ہیروکلیم اور''فسانۂ مبتلا'' کا ہیرو مبتلا اسی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔قطع نظر بیشتر ہندوستانی ایسے بھی تھے جو دن بدن اخلاقی قدروں سے بیگانے ہوتے جارہے تھے۔رسومِ کہنہ میں جکڑے ہوئے تھے۔سب کچھ لٹ جانے کے باوجود قدیم اقدار،روایات،رسوم ورواج اور پرانی طرزِ معاشرت پر چلنے کی ناکام کوشش کررہے تھے روح ِ مذہب سے وہ عاری ہوچکے تھے۔ظاہرداری اور مذہب کے رسم ورواج جو حقیقی مذہب سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے تھے۔ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔وہ ہر معمولی سے معمولی چیز کو بھی رسم ورواج کی عینک سے دیکھنے اوراسی میں اپنی زندگی کے ہر ممکن اور غیر ممکن مسئلے کا حل تلاش کرنے کے خواہاں تھے۔گویا مذہب کا یہ مردہ تصوران کے نزدیک زندگی کا جزولاینفک تھا۔یہ تو عامیوں کا حال تھا لیکن خود علماء میں بھی ایک طبقہ ایسا پیدا ہو چکا تھا جو باوجود اپنا اقتدار چھن جانے کے قدامت پرستی ،علم کی کمی اور ذہنی اُپج سے محرومی کی بنا پر انگریزی علوم ،ان کی طرزِ زندگی اوران کے کلچر اور نظامِ حیات کو متنفر اور مشتبہ نگاہوں سے دیکھتا تھا اوران کی ہر بات کو کفر سے تعبیر کرتا تھا۔ان کے نزدیک انگریزوں کے ساتھ کھانا کھانا کرسٹان ہوجانے کے مترادف تھا۔یہاں تک کہ انگریزی تعلیم کا نام تک زبان پر لانا خارج از اسلام اور سور کا گوشت کھانے کے برابر تھا۔ڈپٹی نذیر احمد کے والد اوران کے استادِ محترم بھی انہیں بزرگوں میں شامل تھے۔نذیر احمد ۱۸۹۳ء میں حمایت اسلام ،لاہور کے آٹھویں سالانہ اجلاس میں لکچر دیتے ہوئے بیان کرتے ہیں:

''اب سے چالیس برس پہلے ایک ایک بات کفر وزندقہ سمجھی جاتی تھی۔ میں ایسے باپ کا بیٹا ہوں کہ دہلی کالج کے پرنسپل نے ہر چند چاہا کہ میں انگریزی پڑھوں والد مرحوم نے جو ایک غریب آدمی تھے مگر اپنے وقت کے بڑے دین دار، صاف کہہ دیا کہ اس کا مرنا منظور، اس کا بھیک مانگنا قبول مگر انگریزی پڑھنا گوارا نہیں۔ میں ایسے مولوی کا شاگرد ہوں جنہوں نے لاٹ صاحب سے باشکراہ ہر چہ تمام تر اور بہ مجبوری ہاتھ ملا کر اس ہاتھ کو مٹی سے رگڑ رگڑ کر دھوڈالا۔ انگریزی صابن سے نہیں۔ جنہو ں نے پانی پینے کا مٹکا جو جماعت میں رکھا رہتا تھا تڑواڈالا تھا۔ اس واسطے کہ اس میں ایک شامت زدہ انگریزی خواں مسلمان، پانی پی گیا تھا''۔ ا

ڈپٹی نذیر احمد کے بڑے بھائی علی احمد کو بھی مرنا منظور تھا لیکن انگریزی دوائی کھانا منظور نہ تھا ۔غرض اس دور کے ہندوستانی اپنے آباواجداد کے رسم ورواج ان کی طرزِ زندگی اور طرزِ معاشرت پر چلتے تھے۔ اس دھن میں وہ اپنے آپ کو بھلائے ہوئے تھے۔ گویا وہ پانی میں رہ کر مگر مچھ سے بیر کر رہے تھے ۔ وہ اپنے انجام سے بالکل بے خبر تھے۔ مذہبی تعصب ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اور نیز مسلمانوں ہی میں آپس میں اختلاف پیدا ہو گئے تھے، مذہبی بحث ومباحث، چھیڑ چھاڑ، فرقہ وارانہ آویزش میں لوگ جکڑے ہوئے تھے۔ مذہب کے نام پر لڑنا اور جان دینا شہادت کا مرتبہ پانے کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ شاید ہی کوئی پولیس، فوجداری، دیوانی یا کچہری اس زمانے میں ایسی رہی ہوگی جہاں اس سلسلے میں ان کے مقدمات دائر نہ ہوئے ہوں۔

اس زمانے میں بالخصوص دہلی میں وعظ گوئی اور خطابت انتہائی عروج کو پہنچ چکی تھی یہاں تک کہ پیشہ ور واعظوں کا ایک مستقل طبقہ تھا۔ اس زمانے میں شاید ہی کوئی غم، نہ خوشی کی تقریب ایسی رہی ہو جس میں وعظ نہ کیا جاتا ہو۔ نذیر احمد کے ناول ''ایامیٰ'' میں بیوگی کے بعد آزادی کے نانا مولوی مقتدیٰ کا وعظ اور ''فسانۂ مبتلا'' میں میر متقی کا بھائی کے انتقال کی خبر سن کر تعزیتی وعظ کرنا اور موقع بہ موقع پند ونصیحت کے تعلق سے ان کی طول طویل تقریریں، عارف اور مبتلا کے بحث ومباحث اور خود نذیر احمد کا ناولوں میں بات بات پر پند ونصیحت کے دفتر کھولدینا اس دور کی مروجہ مناظرہ بازی اور خطابت پسندی کی یاد تازہ کردیتے ہیں (۲)۔

اس عہد میں تعلیمی معیار بالکل پست اور گھٹیا قسم کا تھا۔نصابِ تعلیم بھی غیر مطمئن اور غیر تشفی بخش تھا جس سے لڑکوں کے اخلاق سدھرنے کی بجائے بگڑتے ہی جا رہے تھے۔اس خصوص میں نذیر احمد نے ''فسانۂ مبتلا'' میں مبتلا کے مکتب کا ذکر کرتے ہوئے غیر معمولی تنقید سے کام لیا ہے۔

لڑکیوں بالخصوص مسلم کی تعلیم کا کوئی خاص انتظام نہیں تھا۔بچپن کی شادی اور تعدادِ ازدواج کی رسمیں عام تھیں۔ہندو تہذیب کے اثر سے عقدِ بیوگان کو معیوب ہی نہیں دشنام سمجھا جاتا تھا جس کی وجہ سے بیواؤں کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔۱۸۵۷ء کے سانحہ میں کئی مرد اپنی زندگیاں گنوا چکے تھے۔یوں بھی بیواؤں کی تعداد فزوں ہو چکی تھی۔عقدِ بیوگان پر پابندی کی وجہ سے معاشرہ میں اس کے برے اور بھیانک نتائج ظہور پذیر ہو رہے تھے۔نامناسب اور ناسازگار حالات میں بیوہ کے قدم گھر کی چوکٹ سے نکل کر قحبہ خانوں کی طرف بھی جا رہے تھے۔مرد کو عیاشی کے نت نئے راستوں کی تلاش تھی اور طوائف عیش و عشرت کا سہل الحصول ذریعہ تھی۔سچ پوچھئے تو اس دور میں مرد کے اعصاب پر عورت سوار تھی۔

عورت کی سماجی حیثیت،قدامت پسندی،توہم پرستی،رسم و رواج کی پابندی اور جہالت کی وجہ سے پست تھی ہی لیکن غدر کے سانحہ عظیم نے اس کی پستی میں اضافہ کر دیا تھا اس کا پیدائشی حق اس سے چھن چکا تھا اور وہ مرد ظلم و ستم کا شکار ہو چکی تھی۔نذیر احمد کے عہد میں مسلم معاشرے کی پستی میں عورت کی زبوں حالی کو بڑا دخل تھا۔اگر چہ اس زمانے میں چند ایک مثالیں پڑھی لکھی خواتین کی بھی مل جاتی ہیں جن میں شواعر بھی تھیں اور علوم و فنون،فن موسیقی کی ماہر بھی۔اس خصوص میں فن موسیقی میں راجہ مان سنگھ کی بیوی مرگ نینا اور بھجنوں اور گانوں میں میرا بائی قابلِ ذکر ہیں لیکن ان کا تعلق امرا و روساء اور شاہی خاندان سے تھا جو ایک خاص تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا۔لیکن ایسی مثالیں مسلم معاشرہ میں نہ ہونے کے برابر تھیں۔

مختصر یہ کہ غدر کے بعد ہندوستانیوں،بالخصوص مسلمانوں کی سماجی،سیاسی،معاشی اور اخلاقی حالت گرتی جا رہی تھی۔قدیم روایات سے چمٹے رہنے کی بنا پر وہ احساس کمتری کا شکار ہو چکے تھے۔ان کی صلاحیتیں مفلوج ہو چکی تھیں۔بقول نذیر احمد ''سپہ گری کے وہ فن اور کرتب جو کبھی سلطنتوں کی قسمتوں کا فیصلہ کیا کرتے تھے اب تعزیہ داری کے جلوس کے سوائے اور کسی مطلب کے نہ رہے تھے''۔دنیوی سرمائے کے ساتھ ساتھ ان کا نفسیاتی،ذہنی اور فکری سرمایہ بھی پوری طرح لُٹ چکا تھا۔اندھی تقدیر پرستی عام تھی

۔مناسب علم نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنے اندر چھپی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے سے یکسر قاصر تھے اور جامد تصوف اور بے بنیاد روحانیت کے دامن میں پناہ لے رہے تھے۔

> ''خارجی حالات کا دھارا اتنا تیز و تند تھا کہ انسان کو اپنی داخلی قوتوں پر اعتماد نہ رہا ۔تخریبی سرگرمیوں نے وہ اودھم مچا رکھی تھی کہ کسی کو اپنی صلاحیتوں کا احساس نہ رہا ۔یہی وجہ ہے کہ وہ 'بندگی' کو بے چارگی اور 'قید حیات' کو بند غم سمجھتے رہے۔ان حالات میں وہ سوچ بھی نہ سکے تھے کہ انسان خودی کے زور سے دنیا پہ چھا سکتا ہے۔مگر انہیں اس کا ضرور یقین تھا کہ خودی کو کھو کر ہی خدا کو پایا جا سکتا ہے۔غیر یقینی حالات کا طویل سلسلہ شروع ہو چکا تھا کہ رک کر واقعات کے پیچھے کام کرنے والے اسباب کا پتہ لگانا کارے دارد والی بات تھی۔اس لئے وہ عالم اسباب پر غور کرنے کی بجائے آسانی کے ساتھ تقدیر پر یقین کر لینا چاہتے تھے۔'' ۳

اسی باعث مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔جادۂ کہن پر اڑے رہنے کی وجہ سے وہ ترقی کی راہ میں آگے نہیں بڑھ سکتے تھے۔قومی خیالات سے ان کو دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔جس کی وجہ سے سوسائٹی میں بے ہنروں اور نکمّوں کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہو رہا تھا۔

حکومت برطانیہ میں مسلمانوں کی زبوں حالی پر نظر ڈالتے ہوئے نذیر احمد نے اپنے ایک لکچر میں کہا ہے:

> ''انگریزی عملداری میں مسلمانوں کی ایسی مثال ہے کہ ایک دریائے مواج بہہ رہا ہے ۔اور مردم و مرغ و مور سب اپنے اپنے حوصلے کے موافق اس سے سیر یاب ہوتے چلے جاتے ہیں اور مسلمان ہیں کہ موسمِ تابستان میں دریا کی ریتی پر پیاسے پڑے تڑپ رہے ہیں''۔۴

ادھر نوآبادکاریا انگریز ہندوستانیوں کی کمزوری اور خامیوں کا استحصال کر رہے تھے۔وہ ہندوستانیوں کو ان کے مذہب سے بھی دور کر کے مذہب عیسوی میں شامل کر لینا چاہتے تھے تا کہ ان کے مذہب پر بھی کاری تازیانہ لگے۔اسی مقصد کے تحت جگہ جگہ انگریزی مدارس کھولے گئے اور ہر طرف مشنریوں کا جال بچھا دیا گیا۔تا کہ انگریزی تعلیم کی وساطت سے وہ عیسائیت کی تبلیغ کر سکیں۔ہندوستانیوں

کو جبراً عیسائی بنانے کی تحریک شدومد کے ساتھ شروع ہو چکی تھی جس کو ۱۸۳۰ء میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔

مذہب عیسوی کی غرض سے مدارس میں انجیل پڑھانے کی تجویز عمل میں لائی گئی کالج میں پڑھائی جانے والی کتابوں میں انجیل کے حوالے دئے گئے کہ طلباء انجیل پڑھنے پر مجبور ہو جائیں۔ مذہب عیسوی کے مطابق جوابات دینے والے طلباء کو انعامات دئے جاتے تھے تاکہ وہ اس کالج میں اپنے مذہب کو بھول جائیں۔ اس طرح انگریزوں نے ہندوستانیوں کے ایک بہت بڑے طبقے کو عیسائیت میں شامل کر لیا۔ نذیر احمد بھی ابتدا میں عیسائیت سے متاثر تھے لیکن بعد میں وہ حقیقت کو جان کر راسخ العقیدہ مسلمان ہو گئے۔

ابھی انگریزوں کے ہندوستانیوں کو مکمل طور عیسائی بنانے کے خواب پورے ہو نہیں پائے تھے کہ ہندوستان کے روشن دماغ طبقے میں بیداری پیدا ہو گئی۔ راجہ رام موہن رائے بڑی ذہین فعال اور متحرک شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے 'برہموسماج' کی بنیاد ڈالی اور قدیم ہندو دھرم کی اصلاح کا بیڑا اُٹھایا۔ عورت کی زبوں حالی کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ 'ستی' کی وحشیانہ اور اخلاق سوز رسم کو جو انسانیت پر بدنما داغ تھی، مخالفت کی۔ بڑے بڑے پنڈتوں سے ہمت اور بہادری سے مردانہ وار مقابلہ کیا اور عورت کو مرد کی چِتا کے جلتے ہوئے شعلوں سے نکال کر جینے کا حق دیا۔

ہندوؤں میں راجہ رام موہن رائے کے بعد بنکم چٹرجی ہندو دھرم کے احیاء میں سرگرم نظر آنے لگے۔ دیوندر ناتھ ٹیگور، کیشپ چندر سین اور ودیا ساگر کی تحریک کا مقصد بھی قدیم مذہب اور سماج کی اصلاح تھا۔ کشیپ چندر نے اس کی تعلیم اور ترقی ترویج کے لیے ہندوستان کا کونہ کونہ چھان مارا اور اپنی زوردار پُراثر خطابت سے نوجوان طبقے کو متاثر کیا۔ ذات پات فرسودہ بندھنوں کے خلاف آواز بلند کر کے اس تفریق کو مٹانے کی کوشش کی اور مختلف ذاتوں میں شادی بیاہ کو رواج دیا۔ عورتوں اور لڑکیوں کی اصلاح کے پیش نظر جگہ جگہ اسکول قائم کئے اور عقد بیوگان کے لیے معاشرہ کو راغب کیا۔

اسی زمانے میں شمالی ہند میں دیانند سرسوتی نے 'آریہ سماج' کی بنیاد ڈالی۔ انہوں نے بھی اس تحریک کے ذریعہ ذات پات کے فرق کو مٹانے کی کوشش کی۔ مرد اور عورت کے مساوات پر زور دیا۔ اس لحاظ سے یہ شمالی ہند کی پہلی مذہبی اور اصلاحی تحریک سمجھی جاتی ہے جس نے عوام کے منجمد خیالات میں تحریک پیدا کی۔ ان کی پُر اثر اصلاح نے عوام کے دل و دماغ میں۔ قومی بیداری کا جذبہ پیدا کر دیا۔ جسٹس

مہادیو گوبند رناڈے نے دکن میں ''پرارتھنا سماج'' کی بنیاد ڈالی۔ غرض برہمو سماج ہو کر آریہ سماج ان دونوں تحریکوں کا مقصد قدیم ہندو دھرم کے فرسودہ رسم و رواج کی اصلاح اور اس کو سماجی برائیوں سے پاک و صاف کرنا تھا اور ساتھ ہی اس کو سائنسی تقاضوں سے بھی روشناس کرانا۔ اگر چہ بیشتر تحریکوں کو کامیابی حاصل ہوئی تھی لیکن برہمو سماج کو اس خصوص میں زیادہ کامیابی حاصل ہوئی جس کی بنیاد انسانیت کے مثبت اور اعلیٰ اقدار اور عقلی دلائل پر رکھی گئی تھی۔ اس طرح ہندوستان میں مشرقی علوم کے ساتھ ساتھ علوم جدیدہ کی روشنی کرن بہ کرن پھیلتی جانے لگی۔ اسی زمانے میں مسلمانوں میں بھی مذہب اسلام کو غیر مذہب کے حملوں سے بچانے کا جذبہ مصلحین قوم میں بیدار ہو چکا تھا۔ ان مصلحین میں سر سید احمد خان پہلے شخص تھے جنھوں نے مسلمانوں کی گرتی ہوئی حالات کو سدھارنے اور ان کو زبوں حالی سے نکالنے کے لیے اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ اگر چہ سر سید احمد خاں کی اصلاحی تحریک سے قبل انیسویں صدی کے آغاز میں سید احمد بریلوی کی مذہبی تحریک کی مذہبی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ یہ خالص دینی اور مذہبی تحریک تھی جس کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح تھا جس میں بدعات، قبر پرستی اور غیر شرعی رسومات کو جو عقیدہ بن کر آئین کی صورت اختیار کر چکی تھیں اور اسلام کی پاکیزگی پر بدنما داغ بنی ہوئی تھی۔ پاک کر کے قرآن وسنت کے احکام پر مسلمانوں کو کاربند کرنا تھا۔ اس کے برعکس سر سید احمد خاں کی تحریک کا مقصد ہمہ گیر اور وسیع تھا۔ جس سے مسلمانوں کی سماجی، معاشی اور علمی اصلاح بھی مقصود تھی۔ سر سید احمد خاں کی نظر زمانے کے نشیب وفراز پر بڑی گہری تھی۔ وہ زمانے کے بڑے نبّاض تھے۔ ان کے سامنے ایک طرف مسلمانوں کی قدامت پرستی اور زبوں حالی تھی تو دوسری طرف یوروپین قوموں کی بلند خیالی، تجارت، عقلیت پسندی، سائنسی ایجادات، صنعتی ترقی اور زندگی کے مثبت اقدار پر ان کی نظر بالکل غیر جانبدارانہ تھی۔ سر سید احمد خاں نے سمجھ لیا تھا کہ مغربی ممالک کی ترقی کا راز علوم جدیدہ میں مضمر ہے۔ نذیر احمد نے خود ''ابن الوقت'' میں یورپین قوموں کی ترقی کے راز پر روشنی ڈالتے ہوئے نوبل صاحب کی زبانی کہلوایا ہے:

''اہل یورپ کی عظمت سلطنت نہیں ہے بلکہ ان کی تمام عظمت ان علوم میں ہے جو جدید ایجاد ہوئے ہیں اور ہوتے جا رہے ہیں۔اور ان علوم کے ذریعہ سے انہوں نے ریل اور تار برقی اور اسٹیمر اور ہزار ہا قسم کی بکار آمد کلیں بنا ڈالی ہیں اور بناتے چلے جاتے ہیں اور ہر طرح کی کاریگری میں دوسرے ملکوں پر سبقت لے جا کر روئے زمین کی دولت اپنے ملک گھسیٹ لے گئے اور گھسیٹے لیے چلے جا رہے ہیں ۔جس جس طرح کے ہنر اور کمال اہلِ یورپ میں ہیں ان کے ہوتے ممکن نہ تھا کہ ان کو سلطنت نہ ہو۔سلطنت ان کے کمالات کی قیمت نہیں بلکہ روکھن میں ہے اور ان کا حق لازمی ہے''۔۵

سرسید اچھی طرح جانتے تھے کہ مسلمانوں کی سیاسی ،معاشی ،سماجی پستی اور احساس کمتری سے نکالنے اور ان کا کھویا ہوا اقتدار حاصل کرنے کے لیے علومِ جدیدہ ،اور اعلیٰ درجے کی انگریزی تعلیم کی اشد ضرورت ہے تا کہ وہ اس کی بدولت اپنے اندر چھپے ہوئے جوہر کو اُجاگر کر کے بروئے کار لا سکے،اپنے آپ کو پہچان سکیں جہاں بقول اقبال خدا خود بندے سے اس کی رضا پوچھتا ہے ۔گویا سرسید احمد خان نے مسلمانوں کی پستی اور زبوں حالی کی دُکھتی ہوئی رگ کو چھو لیا تھا۔جس پر کسی مصلح قوم کی نظر نہیں پڑی تھی ۔اس سلسلے میں نذیر احمد نے سرسید احمد خاں کی اس دور بین نظر کا ذکر اپنے ایک لکچر میں بڑے فخر کے ساتھ کیا ہے:

''نہ صرف ہم معدودے چند مسلمانوں میں بلکہ نارتھ وسٹرن پراونسز بلکہ شاید انڈیا کی ہول محمڈن کمیونٹی میں سرسید ہی ایک ایسے مسلمان ہیں جنہوں نے سمجھا کہ مسلمانوں کا یہ مرضِ افلاس زوال پذیر ہے اور جہالت سے پیدا ہوا ہے ۔اور اگر ان کو علومِ مفیدہ سکھا پڑھا کر ان کی جہالت دور کر دی جائے تو یہ خاصے بھلے چنگے جنٹلمین ہو سکتے ہیں ''۔ ۶

سرسید چاہتے تھے کہ مسلمان جو حکمران قوم کی نظر میں حقیر و ذلیل ہیں ۔ان میں علومِ جدیدہ کی وساطت سے شعور کی پختگی ،اعلیٰ ذہنیت ، بلند حوصلگی اور تہذیب و شائستگی پیدا ہو۔وہ اس قابل نہیں کہ انگریز اعلیٰ عہدیداروں ،اسسٹنٹ جوئنٹ کلکٹر تو کجا لاٹ صاحب کے سامنے بھی ہاتھ نہ جوڑیں بلکہ ان سے شیک

ہینڈ کریں۔اس لیے کہ انگریز ہاتھ جوڑنے والے سے اتنے خوش نہیں ہوتے جتنا کہ ''شیک ہینڈ'' کرنے والوں سے خوش ہوتے ہیں اور وہ انگریزوں سے اس طرح ملیں جیسے ایک جنٹلمین دوسرے جنٹلمین سے ملتا ہے۔اس طرح نئے علوم سے مسلمانوں کی تلافیٔ مافات ہوجائے۔اسی مقصد کے تحت سرسید احمد خاں نے نامناسب اور ناسازگار حالات میں بھی مسلمانوں کی اصلاح پر کمر باندھی۔بقول نذیر احمد ''ان کو اگر خیال آجاتا کہ فرہاد کی طرح جوئے شیر لانے سے مسلمانوں کی حالت درست ہوتی ہے تو وہ ہرگز یہ نہ سوچتے کہ جوئے شیر لانا ممکن بھی ہے یا نہیں، کدال، پھاوڑا لے کے کوہ ہمالیہ کو کاٹنا شروع کر دیتے''(۷)۔چنانچہ معاشرے کی اصلاح اور اس کی ترقی کے لئے سرسید احمد خاں نے ۱۸۵۹ء میں مراد آباد میں فارسی مدرسہ قائم کیا۔۱۸۶۳ء میں غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی۔جس کا مقصد اعلیٰ انگریزی کتابوں کا اردو رترجمہ کرنا تھا۔تاکہ مسلمانوں میں اس کا مذاق پیدا ہو۔سائنٹفک سوسائٹی سے قبل قدیم دہلی کالج میں انگریزی کتابوں کے ترجمے کے لیے ''دارالترجمہ'' قائم ہو چکا تھا جس میں اردو نثر کے ان پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا تھا جو فورٹ ولیم کالج میں اجاگر ہونے سے رہ گئے تھے۱۸۶۴ء میں غازی پور میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے ایک مشترکہ اسکول قائم کیا جس میں اردو،عربی ،فارسی اور سنسکرت کے ساتھ ساتھ انگریزی بھی پڑھائی جاتی تھی۔جب ۱۸۶۴ء میں سرسید کا تبادلہ علی گڑھ ہوا تو سائنٹفک سوسائٹی کو بھی وہ اپنے ساتھ علی گڑھ لے گئے۔ہندوستانیوں کو خواب غفلت سے جھنجھوڑ کر بیدار کرنے اور انہیں قومی ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے لیے انہوں نے ۱۰رمئی ۱۸۶۶ء کو علی گڑھ میں ''برٹش انڈیا اسی ایشن'' قائم کی ۔مسلمانوں کو علوم جدیدہ سے فیض یاب کرانے اور ان کی ذہنی اور فکری آبیاری اور یورپین قوم کی سلطنتوں او رترقی کے راز سربستہ سے ان کو واقف کرانے کے لئے سائنٹفک سوسائٹی کی جانب سے ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' جاری کیا۔سرسید نے مقاصد کے علاوہ مغربی تعلیم اور تعلیمی اداروں کا جائزہ لینے کیلئے انگلستان کا سفر کیا اور وہاں سے واپسی پر ۱۸۷۰ء میں ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا۔اس رسالہ کی اجرائی کا مقصد مسلمانوں کی خاطر ایک معیاری تعلیم گاہ کے لیے عوام کو نفسیاتی طور پر تیار کرنا تھا۔سرسید نے اپنے کوششوں کو تیز کرتے ہوئے آخر کار ۲۲رمئی ۱۸۷۵ء کو علی گڑھ میں مدرستہ العلوم قائم کیا۔جو آگے چل کر کالج بنا جس کی موجودہ شکل علی گڑھ یونیورسٹی ہے۔نذیر احمد نے اپنے لکچروں کے ذریعہ کالج کی بنیادوں

کو مستحکم کرنے میں سرسید کا بہت زیادہ ساتھ دیا ہے۔ یہاں تک کہ قومی گداگری بھی کی تھی اور اس سے بڑھ کر قومی وملکی ترقی کے لیے نیک صلاح اور مشورے بھی دیا کرتے تھے۔

علی گڑھ تحریک نے نوجوان پڑھے لکھے طبقے کو بہت متاثر کیا تھا۔نذیر احمد کے ناول ''رویائے صادقہ'' کا ہیرو محمد صادق ہو بہو اسی طبقے کی نمائندگی کرتا ہے۔خود سرسید کے انگریزی وضع قطع اور طرزِ معاشرت کو اپنانے اور انگریزوں سے راہ ورسم، ربط وضبط بڑھانے ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کھانے پینے سے بالخصوص اس زمانے کا رجعت پسند طبقہ سرسید احمد خاں سے بدظن ہو گیا تھا۔ان کو کافر وملحد اور کرسٹان کے ناموں سے یاد کیا جاتا تھا۔اگرچہ سرسید کے مذہبی خیالات سے اختلاف کرنے والوں میں نذیر احمد بھی شامل تھے لیکن نذیر احمد کی علمی تحریک کو وہ بہ نظر استحسان دیکھتے تھے۔یہاں تک کہ انہوں نے سر سید کے اصلاحی کارناموں سے متاثر ہو کر ایک موقع پر کہہ دیا تھا کہ:

''مجھ کو پیر کی تلاش بھی ہوتی تو میں ضرور ان کے ہاتھ پر بیعت لیتا''[۷]

لیکن بعض لوگوں نے سرسید احمد خاں کو مسلمانوں کا غلط رہنما سمجھا اور ان پر نوجوان طبقہ کو مذہب سے بے راہ رو کر کے عیسائی بنانے کا الزام لگایا۔

ڈپٹی نذیر احمد کے عہد یعنی برٹش حکومت کے دور میں سماجی فضا کچھ اس قسم کی ہو گئی تھی کہ مسلمانوں ہی میں تین گروہ ہو گئے تھے۔ایک جو مغربی علوم وفنون تہذیب وتمدن میں رنگا ہوا تھا۔جس میں سرسید احمد خاں پیش پیش تھے اس مکتبِ خیال کی نمائندگی نذیر احمد کے ناول ''ابن الوقت'' کے ہیرو ابن الوقت سے ہو جاتی ہے۔دوسرا گروہ قدامت پرست علماء کا تھا جس میں اکبرالہٰ آبادی بھی شامل تھے۔اس مکتبِ خیال کی عکاسی اسی ناول کے اہم کردار حجتہ الاسلام سے ہوتی ہے اور ان دونوں گروہوں کے درمیان ایک تیسرا گروہ وہ بھی تھا جو مغربی علوم وفنون سے استفادہ کرنے کے باوجود اپنی وضع قطع مذہبی احکام اور روایات کو بھی سینہ سے لگائے ہوئے تھا جس میں وہ کسی قیمت پر بھی کسی قسم کی تبدیلی نہیں چاہتا تھا۔اسی گروہ میں نذیر احمد کا شمار ہوتا ہے

اسی طرح ہندوستان میں برطانوی حکومت کے قائم ہونے پر انگریزوں میں بھی دو مکتبِ خیال پیدا ہو گئے تھے۔ایک وہ جو ہندوستانیوں کو ترقی کی راہ پر گامزن دیکھ کر خوش ہوتا اور مسلمانوں کی تائید میں

تھا۔نذیر احمد کے اسی ناول کا ایک ناول ایک معاون کردار نوبل صاحب اسی مکتبِ خیال کا آئینہ دار ہے ۔اس کے برعکس دوسرا گروہ وہ تھا جو ہندوستانیوں کو سیاسی سرگرمیوں میں آگے دیکھنا کسی قیمت پر بھی گوار نہیں کرتا تھا۔نذیر احمد کے اسی ناول کا ایک اور معاون کردار شارپ صاحب اسی مکتبِ خیال کا ایک فرد ہے۔

غرض غدر کے بعد کا دور طبقاتی کشمکش ،مشرق ومغرب قدامت پرستی اور جدیدت ،پرانی قدروں اور نئی قدروں اور فلسفۂ جبر وفلسفۂ اختیار یعنی دوفکری معاشرتی اور اقتصادی نظاموں کے مابین ٹکراؤ، تصادم اور کشمکش کا دور تھا جس کو ہم نذیر احمد کی تخلیقات ''ابن الوقت،ایامیٰ اور رویائے صادقہ'' میں بآسانی محسوس کر سکتے ہیں۔

حقیقت میں دیکھا جائے تو غدر کے بعد کا دور اصلاحی دور تھا اور تحقیقات اور تخلیقات کا دور بھی اگرچہ انگریزوں کے تعلیمی اداروں کو عام کرنے اور فورٹ ولیم کالج کے قیام کا مقصد انگریزوں کو ہندوستانی زبانوں سے روشناس کرانا تھا۔انگریزوں کی ان تعلیمی کوششوں اور ان کے اقتدار کا مقصد صحیح ہے کہ ہندوستان کو اپنی نوآبادی بنانا اور اس کا معاشی استحصال کرنا تھا۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی بڑی حد تک اہمیت کی حامل ہے کہ انگریزوں کی ان کوششوں سے ہندوستان کو بعض فائدے بھی حاصل ہوئے۔سماج بیداری اور اصلاحی تحریکیں عام ہوئیں۔پرانی قدروں میں ایک انقلابِ عظیم آگیا۔مغربی اثرات نے ہندوستان کے ہر شعبہ اور ادارے کو بڑی ہی تیزی کے ساتھ متاثر کر کے صدیوں کے جمود کو توڑ دیا۔انگریزوں اور ان کی تقلید میں خود کئی ہندوستانیوں نے تعلیمی اداروں کو قائم کیا۔سائنس اور ٹکنالوجی کے ساتھ ساتھ اردو ادب میں بھی زندگی کی ایک لہر دوڑ گئی۔یہی وہ زمانہ تھا جس میں سرسید احمد خاں ڈپٹی نذیر احمد،الطاف حسین حالی،شبلی نعمانی اور محمد حسین آزاد جیسے اردو ادب کے چاند ستارے آسمان اردو ادب پر ابھر کر آئے۔جنہوں نے مغربی علوم سے استفادہ کر کے اردو ادب کو جس کی بنیاد ''ادب برائے ادب'' پر رکھی گئی تھی ایک نیا موڑ،ایک نیا رنگ وآہنگ دیکر اس کی بنیاد ''ادب برائے زندگی'' پر رکھی اور اس کو ہماری زندگی کا عکاس بنایا۔جہاں سرسید نے اپنے سادہ لیکن دلپذیر اور مؤثر انداز بیان سے اردو زبان کو استدلالی حیثیت بخش کر اخلاق،تعلیم اور مذہب کے اہم ترین شعبوں کی طرف متوجہ کیا۔آزاد نے اپنی انشا پردازی سے اردو ادبیات میں ایک درجہ متعین کیا۔حالی نے جدید تنقید کی بنیاد ڈالی اور سوانح نگاری کا آغاز کیا اور

پھر اپنی شاعری سے سوئی ہوئی قوم کو بیدار کیا۔اور مولانا شبلی نے خالص ادبی خدمات پر فلسفہ وتاریخ اور فن شاعری کے راز ہائے سر بستہ کھولے۔ وہیں نذیر احمد نے اپنے زور بیان سے اصلاحی ناول لکھے جو زندگی سے ہم آہنگ بھی تھے اور ہماری زندگی کے بننے سنورنے میں معاون و مددگار بھی۔ یہی مغربی اثرات کا نتیجہ تھا کہ روشن دل ودماغ قوم میں ذمہ داری اور فرض شناسی کا احساس اور زمانے کے ساتھ چلنے کے لیے نئے تقاضوں کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوگئی تھی۔مغربی اثرات کی وجہ سے ہندوستان میں بھی آزادیٔ نسوان اور خواتین میں تعلیم کو عام کرنے اور ان کی اقتصادیات کو بہتر بنانے کی تحریکات کا آغاز ہوا۔اس خصوص میں رام بائی، رکما بائی، راما بائی راناڈ نے بہت اہم رول ادا کیا۔ایشور چندر ودیا ساگر اور پونا کے پروفیسر کاروے نے ودھوا آشرم کھولے۔ پارسیوں نے مختلف قسم کی تعلیم دینے میں سب سے پہلے قدم بڑھایا۔انڈین سوشل کانفرنس نے عورتوں کی ترقی کے لیے مختلف قسم کے کام کئے۔مسلمانوں میں بھی خواتین کی اصلاح کا خیال پیدا ہوا۔نذیر احمد پہلے شخص تھے جنہوں نے معاشرے کی ترقی کے لیے عورتوں کی اصلاح کو اہم بنیادی اہمیت دی اور اپنے ناولوں کی توسط سے اس کا بیڑا اٹھایا۔ویسے قبل ازیں 'تہذیب الاخلاق' میں بھی عورتوں کی تعلیم، تعدد ازدواج کی خرابیوں اور عقد بیوگاں کے بارے میں تھوڑے بہت مضامین شائع ہونے لگے تھے۔۱۹۰۴ء میں تعلیم نسوان کی تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے ''خاتون'' کے نام سے ایک رسالہ بھی جاری کیا تھا اور پھر عبداللہ صاحب نے تعلیم نسواں کو فروغ دینے کے لئے علی گڑھ میں عورتوں کیلئے ایک مدرسہ قائم کیا تھا جو آگے چل کر ویمنس کالج بنا۔آریہ سماج اور برہمو سماج نے بھی عورتوں کی اصلاح اور انکی ترقی کے لیے فضا تیار کی تھی۔

مختصر یہ کہ نوآبادکار (انگریز) جہاں ہندوستان میں اپنے ساتھ نحوستیں لے کر آئے وہاں ان کا وجود ہندوستانیوں کے لیے بابرکت بھی ثابت ہوا۔جس کا نذیر احمد نے اپنے کئی لکچروں میں ذکر کیا ہے۔اس سلسلے میں ۱۵/اکتوبر ۱۸۸۸ء کو اپنا پہلا لکچر انڈین نیشنل کانگریس پر دیتے ہوئے کہتے ہیں:

''زیادہ نہیں ۱۸۵۷ء کے غدر سے پہلے کے زمانے کو اس وقت سے مقابلہ کرو تو ظلمت ونور کا فرق پاؤ گے۔اب ہم پوچھتے ہیں کہ یہ ریل یہ تار برقی یہ سررشتۂ تعلیم، یہ منی آرڈر، یہ پوسٹ کارڈ، یہ ویلیو پی ایبل، یہ میونسپلٹی، یہ سڑکیں، یہ صفائی، یہ نہر

، یہ سفر بحری و بری کی آسانیاں، یہ پولیس، یہ اخباروں کی آزادی، یہ ہندوستانی والیان ملک کے اختیارات تنبیت، یہ نمائش، یہ معدلت گستری کے قوانین اور ضابطے، یہ ہندوستانیوں کی کونسلوں میں شرکت، یہ تعزیری خطاب اور یہ تجارت کی ترقی، غرض یہ سارے انتظام کس نے سوچے؟ کس نے نکالے؟'' ۸

آگے چل کر موصوف یوں کہتے ہیں:

''بارہ برس ہوئے محکمہ برٹش گورمنٹ سے ایک بے تعلقی سی ہے مگر مجھ پر برٹش گورمنٹ کے حقوق ہیں۔ برٹش گورمنٹ نے مجھ کو بڑھایا عزت دی، نوکری دی، میں اس کی رعیت ہوں اور امن و آسائش اور آزادی سے علی وجہ الکمال متمتع۔ بایں ہمہ میں برٹش گورمنٹ کا بھاٹ نہ کبھی تھا اور نہ اب ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ برٹش گورمنٹ کے بہت سے انتظام اصلاح طلب ہیں ''۔ ۹

اسی طرح کے خیالات کا مظاہرہ نذیر احمد نے اپنے ایک لکچر میں بھی کیا ہے:

''انگریزی عملداری کے بے شمار احسان ہیں۔ ریل اور تار برقی اور ڈاک اور اسٹیمر اور سڑکیں اور نہریں اور مدارس اور شفاخانے اور کیا کیا لیکن سب میں بڑا احسان وہی تھا جو لارڈ میکالے ہندوستانیوں پر کر گیا۔ وہ ہمارے لیے تمام دنیاوی برکتوں کو شُور (sure) اور سرٹین (certain) کر گیا ہے۔'' ۱۰

ڈپٹی نذیر احمد اگرچہ انگریزوں کی عملداری پر تنقید بھی کرتے تھے تاہم وہ ہر لحاظ سے اس کو دنیا کی دوسری عملداریوں پر ترجیح دیتے تھے۔ انھوں نے ہر جگہ اس کی ستائش ہی کی ہے۔ اپنے ناول کے ایک کردار ابن الوقت کی زبانی بھی اپنے تاثرات یوں پیش کرتے ہیں:

''اگرچہ اس سے تھوڑی دیر پہلے میں نے گورمنٹ کے انتظام پر سختی کے ساتھ نکتہ چینی کی ہے بایں ہمہ میں اقرار کرتا ہوں کہ انصاف میں، انسانی ہمدردی میں، رعایا کی آزادی میں، رعایا کو مہذب بنانے میں، ملک کی فلاح و بہبودی میں، ملک کی ترقی میں دنیا کی کوئی گورمنٹ انگریزی کو نہیں پاتی۔ انگریزی گورمنٹ میں جو نقصان ہیں عملی قسم کے ہیں۔ ورنہ اس گورمنٹ کے اصول ایسے عمدہ ہیں کہ ان سے بہتر نہ بھی ہوئے اور نہ اب روئے زمین کے کسی حصہ میں ہیں۔ میں انگریزی گورمنٹ کو

ہندوستان کے حق میں خدا کی رحمت اور برکت سمجھتا ہوں‘‘۔۱۱

سر سید احمد خاں بھی برٹش گورمنٹ کو مسلمانوں کے حق میں خدا کی رحمت سمجھتے تھے۔ انگریزوں کی ہندوستان میں آمد سے اگرچہ ہندوستانیوں کے سیاسی نظم و نسق کا شیرازہ بکھر گیا۔ انہیں جان و مال کا کافی نقصان پہنچا، لیکن بقول عبداللہ یوسف علی:

’’اس سے ہمارے اقتصادیات اور جدید حالات میں مطابقت پیدا ہوگئی اور ہمیں ایسے اقتصادی سامان بہم پہنچے جن سے ہمارے تعلقات دنیا کی تحریکات کے ساتھ مظبوط ہو گئے‘‘۔۱۲

مختصر یہ کہ نوآبادکاروں کی آمد سے ہندوستانیوں کو نقصان کم اور فائدہ زیادہ پہنچا اور آنے والی نسلوں کو اس سے کہیں زیادہ فائدے پہنچے جس سے ہم آج بھی فیضیاب ہو رہے ہیں۔ اگر انگریز ہندوستان نہ آئے ہوتے تو مصلحین قوم میں بیداری پیدا نہ ہوتی۔ اس خصوص میں مسلمانوں کی اصلاح کی سر سید نے سعی نہ کی ہوتی اور ان کا بھرپور تعاون نہ دیا ہوتا تو کہا نہیں جا سکتا کہ مسلمان آج کس مقام پر ہوتے۔ شاید وہیں ہوتے جہاں آج سے ایک صدی قبل تھے۔ وہی جہالت وہی توہم پسندی اور وہی رسم پرستی کی گھٹن میں اپنے آپ کو تڑپتا ہوا بے چین پاتے اور علم و ہنر میں دنیا کے دیگر ممالک سے سب سے پیچھے رہتے اور مفلسی، زوال پذیری میں سب سے آگے۔ اس پس منظر میں ناول نگاری کا آغاز کرتے ہوئے نذیر احمد نے سر سید احمد خاں کی تحریک کو آگے بڑھایا ہے بلکہ مجموعی طور پر اپنے عہد کے ترقی پسند ذہن کا ساتھ دیا۔ ان کی مساعی سر سید احمد خاں، راجہ رام موہن رائے اور انہیں جیسے دوسروں کی سی نہ رہی ہوں لیکن ان کے ناولوں کے قارئین کی تعداد کچھ کم نہیں تھی وہ نہ صرف مقبول تھے بلکہ مؤثر بھی اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ نذیر احمد کے قلم کا رشتہ اپنے عہد سے استوار تھا۔ ان کے ناولوں کا مواد، پلاٹ اور کردار وغیرہ ان کے پس منظر سے ابھر کر آئے تھے اور ان کے تانے بانے اس پس منظر ہی سے بنے گئے تھے۔ ان کے عہد کا بخوبی مطالعہ کے بعد ہی ہم ان کے ناولوں کے مقصد و منہاج اور معنی و مفہوم کو کماحقہٗ سمجھ سکتے ہیں۔

ہندوستان میں استعماریوں یا انگریزوں کی آمد اور انقلاب ۱۸۵۷ء کی ناکامی اور اس کے بعد کے حالات نے ہندوستانی معاشرے کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا تھا۔ مغربی تہذیب آہستہ آہستہ پورے معاشرے

پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ انگریزوں کے تسلط اور ان کے غلبہ کی وجہ سے بھی شکست خوردہ مسلم اقوام میں پست ہمتی پیدا ہوئی اور نفسیاتی طور پر وہ دن بدن کمزور ہوتے چلے گئے اور تنزلی کی انتہا کو پہنچ گئے۔ جس کے نتیجے میں مسلمانوں کا زوال ہونا شروع ہو گیا۔ زوال آمدہ قوم میں احتجاج اور رد کی صلاحیت دن بدن کمزور پڑتی جاتی ہے اور وہ مغلوب طبقے کے زیر اثر چلا جاتا ہے۔ یہی حال ہندوستانی مسلمانوں کا بھی ہوا۔ مغربی تہذیب کے اثرات سے یہ قوم اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھ سکی۔ نتیجتاً تہذیب و معاشرت اور مذہب سبھی پر اس کا گہرا اثر پڑا جو آج تک باقی ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کا عہد ان ہی تبدیلیوں کا عہد تھا۔ معاشرے میں کافی تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں اور ہو رہی تھیں۔ نذیر احمد نو آبادیاتی دور کے ایک بہت بڑے مصلح اور مفکر تھے۔ لہٰذا انہوں نے نئی تبدیلیوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والے نت نئے مسائل پر نہ صرف خود غور و خوض کیا بلکہ اپنے خیالات کا اظہار بھی بہت مؤثر انداز میں کیا۔ انہوں نے اپنے ناولوں اور لکچروں کے ذریعے اصلاح معاشرہ کی تحریک شروع کی اور موجودہ معاشرتی صورت حال کو مدنظر رکھ کر ہی ناول لکھے۔ معاشرے میں راہ پانے جانے والی مختلف خرابیوں کو اپنے ناولوں میں نت نئے انداز سے پیش کیا۔ انہوں نے غلط رسم و رواج، مغربی تہذیب کی اندھی تقلید، توہم پرستی اور بے جا پابندیوں جیسے عیوب سے معاشرے میں جو خرابی پیدا ہو رہی تھی اس کو اپنے مختلف ناولوں میں اس طرح اجاگر کیا کہ لوگ ان برائیوں کو سمجھ سکیں اور ان سے بچنے کی کوشش کریں۔ چوں کہ نذیر احمد اپنے ناولوں میں زندگی کی صداقتوں کو پیش کرتے تھے لہٰذا لوگ ان کی طرف ملتفت ہوئے۔

## نو آبادیاتی ہندوستان میں اردو ناول، نو آبادیاتی نظام کی اصلاحات اور استحصال کے تناظر میں

اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں اردو ادب کی جو داستانیں ضبطِ تحریر میں آئیں وہ داستان کے ضخیم پیرائے سے نکل کر ناول کے وجود میں ڈھلتی نظر آتی ہیں لیکن ان کے موضوعات، کردار اور ماحول مافوق الفطرت اور رومانوی ہی ہیں۔ ماحول بھی داستانوی ہے لیکن یہ دور داستان سے ناول کی سمت سفر کا دور ہے۔ سترھویں صدی کے ربع آخر، انگلستان کے شاندار جمہوری انقلاب اور اٹھارویں صدی کے آخری برسوں میں انقلابِ فرانس نے تخت اچھال دئے اور تاج گرا دئے

تھے اس سماجی تبدیلی کے نتیجہ میں متوسط طبقہ کے ہاتھوں میں قیادت آ گئی۔شہنشاہیت کا اختتام ہوا تو ادبی فن پاروں میں بھی شہزادوں،شہزادیوں کی جگہ ناول جیسی حقیقت پسندانہ صنف نے لے لی جو جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ تھی۔

> ''سترہویں اوراٹھارویں صدی کے انقلابات نے مغرب بالخصوص یورپ کے فرد، سماج،تہذیب اور تمدن میں زبردست ہلچل پیدا کردی تھی۔مسلمہ اخلاقی وجمالیاتی نظام اقتدار متزلزل ہوگیا تھا۔نئے ماحول میں نئے انسان کے لیے روایتی اصنافِ ادب، داستان،رومان،رزمیہ،بزمیہ اور المیہ طربیہ،غیر متعلق ہوچکی تھیں۔اشرافیہ اور رعیت کی جگہ متوسط طبقے نے لے لی تھی۔ہیرو کی بجائے فرد انگڑائی لے کر عالمِ بیداری میں آیا۔مافوق الفطرت پر عناصر نے فتح پائی۔یوں داستان سمیت روایتی اصنافِ ادب قصئہ پارینہ ہوئیں اور ناول عہدِ جدید کا ترجمان ٹھرا۔''۱۳

کرۂ ارض پر ناول کے جنم کے لیے سازگار ماحول سب سے پہلے یورپ نے فراہم کیا۔سو یورپی ماحول میں جنم اور نشوونما پانے کے بعد یہ صنف یورپی اقوام کے ساتھ ان کی نوآبادیوں میں آئی اور حالات سازگار پا کر مقبولِ عام ہوئی۔برصغیر میں شاید ادبی فضا داستان کے بوجھل وجود کو چھوڑ کر ناول کے چُست پیرائے کو اپنانے والی تھی لیکن مغربی ناول کے اثرات انگریزوں کے ہمراہ برصغیر آنے سے ناول کو فروغ ملا۔

ناول مافوق الفطرت ماحول کی بجائے حقیقی دنیا کے مسائل کے اظہار کا وسیلہ بنا۔سماجی اور سیاسی انقلاب ، نفسیاتی گھٹن ،سماجی مسائل ،مذہبی تنگ نظری ،پسی ہوئی انسانیت کا غم ،غربت و افلاس ،جاگیردارانہ نظام،سرمایہ دارانہ نظام،عورت کی بے وقعتی یہ سب وہ موضوعات تھے جو ناول کے پیرائے کے منتظر تھے۔سو مغرب سے آنے والی صنف ادب کو سندِ قبولیت ملی۔نوآبادیاتی نظام نے جہاں برصغیر کے عوام کی نفسیات کو مسخ کیا،ان کے معدنی اور طبعی وسائل کو لوٹا،ان کے سیاسی تشخّص کو مسمار کیا وہیں ناول جیسی صنف بھی عطا کی۔

پرتگیزی،فرانسیسی اور برطانوی تاجر پندرھویں صدی عیسوی سے تجارت کی غرض سے ہندوستان آرہے تھے۔برطانوی انگریزوں نے اپنے قدم ہندوستان کی زمین پر جما لیے۔ان تاجروں کی نظر اس سونا

اگلنے والی سرزمین پر تھی اور یہاں کے معدنی وسائل اور کمزور سیاسی اقتدار ہندوستان کو برطانوی نوآبادی بنانے کے لیے کافی تھا۔ ۱۷۵۷ء میں سراج الدولہ کی شکست سے ۱۸۵۶ء سقوطِ لکھنؤ اور ۱۸۵۷ء فتح دہلی نے انگریزوں کو ہندوستان پر باقاعدہ قابض کر دیا۔ اب ہندوستان کو تاراج کرنے، یہاں کے وسائل کو یورپ پہنچانے اور یہاں کی عوام سے غلامانہ مشقت کرانے میں کوئی دقیقہ نہ رہا۔ ہندوستان باقاعدہ یورپی نوآبادی بن گیا اور ہندوستانیوں کا استحصال نوآباد مملکت کی عوام کی طرح ہونے لگا اس دور کا ایک مثبت پہلو بقول چیٹر جی یہ تھا کہ اس دور میں انگریزی ادب کے ذریعے سے ہندوستان کی روحِ عصر بھی نشاۃِ ثانیہ سے متعارف ہوئی۔ انگریزی تعلیم کا سلسلہ تو ۱۸۵۷ء کافی بیشتر چل نکلا تھا۔ تاہم ناول کے لیے سازگار مخصوص حالات ہنوز پیدا نہیں ہوئے تھے۔ یہ صورت حال ۱۸۵۷ء کے بعد ہی پیدا ہوئی، سو برصغیر کا پہلا ناول ''کرن گھیلو'' ۱۸۶۶ء مراٹھی زبان میں لکھا گیا۔ تاہم اردو میں ناول نگاری کا آغاز ڈپٹی نذیر احمد کے ناول مراۃ العروس سے ہوا۔ سرسید کی مقصدی تحریک نے غلام ہندوستان کو علم وادب کے ذریعے انگریز حکمرانوں کے قریب لانے کی کوشش کی۔ اب ہندوستان میں ایک ایسا رجحان پایا جارہا تھا جس میں ہندوستانی ذہن خود کو نوآباد عوام تسلیم کرتے نظر آئے۔ بقول ڈاکٹر محمد عارف:

> ''غلامی کے اعتراف کا مطلب تھا، جدید خیالات کی برتری تسلیم کر لینا، یورپ کی مادی ترقی کی طرف دھیان دینا، سائنسی اکادمیوں اور جدید درس گاہوں کو روشن خیالی کا سرچشمہ مان لینا اور مغرب کے جمہوری نظام کی نئی قدروں کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا ہے'' ۱۳

انگریزی تعلیمی اداروں کی بدولت عام عوام تعلیم یافتہ ہورہے تھے انہیں ریلوے، محکمہ مال، عدالتوں اور انتظامیہ میں ڈپٹی تک کی ملازمتیں ملنے لگیں تھیں۔ یوں، متوسّط تعلیم یافتہ طبقہ وجود میں آیا اور فروغ پانے لگا۔ حالؔی کی ''مجالس النساء'' جیسی تصانیف نے تعلیمِ نسواں کے رجحان کو تقویت دی۔

## نوآبادیاتی نظام کے اثرات اور ڈپٹی نذیر احمد کے ناول

ڈپٹی نذیر احمد (۱۸۳۶ء تا ۱۹۱۲ء) اردو کے اولین ناول نگار اور اردو کے ارکانِ خمسہ میں سے ایک ہیں اور سرسید کے رفیق اور ان کے مقصدی تحریک کے داعی ہیں۔ گو وہ سرسید کی طرح مذہبی طور پر

لبرل ازم کے قائل نہیں تاہم مادیت پرستی پر مذہب کوفوقیت دیتے ہیں اور عملی زندگی میں افادیت پسندی کی راہ پر گامزن تھے۔ نذیر احمد ۱۸۳۶ء میں بجنور، اتر پردیش میں پیدا ہوئے اور مئی ۱۹۱۲ء میں دہلی میں انتقال کر گئے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے ۱۸۴۶ء سے ۱۸۵۳ء تک دہلی کالج میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۵۷ء کے پُر آشوب دور میں بھی ان کا قیام دہلی میں ہی تھا۔ ڈپٹی کلکٹری کا امتحان پاس کرنے کے بعد وہ کانپور اور بعد ازاں گورکھ پور کے ڈپٹی کلکٹر رہے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے کل سات (۷) ناول تخلیق کئے جن کے نام یوں ہیں ۱) مراۃ العروس (۱۸۶۹ء)، ۲) بنات النعش (۱۸۷۲ء)، ۳) توبۃ النصوح (۱۸۷۴ء)، ۴) فسانۂ مبتلا یا محصنات (۱۸۸۵ء)، ۵) ابن الوقت (۱۸۸۸ء)، ۶) ایامیٰ (۱۸۹۱ء)، ۷) رویائے صادقہ (۱۸۹۲ء)

ڈپٹی نذیر احمد کے تمام ناول ۱۸۵۷ء ناکام جنگِ آزادی کے بعد لکھے گئے۔ ان کا بنیادی مقصد مصلحت پسندی، مذہب سے رغبت، حصولِ تعلیم، مغرب کی اندھی تقلید کی مخالفت، مشرقی اقدار کا فروغ اور مغربی طرزِ رہن سہن کو اپنانا تھے۔ مراۃ العروس اور بنات النعش میں عورتوں کی تعلیم و تربیت کو موضوع بنایا۔ بدلتے معاشرتی نظام میں عورتوں کا کیا کردار ہونا چاہئے۔ توبۃ النصوح میں مصنف نے نئی نسل کو بے دینی کی دلدل سے بچانے کی کوشش کی ہے۔ اس میں یہ اشارہ بھی موجود ہے کہ مسیحی مبلغین بھی دہریت کی روک تھام کی غرض سے اہم فریضہ ادا کر رہے ہیں۔ فسانۂ مبتلا میں مسلمان مرد، عورت کو سبق دیا گیا ہے کہ عقدِ ثانی کی صورت حال ہرگز پیدا نہ ہونے دی جائے یہ موضوع بھی سماجی اصلاح ہی کی ذیل میں آتا ہے۔ یہی حال ایامیٰ اور رویائے صادقہ کا ہے۔ بہر حال سیاسی و سماجی غلامی کی نئی صورت حال کو نذیر احمد نے جس ناول کا موضوع بنایا وہ ابن الوقت ہے۔

انگریزوں نے نام نہاد اقتدار مسلمانوں سے چھینا تھا۔ سو مسلمانوں کا سیاسی و سماجی استحصال ان پر واجب تھا۔ اگر نوآبادی کی عوام کو برابری کے حقوق دے دیئے جاتے تو وہ ریاست کہلاتی، نہ کہ نوآبادی۔ ہندوستان کی عوام کو بھی اس امتیازی سلوک سے گزرنا پڑا جو نوآبادیوں کی عوام کا مقدر ہوتا ہے۔ ان کی مذہبی عبادت گاہوں اور رسم و رواج کو پامال کیا گیا جس کا ذکر نذیر احمد کے ناولوں میں بارہا ملتا ہے۔

> ''دہلی کی جامع مسجد ایک مشہور عمارت ہے۔ ایسا کون سا مردہ دل انگریز ہوگا کہ اس
> شہر میں کسی تقریب میں آنا ہوا اور وہ اس مسجد کو دیکھنے نہ جائے۔ یہاں تک کوئی حرج

نہیں۔مگر جب مسلمان جوتیاں پہن کر مسجد میں جانا اپنی توہین کا موجبِ خیال کرتے
ہیں تو اگر چہ انگریزوں کے ہاں جوتی کا اتارنا خلافِ تہذیب ہو مگر اس میں کیا حرج
ہے کہ یا تو دروازے میں سے دوربین لگا کر دیکھ لیا جائے یا جوتی اتار کر اندر چلیں
پھریں۔ مانا کہ عمدہ اور مشہور عمارتوں کا دیکھنا ایک طبعی شوق ہے مگر شوق کے لیے
دوسروں کی دل آزاری کیا ضروری ہے۔'' ۱۴

مذہبی تقدس اور معاشی اور معاشرتی زبوں حالی کا دور دیکھنے کے بعد باشعور مسلمانوں کو یہ احساس ہوا کہ اقتدار کا واپس حصول ناممکن ہے۔ چنانچہ اگر ہم اچھے حاکم نہ بن سکیں تو اچھے محکوم بننے کی کوشش کرنی چاہیے یہ احساس سرسید اور ان کے رفقاء نے اپنی تحریروں سے اجاگر کیا ہے۔ڈپٹی نذیر احمد کے تقریباً تمام ناول اس شعور کی تشریح و تفسیر کرتے نظر آتے ہیں۔

''اصغری: ہم کو تو بس اتنا کرنا ہے کہ ملکہ کی عمل داری میں ( خدا ان کو سلامت رکھے
)امن و چین سے بیٹھے ہیں کسی طرح کا زور نہیں، بھینٹ نہیں، بیگار نہیں، لوٹ نہیں
،کھسوٹ نہیں، مار نہیں، ڈھار نہیں، جھگڑا نہیں، تم کو اس عمل داری کی جب قدر آئے کہ
کسی دوسری عمل داری میں جا کر رہو، اور گئی تو میں بھی نہیں اور خدا نہ لے جائے لیکن
تاریخ کی کتابیں میں دیکھتی ہوں، اخبار پڑھتی ہوں، بعض ظالم بادشاہوں نے لوگوں
کو ایسا ایسا ستایا کہ ان کے حالات دیکھ کر کلیجہ تھر تھر کانپنے لگتا ہے اور اب بھی دنیا میں
سبھی دنیا میں سبھی طرح کے بادشاہ ہیں لیکن خلقِ اللہ کو جیسا کچھ آرام ہماری وکٹوریہ کی
عمل داری میں ہے روئے زمین پہ کہیں نہیں۔ یہ سچ ہے کہ ملکہ یہاں ہمارے پاس
رہتی ہوتیں تو ہم لوگوں کو ان کی ذات سے بہت فائدے پہنچتے۔ پھر بھی میں نے تحقیق
سنا ہے کہ جب یہاں کی رعایا کو ذرا سی تکلیف میں بھی سن پاتی ہیں تو ان کا دل بے
چین ہو جاتا ہے اور ملکہ کی رحم دلی اور خدا ترستی کی حکایتیں جو کبھی کبھی اخبار میں سے
نظر سے گزری ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بے شک ان لوگوں کی پرداخت کا بہت
بڑا خیال ہے اور سمجھتی ہوں کہ ہو نہ ہو ملکہ نے اپنے بیٹے کو بھی اسی غرض سے بھیجا ہے
کہ اپنی آنکھوں سے رعیت کا حال دیکھو اور مجھے آ کر بتاؤ۔'' ۱۵

ڈپٹی نذیر احمد اُن اکابرین ادب میں سے تھے جو انگریزوں کی بالا دستی کو تسلیم کر چکے تھے اور ان

کے احکامات کو تسلیم کرنے اور اچھی رعایا بننے کی سوچ کو ترویج دے رہے تھے۔ انگریزوں کی حمایت میں بعض اوقات زمین آسمان ایک کر دیتے ہیں۔لیکن ساتھ ساتھ اس بات کا بھی احساس ہوتا ہے کی ڈپٹی نذیر احمد قوم کی ترقی اور حصولِ آزادی کے لئے علم کو حاصل کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ کیونکہ کہ علم کی دولت سے عقل کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ جب تک قوم تعلیم یافتہ نہ ہو تب تک کوئی ترقی ممکن نہیں، علم کے بغیر قوم جہالت، گمراہی، توہم پرستی ، تنزلی اور دیگر برائیوں کی ہدف بنتی ہے۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ جدید سائنسی علوم اور ٹیکنولوجی کے بغیر قوم ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جائے گی۔ اسی لیے وہ جدید علوم کو حاصل کرنے کی وقت کی اہم ضرورت سمجھتے ہیں۔ کیونکہ وہ ان نئے علوم کی افادیت اور اہمیت سے پوری طرح باخبر تھے۔ اس قسم کے خیالات اور نظریات ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کے متن میں ملتے ہیں:

استانی جی:

''قوم کی قوم کا یہی حال ہے کہ عقل کے پتلے نہ ہوتے تو کالے کوسوں کو آ کر بادشاہ کس طرح بن بیٹھے؟ ذرا انگلستان کی تاریخ پڑھو تو تم کو معلوم ہو کہ ابتدا ان لوگوں کی کیا تھی۔ نرے وحشی تھے، جانوروں کو مار کر ان کا گوشت کھاتے اور چمڑا پہنے، پہاڑوں کی کھوؤں میں رہتے، کھیتی باڑی اور مکان بنانے کی عقل نہ تھی۔ رومیوں کی سلطنت تھی۔ انھی سے انگریزوں نے عقل و سلیقہ سیکھا یہاں تک کہ رومیوں کو اپنے ملک سے نکال باہر کیا اب یہ وہی انگریز ہیں کہ روئے زمین پر کوئی قوم ایسی دانش مند اور ایسی شائستہ نہیں ہے۔'' ۱۶

حسن آرا:

''اب تک میں یہ سمجھتی تھی کہ خدا نے سب انسانوں کو برابر عقل دی ہے مگر آپ کے فرمانے سے معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں کے ملک کی آب و ہوا میں ایک خاص تاثیر ہے کہ وہاں کے لوگ زیادہ عقل مند ہوتے ہیں میری کتاب میں بھی کئی جگہ دانش مندانِ فرنگ آیا ہے۔'' ۱۷

انگریزوں کی تقلید فقط کورانہ پیروی نہیں تھی۔ ڈپٹی نذیر احمد ان کے علوم وفنون کے حصول کو بھی لازمی سمجھتے تھے ان کے خیال میں مغربی عوام کی ترقی کی وجہ ان کے علم و ہنر ہے۔ اور مسلمانوں کی ترقی بھی

اسی میں مضمر ہے کہ جدید علم حاصل کریں۔ برصغیر کی دوسری اقوام ہندواور سکھ وغیرہ انگریزی تعلیم حاصل کر رہے تھے صرف مسلمان ہی اس میدان میں پیچھے تھے۔ نذیر احمد مسلمانوں کی علمی ترقی اور بالخصوص عورتوں کی تعلیم حاصل کرنے کے پرزور حمایتی تھے۔ ان کے پہلے دونوں ناول مراۃ العروس اور بنات النعش اسی موضوع کے حامل ہیں:

''جن عورتوں نے وقت کی قدر پہچانی اور اس کو کام کی باتوں میں لگایا، ہُنر سیکھا ،لیاقت حاصل کی وہ مردوں سے کسی بات میں ہیٹی نہیں رہیں۔ ملکہ وکٹوریہ کو دیکھو، عورت ذات ہوکر بھی کس دھوم دھام، کس شان اور کس ناموری اور کس عمدگی کے ساتھ اتنے بڑے ملک کا انتظام کر رہی ہیں کہ دنیا میں کسی بادشاہ کو آج تک یہ بات نصیب نہیں ہوئی۔ جب ایک عورت نے سلطنت جیسے کٹھن کام کو اور سلطنت بھی ماشاء اللہ اس قدر وسیع ہے کہ ایسے نازک وقت میں بات منہ سے نکلی اور اخباروں نے بتنگڑ بنایا یا اتنی مدت دراز تک سنبھالا اور ایسا سنبھالا کہ جو سنبھالنے کا حق ہے تو اب عورتوں کی خداداد قابلیت میں کلام کرنا بڑی ہٹ دھرمی ہے۔''۱۸

عورتوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ڈپٹی نذیر احمد انگریزوں کے ایک اور عمل سے بڑے مرعوب نظر آتے ہیں وہ معذوروں کی تعلیم ہے:

''انگیریزوں کی ولایت میں تو اندھوں کی تعلیم کا ایک ایسا عمدہ نظام ہے کہ اندھے ٹٹول ٹٹول کر اچھی طرح اخبار اور کتابیں پڑھ لیتے ہیں۔''۱۹

ناول ابن الوقت کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر خلیق انجم کا کہنا ہے کہ ابن الوقت اردو کا پہلا ناول ہے جس میں اپنے دور کی سیاست، تہذیبی و معاشرتی کش مکش، مذہبی رجحانات، برطانوی حکومت کے موافقین اور مخالفین کے سیاسی عقائد، حاکم و محکوم کے رشتے اور فرد کی خارجی اور سماجی زندگی کو تاریخی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد ابن الوقت میں عقیدت کی انتہا کو چھوتے نظر آتے ہیں۔ انگریزی تعلیم اپنانے کے ساتھ ساتھ انگریزی وضع اختیار کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں سمجھتے۔ نوآباد عوام شعوری اور لاشعوری طور پر اپنے حاکموں کے قریب آنے کی کوشش کرتی ہے بھلے انھیں دوسری جانب سے پسندیدگی یا ناپسندیدگی کا

سامنا کرنا پڑے۔ان کا کردار ابن الوقت ایک ایسا ہندوستانی باشندہ ہے جو انگریزی تہذیب وتمدن کو اپنا رہا ہے۔ ناصر عباس نیرؔ کے مطابق ڈپٹی نذیر احمد اصل میں دوجذبیت کے شکار ہیں کبھی وہ انگریزوں کی تقلید کرنے کو کہتے ہیں کبھی وہ مغرب کی پیروی کرنے کی مخالفت یا مذاحمت کرتے نظر آتے ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں اس نوآبادیاتی فکر کا مطالعہ قاری کو پڑھنے کو ملتا ہے۔ وہ کبھی مذاحمت پر اتر آتے ہیں تو کبھی مفاہمت کی تلقین کرنے کو کہتے ہیں:

''آج کل کا ساز مانہ ہوتا تو کانوں کان کسی کو خبر بھی نہ ہوتی ابن الوقت کی تشہیر کی بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس نے ایسے وقت میں انگریزی وضع اختیار کی جب کہ انگریزی پڑھنا کفر اور انگریزی چیزوں کا استعمال ارتداد سمجھا جاتا ہے۔'' ۲۰

مسلمانوں کی علمی ترقی اور انگریزی تہذیب اختیار کرنے کا درس دینے والے ڈپٹی نذیر احمد ایک بہت ہی نازک مسئلے پر قلم اٹھاتے ہیں۔ اس دور میں محکوم مسلمانوں اور حاکم عیسائیوں کے مابین کئی مذہبی اختلافات تھے جن میں سے ایک اکھٹے کھانا کھانا کا مسئلہ تھا۔ مسلمانوں کی محکومیت انہیں حاکموں سے نفرت کرنے پر مجبور کرتی تھی۔ ایسے میں نذیر احمد اور ان کی مقصدی تحریک کے دوسرے رفقاء نے مسلمانوں کو عیسائیوں کے قریب لانے کی کوشش کی تاکہ ان کے معاشی اور معاشرتی استحصال میں کچھ کمی آئے:

''ہم نشین: آپ نے ان کے برتن الگ کر دیئے ہوں گے۔

ابن الوقت: بھائی سچی بات تو یہ ہے کہ ہم نے برتن بھانڈا کچھ الگ نہیں کیا۔ کھانا ہمارا، برتن ہمارے، پکانے والے ہم، پھر الگ کرنے کی وجہ۔

ہم نشین: آخر وہ تھا تو انگریز۔

ابن الوقت: انگریز تھا تو ہونے دو۔ کھانے میں کوئی حرام چیز نہیں ہوتی تھی۔'' ۲۱

نوآبادریاست کے محکوم اور حاکم باہم منافرت کے رشتے میں بندھے ہوتے ہیں جس کی بڑی وجہ عوام کا استحصال ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے اس نفرت کو کم کرنے کی کوشش کی ہے۔

''جان نثار: صاحب کے منہ سے سنا ہے کہ روم اور مصر اور ایران اور عرب کہیں مسلمان پرہیز نہیں کرتے۔ بے تکلف انگریزوں کے ساتھ کھاتے پیتے مگر ہمارے

ملک کے لوگ تو بڑی چھوت مانتے ہیں۔'' ۲۲

ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے عہدے کی مدد سے ہمیشہ کوشش کی کہ انگریز سرکار کے دل میں سے بھی مسلمانوں کی نفرت کو کم کریں اور اپنی تحریروں سے بھی اس کی تقویت دی:

''جو نفرت ہندوستان کے مسلمانوں کو انگریزی سے ہے ہر گز مذہبی نہیں ہے بلکہ ایک رسم ہے جو انہوں نے ہندوؤں سے اخذ کی ہے اور جتنے مسلمان اپنے مذہب سے بخوبی آگاہ ہیں ہر گز اس نفرت میں شریک نہیں۔'' ۲۳

انگریزں نے ہندوستان پر قبضہ کر کے یہاں کی عوام کو جسمانی و ذہنی طور پر اپنا محکوم بنا لیا تھا۔ اب ان کی مذہبی حیثیت کو مجروح کرنا مقصود تھا چنانچہ انگریز پادری انگلستان سے ہندوستان آئے اور عیسائیت کی بھر پور تبلیغ کی جس کا ذکر اس دور کت کم و بیش سبھی ناول نگار کے ہاں ہے۔

''مذہب کو پھیلانے میں سرگرمی اس درجے کی کہ گلی گلی پادری وعظ کہتے، مذہبی کتابیں مفت بانٹتے پھرتے ہیں۔ چمار ہو یا بھنگی ہو ان کو اپنی ذات میں ملا لینے سے انکار نہیں یوں ہندوستانیوں کے دلوں میں از خود سرکار انگریز کی طرف سے مذہبی بدگمانی پیدا ہوئی۔'' ۲۴

مذہبی نکات پر جو سوال عوام کے ذہنوں میں اٹھ رہے تھے اس کا محرک مذہبی اختلاف تھا یعنی عوام اور حکمرانوں کا الگ الگ مذہب، دوسرا جدید تعلیم حاصل کرنے سے عوام سرکاری ملازمتیں حاصل کر رہے تھے جس سے یہ سوچ ابھر رہی تھی کہ مسلمان انگریز حکومت کے کارندے بننے اور انگریزی تعلیم حاصل کرنے سے لادین ہوتے جا رہے ہیں۔

''یہ کیوں کہ حضرت ہندوستان آپ کے نزدیک دارالحرب ہے یا نہیں؟ انگریزوں سے اور ہنود سے سود لینا روا ہے یا نہیں؟ انگریز اگر کابل میں چڑھائی کریں اور ایک پلٹن کو امیر کے مقابلے میں لڑنے کا حکم دیں اور ایک مسلمان اس پلٹن میں پہلے سے نوکر ہو تو اس کو کیا کرنا چاہیے۔ جنھوں نے مصر میں خروج کیا ہے، میر موعود ہے یا نہیں اور ان کو مدد دینا از روئے شرح شریف کیا حکم رکھتا ہے؟ انگریزی دواؤں کا استعمال درست ہے یا نہیں؟ کچہری سے برابر سود کی ڈگریاں ہوتی ہیں سود کا دینا گناہ ہے یا نہیں؟ انگریزوں کے ساتھ کھانا اور لباس کا طرزِ تمدن کیا حکم رکھتا ہے۔'' ۲۵

انگریزی تہذیب، انگریزی زبان اور انگریزی مذہب کے لیے نرم گوشہ رکھنے کے باوجود ڈپٹی نذیر احمد نوآبادہندوستان کی بدحالی اور انگریزوں کے ہاتھوں ہونے والے استحصال کو چھپا نہ سکے اور وہ اُن کی تحریروں میں در آیا۔ ہندوستان ایک زرعی ملک ہے جس کی آمدنی کا بڑا حصہ زراعت سے حاصل ہوتا ہے انگریزوں نے اس سونا اگلنے والی سرزمین کو اچھی طرح نچوڑا اور کسانوں کو جو کم علم تھے اپنے زیرِ نگیں کر لیا۔

''اب گورنمنٹ انگریزی انتظام کو دیکھنا چاہیے کہ اول کوافتادہ، بنجر چپے چپے زمین کی پیمائش کرائی پھر مٹی کی ذات اور کھاد اور آب پاشی کے لحاظ سے کھیت کھیت کی حقیقت دریافت کی پھر کاغذات بہی اور لوگوں کی گواہی اور ذاتی تجربے سے یہاں تک تحقیق کیا کہ اس کھیت میں اس قدر پیداوار کی قابلیت ہے اس طرح واقع میں اچھا خاصا کسا ہو، دو تہائی حق سرکار ٹھہرادیا اور اتنی کاوش پر بھی ہمیشہ کے لیے بلکہ غائیت درجہ صرف تیس برس کے لیے کہ اتنے میں زمین دار پھر بیچے گا، پھر نچوڑیں گے۔'' ۲۶

انگریزوں نے ہندوستان کی معیشت کا استحصال ایسا کیا کہ کمر توڑ کے رکھ دی، یہاں سے خام مال برطانیہ پہنچایا اور وہاں کی تیار مصنوعات ہندوستان کی منڈیوں میں بیچیں جس سے یہاں کی صنعت وحرفت پر دائمی زوال آ گیا اور وہ بھی زراعت کی طرح انگریزوں کے ہاتھوں تاراج ہو گئی۔

''اہلِ حرفہ کی کیفیت کسانوں سے کہیں بدتر ہے یہ سچ ہے کہ گورنمنٹ ان کے حال سے کم تعرض کرتی ہے بلکہ، یوں کہنا چاہیے کہ نہیں کرتی مگر یورپ کے ملکوں نے ان کو مار پڑا کر دیا ہمارے دیکھتے دیکھتے بہت سے عمدہ ادویات کے پیشے معدوم ہو گئے اور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اب کہاں ہے وہ ڈھاکے کے ململ، بنارس کے مشروب، اورنگ آباد کے کمخواب، بیدر کے برتن، کاپی کے کاغذ، کشمیر کی شالیں، لاہور کے ریشمی ڈورے، اہل یورپ کیا اس پر بند ہیں کہ جس چیز کی مانگ ہندوستان سے ہوئی، بنائی، بھیج دی؟ نہیں وہ لوگ رات دن اس ٹوہ میں لگے ہیں کہ ہندوستان میں کیا کیا چیز پیدا ہوتی ہے اور وہ انسان کے کس مصرف کی ہے اور اس ملک کے لوگوں کو کیا درکار ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان سے ہر طرح کی پیداوار ولائیت ڈھلی چلی جاتی ہے۔ کچھ تو یورپ میں کھپی اور کچھ ہندوستان کی مصرف بن کر آ گئی۔ ہندوستانی اہل

حرفہ تھکے تو یوں تھکے کہ انسان کی قوت کا اندازہ معلوم ہے۔اور وہ یورپ میں ملیں ہیں
کہ سارے سارے دن، ساری ساری رات برابر بے تکان پڑی چل رہی ہیں
۔ ہندوستان میں ملوں کا ایجاد کرنا تو کجا۔ انہیں تو ملوں سے کام لینے کے سلیقے کو بھی
عمریں چاہئیں۔'' ۲۷

زراعت پر انگریزوں کا ایسا قبضہ ہوا کہ تمام خام مال ہندوستانی غلاموں کے ہاتھوں کاشت ہونا اور برطانیہ چلا جاتا ۔نیل ، کپاس ،تمباکو، چائے ،مصالحہ جات وغیرہ برطانیہ جاتے اور وہاں سے تیار مصنوعات ہندوستانی منڈیوں میں مہنگے داموں بیچی جاتیں ۔ ہندوستانی کاریگر فارغ ہوگئے ،تاجر انگریزوں کی شرائط پر تجارت کرنے لگے، یوں کسان غریب سے غریب تر ہوتے چلے گئے۔

''ہمارے ملک کی صنعت پر اوس پڑی چلی جاتی ہے پس اسی نسبت سے تجارت میں
بھی کمی ، سچ پوچھیئے تو ساری تجارت اہل یورپ کی مٹھی میں ، ہندوستانیوں کو تاجر نہیں
بلکہ تاجروں کا دلال سمجھتا ہوں ، ولایت سے مال منگواتے ہیں اور اس کے طفیل روپے
پیچھے دھیلا دمڑآپ بھی جھاڑ کھاتے ہیں۔'' ۲۸

نوآبادکاروں نے پورے ہندوستان میں خام مال اٹھانے کے لیے شمال سے جنوب تک ریل کی پٹریاں بچھادیں،نوآبادیاتی دور کی یہ بہت بڑی عطا ہے۔اس کا ذکر بھی ڈپٹی نذیراحمد کے ناول میں آیا ہے:

''انگریزوں کی عمل داری سے ہزاروں قسم کی نئی چیزیں چل پڑی ہیں،ان میں سے
ایک عجیب اور بڑے کام کی ریل ہے جس کی وجہ سے مہینوں کا سفر گھنٹوں میں طے کیا
جائے اور وہ بھی سہولتوں اور آسائش کے ساتھ سفر کا سفر اور تفریح کی تفریح۔یہی سبب
ہے کہ لوگ جیسے پردیس گئے کام سے گھبراتے تھے ، اب سفر کے لیے بہانے
ڈھونڈتے ہیں۔'' ۲۹

ریل جیسی نعمت بھی نوآبادیاتی عوام اور حکمرانوں کو قریب نہ لاسکی۔ مذہبی اختلافات اور معاشرتی و معاشی استحصال، اقتصادی زبوں حالی، اہل حرفہ کی تباہی اور دینی مدارس کی بے حرمتی ایسے عوامل تھے جنھوں نے مسلمانوں کو انگریزوں، ان کی زبان، ان کی تہذیب وتمدن سے نفرت کرنے پر مجبور کیا اور ہندوستان میں حاکموں اور محکومین کے درمیان اچھے روابط استوار نہ ہوسکے:

''انگریزی گورنمنٹ میں جتنے نقصان ہیں آخر کو سب کا یہی ایک سبب جا کر ٹھرتا ہے

کہ حاکم ومحکوم میں اختلاط نہیں اور ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف نہیں۔'' ۳۰

ڈپٹی نذیر احمد اپنے دور کے ماہر عکاس ناول نگار ہیں انہوں نے اپنے عہد کے غلام ہندوستان کی تصویریں اپنے ناولوں میں پیش کی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ وہ اس باشعور طبقے کی ذہنی اُپج کو بھی پیش کرتے ہیں جو نوآبادیاتی عوام اور انگریز حاکموں کو بھی ایک دوسرے کے قریب لانا چاہ رہے تھے اور دونوں قوموں کے مابین مذہبی، ثقافتی، تعلیمی اور معاشرتی بدگمانیوں کو ختم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ حالؔی کے دیوان کے چہرے پہ لکھا ہے:

'' چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی''

یعنی وہ عوام کو حکمرانوں کی تقلید کرنے کو کہہ رہے ہیں یہی موضوع ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں اور سر سید کے مضامین کا ہے۔ انگریز حکومت نے ہندوستان کا انتظام و انصرام چلانے کے لیے حکومت کے انتظامی ڈھانچے میں بہت سی تبدیلیاں کیں ان میں ان کے ذاتی مفادات تھے لیکن بہر حال اس میں ہندوستان کی اور ہندوستانیوں کی فلاح بھی تھی۔ مثلاً عدالتی نظام میں تبدیلی، تعلیم کے محکمے میں تبدیلیاں، اردو زبان کی سر پرستی، جاگیرداری کا خاتمہ وغیرہ۔ انگریزوں نے مقننہ، عدلیہ اور انتظامیہ کو الگ الگ شعبہ بنا دیا جبکہ اس سے پہلے تمام اختیارات ایک ہی شعبے پولیس کو حاصل تھے:

> ''اصل بات یہ ہے کہ پہلے کوتوالی اور فوج داری ایک تھی۔ جب یہ لوگ لگے اظہار کار گزاری کے لیے، ہر واردات بے سراغ کے لیے مجرم بنانے اور اصل مجرموں سے سازش کر کے، بے گناہوں کو ناحق پھنسانے، تو سرکار نے کوتوالی اور فوج داری کو الگ کر دیا۔ اب کوتوالی کا اتنا ہی اختیار تھا کہ جس کو اپنے نزدیک مجرم سمجھتے حاکم عدالت، مدعی اور گواہوں کے اظہار قلم بند کرتا ہے اور اپنے بیان کی روداد پر سزا پایا کرتا ہے۔'' ۳۱

مسلمانوں کے مخصوص پڑھے لکھے طبقے کو متاثر کرنے کے لیے نوآبادکاروں کا ہندوستانیوں کی تعلیمی سرپرستی کرنا ہی کافی تھا اور پھر انہوں نے بلاشبہ اپنے فائدے کی خاطر اردو کو فروغ دیا لیکن اس مسلمان متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ فورٹ ولیم کالج، دہلی کالج اور علی گڑھ کالج، جو بعد ازاں یونیورسٹی بنا، جیسے اہم اقدامات اور انگریزوں کی تعلیمی اصلاحات نے انہیں ہندوستانی مسلمانوں کے قریب کر دیا:

> ''اللہ! اللہ وہ بھی کیا دن تھے کہ سر ولیم میور ممالک مغربی و شمالی کے لیفٹیننٹ گورنر تھے

،مسٹر ولیم کمپنی کے ڈائریکٹر تھے۔تعلیم کے اعتبار سے یہ دونوں صاحب مسلمانوں کے گویا ہارون الرشید اور منصور تھے۔اور ہنود کے بکر ماجیت اور بھوج۔انگریزی جتنی پڑھی جائے اتنی تھوڑی ،مگر کتنی ہی کیوں نہ پھیلے۔ ہندوستان کی ملکی زبان تو بن بیٹھنے سے رہی۔قوم من حیث القوم اوپر سواوپر جب کبھی ترقی کرے گی۔اپنی زبان میں پڑھنے لکھنے سے سر ولیم میور کا یہی گُر تھا۔زبانِ اردو کی سرپرستی کے پیرائے میں ہماری فلاح کی فکر میں تھے۔انہی قدر دانی مجھے تصنیف و تالیف کی باعث ہوئی یہاں تک کہ عورتوں کی تعلیم کا سلسلہ مرتب ہوگیا۔'' ۳۲

## نوآبادیاتی ہندوستان میں غلط رسومات اور ڈپٹی نذیر احمد کا ردّعمل

ڈپٹی نذیر احمد نے سب سے پہلے اپنے ناول مراۃ العروس میں معاشرے کے غلط رسم و رواج کی طرف اشارہ کیا۔مذہب کے نام پر ہونے والی فضول خرچی جو تنگ دستی کا ذریعہ بن جاتے ہیں سے لوگوں کو خبردار کیا۔شب برأت کے موقع پر لوگ عبادت سے زیادہ نام و نمود اصراف بے جا اور آرائش بازی وغیرہ پر توجہ صرف کرتے ہیں جس کی مذہبی حیثیت کچھ بھی نہیں۔لہذا ایسی مقدس اور معتبر رات جو عبادت میں بسر ہونی چاہیئے توہمات اور خرافات کی نذر ہو جاتی ہے اور توہمات کے بدلے ثواب کے بجائے گناہ ہی کماتے ہیں۔

ایسی ہی ایک شب برأت کا ذکر نذیر احمد نے مرأۃ العروس میں کیا ہے۔اصغری کی ساس جن کے پاس روپے نہیں ہیں قرض لے کر آتش بازی اور حلوے کا انتظام کرنا چاہتی ہیں لیکن اصغری ان باتوں کو غلط سمجھتی ہے اور سسرال آتے ہی ایسی تمام توہمات اور بدعتوں کو ختم کروا دیتی ہے۔ڈپٹی نذیر احمد ایسی تمام رسموں کو جوان کی نگاہ میں بدعت تھیں ان کو اصغری کی ساس کی زبان سے گنوا دیتے ہیں اور مسلم معاشرے کو اس قسم کی تمام رسموں سے باز رکھنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں:

''اصغری کی ساس۔'' شب برأت کا حلوہ، بیوی کا کونڈا ،صحنک منت ،عرس ،قبروں کی چادر پنکھا، پھولوں کی سیر ،سلطان بی کی سترہویں سہرا، کنگنا ،نوبت ،نقارہ ،ڈھولک

،آرائش موری تو سب ہی چیزوں کو منع کرتے ہیں۔'' ۳۳

ڈپٹی نذیر احمد کے عہد میں یہ رسمیں صرف دہلی ہی میں نہیں بلکہ کم وبیش پورے ہندوستان کے مسلم معاشرے میں جاری تھیں۔جن میں بعض رسومات آج بھی رائج ہیں۔ ذات پات کی تقسیم ،اونچ نیچ ،سماجی نابرابری کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔نذیر احمد بھی سماج کی اس بے جا تقسیم اور تفریق کے خلاف تھے۔اسلام نے اخلاق وکردار کی بنیاد پر شرافت کا جو معیار قائم کیا ہے وہ اس کی حمایت کرتے نظر آتے ہیں ۔کم سنی کی شادی معاشرے میں عام تھی۔نذیر احمد کم سنی کی شادی کو معاشرتی زندگی کے لیے مفید نہیں سمجھتے تھے لہذا وہ اس کی مخالفت کرتے نظر آتے ہیں۔''فسانۂ مبتلا'' میں انہوں نے کم عمری کی شادی کے برے نتائج پیش کیے ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد عقد بیوگان کے پُر زور حامی تھے جب کہ اس وقت کا معاشرہ ہندوستانی تہذیب کے زیر اثر عقد بیوگان کو عیب قرار دیتا تھا۔اسلامی اصولوں کے پیش نظر ،سماجی حالات کو بہتر بنانے کے لیے نذیر احمد نے عقد بیوگان کی پُر زور حمایت کی۔''ایامیٰ'' کا موضوع یہی ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد تعداد ازدواج کے قائل نہیں تھے۔وہ ایک شادی کو ہی معاشرے کے لیے بہتر سمجھتے تھے۔دو شادیوں کے برے انجام کو انہوں نے اپنے ناول ''فسانۂ مبتلا'' میں پیش کیا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد نے ازدواجی زندگی کو خوش گوار بنانے اور تجرد کی زندگی نہ اختیار کرنے کی تلقین کی ہے اور مسلمانوں کو کاہلی ،سستی اور آرام طلبی ترک کرنے کا مشورہ دیا ہے اور عمل کے لئے ابھارا ہے۔اس لیے کہ ان کی بے عملی سے معاشرے میں جمود پیدا ہو گیا اور ترقی رک گئی تھی اسے دور کرنے کی کوشش کی ہے ۔مسلمانوں کو ترقی حاصل کرنے کے لیے تجارت کی ترغیب دی ہے۔ان کا ماننا تھا کہ جب تک مسلمان تجارت کی طرف راغب نہیں ہوں گے اس وقت تک معاشرہ ترقی نہیں کرسکتا۔مغربی قوموں کی ترقی تجارت سے ہوئی۔لہذا مسلمان قوم کو کاہلی اور آرام طلبی کو ترک کر کے تجارت میں لگ جانا چاہئے۔تبھی ترقی ممکن ہے۔

## ڈپٹی نذیر احمد کے تعلیمی نظریات کا مابعد نوآبادیاتی مطالعہ

ڈپٹی نذیر احمد سخت گیر مولوی تھے۔وہ مذہبی تعلیم کو ضروری سمجھتے تھے لیکن اس میں بے جا قدامت

پرستی اور نری مولویت سے انہیں نفرت تھی۔ وہ صرف مدرسے کی تعلیم کو انسان کے لیے نامکمل سمجھتے تھے۔ وہ مغربی علوم و افکار کو مسلمانوں کے لیے اہم سمجھتے تھے۔ وہ ایسی تعلیم کے حامی تھے جس میں تعلیم سے زیادہ تربیت شامل ہو۔ نذیر احمد لکھتے ہیں:

> ''گورمنٹ کو ایسی تعلیم دینی چاہئے جس میں تعلیم سے زیادہ تربیت شامل ہو۔ اور بی اے اور ایم اے کی جگہ یا اس کے بعد انجینئری، ڈاکٹری، ایگریکلچر، باٹنی، طبیعات، جیالوجی جن کے ذریعے سے صنعت اور دست کاری اور ایجاد کی قدرت حاصل ہوتی ہے سکھائی جائے۔ ہندوستان میں یورپ کی طرح صنعت و حرفت کے اسکول کھول دئے جائیں اور جتنی ضرورت کی اشیاء باہر سے آتی ہیں وہ ہمارے ملک میں تیار ہوں۔''[۳۴]

تعلیم سے ترقی نو آبادیاتی دور میں ڈپٹی نذیر احمد کا خواب اور مقصد تھا اور ان کے درسگاہ میں ایسی ہی تعلیم کا سبق دیا جاتا تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد تعلیم و تربیت سے سماج کو بدلنے کے حق میں تھے اور ایک ذہنی اور فکری انقلاب لانے کے خواہشمند نظر آتے ہیں۔ وہ ایک مثبت سماجی تبدیلی لانے کا ارادہ رکھتے تھے جو تعلیم کے بغیر ممکن نہیں۔ وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ ایک فرد کی زندگی، اس کی سوچ و فکر کو بدلنے میں تعلیم کا کردار بہت اہمیت رکھتا ہے۔ قومی ترقی کے ساتھ ساتھ قومی شعور کو بیدار کرنے میں وہ تعلیم کو اہمیت دیتے ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد تعلیم، ہُنر، تعلیم نسواں اور خانداں کی اصلاح اور تربیت پر زیادہ زور دیتے تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ نو آبادکاروں کی ترقی کا راز انہی باتوں میں ہیں۔ وہ انگریزوں کے تعلیم اور ترقی سے متاثر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ نذیر احمد ایک فرد، سماج اور قوم کی ترقی میں نئے افکار اور سائنسی علوم و فنون کو حاصل کرنا بہت ضروری سمجھتا ہے۔ اور ان کو یہ احساس ہے کہ ان کے تحصیل کے بغیر قوم پیچھے رہ جائے گی۔ اس لئے وہ اپنے مکتب میں ان پر بار بار بحث کرتے نظر آتے ہیں اور ہر زاویہ سے قوم کو سمجھانے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔

لہذا وہ ایسی تعلیم کے حمایتی تھے جس کے حاصل کر لینے کے بعد فارغ طالب علم ملک، قوم اور معاشرے کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید اور کارآمد ہو سکے۔

ڈپٹی نذیر احمد نے اصلاح معاشرہ کی مہم میں مذہب کو بنیاد بنایا اور مذہب کے مثبت پہلو کو اجاگر کر

کے عیوب سے پاک معاشرے کی تمنا کی ۔سارے عیوب ایک ایک کر کے گنایا اور کہا کہ اگر یہ ساری برائیاں معاشرے سے دور ہو جائیں تو یہ معاشرہ صالح بن سکتا ہے ۔نذیر احمد کی اصلاحی کوششوں کا معاشرے پر خاطر خواہ اثر ہوا۔

ڈپٹی نذیر احمد کے ناول کے کردار صاف طور پر دو تہذیبوں کے ٹکراؤ کی کہانی بیان کرتے ہیں ۔ ہندو اور مسلمان دونوں ہی ملک پر نوآبادکاروں کے تسلط سے چھٹکارا چاہتے تھے اور اپنے اپنے طور پر تنظیمیں بنا رہے تھے جو ہندوستانی عوام کو بیدار کریں ۔غلامی کی لعنتوں سے روشناس کرائیں اور انگریزی کے طور طریقوں، رہن سہن، کھانے پینے اور پوشاک کی خرابیوں کو بیان کر کے ان سے نفرت پیدا کرنے کی راہیں ہموار کریں۔ڈپٹی نذیر احمد نے بھی اپنے ناول انہیں مقاصد کو سامنے رکھ کر لکھے۔

عالمی مسائل میں نوآبادیاتی نظامِ حیات کی تشکیل و تعمیر بھی مطالعہ کا ایک اہم موضوع ہے ۔نوآبادیاتی نظام حکم ومحکوم، فاتح ومفتوح قوم اس صورت حال کا نام ہے جس میں حاکم طبقہ محکوم قوم کو اپنا غیر تصور کرتے ہوئے اس سے اس طرح معاملہ کرتا ہے جس میں وہ خود کو بہتر و برتر اور محکوم قوم کو حقیر و کم تر سمجھتا ہے۔یہ نوآبادکار یا حاکم طبقہ اپنے محکوم طبقہ کے طرزِ حیات کو بے معنی قرار دیتے ہوئے اپنی مقتدرہ حیثیت کی بنا پر اپنے تصورات کو اعلیٰ، افضل اور قابل قبول بنا کر پیش کرتا ہے ۔نوآبادیات کی تعریف بیان کرتے ہوئے مظہر مہدی لکھتے ہیں:

> ''نوآبادیات حاکم اور محکوم کے قدیم اور روایتی رشتے کے برعکس اس نئے رشتے کا نام ہے جو کوئی غیر ملکی حکمراں طبقہ ایسے لوگوں کے ساتھ قائم کرتا ہے جو اس کے نزدیک کس ملکی یا طبقاتی امتیاز کے حامل نہیں ہوتے ۔اس رشتے کی رو سے یہ محکوم آبادی نوآبادی کہلاتی ہے اور یہ حکمراں طبقہ پوری محکوم نوآبادی کا استحصال کرتا ہے اور وہاں کی معیشت کے تابع بنا کر اپنے مقاصد کے حصول کی ہر ممکن سعی کرتا ہے۔'' ۳۵

ہندوستان میں نوآبادیات کو ممکن اور مستحکم بنانے کے لیے نوآبادکاروں نے جو تدابیر اور حکمت عملیاں اختیار کیں، انھوں نے ہندوستانی قوم کے مختلف شعبہ حیات پر گہرے اثرات قائم کیے۔انھوں نے اس تصورِ حیات کو فروغ دینے کے لیے مقامی افراد کی شناخت کو مٹانے یا منقلب کرنے، ان کے علوم

،زبان،ادب،تہذیب،ثقافت،معاشرت،مذہب وعقائد کے بارے میں مصنوعی تصورات عام کیے جس سے نہ صرف اس قوم کے تابناک ماضی اور علمی و ادبی سرمائے کو مٹانے کی کوشش کی گئی بلکہ انھیں قابل ِاصلاح قرار دیتے ہوئے نئے پیمانوں کے مطابق اپنا محاسبہ کرنے کی طرف مائل کیا۔ چناچہ ہندوستان میں اصلاح پسند طبقے نے مغرب کو معیار قرار دیتے ہوئے علوم وادب،تہذیب وثقافت،مذہب وعقائد کی نئی نئی تعبیریں بیان کیں۔

نوآبادکار کے نزدیک ہندوستانی قوم کے علوم،افکار،تہذیب،معاشرت اور ادب ہر شعبے میں اصلاح کی ضرورت تھی۔جس کا وسیلہ انھوں نے انگریزی تعلیم کو قرار دیا۔گویا یہ نئی تعلیم وہ بنیادی محرک تھی۔جس کے ذریعے مسلمانوں کی معاشرت،مذہب اور اخلاق کی اصلاح کی جاتی تھی،اور یہی اصلاح ان کی ترقی کی راہ ہموار کرنے والی تھی۔اس طرح ہندوستان میں مغربی تہذیب اور مغربی علوم کے ذریعے نہ صرف فکری،تہذیبی اور تعلیمی سطح پر تبدیلی آئی بلکہ ہندوستان کو اپنے تحفظ وارتقاء کے لیے سامراجی نظام کی پیروی کرنا ضروری ہوگیا۔پرسیول اسپئیر کا خیال ہے کہ:

''دربار مغلیہ کے خاتمے کے بعد ہندوستانی معاشرے میں تعلیم کا مطلب انگریزی زبان سے معمولی واقفیت حاصل کرلینا اور تہذیب کا مطلب مغربی طرز زندگی کی کورانہ تقلید ہوکر رہ گیا تھا۔'' ۳۶

یہ امر پیش نظر رہے کہ نوآبادیات کے استحکام اور نوآبادیاتی معاشرے کی تقلیب میں سب سے مؤثر حربہ تعلیم وتربیت کا تھا۔ہندوستان میں اس نظام کے مطابق جو نصاب تیار کیا گیا وہ برطانوی سامراج سے مرعوبیت اور اثر انگیزی کا نتیجہ ہے۔مشرقی علوم کے مقابل علوم عقلیہ کی تحصیل پر زور دیا گیا کیوں کہ اب یہی علوم انسان کی ترقی اور اس کی معاشی کفالت کا ذریعہ تھے۔پروفیسر قاضی جمال حسین اس اقدام کا محاکمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عقلیت اور حقیقت پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ ذہنوں کو اگر بدلتی ہوئی دنیا کا احساس نہ دلایا گیا اور انھیں زندگی کے مطالبات و نئے حقائق سے ہم آہنگ نہ کیا گیا تو قوم زندگی کے اس دوڑ میں بہت پیچھے رہ جائے گی گویا نظامِ حیات کی اس نئی بساط پر تعمیر و ترقی کے لیے اس کے اصول و معیار پر اترنا ناگزیر ہے۔چناچہ ہوا یہ کہ جدید افکار و

اقدار کے لئے ہمیں اپنے اصولوں سے مفاہمت کرنی پڑی۔ خارجی و مادی راحتوں
کی خاطر اپنے مسلک زندگی ونشان راہ سے ہٹنا پڑا اور اس طرح بالآخر ہمارا معنوی
وجود خطرے میں پڑ گیا۔'' ۳۷

برصغیر کے مصلحین میں برطانوی نوآبادکار سے مرعوب حلقے نے اس کا گہرا اثر قبول کیا۔ انھوں نے نوآبادیاتی نظام میں آقا اور غلام کے درمیان اتحاد و یگانگت پیدا کرنے کے لیے مغربی طرزِ حیات سے مناسبت کو ناگزیر قرار دیا سرسید اور ان کے رفقاء کار نے مغربی خطوط کی روشنی میں ادب وعلوم میں اصلاح کی تحریک شروع کی۔ انھوں نے مشرقی نظم حیات کے مقابل مغربی طرزِ فکر کی برتری کو تسلیم کرلیا تھا اور یہ نقطہ نظر کی ایسی تبدیلی تھی جس نے مشرقی نظام تعلیم، تہذیب اور ادب کے ہر شعبہ کے روایتی اوصاف و امتیازات کو بے اعتبار کر دیا۔ سرسید اور ان کے رفقاء نے ہندوستانی نظم حیات کی تشکیل نو کا کام انجام دیا۔ انھوں نے اپنی تعلیم، تہذیب، مذہب، معاشرت اور ادب میں ایک مصالحتی رخ اختیار کیا۔ اور مشرق کے ادبی تصورات کو غیر معیاری قرار دیتے ہوئے کلیتاً مغرب کے ادبی تصورات کو رائج کرنے کی کوشش کی۔ محمد حسن عسکری اپنے مضمون 'پیروی مغرب کا انجام' میں مغرب سے اخذ و استفادے کی صورت حال کے متعلق حالی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''جو چیز ایک ادب کو دوسرے ادب سے الگ کرتی ہے وہ طرز احساس کا فرق ہے۔ لیکن حالی کے زمانے میں لوگوں نے پیروی مغرب کے معنی یہ سمجھے کہ چڑیوں اور پھولوں پر نظمیں لکھی جائیں کیونکہ مسٹر ورڈز ورتھ بھی یہی کرتے تھے۔ یا پھر شاعری کے ذریعے لوگوں کا اخلاق درست کیا جائے کیونکہ یہ میکالے نے کہا ہے۔۔۔ غرض حالی کے زمانے سے لے کر آج تک ہمارے یہاں پیروی مغرب اس طرح ہوئی ہے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہمارے ادب سے ہر قسم کے معیار بالکل ہی غائب ہو گئے۔ ہمارے نقاد کہتے رہے ہیں کہ ہمارے پاس جو کچھ تھا وہ بھی گنوا بیٹھے ہیں۔۔۔ پیروی مغرب کے صرف ایک ہی معنی ہو سکتے تھے اور یہ کہ ہم مغرب کا طرز احساس قبول کرلیں۔ لیکن ہم نے تھوڑی دیر کے لیے رک کے یہ بھی نہیں سوچا کہ ہمارا طرزِ احساس کیسا تھا اور اس میں کوئی تبدیلی آئی یا نہیں۔'' ۳۸

شعروادب کے سلسلے میں یہ امرملحوظ نظر رہے کہ نوآبادیاتی نظام نے اپنی سیاسی ضرورتوں کے تحت مشرقی ادب کے تصورات متعین کیے اور ہمارے ادب کی شعریات کو رد کر کے مغربی ادب کو مفید وتوانا قرار دیا۔مغرب کے اصولِ نقد کو معتبر اور آفاقی قرار دیتے ہوئے مشرقی ادب کی نئی نئی تعبیریں بیان کی گئیں ۔اس سے ان کا ایک مقصد جہاں ہندوستانی ادب وثقافت کو مسترد کر کے اپنے ادب وثقافت کو بہتر و برتر ثابت کرنا تھا وہیں ان کا ایک بڑا مقصد ہندوستانیوں کی ذہنی واختراعی قوت کو سلب کر کے اپنا پابند بنانا تھا ۔لہذا مشرقی شعروادب کو بیہودہ ،لغو اور مخرب اخلاق قرار دیا اور اس مجرد ایقان کو حقیقت میں بدلنے کے لئے انھوں نے ادب کے افادی پہلو پر زور دیا اور شاعری ونثر میں حقیقت کی ترجمانی پر اصرار کیا کیونکہ ان کی ضرورت کی مناسبت سے مغرب میں ادب کا یہی تصور ہے۔

مغرب پرستی میں اردو شعروادب کی تفہیم وتعبیر کا واحد طریقہ مغربی اصولوں کو سمجھا گیا اور مشرقی ادبی وتہذیبی روایات کو ناقص اور غیر معیاری قرار دیا گیا مغرب سے استفادہ کا یہ رجحان اردو زبان وادب کے لیے کس حد تک کار آمد تھے اس پر سوالیہ نشان لگایا گیا ایک حلقہ صاف صاف کہنے لگا کہ جزوی خصوصیات کے اخذ واستفادہ تک تو کوئی حرج نہیں لیکن ادب کا بنیادی تصور ہر زبان کے اپنے لسانی و معاشرتی امتیازات سے مرتب ہوتا ہے۔اس سلسلے میں پروفیسر قاضی افضال حسین کا یہ بیان قابلِ ذکر ہے کہ:

> ''متن کی قرأت یا اس کی تقدیر کے ایسے اصول ممکن ہی نہیں ،جن کی رو سے ہر زبان اور ہر زمانے کے ادب کا محاکمہ کیا جا سکے۔مزید یہ کہ اگر ادب کے اصول آفاقی نہیں ، بلکہ ہر زبان ، ہر معاشرہ اور بعض صورتوں میں مخصوص زمانی عرصہ کی اپنی فکری وفنی ترجیحات سے نمو کرتے ہیں تو ان میں کوئی ترجیحی ترتیب قائم ہی نہیں ہوسکتی۔یعنی کسی ایک زبان یا ادبی روایت کے اصول دوسری زبان یا روایت کے اصولوں سے برتر یا فروتر نہیں ہوسکتے۔'' ۳۹

نوآبادیات نے فکر وتہذیب کے دوسرے شعبوں کی طرح ادب کی اصلاح کے لیے بھی بعض بنیادی اصول مقرر کیے۔اس میں کلام کو فطرت سے قریب کرنے کی تلقین کی گئی۔اس میں کوئی بات خلاف عقل یا قیاس بیان نہ ہو بلکہ ادب کا مواد فطرت کے تجربے پر مشتمل ہونا چاہیے۔لہذا مشرق کے ادبی

سرمایہ کا احتساب کرتے ہوئے مغربی نظریہ ادب کو واحد معیار نقد قرار دیا۔اور ہمارے شعری ،ادبی اور تہذیبی سرچشموں کو خشک اور ساقط الاعتبار ثابت کیا گیا۔اس پس منظر میں شمیم حنفی ان ادبی اصلاحات کا محاکمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قومی تعمیر اور معاشرتی اصلاح کے جوش میں یہ سمجھ لیا گیا کہ ہماری پرانی شعریات کا دائرہ نئی تہذیبی ضرورتوں کے حساب سے شاید ناکافی ہے۔یہ سچائی نظرانداز کر دی گئی ہماری کلاسیکی شعریات میں اور پیش رو ادبی روایت میں اخلاقی مضامین باندھنے کی روش عام رہی ہے اور زندگی یا کائنات کی کوئی حقیقت ایسی نہیں جس کے بیان کی گنجائش عہد قدیم سے عہد وسطیٰ تک کی ادبی تاریخ ناپید رہی ہو۔۔۔مشرق کی مجموعی ادبی روایات اور شعریات میں انسان اور اس کی کائنات سے متعلق حقائق کی تفتیش ،تفہیم اور تعبیر کا جو چلن صدیوں سے جاری تھا،اس کے پیش نظر مغرب کے تنقیدی تصورات بہت کم مایہ تھے۔لیکن مغربی علوم وافکار اور طرزِ احساس کا جادو ایسا پھیلا کہ ہم اپنی معاشرتی ترجیحات اور امتیازات سے بخوشی دست بردار ہونے لگے۔'' ۴۰

متن کی تشکیل میں اس معاشرے کے تصور کائنات کو بنیادی حیثیت حاصل ہے جس کی رو سے فن پارہ کسی مخصوص معاشرے میں بامعنی بنتا ہے۔اور اسی کے ذریعے اس متن کے حسن وقبح کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔لہذا ہند اسلامی معاشرے کے تصور کائنات کے سبب داستان میں فوق الفطرت عناصر اور محیر العقول واقعات کی روداد داستانوں کا امتیازی وصف ہے وہیں مغربی معاشرے کے تصور کائنات کے سبب ناول میں واقعہ خیالی وفرضی ہونے کے باوجود ناممکن الوقوع نہیں ہوسکتا۔انسانی منطق وفہم کے مطابق اس کا وقوع پذیر ہونا لازمی ہے۔چونکہ فارسی اور اردو ادب اس اصول کے تحت تخلیق بھی نہیں کیا گیا تھا اس لیے اس بنیادی شرط کی مثالیں مغرب میں تلاش کی گئیں۔ناول کا پودا،مغرب سے لاکر محکوم قوم کی زمین میں لگایا گیا۔اس میں واقعہ کا تصور،ترتیب اور ان کا مقصود،سب نئے اور حاکم کی سیاسی ضرورتوں کے پابند تھے۔نوآبادیاتی نظامِ حکومت نے مشرقی ادب،تہذیب اور تصور کائنات کو مہمل،خلاف عقل اور مخرب اخلاق قرار دیتے ہوئے نئی طرز کی کتابیں لکھوائیں۔نوآبادکار نے مغربی نظریہ حیات کو تشکیل دینے کے لیے متعدد علمی وادبی اداروں کو سیاسی حربے کے طور پر استعمال کیا۔اور اسی نقطۂ نظر کے تحت تیار کردہ ان تخلیقات

میں 'باغ و بہار' اور 'فسانۂ آزاد' جیسی کتابوں کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ مشرقی معاشرے میں مغربی تصور کائنات کی اشاعت کے لیے نئے طرز کے قصوں میں 'ناول کی صنف کو فروغ دیا گیا اس کے متعلق پروفیسر عقیل احمد صدیقی، ایڈورڈ سعید کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مغرب میں ناول کا ارتقاء جس نہج پر ہوا ہے اس سے یہی لگتا ہے کہ یہ صنف بنیادی طور پر ''اسلامی تصور کائنات کی دشمن ہے۔'' ۴۱

اردو ادب میں ناول انگریزی ادب کی دین ہے اور اس پر مغربی فکر و ادب کے اثرات نمایاں ہیں ۔کولونیل معاشرہ میں اس صنف کے ارتقا اور قبول عام ہونے کی وجہ یہی تھی۔ یہ نوآبادیاتی نظام حیات کی عکاس و ترجمان تھی۔ اس ضمن میں علی عباس حسینی انگریزی میں صنف ناول کے بنیاد گزار ڈینیل ڈفو کا تذکرہ کرتے ہیں کہ وہ فن ناول نگاری میں دو باتوں کے التزام کو ضروری خیال کرتا ہے، ایک تو یہ قصہ گو کو حقیقت نگار ہونا چاہیے دوسرا یہ کہ اسے کوئی نہ کوئی اخلاقی سبق دینا چاہیے۔

ڈپٹی نذیر احمد اور ان کے متبعین نے اسی طرز پر ناول نگاری کی بنیاد رکھی۔ ان کے زیرِ اثر لکھے جانے والے ناولوں کی غرض و غایت ان کے مقدموں اور دیباچوں سے بخوبی ہوتی ہے کہ ان مصنفین نے اپنی ان تخلیقات کے ذریعے تعلیم، ترقی اور اصلاح کا جو تصوّر پیش کیا وہ نوآبادیاتی حکمرانوں کے وضع کردہ اصولوں کے مطابق تھا اور اس کے ذریعے کولونیل معاشرہ سے ارتباط اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی ۔ان مصنفین نے اپنے عہد کے تقاضوں کے مطابق اپنی علمی، تہذیبی اور معاشرتی صورت حال کو بدلنے اور اس کے ذریعے اپنے وجود کو باقی رکھنے کی کوشش کی۔

ناول کا آغاز استعماری حکمرانی میں ہوا جو کسی صورت استعماری مفاد سے الگ نہیں ہوسکتا۔ اردو ادب میں صنف ناول کی ابتدا ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں سے ہوتی ہے جو واضح طور پر مقصدی اور اصلاحی قصے تھے اور جس میں تعلیم، تہذیب اور ترقی کا نیا تصور پیش کیا گیا۔ نذیر احمد ایشیائی لٹریچر کے سخت مخالف تھے۔ اس لیے کہ یہ خیالی اور مبالغہ آمیز بیانات کے سبب ان خیالات کو پیش کرتا ہے یا ان جذبات کو تحریک دیتا ہے جو مخرب اخلاق ہیں۔ انھوں نے نہایت بے باکی سے اپنے خیالات کا اظہار کیا:

''علوم قدیمہ میں لٹریچر کا سخت مخالف ہوں ۔مسلمانوں میں ایز اے نیشن ( بحثیت قومی ) جتنی خرابیاں کل تو نہیں اکثر اسی لٹریچر نے پیدا کی ہیں ۔ یہ لٹریچر جھوٹ اور خوشامد سکھاتا یہ لٹریچر ۔۔۔موجودات کی اصلی خوبی کو دباتا اور مٹاتا ۔۔۔ یہ لٹریچر توہمات اور مفروضات بے اصل کو فیکٹس ( واقعات ) بناتا ۔ یہ لٹریچر نالائق ولولوں کو شورش دلاتا ۔۔۔انگریزی پڑھنے سے اتنا تو ہوا کہ مجھ کو اپنے ہاں کے لٹریچر کے عیوب معلوم ہونے لگے مگر میں وہی کا وہی رہا۔'' ۴۲

ڈپٹی نذیر احمد اپنے دور کے محرکات ور جحانات اور معاشرتی پس منظر کے تحت ادب میں انقلابی تبدیلی کے خواہشمند تھے ۔انھوں نے جدید خیالات وافکار کی نشر واشاعت کے لیے نیا اسلوب وآہنگ اختیار کیا۔ جو اصلاحی واخلاقی نقطۂ نظر کے ساتھ ساتھ واقعیت وافادیت کا بھی حامل تھا۔انھوں نے اپنے ناولوں میں زبان وبیان کا وہی طریقہ اختیار کیا جو نوآبادیاتی نظام کے وضع کردہ اصولوں کے مطابق تھا ۔ناصر عباس لکھتے ہیں:

''ایک تو نذیر احمد کی 'قصہ گوئی' کو معاصر عہد میں قابلِ قبول ہونے کے لئے وہ زبان اور محاورہ اختیار کرنا پڑا جو دیسی زبانوں میں 'حقیقت نگاری' کی مثال ہو۔دوسری طرف انھیں اپنے ناولوں کا معنیاتی نظام ان خیالات وتصوّرات پر استوار کرنا پڑا جن کا ناک نقشہ اور جن کی ضرورت وافادیت نوآبادیاتی حکمرانوں کے وضع کی تھی ۔'' ۴۳

انیسویں صدی کے وسط میں انگریز حکومت نے مختلف صوبوں میں جدید نظام تعلیم رائج کرنے خصوصاً تعلیم نسواں کی غرض سے نئے طرز کے مدارس قائم کئے ۔اس تعلیمی مشن کے تحت محکمۂ تعلیم کے حکمرانوں کی رہنمائی میں نہ صرف علمی تصانیف کے ترجمے ہوئے بلکہ ان نئے مدارس کی نصابی ضروریات کے تحت خاص قسم کی کہانیاں رکتابیں لکھوائی گئیں ۔نذیر احمد خود اس نظامِ تعلیم کے پروردہ اور اس کے قدرداں تھے ۔دوسرے زمانۂ ملازمت میں محکمۂ تعلیم سے وابستگی کے سبب ان تعلیمی واصلاحی سرگرمیوں سے بخوبی واقف تھے جو نوآبادیاتی حکمرانوں کے پیش نظر تھے اور وہ خود بھی اس قسم کی ترمیم واصلاح کے حامی ومبلغ تھے ۔لہذا انھوں نے شعوری طور ایسے قصے لکھے جو اس نظام فکر کی مقصدیت وافادیت سے اس درجہ مطابقت رکھتے تھے ،انھیں ان کے تین ناولوں پر یکے بعد دیگرے سرکاری انعام واکرام سے نوازا گیا

۔گویا نذیر احمد کے ناول ان مقاصد کی ترجمانی کر رہے تھے جو نئے مدارس کے درسی نصابات کے ذریعے تشکیل پا رہے تھے۔

مرأۃ العروس (۱۸۶۹ء) اردو کا پہلا انعام یافتہ ناول ہے جسے ڈپٹی نذیر احمد نے اصلاحی مقصد کے پیش نظر لکھا۔انھوں نے دیباچہ میں ناول کی وجہ تخلیق یہ بیان کی ہے کہ اپنی بچیوں کو پڑھانے کے لیے ایسی کوئی کتاب موجود نہیں تھی جو اخلاق و نصائح سے بھری ہو۔یہاں وہ نہ صرف مشرقی طرزِ حیات کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں بلکہ اس کی خرابیوں اور خامیوں کی نشاندہی بھی کرتے ہیں جس کی ایک مثال طبقہ نسواں کو جاہل، توہم پرست اور بے اخلاق قرار دینا ہے۔جب کہ یہاں مذہبی کتابوں کے ذریعے عورتوں کی تعلیم و تربیت کا رواج ملتا ہے۔لیکن یہ تعلیمی نظام نذیر احمد کے مقاصد کے مطابق نہیں تھا۔یہاں دراصل ناول نگار کا مسئلہ صرف لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کا نہیں ہے بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ لڑکیاں نوآبادیاتی نظام کے استحکام میں کس طرح معاون و مددگار ثابت ہوں۔

اس ناول کا واضح مقصد یہ نظر آتا ہے کہ ہندوستان میں انگریز حکومت قائم ہونے کے بعد نوآبادکاروں کی عمل داری میں جو نئی اسامیاں قائم ہوئیں، ان پر کام کرنے کے لیے رفتہ رفتہ ایک نوکری پیشہ نچلا متوسط طبقہ وجود میں آ رہا تھا۔اس نچلے متوسط طبقے کی ایک متعین تنخواہ تھی اس طبقے کی لڑکیوں کو اپنی معاشی بنیادی حدود کے اندر رہنے کے ہنر کو ڈپٹی نذیر احمد ان کی تعلیم و تربیت بتا رہے ہیں۔چونکہ مذہبی کتابیں ان مقاصد کے تبلیغ و تکمیل کرنے سے قاصر تھیں لہذا انھوں نے اس کے مقابل انگریزی نظامِ تعلیم کے تحت اس کتاب کو انھیں خطوط پر تیار کیا جو ان نئے حاکموں کے منشا کے عین مطابق تھے۔یہی وجہ ہے کہ اس قصہ کے مرکزی کردار اکبری اور اصغری دونوں کے لیے ماحول اور توارث کے یکساں عوامل کے باوجود دونوں کی شخصیت ایک دوسرے سے متضاد دکھائی دیتی ہے لیکن اس کے باوجود ان کی شخصیت میں حد درجہ تضاد نظر آتا ہے ایک سراپا شر اور دوسری سراپا خیر کا مجموعہ ہے۔دراصل اکبری مشرقی نظم حیات کی پروردہ ہے۔اس کے برعکس اصغری پڑھ لکھ کر (نہیں معلوم ہوتا کہ اصغری نے کون کون سی کتابیں پڑھیں کہ اتنی سلیقہ شعار اور سمجھ دار ہوگئی) صرف اپنے سلیقہ سے گھر کا نقشہ بدل دیتی ہے۔گھر کا ماحول درست کرنے کے علاوہ اصغری کا دوسرا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اپنے بے کار اور قدرے آزاد مزاج شوہر کو انگریزی

نوکری دلوادی۔

''اصغری: انگریزی نوکری تلاش کرو۔

محمد کامل: انگریزی نوکری تو بے سعی وسفارش کے نہیں ملتی۔ ہزاروں لاکھوں آدمی مجھ سے بہتر بہتر مارے مارے پھرتے ہیں۔کوئی نہیں پوچھتا۔

اصغری: جولوگ نوکری پیشہ ہیں ان سے ملاقات پیدا کرو۔ان سے محبت بڑھاؤ۔ان کے ذریعے سے تم کونوکری کی خبر لگتی رہے گی اوران ہی کے ذریعے سے تم کسی حاکم تک بھی پہنچ جاؤ گے۔'' ۴۴

ہندوستان میں برطانوی سامراج کے جلو میں ہندوستانیوں پر عرصۂ حیات تنگ ہوتا جارہا تھا۔قدیم جاگیردارانہ نظام دم توڑ رہا تھا اور استعماری نظام آہستہ آہستہ اپنی ایجادات واختراعات کے ذریعے ہندوستانی زندگی پر قابض ہوتا جارہا تھا۔ڈپٹی نذیر احمد انگریزی حکومت سے متاثر و مرعوب تھے۔وہ ان حالات کے اسباب دریافت کرتے ہوئے انگریزی علوم کے سبب انگریزوں کی برکات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سارے ہندوستانیوں پر انگریز قابض ہیں۔۔۔سب کے سب پڑھے لکھے ہوتے ہیں اور اسی سے خدا نے ان کو یہ ترقی دی ہے کہ کہاں ان کی ولایت اور کہاں ہندوستان۔۔۔مگر علم کے زور سے اس ملک میں آئے۔علم ہی کے زور سے سلطنت کی اور علم ہی کے زور سے اس کو اس خوبی اور عمدگی کے ساتھ چلا رہیں کہ روئے زمین کی کسی سلطنت میں ایسا امن وانصاف اور ایسا نظام نہیں۔'' ۴۵

اس طرح وہ نہ صرف انگریزی عملداری کو سب سے بہتر و برتر حکومت تسلیم کرتے ہیں بلکہ ان کو اپنا آقا اور حاکم تسلیم کرتے ہوئے خود کو اس کا غلام بھی قرار دیتے ہیں:

''صاحب نے پوچھا: کیا آپ کا کوئی لڑکا بھی میری کچہری میں تھا؟

مولوی صاحب نے کہا: محمد کامل''

صاحب نے کہا: ''وہ تو ہمارے ساتھ آیا ہے۔وہ آپ کا بیٹا ہے؟''

مولوی صاحب نے کہا: آپ کا غلام ہے''۔ ۴۶

مولوی فاضل اور جیمس صاحب کی اس گفتگو سے محکوم طبقہ کی ذہنیت کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔اس

نظام کا سیاسی جبر محکوم طبقے پر اس درجہ مسلط ہوا کہ وہ اپنی شناخت کو مٹا کر خود کو اس کا تابعدار تسلیم کرتا ہے ۔لیکن کسی حکومت کے دست نگر رہنا الگ بات ہے اور غلامانہ ذہنیت کو پروان چڑھانا جدا حقیقت ہے۔اور یہی نوآبادیاتی نظام کی برکات وثمرات کا ایک قابل حیرت نتیجہ ہے۔اس طرح نذیر احمد انگریزی تہذیب و معاشرت کے بھی قائل نظر آتے ہیں ۔لہذا مغرب کی بے پردہ عورتوں کو مشرق کی با پردہ خواتین کے مقابلے میں حیا اور شرم کا پیکر قرار دیتے ہیں ۔دراصل اس ناول میں کوئی بھی واقعہ محض واقعہ قرار نہیں دیا جاسکتا بلکہ اس کے ذریعے وہ فضا تیار کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس میں مشرق کا ہر فرد جاہل، بدطینت اور بدتہذیب ثابت کیا جاسکے۔چونکہ نوآبادیاتی نظام نے حاکم ومحکوم طبقے میں یہ حد فاصل قائم کی کہ ہندوستانی توہم پرست ،غیر مہذب ،ناشائستہ ،جاہل اور کٹھ حجت قوم ہے ۔اس کے برعکس انگریز تعلیم یافتہ ،مہذب ،شائستہ ،باسلیقہ،عقل منداور ترقی یافتہ قوم ہے۔

## ڈپٹی نذیر احمد کے مکتب میں سائنس کی تعلیم

لہذا ڈپٹی نذیر احمد اور بشمول دوسرے اصلاح قوم نے اس تفریق کے تناظر میں محکوم طبقہ کی تعلیم و اخلاق کی اصلاح کا کام انجام دیا اور عہد نو کے تقاضوں اور اخلاقی ومعاشرتی خرابیوں کو دور کرنے کے لئے سائنسی علوم وفنون اور علوم جدیدہ پر زور دیا۔ان کا ماننا تھا کہ ہندوستانیوں کو چاہیے کہ وہ ''علم و ہنر حاصل کریں جس سے دنیا و عاقبت دونوں درست ہوں'' ۴۷۔ یہاں علم و ہنر سے مراد مشرقی علوم نہیں ہیں اس لیے کہ ان کا خیال تھا کہ:

> ''علم ہندوستان سے بالکل اٹھ گیا ہے اور جو ہے وہ جہل سے بدتر ناحق کی کٹھ حجتی اور جھوٹی شاعری کے سوائے ہندوستان میں کچھ اور بھی نہیں۔'' ۴۸

وہ مشرقی علوم کو مسترد کرتے ہوئے علم کی یہ تفسیر بیان کرتے ہیں:

> ''علم وہ باتیں ہیں جو کتابوں میں لکھی ہیں ۔حساب ،جغرافیہ،تاریخ،طبیعات ،طب ،صرف ونحو،منطق ،ہندسہ،ریاضی وغیرہ۔۔۔تمام تر علموں کا نتیجہ یہ ہے کہ۔۔۔کوئی چیز جو دیکھو اس کی حقیقت اور کوئی بات جو سنو اس کی وجہ سوچنی چاہیے۔'' ۴۹

اس طرح نذیر احمد انگریزی علوم کی نشر واشاعت کے ذریعے سائنسی فکر پیدا کرنا چاہتے تھے۔ان

کے مطابق علم عقل کی غذا ہے اور علم سے مراد ہیں سائنسی علوم جسے وہ دین و دنیا کی درستگی کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔اس لیے کہ قدیم علوم غیر افادی ہیں اور اس کے مقابل انگریزی علوم مفید و بکار آمد ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

''جو علم بکار آمد ہیں انگریز سب سے زیادہ جانتے ہیں اسی علم کے زور سے وہ نادر کلیں ایجاد کی ہیں اور آئے دن ہوتی چلی جاتی ہیں کہ سن کر عقل دنگ ہوتی ہے۔دنیا کا تمام کام کلوں سے لیا جاتا ہے۔کلیں سوت کاتیں۔کلیں کپڑے بنیں اور کلیں آٹا پیسیں کلیں کتابیں چھاپیں، کلیں باجے بجائیں، کلیں لوہار بڑھئی کا کام دیں بلکہ کلیں وہ کام کریں جو آدمی سے نہ ہو سکے۔'' ۵۰

## حقوقِ نسواں اور ڈپٹی نذیر احمد

ڈپٹی نذیر احمد نہ صرف انگریز قوم اور انگریزی علوم کے دلدادہ تھے بلکہ ان کو تمام روئے زمین میں سب سے زیادہ دانش مند، مہذب اور شائستہ قوم قرار دیتے ہیں۔لہٰذا اس قوم کی طرز معاشرت سے واقفیت پیدا کرنے کے لئے ایک انگریز خاندان کے حالات ہندوستانیوں کے لیے بطور نمونہ پیش کیے گئے ہیں کیونکہ نذیر احمد چاہتے تھے کہ اس طرز حیات کی تقلید و پیروی کی جائے یا اسے اپنا آئیڈیل بنایا جا سکے۔اس ضمن میں ہندوستانی معاشرے میں مسلمان عورتیں اظہار رائے کی آزادی، خلع کا حق اور عقد ثانی وغیرہ ان تمام حقوق سے محروم قرار دیتے ہوئے اس نظام حیات پر جا بجا تنقید کی ہے۔مثلاً انگریز خاتون کے ذریعے مغربی طرز حیات کے مقابل مسلمانوں کے طرز معاشرت پر اعتراض کرتے ہیں کہ:

''ہم لوگوں میں یہ بہت اچھا طریقہ ہے کہ شادی لڑکا لڑکی کی رضا مندی سے ہوتی ہے۔میں نے کتابوں میں پڑھا ہے کہ رضا مندی آپ لوگوں کے مذہب میں بھی شرط ہے مگر دیکھتی ہوں کہ اس کا برتاؤ کچھ بھی نہیں ہوتا۔'' ۵۱

نو آبادیاتی نظام میں محکوم طبقے کا اپنے آقاؤں سے مطابقت و مناسبت اختیار کرنا ضروری تھا لہٰذا اس طبقے کی اصلاح کے لیے معیاری نمونہ اپنے حاکموں کا طرز حیات تھا۔ڈپٹی نذیر احمد نے انھیں کے بتائے ہوئے طرز حیات کے مطابق اپنے معاشرے میں اصلاح و ترمیم کی کوشش کی۔ان کے ناولوں میں عورتوں کی تعلیم کا معاملہ ہو یا آزادی نسواں کا، اچھی بیوی کی صفات یا بچوں کی عمدہ تربیت کا، انتظام و انصرام کی عمدگی کا ہر جگہ حاکم طبقے کو مثالی نمونہ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔اپنے دوسرے ناولوں کی طرح وہ ناول

''فسانۂ مبتلا'' میں مسلمانوں کی اخلاقی ومعاشرتی زوال کو پیش کرنے کے لیے عورتوں کے موروثی حقوق کو تلف کر لینا، نکاح کے معاملہ میں اظہار رائے کی آزادی کا نہ ہونا اور بیوہ کے نکاح ثانی کی ممانعت وغیرہ ہندوستانی مسلمانوں کی مختلف سماجی برائیوں کی نشاندہی کرتے ہیں اور اس ضمن میں وہ مغربی معاشرت کی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر چنبیلی کی زبانی بیان کرتے ہیں کہ:

''ہم لوگوں میں مرد دوسری بی بی نہیں کر سکتے۔ اور مرد اور عورت دونوں کے حقوق کو تولا جائے تو شاید عورت ہی کا پلہ جھکتا ہوا رہے گا۔'' ۵۲

ڈپٹی نذیر احمد عورتوں کے حقوق کے حامی اور لڑکیوں کی گھریلو تعلیم وتربیت کے نہ صرف طرفدار ہیں بلکہ اس کے لیے وہ اپنے ناولوں میں مدلل بحث بھی کرتے ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد اس قصے میں نہ صرف انگریز قوم اور ان کے طرز بود و باش کو تحسین آمیز قرار دیتے ہیں بلکہ انگریزوں کے ساتھ اختلاط پر بھی زور دیتے ہیں۔ اس طرح نذیر احمد نے قصے میں انگریز خاندان کے عادات واطوار کو اس انداز میں پیش کیا ہے کہ انگریز خاندان کی حسن معاشرت اور اخلاق کو دیکھ کر حلیمہ کی ماں (ناول بنات النعش کا کردار) اس درجہ متاثر ومرعوب ہوتی ہے جس سے نو آبادیاتی طبقے کی ذہنیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

'' آگ لگے اس ملک کو جس میں ہنر کا نام نہیں ہم لوگ شہر میں بڑے سلیقہ شعار کہلاتے تھے مگر سچ یہ ہے کہ ہنر اور سلیقہ آپ لوگوں پر ختم ہے۔ غرض میم صاحب سے ہو کر گھر آئے تو جدھر آنکھ پڑی تھی ہر چیز حقیر اور بھونڈی نظر آتی تھی۔'' ۵۳

## مغرب پرستی

ڈپٹی نذیر احمد نے قومی اصلاح اور معاشرتی تعمیر میں مغرب کو اپنا آئیڈیل بنایا۔ اس مغرب پرستی کی بنا پر اس طبقے کی بے حد مخالفت ہوئی۔ مخالفت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انھوں نے اپنے ماضی کے احیاء و مراجعت کی کوشش نہ کی بلکہ مشرق کے مسلمہ اقدار وروایات اور مروجہ علوم کو متروک قرار دیتے ہوئے مغربی علوم واقدار کو اختیار کرنے پر زور دیا۔ جب کہ مشرق ومغرب کی تہذیب ایک دوسرے سے مخالفت بلکہ بعض معاملات میں متضاد ہیں۔ اشپنگلر کے مطابق:

''ایک کلچر دوسرے کلچر کا طرز احساس مستعار لے نہیں سکتا۔ اس کے خیال میں تو ہر کلچر

زمان ومکان کا ایک مخصوص تصوّر رکھتا ہے۔اور اسی سے اس کے طرزِ احساس کا تعین ہوتا ہے۔یہ ایسی چیز نہیں، جو کسی اور کلچر کو منتقل کی جا سکے۔ ہر کلچر اپنے اظہار کے لیے مخصوص شکلیں پیدا کرتا ہے جو اسی کے ساتھ مر جاتی ہیں یہ کسی اور کلچر کے کام نہیں آسکتیں بلکہ دوسرے کلچر والے اسے سمجھ تک نہیں سکتے۔'' ۵۴

اس دور کا اصلاح پسند طبقہ قوم کی قلب ماہیئت کا خواہاں تھا۔انگریزی تمدن اختیار کرنے سے ان کا مقصد قومی تعصّبات کو گھٹانا اور انگریزوں سے میل جول بڑھانا تھا۔لہذا ڈپٹی نذیر احمد کے ناول ''ابن الوقت'' میں شاہ کردار ابن الوقت کی تبدیلیٔ وضع ،اعلیٰ تمدن ،عمدہ معاشرت اور باعزت زندگی کے حصول کی شعوری کوشش ہے۔اس طرزِ معاشرت کی قبولیت سے اس کا مقصد حکمران قوم سے مناسبت و برابری کا درجہ حاصل کرنا ہے۔ابن الوقت کا کردار انگریزی خواں طبقے کی داستانِ حیات کو پیش کرتا ہے۔یہ انگریزی وضع وقطع کے ذریعے اپنے آپ میں ''جنٹلمین'' بن گیا۔لیکن انگریز حکمران نیٹو قوم سے برابری کی سطح پر ملنا جلنا اپنی حاکمانہ شان کے خلاف سمجھتے تھے۔انگریز حاکم شارپ کے رویے سے نوآبادیاتی حاکموں کی ذہنیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

''یہ لباس ہمارا قومی شعار ہے اور اگر کوئی ہندوستانی ہمارے جیسے کپڑے پہنے تو ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری نقل کرتا ہے یا ہم کو چھیڑتا ہے اور چڑھاتا ہے۔کوئی ہندوستانی ہمارے لباس کو جس میں اس کو کسی طرح کی آسائش نہیں بے وجہ اختیار کرے گا اور سوائے اس کے کہ اس کے دل میں ہمارے ساتھ برابری کا داعیہ ہو اور کیا وجہ ہو سکتی ہے؟۔۔۔ہم اپنی رعیت کو جسے ہم نے بہ زورِ شمشیر زیر کیا ہے کیوں اپنی برابری کرنے دیں گے؟'' ۵۵

محکوم طبقہ نہ صرف اس جھوٹ کو سچ تسلیم کرتا ہے بلکہ اس کو حق بجانب بھی سمجھتا ہے۔مثلاً حجتہ الاسلام کا بیان:

''بڑائی تو خدا کی ہے مگر خدا نے آپ لوگوں کو دنیاوی بڑائی دی ہے تو آپ کی چیزوں میں بھی بڑائی کی شان دی ہے یہاں تک کہ لباس میں تو بلاشبہ جو اس لباس کو پہنے گا لوگوں کی نظر میں بڑا دکھائی دے گا۔'' ۵۶

ابن الوقت نے شعوری طور پر مغربی طرز تمدن کو اختیار کیا اور اس نظام حیات سے مکمل طور پر مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ لیکن نوآبادیاتی نظام میں حاکم ومحکوم میں یکساں موانست کا پیدا ہونا ممکن نہ تھا۔ اس طرز کے متعلق ژاں پال سارتر لکھتا ہے:

''کوئی شخص جرم کا مرتکب ہوئے بغیر اپنے جیسے انسانوں کو نہ غلام بنا سکتا ہے، نہ لوٹ سکتا ہے اور نہ قتل کر سکتا ہے۔ اس لیے وہ نوآبایاتی حکمراں یہ اصول وضع کرتے ہیں کہ دیسی باشندہ ہمارے جیسا انسان نہیں، ہماری فوجوں کے سپرد یہ کام ہے کہ وہ اس مجرد ایقان کو حقیقت میں بدل دیں۔ انھیں یہ حکم دیا جاتا ہے کہ مفتوحہ ملک کے باشندوں کو 'بالاتر بندروں' کے درجہ پر پہنچا دیا جائے۔ تاکہ نوآبادکاران سے بار برداری کرانے کو جائز قرار دیا جا سکے۔ نوآبادیات میں تشدد کا استعمال محض اس لیے نہیں ہوتا کہ ان کی انسانیت ختم کر دی جائے۔ اس بات کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے کہ ان کی روایات کو مٹا دیا جائے۔ ان کی زبان کی جگہ اپنی زبان رائج کی جائے اور ان کی تہذیب کو اپنی تہذیب دیے بغیر برباد کر دیا جائے۔'' ۵۷

نوآبادکار نے اپنے مقبوضہ اور جبری حکومت کی ترقی و بقا کے لیے ہندوستانیوں کا حد درجہ اقتصادی ومعاشی استحصال بھی کیا۔ انگریز حکومت کی سخت گیری اور نئے نظام زیست کے سبب حاکم ومحکوم میں کسی طرح کی مناسبت نہیں رہی۔ برطانوی حکومت نے صنعت وحرفت کو متاثر کیا۔ علوم جدیدہ، سائنس اور ٹکنالوجی کو قومی وملکی ترقی کا ذریعہ قرار دیا گیا لیکن یہ مشینی صنعت اہل حرفہ میں بے روزگاری کا سبب بنی۔ ڈپٹی نذیر احمد انگریزی علمداری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عام لوگ جن کی معلومات کا دائرہ تنگ ہے اور جن کو سوچنے اور غور کرنے کی عقل نہیں سب کے سب بالاتفاق کہتے ہیں کہ انگریز کی عملداری میں امن ہے، انصاف ہے، زور نہیں، مگر خدا جانے کیا بات ہے اگلے وقتوں کی سی خیر و برکت نہیں۔'' ۵۸

انگریز حکمرنوں نے بعض زرعی اصلاحات کے تحت انتظام مالگزاری کو زیادہ مؤثر بنانے کی کوشش کی لیکن اس نظام کی بدولت زمینداروں اور کاشتکاروں کی حالت زبوں تر ہو گئی۔ ابن الوقت انگریز حکام کو متوجہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

''رعایا اور سرکار کا تعلق من وجہ بندے اور خدا کا تعلق ہے۔ یہاں انصاف سے کام نہیں چلتا بلکہ رحم و رعایت سے۔ سرکار کو قرار دار جمع کرنے میں ایک سود خوار بنیے کی طرح دمڑی اور ادھی ادھی کا حساب نہیں کرنا چاہیے تھا۔''۵۹

برطانوی استعمار، ہندوستانی قوم کے علوم و ادب تہذیب و معاشرت پر ہی اثر انداز نہیں ہوا بلکہ اس نے ان مذاہب و عقائد میں اصلاح و ترمیم کی کوشش کی۔ ناول توبتہ النصوح میں ڈپٹی نذیر احمد نے انھیں اثرات کے تحت مذہبی اصلاح کے پیش نظر ناول تخلیق کیا۔ سر ولیم میور نے اس کتاب کی افادیت کو تسلیم کرتے ہوئے اسے اہالیان یورپ کے لیے مسلمانوں کی خانگی حالات سے آگاہی اور واقفیت کا ذریعہ قرار دیا اور اسے ''کوئی امر متعلق تعصب مذہب یا ایسا کہ غیر مذہب والوں کو ناگوار ہو'' داخل نہ ہونے کے سبب اوّل انعام کا مستحق بتایا۔ سر ولیم میور اور میتھو کیمپسن نے ناول شائع ہونے سے پہلے حاشیہ پر اصلاح کی غرض سے کچھ ہدایات بھی لکھی تھیں۔ نذیر احمد نے حسب منشا ان صاحبان کے اس میں اصلاحات کیں۔

ناول توبتہ النصوح میں مذہبی اصلاح کے ذیل میں قرآن و حدیث یا کسی مذہبی کتاب کا ذکر نہیں ملتا۔ بلکہ یہ کام پادری کے ذریعہ دی گئی سنہری جلد والی کتاب سے انجام پاتا ہے اور اس کتاب کے مطالعے سے ناول کا کردار کو ایک نئی آگہی نصیب ہوتی ہے۔ کہتا ہے:

''اس کتاب کے پڑھنے سے مجھ کو معلوم ہوا کہ میرا طرز زندگی جانوروں سے بھی بدتر ہے، اور میں روئے زمین پر بدترین مخلوق ہوں۔'' ۶۰

ڈپٹی نذیر احمد نے یہ ناول یورپی حاکموں کے حسب منشا اور سرکاری انعام کے اشتہار کی شرائط کے مطابق ترتیب دیا تھا۔ لہٰذا ناول میں کردار کے شاعرانہ کمالات کا اعتراف کرنے کے باوجود اسے اس کا سبب سے بڑا عیب قرار دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کیمپسن نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''مصنف نے جوان دنوں کے شاعروں کی تحقیر لکھی ہے وہ اسی لائق ہیں۔''۶۱ چنانچہ انگریزی نظام میں یہ کمالات عیب بن جاتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ کسی جبری نظام کی اطاعت و بندگی کے قائل نہیں بلکہ اپنی ذہنی آزادی کو برقرار رکھتے ہیں۔ کلیم پر اس نظام کے برخلاف ہونے کے سبب عرصۂ حیات تنگ ہو جاتا ہے۔ وہ حصولِ معاش کے لیے دربدر کی ٹھوکریں کھاتا ہوا دولت آباد پہنچتا ہے جو دربارِ عیاشی میں ضرب المثل تھا لیکن حکومت

انگریزی کے سبب اس کے اختیارات ایک کمیٹی کو دیے جا چکے تھے۔ یہاں وہ شاعری کو ذریعہ معاش بنانے کی کوشش کرتا ہے۔لیکن شاعری کے متعلق یہ خیالات پیش کیے جاتے ہیں کہ ''ایسے مضامین میں اشتغال وانہماک رکھنے سے ذہول وغفلت، استحسان لہوولعب، اختیار مالایعنی کے سوائے کچھ اور بھی حاصل ہے'' ۶۲ گویا سرکار انگریزی کے ماتحت انتظامی کمیٹی کے صدر اعظم کے یہ خیالات نہ صرف شاعری کے بے وقعتی و ناقدری کو پیش کرتے ہیں بلکہ فن شاعری کے ساتھ ساتھ خدمت شاعری کے خاتمے کا بھی اعلان کرتے ہیں۔ چنانچہ کلیم کو یہ اطلاع دی جاتی ہے کہ ''انتظام جدید کے مطابق ریاست میں کوئی خدمت شاعری باقی نہیں۔'' ۶۳

اس طرح کلیم بحیثیت شاعر اس ریاست میں جگہ حاصل نہیں کر سکا لیکن ایک فوجی اور شورہ پشت سپاہی کے طور پر اسے عزت ومنصب عطا کیا جاتا ہے اس لیے بقول کیمپسن ''ہم شاعروں کو نہیں چاہتے ہم کو کام کے آدمی چاہئیں جو مالگزاری کی تحصیل کے وقت ان لڑاکے ٹھاکروں سے لڑائی بھڑائی کو خیال میں نہ لاویں۔'' ۶۴ اور جن کے ذریعے انگریزی نظام کو استحکام حاصل ہو۔ یہی وجہ ہے کہ کلیم جو مشرقی تہذیب وثقافت کا نمائندہ ہے وہ اس نظام کا ناکام پرزہ تھا اس لیے وہ ناکام ونامراد رہ جاتا ہے۔کلیم کے انجام کے ذریعے جہاں مشرقی نظام حیات کے زوال کو پیش کیا گیا ہے وہیں سامراجی نظام کی اطاعت میں اس کی نجات کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔کلیم کا یہ انجام منشائے مصنف کے عین مطابق ہے۔ چنانچہ ناول کے آخر میں اس معتوب کردار کی ناکامی کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ نئے نظام کے تربیت یافتہ افراد کی کامیابی و ترقی کا ذکر بطور مثال کیا گیا ہے۔

نوآبادیاتی نظام میں وہ طبقہ جو اس طرز حیات سے مطابقت نہیں رکھتا مجہول قرار دیا جاتا ہے ۔ہندوستان پر برطانوی سامراج کے مسلط ہونے کے بعد ان کی نوازش ومہربانی حاصل کرنے کے لیے ان کی حاکمیت کو قبول کرنا ضروری تھا لیکن مسلمانوں میں ایک طبقہ ایسا تھا جو اس جبری نظام کا قائل نہیں تھا جس میں مولوی وعلماء کرام شامل تھے۔لیکن نذیر احمد نے وقتی مصلحت کے تحت خود کو محکوم ونااہل قرار دیتے ہوئے ان کی اطاعت وفرماں برداری کی تعلیم دی۔ نذیر احمد اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ عوام اپنے مذہبی معاملات میں علماء کے مقلد اور ان کے پابند تھے۔ چونکہ عوام کے مولویوں پر اس انحصار کے سبب قوم

کی ترقی وتعمیر کے لیےضروری تھا کہ پہلے خود مولوی حضرات کی اصلاح کی جائے ۔ڈپٹی صاحب قومی وملی انحطاط کا سبب انھیں مولویوں کو سمجھتے تھے۔

ڈپٹی نذیر احمد انگریزی سامراج سے مرعوب تھے ۔انھوں نے مشرق کے مقابل مغربی علوم و افکار کی روشنی میں ہندوستانی قوم کی تعمیر وترقی اور اصلاح وتجدید کی کوشش کی ۔جس کی مثالیں ان کے ناولوں سے پیش کی جا چکی ہیں ۔ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے ناولوں بلکہ اپنی دوسری تصانیف،تقاریر،خطابت اور شاعری کے ذریعہ جو نظام حیات تشکیل دیا وہ مغرب سے مرعوبیت اور اثر انگیزی کا مثالی نمونہ تھا جسے نہ صرف انھوں نے برضا ورغبت قبول کیا بلکہ ہندوستانیوں کی ترقی وبقا کے لیے ایک ناگزیر حقیقت کے طور پر پیش کیا۔اردو ادب میں نذیر احمد کے تتبع میں کثرت سے اس طرز پر ناول لکھے گئے ۔اوران مصنّفین کے پیش نظر یہی اصلاحات تھیں جن کا خاکہ نوآبادکار نے تیار کیا۔ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کے نہج پر تیار کی گئی دوسری تصانیف کا مطالعہ وتجزیہ بھی اسی نقطۂ نظر کے ساتھ کیا جاسکتا ہے ۔اوراس کے ذریعے اپنے علوم ،اپنی زبان،ادب،تہذیب،ثقافت اوراپنی اصل کی بازیافت کی جاسکتی ہے جسے نوآبادیاتی نظام میں مسخ کر دیا گیا۔ڈاکٹر نعیم احمد اس مطالعے کی ضرورت کے متعلق لکھتے ہیں:

''استعماریت کا مطالعہ اپنی نوعیت میں دراصل ان حربوں اورحکمت عملیوں کا مطالعہ ہے جن کی مدد سے یورپی ملکوں کا دنیا کے بڑے رقبے پر قبضہ ممکن ہوااوراس قبضے نے ایسے ہمہ گیر اثرات ان ملکوں کی ثقافت،معاشی ڈھانچے،سیاسی طریقہ کاراور زبان و ادب پر چھوڑے کہ آزادی حاصل کرلینے کے باوجود بیشتر ملک نہ تو اپنی منفرد شناخت قائم کرپائے ہیں اور نہ ہی ان اثرات سے پوری طرح نکل پائے ہیں۔'' ۶۵

ڈپٹی نذیر احمد مشرقی ثقافت اور طرزِ معاشرت کو عزیز رکھتے تھے۔ان کو اپنے وطن کی ہر چیز سے محبت تھی۔ان کو مغربی تہذیب پر اعتراض تھا لیکن وہ دوجذبیت سے متاثر نظر آتے ہیں کبھی وہ مغرب کی پیروی کرنے کو کہتے اور اس کے مخالف بھی نظر آتے ہیں ۔ان کی یہ نوآبادیاتی فکر اور سوچ ان کے تمام ناولوں میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے ۔اس کے بارے میں ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی لکھتے ہیں:

''وہ مشرقیت کے دلدادہ اور مغربیت کے سخت مخالف ہیں۔ان کی یہ نفسیات ان کے تمام ناولوں مین جاری وساری نظر آتی ہے۔'' ۶۶

## نوآبادیاتی عہد میں ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں فکری رجحانات

نوآبادیاتی دور میں اگر فکری حوالے سے دیکھا جائے تو تنقید اور تخلیق دونوں میں نوآبادیاتی فکر کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔تنقید میں مولانا محمد حسین آزاد کی نظم آزاد کی بحث کے ساتھ ساتھ مولانا الطاف حسین حالی کی پیروی مغربی تو اک ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں۔اس کے علاوہ سرسید احمد خان کا کردار نوآبادیاتی فکر کی ترویج کے حوالے سے کسی تعارف کا محتاج نہیں۔تخلیق اور خاص طور پر ناول نگاری پر نوآبادیاتی فکر کے اثرات کے حوالے سے دیکھا جائے یہاں متنوع فکری رجحانات ملتے ہیں۔

نوآبادیات کے زیر اثر پروان چڑھنے والے ادب میں شروع میں ہی اک عجیب صورت حال پیدا ہوئی۔مغرب جو کہ صنعتی انقلاب کے ثمرات سمیٹ چکا تھا اس کی فکر کی نقالی کرتے ہوئے ادب تخلیق کرنے کی کوشش خاصی مضحکہ خیز ثابت ہوئی کیونکہ برصغیر میں تو صنعتی انقلاب آیا تھا نہ ہی نئے سرمایہ دارانہ نظام کی ابتدا ہوئی تھی اس کی بجائے یہاں کا معاشرہ اپنی قدیم مذہبی اور تہذیبی اقدار کو اپنائے ہوئے تھا،نوآبادیاتی دور کی ادبی صورت حال پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر علمدار حسین بخاری لکھتے ہیں:

> ''یورپی تعلیمی اور تہذیبی اداروں اور نوآبادیاتی استعمار کی ضرورتوں کے تحت جو نئی ادبی اصناف سامنے لائی جا رہی تھیں وہ صدیوں کی مستحکم مقامی ادبی اور تہذیبی روایات اور اصناف سے مختلف تھیں اس لئے شروع میں مغربی اصناف ادب کی نقالی اور چربہ سازی سے زیادہ کچھ نہیں تھیں،اس لیے ہندوستانی اہل دانش کے ساتھ ساتھ خود برطانوی لوگوں کو بھی کافی کچھ مضحکہ خیز لگتی تھیں۔'' ٦٧

نوآبادیاتی عہد میں اردو ادب خاص طور پر ناول نگاری میں فکری حوالے سے جو رجحانات سامنے آئے،ان میں سے اہم رجحان اسلامی فکر کا تھا۔برصغیر کا معاشرہ صدیوں سے اسلامی تہذیب وتمدن کا گہوارہ رہا تھا،مسلم حکمرانوں کے ادوار میں یہاں اسلامی ثقافت اور اسلامی طرز بود و باش کو کافی فروغ ملا،مساجد کی تعمیر میں بھی خصوصی دلچسپی لی گئی اور اس دور میں تعمیر ہونے والی مساجد اسلام کے ساتھ عوام الناس اور حکمران طبقہ کی گہری وابستگی کا مظہر ہیں۔مغلیہ دور حکومت میں تعمیر ہونے والی مساجد جہاں ایک طرف اسلامی شعائر سے محبت کو واضح کرتی ہے وہاں دوسری طرف فن تعمیرات کا بھی منہ بولتا ثبوت ہیں

۔اسلامی تہذیب وتمدن سے گہری وابستگی کا ہی نتیجہ تھا کہ نوآبادیاتی عہد تک آتے آتے اسلامی تہذیب و تمدن اور اسلامی فکر کی جڑیں اس علاقے میں گہری ہو چکی تھیں یہی وجہ ہے کہ نوآبادکاروں کے تمام تر خوش نما حربوں کے باوجود لوگوں اور خاص طور پر ادیب طبقہ کے اذہان سے اسلامی فکر کو ختم نہ کیا جا سکا، زمینی حالات اور اپنی بقا کی خاطر ذہنی طور پر انگریز کی غلامی اختیار کرنے والوں کے ہاں بھی شعوری اور لاشعوری طور پر ایسے عناصر دکھائی دیتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ نوآبادیاتی عہد میں تخلیق ہونے والے ادب پر اسلامی فکر کے گہرے اثرات ہیں۔

اردو ادب اور خاص طور پر اردو ناول نگاری میں اسلامی فکر کے حوالے سے نوآبادیاتی دور کا مطالعہ کیا جائے تو اس دور میں تخلیق ہونے والے بیشتر ناول اسلامی فکر کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ نوآبادیات کے اس دور میں ایک مضبوط طبقہ ایسا بھی موجود تھا جو مغربی نوآبادکاروں کے مقابلہ میں اسلامی طرز زندگی کے احیاء اور اسلامی اقدار کے فروغ کا داعی تھا، ادیب چوں کہ معاشرے سے متاثر ہوتا ہے اور معاشرے کے اثرات ادب پر لازمی طور پر پڑتے ہیں اس لئے اس مذہبی طبقے کی موجودگی میں اس وقت کے معاشرے میں مذہبی اقدار اور اسلامی طرز زندگی کے اثرات واضح طور پر ملتے ہیں اور یہی اسلامی فکری اثرات شعوری اور لاشعوری طور پر اس عہد کے ناول نگاروں پر بھی چھائے رہے ،اس کے علاوہ بعض ادیب ایسے بھی تھے جو ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ خود عالم دین، مفسر اور مذہبی طبقے سے تعلق رکھنے والے تھے۔اس لئے ان کے ہاں اسلامی فکر کی عکاسی ہونا ایک فطری عمل ہے، ایسے ادباء میں سرفہرست ڈپٹی نذیر احمد ہیں جنہیں اردو ناول نگاری کی ابتداء کا شرف حاصل ہے۔ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں اسلامی فکر کی عکاسی واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کا تعلق ایک مذہبی طبقے سے تھا، ڈاکٹر سہیل بخاری لکھتے ہیں:

> ”نذیر احمد مولوی اور حافظ ہونے کے ساتھ ساتھ مفسر قرآن بھی تھے، اس لئے ان کے
> تمام ناولوں میں مذہب اور تعلیم اخلاق پر زور ہے۔“٦٨

ابن الوقت (١٨٨٨ء) ڈپٹی نذیر احمد کا معروف ناول ہے۔اس ناول میں ایسے لوگوں کی کہانی ملتی ہے جو نوآبادکاروں کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ کو دیکھتے ہوئے اس سے وقتی طور پر فائدہ اٹھانے کی

کوشش کرتے ہیں، ابن الوقت کا ہیرو انگریز سے فائدہ حاصل کرنے کے لیے اس حد تک آگے بڑھ جاتا ہے کہ اپنی مذہبی اور سماجی روایات کو بدلنے پر آمادہ نظر آنے لگتا ہے، تمام تر پیروی مغربی کے باوجود اس ناول میں اسلامی فکر کی عکاسی واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔ وہ دور جب اسلامی سلطنت کا وجود پارہ پارہ ہو چکا تھا، مسلمان مفلوک الحال ہو چکے تھے۔ نو آبادکاروں کی طاقت اور اثر و رسوخ میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا اس وقت بھی ڈپٹی نذیر احمد اسلام کو ایسا مذہب قرار دیتے نظر آتے ہیں جو سپاہیانہ خصوصیات کا حامل ہے، ابن الوقت سے اقتباس ملاحظہ ہو:

''میں ان کے مذہب کو (آپ معاف کیجئے گا) سپاہیانہ مذہب خیال کرتا ہوں ، میرے نزدیک ہر مسلمان مذہباً سپاہی ہے۔'' ۶۹

اسی طرح ''ابن الوقت'' کے مذہبی خیالات ڈپٹی نذیر احمد کی زبانی سنئے:

''پانچوں وقت جامع مسجد کی اول جماعت کی تکبیر تحریمہ ناغہ نہیں ہونے پاتی تھی اور تہجد اور اشراق کے علاوہ تحیۃ المسجد، صلوٰۃ التسبیح، منزل فیل، دلائل الخیرات، ضرب والبحر اور خدا جانے اور کتنے وظائف، جمعے کے دن کبھی اس کے گھر جانے کا اتفاق ہوا تو پہر دن چڑھے سے نماز جمعہ کی تیاری ہو رہی ہے۔'' ۷۰

ڈپٹی نذیر احمد نے سماجی اصلاح کا جو بیڑہ اٹھایا تھا اس کا لازمی نتیجہ یہ ہی نکلتا تھا کہ وہ اسلامی طرز زندگی کو رواج دیں، یہی وجہ ہے کہ ان کے بیشتر ناول اسلامی فکر میں رنگے نظر آتے ہیں ''فسانہ مبتلا'' ان کا ایک اور معروف ناول ہے۔ ابن الوقت کی طرح اس ناول میں بھی جا بجا اسلامی فکر کے نمونے دکھائی دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جل شانہ کے قبضہ قدرت کے بارے میں خیالات ملاحظہ ہوں:

''اگر خدا نہ چاہے تو کیا بندے آپ سے آپ پیدا ہو جائیں اور اپنے اختیار سے زندگی بسر کریں، ایسا خیال کرنا تو کفر کے علاوہ غلط صریح بھی ہے۔ بندے بھلے اور بُرے، امیر اور غریب، قوی اور ضعیف، حاکم اور محکوم، بادشاہ اور رعیت، یہاں تک کہ ولی اور پیغمبر سب کے سب اس قدر عاجز اور بے اختیار ہیں کہ بدون خدا کی مرضی کے ایک پتا ہلانا چاہیں تو نہیں ہلا سکتے۔ ایک ذرے کو جگہ سے سرکانا چاہیں تو نہیں سرکا سکتے۔'' ۷۱

اسلامی فکر کی عکاسی کے ساتھ ساتھ نوآبادیاتی عہد میں ڈپٹی نذیر احمد کی ناول نگاری کے جو فکری رجحانات سامنے آئے ان میں اصلاحی فکر کو اہم مقام حاصل ہے۔اس دور میں جب باشندگان برصغیر نوآبادکاروں کے شکنجے میں جکڑتے چلے جارہے تھے اور نوآبادکار کی پالیسیوں کی وجہ سے اخلاقی اقدار اور سماجی روایات بھی دم توڑ رہی تھیں تو ایسے میں بعض ایسے ادیب بھی تھے جو ادب کے ذریعے معاشرے کی اصلاح کا بیڑہ اٹھاتے نظر آتے ہیں۔اصلاح کی یہ کوشش کہیں تو ملکی سطح پر پائے جانے والی استعمار زدگی کے حوالے سے ہیں اور کہیں یہ گھریلو زندگی حتیٰ کہ ایسی رسومات کے حوالے سے ہیں جو وقت اور پیسے کی بربادی کا سبب بنتی ہیں۔

اصلاحی نقطہ نظر کے حوالے سے لکھنے والوں میں ڈپٹی نذیر احمد بھی شامل ہیں،ان کے ناولوں میں فضول رسومات کی مذمت اور ان سے بچنے کی تلقین واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہے،اس کے علاوہ ان کے ہاں عورتوں کی تعلیم وتربیت کے ذریعے اصلاح معاشرہ کا رجحان بھی ملتا ہے۔ان کے ناول ''مراۃ العروس '' اور ''بنات النعش'' اس حوالے سے خاص اہمیت کے حامل ہیں۔جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ استعمار کاروں نے استعمار زدگان کے اذہان کو تبدیل کرنے کے لئے جو لائحہ عمل مرتب کیا تھا،اس وقت کے ادیب نہ صرف اس کے مضر اثرات سے آگاہ تھے بلکہ وہ محکوم طبقے کی گھریلو اور سماجی اصلاح کو بھی اپنا مقصد بنائے ہوئے تھے تاکہ محکوم ہوتے ہوئے بھی یہ قوم اپنی مذہبی اور اخلاقی اقدار سے بغاوت نہ کر پائیں اور معاشرہ میں مذہبی اور اخلاقی اقدار کی جڑیں مضبوط رہیں،مگر یہ بھی حقیقت ہے نوآبادکاروں نے جس طرح برصغیر کی تہذیب وثقافت اور یہاں کے باشندگان کے ذہنوں پر یلغار کی اس میں بہت سے ادیب بہتے چلے گئے اور اصلاحی نقطۂ نظر کی بجائے اردو ناول نگاری میں ایسے فکری رجحانات سامنے آنے لگے جو استعمار زدگی کی علامت قرار دیئے جاسکتے ہیں۔

نوآبادکار اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ برصغیر جیسے مذہبی اور تہذیبی گہرائی والے خطے پر بزور طاقت زیادہ دیر تک تسلط قائم رکھنا ممکن نہیں ہے،اس لئے طاقت کے ساتھ ساتھ انہوں نے اس خطے کے لوگوں کی فکر میں تبدیلی پیدا کرنے کے لیے بھی حکمت عملیاں ترتیب دیں وہ اس خطے میں ایسے لوگوں کا ایک طبقہ پیدا کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے جو ان کی ہاں میں ہاں ملانے والا تھا۔اس

طبقہ نے زندگی کے ہر شعبے میں ایسی فکر کو رواج دیا جس سے نوآبادکاروں کے مقاصد کے حصول میں آسانی پیدا ہوئی ،استعمار زدگی کا یہ عنصر انیسویں صدی میں کئی حوالوں سے سامنے آیا،ان میں مذمت ،مدحت اور مرعوبیت کی صورتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔انیسویں صدی کے بیشتر ناول نگاروں کے ہاں ایسے فکری رجحانات ملتے ہیں جن سے نوآبادکاروں کے نظریات کے پرچار کی بو آتی ہے۔

نوآبادکاروں نے استعمار زدگان کے ذہنوں کو مطیع بنانے کے لئے یہاں کی ثقافت اور رسوم و رواج کو فرسودہ اور فضول قرار دینے کی حکمت عملی اپنائی ،انھوں نے ہندوستانی ثقافت اور رسوم کے مقابلے میں استعماری ثقافت کو رواج دینے کی سعی کی ، ہندوستانی ثقافت اور رسوم کی مذمت کی جانے لگی ۔یہی وجہ ہے کہ نوآبادکار طبقہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اس دور کے بیشتر ناول نگار اپنی تمام تر اسلامی اور اصلاحی فکر کے باوجود استعماری حربوں کے آلہ کار بنے نظر آتے ہیں اور ناول نگاری میں ہندوستانی رسومات کی مذمت میں ان کے قلم رواں رہتے ہیں ۔اسلامی اور ہندوستانی رسومات کی مذمت کے حوالے سے ڈپٹی نذیر احمد کا ناول ''ابن الوقت'' خاص طور پر قابل ذکر ہے ۔پچھلے صفحات میں ابن الوقت میں اسلامی فکر کے عناصر کا بیان کیا گیا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ تمام تر اسلامی فکر کے باوجود اس ناول کا ہیرو انگریز حکمرانوں کا آلہ کار نظر آتا ہے اور انگریزی رسوم کے مقابلے میں اسلامی اور ہندوستانی رسومات کی مذمت کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے سابقہ حکمرانوں کی مذمت بھی کی گئی ہے ۔ابن الوقت میں نوبل کا بیان دیکھئے:

> ''آپ کے جہاں پناہ نے اپنے ساتھ نسل تیمور اور تمام خاندان شاہی بلکہ شہر کے برباد کر دینے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ۔انہوں نے ملک گیری کی ہوس کی جب کہ ان کو اور ان کے اعوان و انصار کو ملک داری تو کجا، خانہ داری کی بھی لیاقت نہ تھی۔'' ۲۷

ناول نگار کے خیالات فکری پسماندگی اور ذہنی غلامی کی الم ناک صورت حال کی تصویر کشی کرتے ہیں ،مندرجہ بالا اقتباس میں ایسے خاندان کو حکومتی امور کے لئے نا اہل ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس نے اس خطہ پر نہ صرف یہ کہ صدیوں تک کامیاب حکمرانی کی بلکہ پورے عالم میں اپنی قابلیت اور بہترین نظم و نسق کا بھی لوہا منوایا ،نوآبادکاروں نے صرف حکمرانوں بلکہ مسلمان اہل علم لوگوں کے بارے میں گمراہ کن تصورات کا پرچار کیا اور انتہائی جھوٹ سے کام لیتے ہوئے اسلامی علوم اور مسلمان اہل علم

لوگوں کو مغربی دانشوروں سے کم تر ثابت کرنے کی کوشش کی اس بارے میں برصغیر میں تعلیمی حوالے سے لارڈ میکالے کا نام خاص طور پر لیا جاتا ہے۔جس نے عربی اور فارسی سے اپنی ناواقفیت کا اعتراف کرنے کے باوجود عربی و فارسی اور دیگر اسلامی امور کے تمام اثاثہ جات کو مغرب کی کسی ایک الماری کی کتابوں سے بھی کم تر گردانا۔

نوآبادیاتی دور کے اس فکری جائزے سے واضح ہوتا ہے کہ اس دور میں ایک طرف تو ڈپٹی نذیر احمد اپنے اسلامی تشخص اور اسلامی روایات کو برقرار رکھنے کی سعی میں لگے تھے تو دوسری طرف استعماری پالیسیوں کے اثرات بھی ان کی فکر پر گہرے اثرات مرتب کر رہی تھیں۔نوآبادکاروں کی بڑھتی ہوئی طاقت اور اثر و رسوخ نے ادباء کے قلموں کا رخ استعماری ایجنڈے کی تکمیل کی طرف کر دیا تھا۔ذہنی پسماندگی اور فکری ردعمل کی انمٹ مثالیں اس دور کے ادب میں دیکھی جاسکتی ہیں۔اس دور میں رواج پانے والے فکری رجحانات میں مادیت پرستی اور حقیقت نگاری کی مثالیں بھی ملتی ہیں،اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر علمدار حسین بخاری لکھتے ہیں:

> ''ہندوستان میں جدید اصلاحی سرگرمیاں دراصل مغرب کے اس سیکولر تصور زیست کی پیداوار تھیں،جس کی بنیادیں یورپی نشاۃ ثانیہ کے بعد جنم لینے والی انسان دوستی اور آزاد خیالی پر استوار تھیں،اس سیکولر تصور زیست نے مغرب کی طرح مشرق میں بھی رجائیت پرستی کی ایسی لہر پیدا کر دی،جس کے سامنے غلاموں کی قنوطی اور شکست خوردہ ذہنیت پسپا ہونے لگی اور خود انسان کی پیدا کردہ برائیوں کے خلاف جدوجہد کا حوصلہ پیدا ہوا،اسی بناء پر جدید ہندوستانی ادب میں انسان کی موجود اور مادی زندگی میں دلچسپی بڑھنے لگی اور سماجی حقیقت نگاری کا رجحان پروان چڑھنے لگا۔''۳۷

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو نوآبادیات کے دور میں بہت سے فکری رجحانات ادب میں ملتے ہیں جس کی وجہ سے اس دور کے ادب میں یکسانیت کی بجائے تنوع کی صورت ملتی ہے۔متنوع فکری رجحانات کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اس دور میں ادباء متنوع خاندانی اور سماجی پس منظر کے حامل لوگ تھے۔تاریخ کے مختلف ادوار نے اس تنوع کو اور زیادہ گہرا کر دیا تھا۔اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ ادب یکسانیت کا شکار

ہونے سے محفوظ رہا۔اس دور میں چلنے والی مختلف اصلاحی اور انقلابی تحاریک نے بھی ادب کو نئی جہتوں سے آشنا کیا۔انہی نئی جہتوں نے نوآبادیات کے خاتمے کے بعد بھی اردو ادب میں تنوع کی صورت حال کو برقرار رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔

## نوآبادیاتی ہندوستان میں تعلیمِ نسواں کا علمبردار: ڈپٹی نذیر احمد

ریاست کی جدید شکل سے قبل، جسے صنعتی معیشت نے ممکن بنایا، ریاستی ڈھانچہ زرعی پیداوار اور جاگیردارانہ اقدار پر انحصار کرتا تھا۔یورپی صنعتی انقلاب نے اس سماجی ساخت کو تبدیل کیا اور سرمایہ دارانہ معاشی نظام کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے ہنرمند افراد کی تیاری کا بندوبست عام تعلیمی اداروں کے اجرا اور باقاعدہ نظام الاوقات کے تعین سے کیا۔برعظیم میں نوآبادیات کا ابتدائی دور ہندوستانی تہذیب اور اس کے مظاہر کے اعتراف کا دور جب انگریز مستشرقین کی پہلی نسل اٹھارویں صدی میں ہندوستانی زبانوں اور تہذیب کو حیرت و تحسین کی نظر سے دیکھتی ہے۔تاہم جیسے جیسے نوآبادیات کے قدم جمتے ہیں، برطانیہ میں لبرلزم عام ہوتا ہے اور ہندوستان میں نوآبادکاروں کی ضرورتیں بڑھتی ہیں، ویسے ویسے ہندوستانی تہذیب کے بارے میں نوآبادکاروں کی رائے میں تحقیر اور یہاں کی آبادی کو اپنے مقاصد کے تحت تعمیر کرنے کی خواہش زور پکڑتی ہے۔جو خوب تھا اب بتدریج ناخوب ہوا۔۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی استعماریوں اور مقامیوں ہر دو کو مفاہمت کی راہ تلاش کرنے پر تیار کرتی ہے۔ایک کا مقصد دوبارہ ایسی بغاوت کی روک تھام، دوسرے کے پیشِ نظر اپنی پوزیشن بحال کرنے کا سوال ہے۔ایسے عالم میں شمالی ہندوستان سماجی اصلاح کی مختلف تحریکوں کا گھر بنتا ہے جن میں ایک تعلیمِ نسواں ہے۔اسے لوگوں کے فکری مکالمے کا حصہ بنانے میں ناول نے بھرپور حصہ لیا۔ان مباحث کی ضرورتوں میں نوآبادیات کا براہِ راست حصہ ہے ۔مقامی آبادی کو اپنے مقاصد کے تحت تعمیر کرنے اور اپنے نظام کا کل پرزہ بنانے کے لیے نوآبادکاروں نے ہندوستان میں اصلاحی منصوبوں پر زور دیا۔ہندوستانیوں کو جدید خطوط پر استوار کرنے کا بیڑہ اٹھایا گیا ۔جس کے ردِعمل میں ہندوستانی اہلِ قلم نے مختلف تحریروں میں دیسی باشندے کے سامنے اصلاح یا احیا کے مختلف رول ماڈل پیش کیے۔انھی میں تعلیمِ نسواں کے مختلف ماڈل سامنے آئے جو بدیسی حکمرانوں ،استعماری صورتِ حال اور مقامی سماج کی مختلف ضرورتوں کی بنیاد پر متشکل ہوئے۔آئندہ صفحات میں ان

ضرورتوں کو سامنے لاتے ہوئے ڈپٹی نذیر احمد کے ناول 'مرأۃ العروس' کا جائزہ لیں گے، جس سے شمالی ہند میں عام نسوانی تعلیم کے ابتدائی خدوخال کو سمجھنا ممکن ہو سکے گا۔

یورپ میں مڈل کلاس کا ارتقا کلیسا سے آزادی، مذہبی اجارہ داری پر سوال اٹھانے، اپنے حقوق کا شعور حاصل کرنے اور علمی دنیا میں تشکیلی رویے کے پھیلاو کی صورت میں ہوا جسے جدیدیت کا دیا گیا۔ تاہم شمالی ہندوستان کے متوسط یا اشراف مسلمانوں میں جدیدیت کی لہر نے ان رویوں کی بجائے مذہب کی روایتی اور جدید تعبیروں میں پناہ لی۔ جہاں دیگر کی بجائے دنیاوی زندگی کے مختلف شعبوں کی سمت توجہ منعطف کرنے کے باوصف شمالی ہند کے مسلمان مذہبی طرز احساس کو نظر انداز کرنے پر تیار نہ تھے۔ مذہب ان کے لیے استعماری صورتِ حال میں اپنی شناخت وضع کرنے کا ایک ذریعہ بن گیا تھا۔ یہ بات دیکھنے کی ہے کہ شناخت کی اس بنیاد کو قائم کرنے اور پختہ بنانے میں خود استعماری طرز علم کا بنیادی کردار تھا۔

یو پی میں کچہری سے وابستہ مسلم نوکری پیشہ اشرافیہ کے لیے فارسی کی بندش اور انگریزی و اردو کے نفاذ سے ایک نئی صورتِ حال نے جنم لیا۔ جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے نئے سیاسی انتظام نے پیدا کی تھی۔ مسلم اشرافیہ سے مراد وہ لوگ تھے جو مغل دربار سے منسلک رہے جنھیں جاگیریں، خلعتیں اور خطابات عطا ہوئے۔ اشراف ہونے کے لئے دوسری اور لازمی شرط نسلی شرف تھا۔ جس میں سید، شیخ، ترک اور پٹھان شامل تھے۔ یعنی اشراف کے لیے غیر ہندوستانی النسل ہونا ضروری تھا۔ نوآبادیات نے ہندوستان کے سماج، معاشی ڈھانچے اور علمی وضعیں تبدیل کرنے کے لیے متعدد تدابیر اختیار کیں۔ ان تبدیلیوں سے معاملہ کرنے کے لیے مقامی اشرافیہ نے جدید تعلیم سے قربت اور عامیوں کے لیے مذہبی تعلیم کے اجرا کی حکمت عملیاں بیک وقت اختیار کیں۔ گھر سے باہر تبدیل ہوتی دنیا کے ساتھ تعامل کے لیے محض مردوں کی تعلیم کافی نہیں تھی۔ نوآبادکاروں سے میل جول نے ملازمت پیشہ اشرافیہ کو خواتین کی تعلیم و تربیت کی طرف متوجہ کیا۔ ان تبدیلیوں کے ضمن میں مردوں نے دوہری پالیسی اختیار کی۔ گھر سے باہر کی دنیا یعنی سماج میں مغربی جدیدیت کو قبول کیا تاہم گھر کے اندر کی دنیا یعنی ثقافت میں روایت کو محفوظ کرنے اور رواجی عناصر کو اگلی نسلوں تک منتقل کرنے کا وطیرہ اپنایا۔ اس لیے سماجی اصلاح کی ہندوستانی مثال یورپی جدیدیت سے مختلف صورت اختیار کرتی ہے۔

ایسے عالم میں اشراف کے ہاں آئندہ نسلوں کی تربیتِ نو اہمیت حاصل کرگئی اور تعلیمِ نسواں کی طرف نو آبادکاروں نے بھی توجہ دلائی ۔اپنے من چاہے تصورات کو فروغ دینے اور ناپسندیدہ خیالات کی عوامی ترسیل کی روک تھام کے لیے استعماریوں نے نگرانی کا نظام وضع کیا اور مختلف انعامی سلسلے متعارف کروائے ۔عام تعلیم کے فروغ کے بنیادی اسباب میں سے ایک اور اس کی وجہ سے مہمیز حاصل کرنے والی طباعت کے نتیجے میں تحریر اور سماجی مکالمے کے نئے امکانات بروئے کار آرہے تھے ،تاہم ان پر پبلک انسٹرکشن جیسے اداروں اور سنسر شپ ایکٹ جیسے قوانین سے استعماری گرفت مظبوط کی گئی تھی ،نتیجہ ان امکانات سے چند خاص دائروں میں ہی کام لیا جاسکتا تھا۔ان امکانات میں سے چند ایک اردو ناول میں سامنے آئے ۔ یہ بات خالی از دلچسپی نہیں کہ اردو کا پہلا ناول استعماری حکومت کی طرف سے انعامی اعلان کے جواب میں لکھا گیا اور یہیں سے تعلیم وتربیت کا جدید سلسلہ شروع ہوا۔

مراۃ العروس ۱۸۶۹ء میں اصغری بہترین نسوانی رول ماڈل کے طور پر پیش کی گئی ہیاور اس کی خوبیاں اکبری کی خامیوں کے بالمقابل روشن ہوتی ہیں ۔ یہ بات یادرکھنے کی ہے کہ اس اولین ناول کے دیباچے میں تعلیمِ نسواں کی اہمیت اور اس کے مفید نتائج کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ڈپٹی نذیر احمد نے ملکہ وکٹوریہ کی مثال کا ایک سے زائد بار حوالہ دیا ہے ۔اسی کو بنیاد بنا کر خواتین کی مخفی صلاحیتوں اور امکانات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے ۔اس پر مستزاد پبلک انسٹرکشن کے ڈائریکٹر میتھیو کیمپسن نے ناول پر اپنی تقریظ میں اس کے تعلیم وتربیتِ نسواں کی ذیل میں مفید ہونے اور مستقبل میں اس کے مشہور ہونے کی نوید دی ہے ۔البتہ یہ پیش نظر رہے کہ اصغری کا باپ اس کی شادی کے موقع پر نصیحت آمیز خط میں عورتوں کی ناقص العقل ہونے کی بات کرتا ہے ۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زردو ناول کا یہ ابتدائی نمونہ سماجی فہم میں آنے والی تبدیلیوں سے ابھرنے والے رجحانات اور ثقافت کے باقی ماندہ عناصر کے درمیان چل رہی کشمکش کی نمائندگی کرر ہا تھا۔اگر ایک طرزِ فکر عورت کو ناقص العقل کہتا تھا تو دوسرا اس کی نصف جہاں پر پھیلی سلطنت کو چلانے میں مہارت کا معترف تھا۔

نو آبادیاتی حکومت کے فروغ نے نئی سماجی اور معاشی صورتِ حال پیدا کی ۔اس میں قدیم ہنر جنھیں مغل دربار میں قبولیت اور اعتراف حاصل تھا،ان کی پوچھ گچھ نہ رہی ۔شاعری،زبان دانی اور دیسی

فنون کی قدر دانی کرنے والے امرانہ رہے۔ایسے عالم میں بدیسیوں کی پسند کے مطابق خود کو ڈھالنا زندہ رہنے کے لیے لازم ہو گیا تھا۔اس ضمن میں سرکاری تعلیم اور انگریزی پسند طرزِ زندگی کامیابی کے لیے ضروری ہو گئے تھے۔سماج میں در آنے والی تبدیلی کا مطلب تھا مردوں کی دنیا کا بدل جانا۔یوں گھر کے اندر کی دنیا کو بھی تبدیلی کے لیے تیار کرنا ضروری تھا۔دوسری بات یہ کہ لڑکوں کی تربیت گھر میں ہو رہی تھی ۔یوں باہر کی بدلی ہوئی دنیا سے اگر زنانہ کی مطابقت نہ ہو تو نوخیز کے لیے اس سے مطابقت قائم کرنے میں مشکل ہو سکتی تھی۔اس لیے ماں کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری قرار پایا۔

اس میں شک نہیں ہے کہ یہاں کی عورتیں بالکل جاہل ہیں اور اکثر ان پڑھ ہوتی ہیں۔اس لیے اولاد کی تعلیم اچھی نہیں ہوتی ۔لڑکے ماؤں سے ایامِ طفولیت میں جس قدر ہلے ملے رہتے ہیں اس قدر کسی سے نہیں رہتے اور جو ماں کہ پڑھی لکھی ہوتی ہے وہ پہلے ہی سے ان لوگوں کی طبیعت پڑھنے لکھنے کی طرف رجوع اور بنیاد مستحکم کرتی ہے۔ یوں مردوں کی آئندہ جدید تربیت کے لیے تعلیم نسواں لازم آئی دوسری طرف نوآبادیات کے زیرِ اثر معاشی نظام کے بدلنے سے پیدا ہونے والی غیر یقینی نے بھی اشراف کو مجبور کیا کہ وہ بدلتے حالات کے مطابق خود کو تیار کریں ، پھر نوآبادیاتی نظام میں ملازمت کے لیے دور دراز مقامات پر بھی ٹھہرنا پڑ سکتا تھا۔جیسے مرأۃ العروس میں اصغری کا والد اور شادی کے بعد اس کا شوہر بھی ملازمت کے سلسلے میں دوسرے شہروں میں مقیم ہوتے ہیں۔ان حالات میں گھر کا نظم ونسق چلانے کی ذمہ داری بھی عورت پر آ رہتی ہے۔اصغری کا کردار اسی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔

اصغری کی صفات اور طرزِ عمل پر غور کرنے سے ان توقعات اور مقاصد کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے جن سے اس کردار نے جنم لیا۔دوسری بات اس کردار کو ناول کے پورے تناظر میں رکھ کر دیکھنا اور اس دور میں عورت کے بارے موجود تصورات کے سیاق میں اس کی تفہیم سے کئی نئے زاویے سامنے آ سکتے ہیں ۔اوپر مذکور خط میں اصغری کا والد اسے نصیحت کرتے ہوئے اس مردانہ طرزِ فکر کے بنیادی خدوخال وضع کرتا ہے جس میں اصغری کی تشکیل ہوئی ہے۔وہ سمجھتا ہے کہ حوا کو آدم کی خوشنودی کے لئے پیدا کیا گیا۔

> ''عورت کا پیدا کرنا صرف مرد کی خوش دلی کے واسطے تھا اور عورت کا فرض ہے مرد کو خوش رکھنا۔''۴۷

وہ عورتوں پر مردوں کی فضیلت کے دو سبب بیان کرتا ہے، جسمانی طاقت اور عقل۔ وہ عورتوں کی ان ڈینگوں کو بھی ناپسند کرتا ہے جس میں مردوں کو زیر بار رکھنے یا نخروں کے ذریعے مطیع کرنے پر فخر کرتی ہیں۔ اس کی دانست میں بیوی کو شوہر سے محبت کے ساتھ ساتھ اس کا ادب بھی کرنا چاہیے۔ وہ ایسی رسموں کو آڑے ہاتھوں لیتا ہے جن سے مردوں پر عورت کی برتری قائم ہوتی ہو۔ اس کی نصیحت کا مرکز یہ ہے کہ اصغری شوہر کو ہر طرح سے خوش رکھے، اتفاق اور صلح کاری، خانہ داری میں خوشی کے لیے لازمی عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں اور شوہر کا دل فرماں برداری سے رام کیا جا سکتا ہے۔ ان نصیحتوں کی مدد سے مطلوب تعلیم و تربیت کے اشارے مل جاتے ہیں۔ یہیں عورت بطور صنف بھی کچھ صفات کا تعین ہوتا ہے۔ اصغری کے کردار میں انھی خوبیوں کی جھلک ملتی ہے اس ایک فرق کے ساتھ کہ وہ عقل کی مدد سے گھر بھر کو اپنا گرویدہ بنا لیتی ہے۔ اس میں انتظام و انصرام کی صلاحیت کو تقویت اور دلیل ملکہ وکٹوریا کے کردار سے ملتی ہے۔ اس طرح ناقص العقل ہونے کے باوصف اس کی تدبیر اور حسن انتظام کی خوبیاں ان مل نہیں لگتیں۔ تاہم یہ سمجھنا چاہیے کہ اصغری کی تمام خوبیوں کا مرکز اس کے شوہر کی ذات اور اس کا گھرانہ ہے۔ وہ گھر میں ایک مدرسہ کھولتی ہے، جس کی تقریب کچھ اس طرح بنتی ہے کہ برادری کی ایک پھوہڑ رئیس زادی حسن آرا کو اصغری کی سلیقہ شعاری کا شہرہ سن کر اس کے پاس تربیت کے لیے بٹھایا جاتا ہے۔ اصغری اس ایک شاگردہ کے ساتھ اپنی نند محمودہ کو بھی تربیت دیتی ہے جس کی خبر پا کر محلے سے اور لوگ بھی اپنی بچیاں یہاں چھوڑ جاتے ہیں۔ اصغری تربیت کے شوق میں آنے والی ہر طالبہ کو اپنے مکتب میں جگہ نہیں دیتی۔ وہ شاگردوں کے انتخاب میں نسلی شرف کو معیار بناتی ہے۔

> ''حسن آرا کے بیٹھتے ہی محلے کا محلّہ ٹوٹ پڑا۔ جس کو دیکھو اپنی لڑکی کو لیے چلا آتا ہے
> اصغری نے شریف زادیوں کو چن لیا اور باقیوں کو حکمت سے ٹال دیا۔'' ۷۵

اصغری کے اس عمل اور بچیوں کی تعلیم گھر پر دینے سے کم از کم ایک بات صاف ہو جاتی ہے۔ تعلیم و تربیت کا یہ منصوبہ اپنے اندر طبقاتی امتیاز رکھتا تھا۔ اصغری کے مکتب میں جو تعلیم دی جاتی ہے وہ اشراف زادیوں کو گھر میں درپیش ممکنہ مسائل اور صورتحال کے لیے تیار کرنے کا مقصد لیے ہوئے ہے۔ قرآن، ابتدائی حساب، لکھنا، پکانا، ریندھنا اور سینا پرونا یہ وہ نصاب ہے جس کی اصغری کے گھر پر تعلیم ہوتی ہے۔

ان قابلیتوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ نصاب گھر کی چار دیواری کے اندر خانگی زندگی کو زیادہ باسہولت اور کامیاب بنانے کے لیے ترتیب دیا گیا ہے اور اس سے عورتوں کے رول کا تعین بھی ہو رہا ہے۔

نوآبادیات کے زیرِ اثر پروان چڑھنے والا یہ تعلیمی منصوبہ ہندوستانی تہذیب کے زبانی پن سے خواندگی کی طرف سفر کے حوالے سے بھی اہم ہے۔ ہندوستانی تہذیب زبانی روایت سے تعلق رکھتی تھی اور اس میں آمیخت ہونے والی مسلم روایت میں بھی کتاب کی بنیادی اہمیت کے باوصف زبانی پن کا کردار مسلمہ ہے۔ خود قرآن کو کتابی صورت بھی زبانی روایتوں سے سند لے کر دی گئی۔ زبانی روایت میں راوی کی حیثیت اساسی ہوتی ہے۔ اس کا استناد اس کی سماجی حیثیت، کردار اور تجربے سے قائم ہوتا ہے۔ دوسری بات زبانی روایت میں رواج بھی بطور سند استعمال ہوتا ہے۔ انیسویں صدی کی تبدیلیوں نے اس روایت کے استناد پر سوال اٹھانے کے لیے جو استدلال استعمال کیا وہ منطق سے زیادہ محکم حیثیت کو استعمال کرتا ہے۔ زبانی پن میں راوی یا رواج کو جو استناد حاصل تھا، وہ مقام اب مطبوعہ کتاب اور رسمی تعلیم یافتہ کو حاصل ہوا۔ جس طرح رواج کسی رسم یا طور کے مستند ہونے کی علامت نہیں اسی طرح کوئی مطبوعہ کتاب یا کسی رسمی تعلیم کے ذریعے حاصل کردہ ڈگری بھی علم کا معیار نہیں ہوسکتی۔ لیکن اگر ناول نگار کے زاویہ نظر اور کرداروں کی پیش کش پر نظر رکھی جائے تو کچھ ایسی ہی صورت برآمد ہوتی ہے۔

یہاں دو باتیں قابلِ غور ہیں۔ علم اور عقل کا تعین کرنے میں ہندوستانی آزاد نہیں رہے۔ یہ زمام اب انگریزوں کے ہاتھ میں ہے۔ وہی یہ طے کر رہے ہیں کہ علم کیا ہے۔ دوسری بات ان کی مقتدر حیثیت انھیں یہ موقع فراہم کر رہی ہے۔ نتیجہ اب وہی سرگرمیاں لائق تحسین ہیں جن کو وہ خوب قرار دے رہے ہیں۔ وہ کام جو انگلستانی لڑکیاں کرتی ہیں وہی اگر ہندوستانی کریں تو وہ بھی تعلیم یافتہ اور عاقل کہلائیں۔ اور ایسا نہ کرنے کی صورت لوگ نام دھرتے ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں بعض مقامات پر انگریزی قانون اور جغرافیے کا علم بھی بذریعہ قصہ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

اگر ناولوں میں تعلیم کی ضرورت کے بارے میں پیش کیے گئے خیالات اور غیر رسمی نصاب پر نظر کریں تو ایک نکتہ واضح ہوتا ہے کہ یہاں تعلیم، علم کی تخلیق، جاننے کے ذوق اور دریافت کے شوق کی پیداوار نہیں ہے۔ یہ چند ضرورتوں کو پورا کر رہی ہے سو اس میں افادی نقطۂ نظر غالب ہے۔ یہ چند ہنرمند

یوں کو سکھانے کے گرد گردش کرتی ہے۔اس کا مقصد انسان کے ذوقِ جستجو کو جلا بخشنا یا شوقِ تحقیق کی آبیاری کرنا نہیں ہے۔اس لیے تعلیم ایک محدود دائرہ کار کی حامل ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں یہ قدر مشترک ہے کہ تعلیم گھر پر ہو رہی ہے۔ یہاں عورت کا ایک نیا روپ سامنے آرہا ہے جس میں گھر ساز اور تربیت کار ہے۔اسے ایسے ہنر سکھائے جارہے ہیں جن سے گھر داری میں حسن سلیقہ در آئے اور نو آبادیاتی صورت حال سے پیدا ہونے والی ضرورتیں بھی پوری ہوں۔ یہ بات صاف ہے کہ تعلیم نسواں، مردانہ ضرورتوں کے تابع تھی اور بڑی حد تک آج بھی ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد تعلیمِ نسواں اور اولاد کی اچھی تربیت پر بہت زور دیتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ گھریلوں نظام کی درستگی عورت کی ذمہ داری ہوتی ہے اور اچھی تربیت سے گھر کی خوشحالی اور زندگی کامیاب ہو جاتی ہے۔ میں ڈپٹی نذیر احمد کے اس اقتباس کی طرف آپ کی توجہ کرنا چہتا ہوں جس میں وہ خواتین کی تعلیم اور بچوں کی تربیت کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

> ''مائیں تو باتوں باتوں میں وہ سکھا سکتی ہیں جو استاد برسوں کی تعلیم میں بھی نہیں سکھا سکتا۔'' (مراۃ العروس،ص۲۲)

## نو آبادیاتی تہذیب وفکر کے اثرات

یورپ میں نشاۃ الثانیہ کے بعد سے جس انسان مرکز اور عقل پرست رویوں کے تحت ایک نئے دور کا آغاز ہوا اسے اصطلاحاً جدیدیت کی تحریک کہتے ہیں۔اس اصطلاح نے کافی انتشار پیدا کیا ہے اور مختلف بلکہ متضاد معنی میں بھی استعمال کی جاتی ہے۔بیسویں صدی میں اس عقل پرستی اور حتمیت والے رویے کے خلاف یورپ ہی سے مختلف سطحوں پر آوازیں بلند ہونا شروع ہوئیں، اسے بھی جدیدیت کہا جاتا ہے۔ بظاہر یہ دونوں قسم کی جدیدت متضاد عناصر کی حامل ہے، مگر اپنی روح میں چند باتوں کو چھوڑ کر یہ ایک ہی چیز ہے۔

مابعد جدیدیت ایک دور کا عبوری نام ہے۔اس دور کی شکل وصورت ابھی پوری طرح نکھر کر سامنے نہیں آئی۔کم از کم اتنی بات تو طے ہے کہ یہ دور جدیدیت کے دور سے مختلف ضرور ہے اور جدیدیت کی بنیادی روح سے اس میں انحراف موجود ہے:

''جدیدیت نے مذہب کے بجائے عقلیت ،برادری کے بجائے انفرادیت ،روحانیت کے بجائے مادیت ،مابعد الطبیعات کے بجائے سائنس اور ترقی کو ترجیح دی جبکہ مابعد جدیدیت نے تاریخ اور سماجیات کے بجائے ثقافتی مطالعات کو زیادہ اہم قرار دیا۔'' ۷۶

اس بدلے ہوئے دور میں مصنف کے بجائے قاری نے زیادہ اہمیت حاصل کر لی ہے ۔اب ٹیکسٹ کی بجائے کنٹکسٹ زیادہ اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس طرح پوری تہذیب اور معاشرہ کا احاطہ ممکن ہو جاتا ہے۔اس کا اطلاق صرف نئے متون پر ہی نہیں ہوا بلکہ ماضی کے متون کا مطالعہ بھی ازسرِنو انہی خطوط پر کیا گیا۔اس ضمن میں سب سے اہم کام ایڈورڈ سعید کا ہے۔ان کی دو کتابوں 'شرق شناسی' اور 'ثقافت اور سامراج' نے نئے مباحث کو جنم دیا۔ایڈورڈ سعید کے مطابق نشاۃ الثانیہ کے بعد یورپ میں مخصوص حالات کے پیش نظر ''مشرق'' کا تصور ابھارا گیا۔مشرق سے نہ سمجھ آنے والا احسن وابستہ کیا گیا۔مشرق کو ایک معروض کے طور پر پیش کیا گیا جس کا مطالعہ درکار تھا۔دانشورانہ سطح پر یہ کام زبان،ادب،تاریخ،فلسفے غرض بہت سے شعبوں میں کیا گیا۔مغرب نے اپنے لیے ایک ''دگر'' other پیدا کیا۔اس 'مشرقیت' کے ذریعے مغرب نے قوت اور شناخت حاصل کرنا چاہی۔اس طرح شرق پسندی درحقیقت 'دگر' اور 'ہم' کا تنازعہ ہے۔جس کا عملی اظہار نوآبادیوں کی صورت میں پیدا ہوا۔

اسی پس منظر میں ایڈورڈ سعید نے 'ثقافت اور سامراج' میں انگریزی ناول بالخصوص کانرڈ اور جین آسٹن کا مطالعہ کیا۔ایڈورڈ سعید کے بقول ایک مخصوص ثقافت کو فروغ دینا اور دو مختلف ثقافتوں کو پروان چڑھانا سامراجی ایجنڈا ہوتا ہے۔وہ اس بات پر حیرت زدہ ہیں کہ انگریزی ناول میں انگریزی اور 'دیگر' ثقافت اتنے زوردار طریقے سے پیش کی گئی ہے کہ جسے نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے تھا۔وہ سامراج اور انگریزی ناول میں بھی ربط تلاش کرتے ہیں۔

ایڈورڈ سعید کے بقول سامراجیت اور ناول کا گٹھ جوڑ پرانا ہے۔ناول نے ثقافت کو ایک خاص رخ سے پیش کیا ہے۔ناول نے نوآبادیات کے لیے راہ ہموار کی۔دونوں نے ایک دوسرے کو تحفظ فراہم کیا۔ناول کے بیانیے میں اتنی گنجائش ہوتی ہے کہ وہ محتاط انداز سے اخلاقی،سیاسی،اقتصادی سمت بندی

کر سکے۔اس لیے ڈکنز،تھیکرے، جارج ایلیٹ،کونرڈ،جین آسٹن جیسے ناول نگاروں کے ہاں سمندر پار املاک، سستی مزدوری، گوروں اور سیاہ فاموں کی قدار میں فرق، یورپ کی برتری اور ایشیاء اورافریقہ کی پستی جیسے موضوعات فطری انداز میں درآتے ہیں۔ایڈورڈ سعید لکھتے ہیں:

''پہلی جنگ کے وقت برطانوی ایمپائر مطلق طور پر غالباً گئی تھی اور یہ سولہویں صدی کے اواخر میں شروع ہونے والے عوامل کا نتیجہ تھا۔ یہ محض ایک اتفاق نہیں ہے کہ برطانیہ نے ناول کا رواج ڈالا اور اسے قائم رکھا۔جس کا کوئی یورپی مقابل یا مساوی نہیں تھا۔کم از کم انیسویں صدی کے نصف اول میں فرانس کے پاس زیادہ ترقی یافتہ عقلی ادارے تھے۔اکیڈمیاں، یونیورسٹیاں،انسٹی ٹیوٹس، جرائدوغیرہ۔لیکن اس کمی کا ازالہ برطانوی ناول کے غلبے نے کردیا۔'' ۷۷

ہندوستان میں ۱۸۵۷ء نے ہماری سیاسی تاریخ کو ہی نہیں بدلا بلکہ ہمارے شعوراور رویوں کو بھی بدل کر رکھ دیا۔نوآبادیاتی صورت حال وضع کی گئی اور ایسا محض عسکری قوت کے بل بوتے پر ممکن نہیں تھا ۔یہ صورت حال تشکیل شدہ تھی ،نوآبادکار اپنے مفادات کوطول دینے کے لیے بہت سے اقدامات کرتا ہے ۔

نوآبادیاتی نظام ثنویت پر قائم ہوتا ہےاوراس تقسیم کا اختیار نوآبادکار کے پاس ہوتا ہے۔ایک کے اختیار میں اضافے کا مطلب دوسرے کے اختیار میں کمی ہوتا ہے۔طرزِ زندگی مشاغل ،عمارات ،تفریح ،رہائش غرض ہر شئے میں ثنویت کا اظہار ہوتا ہے۔ناصر عباس نیئر لکھتے ہیں:

''نوآبادکار اپنی شخصیت، اپنی ثقافت، اپنے علمی ورثے، اپنے سیاسی نظریات، اپنے فنون کے بارے میں جو آراء پھیلاتا ہے، وہ نوآبادیاتی دنیا کے افراد کی شخصیت ،ثقافت،علم اور رفنون کے متعلق موجود آراء کے متضاد اور انھیں بے دخل کرنے والی ہوتی ہیں۔'' ۷۸

مقامی باشندوں کے بارے میں ایک تصور خود ان پر مسلط کر دیا جاتا ہے۔انھیں بتایا اور باور کرایا جاتا ہے کہ وہ کیا تھے اور کیا ہیں۔علمی، سیاسی، ثقافتی غرض ہر طرح کی تاریخ کو خاص زاویے سے دکھایا جاتا ہے۔نوآبادکار کی برتری ثابت ہونے کے بعد نوآبادیاتی نظام کو استحکام ملتا جاتا ہے۔اس لیے رسمی اور غیر

رسمی طور پر ایک ایجنڈے پر کام کیا جاتا ہے۔فورٹ ولیم کالج ہو یا انجمن پنجاب سب نے مقامی باشندوں کے لیے ایک دنیا تشکیل دینے میں کردار ادا کیا۔علی گڑھ تحریک کو اس زاویے سے دیکھا جا سکتا ہے۔

یعنی ایک صورت 'پیروی مغربی' کی ہی جس میں نوآبادکار کی ہر سطح اور ہر مقام پر برتری طے شدہ ہوتی ہے۔بظاہر یہ گروہ عقل پرست دکھائی دیتا ہے۔مگر ذہنی مغلوبیت کے بعد خود مختار حیثیت قائم رہنا ممکن نہیں رہتا۔نوآبادکار اپنی اور مقامی زبانوں کی ترویج پر خاصا زور دیتے ہیں۔فورٹ ولیم کالج کی پالیسی میں مقامی زبانوں کی ترویج شامل تھی۔اس گروہ کا مقصد مشرق شناسی تھا لیکن کچھ عرصے بعد کمپنی میں دوسرا گروہ غالب آجاتا ہے جس کا نمائندہ لارڈ میکالے تھا۔اس نے مقامی زبانوں کے بجائے انگریزی کو فروغ دیا۔میکالے انگریزی زبان کے ذریعے تعلیم دینے کے حق میں تھے یعنی وہ انگریزی زبان کو Medium of Instruction بنانا چاہتے تھے۔انہوں نے کہا تھا کہ: "A single shelf of a good European library was worth the whole native literature of India and Arabia."۔اس کے نزدیک اس پالیسی کے دو نتائج برآمد ہوں گے: ایک کاروبار حکومت کے لیے افراد تیار ہوں گے، دوسرا ایسے ہندوستانی پیدا ہوں گے جو اپنی سوچ اور رویوں میں انگریزی ہوں گے۔ ''A class of people,Indian in blood and colour but English in tastes,in opinions,in morals and in intellect."۔اس طرح معاشرے میں ثنویت کا دائرہ وسیع ہو جائے گا۔ظاہر ہے کہ اس پالیسی کے نتیجے میں کمپنی کو استحکام ملنا تھا۔مقامی باشندوں میں اس گروہ کی نمائندگی سرسید کر رہے تھے وہ لکھتے ہیں:

> ''اگر ہم اپنی اصل ترقی چاہتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی مادری زبان تک کو بھول جائیں۔ہماری زبان یورپ کی اعلیٰ زبانوں میں سے انگلش یا فرنچ ہو جائے۔'' ۷۹

اس عہد کی سب سے توانا شخصیت سرسید کی ہے۔انہوں نے زبان، ادب، سیاست، معاشرت تعلیم غرض ہر شئے کو بدلتے ہوئے حالات کے مطابق دیکھا اور وسیع تر انقلاب کے خواہاں تھے۔انہوں نے جس طرح کا معاشرہ تشکیل دینا چاہتے تھے، ادب میں آپ کا خواب محمد حسین آزاد اور حالی نے پورا کیا۔

حالؔی نے مقدمہ میں جس ادبی نظریہ سازی کو فروغ دیا اس میں بھی اردو شاعری اور اس کی جانچ

کے نئے معیار قائم کیے گئے اور باوجود اپنی مشرق پسندی کے شعوری اور غیر شعوری طور پر اسی ایجنڈے کے فروغ کا باعث بنے۔ اس طرح کلاسکی ورثے کے خلاف مہم اپنے ہی بزرگوں نے چلائی۔ بالآخر ایک ایسی فضا قائم ہوگئی جس کے نتیجے میں ایسے ہندوستانی تعلیم یافتہ نوجوان پیدا ہوئے جو رنگ و نسل کے اعتبار سے ہندوستانی اور کردار اور روح کے اعتبار سے برطانوی سامراج کا نوآبادیاتی ماڈل تھے۔ 'شریف زادہ' میں عابد حسین کا کردار ایک ایسے تعلیم یافتہ ہندوستانی کا ہے۔ ابوالکلام قاسمی لکھتے ہیں:

> ''برطانوی سامراج نے ہندوستانیوں کے ذہن کو ایسے مغربی رنگ میں رنگنے کا خواب دیکھا تھا کہ ان کی اپنی روایت ان کے لیے بے وقعت اور نا قابلِ تقلید بن جائے۔'' ۸۰

مقامی باشندوں میں دوسرا رویہ بغاوت کا ہوتا ہے۔ اس رویے کا سامنا کرنے کے لیے نوآبادکار پہلے سے ہی تیار ہوتے ہیں اور یہ تیاری محض قوت کے بل بوتے پر نہیں ہوتی بلکہ دور رس نتائج حاصل کرنے کے لیے گہری تعلیمی و ثقافتی پالیسیاں مرتب کی جاتی ہیں۔ باغی گروہ مفاہمتی گروہ کی نسبت زیادہ دوراندیشی کا ثبوت دیتا ہے۔ باغی گروہ تہذیب کی ظاہری چکاچوند اور ترقی سے مرعوب نہیں ہوتا۔ لیکن اس گروہ کا بھی ایک حصّہ ظاہر پرست واقع ہوتا ہے اور نوآبادکار کی ہر شئے سے نفرت کا اظہار کرتا ہے جیسا کہ نذیر احمد 'ابن الوقت' کے آغاز ہی میں کہتے ہیں:

> ''ابن الوقت (بطور کردار) کی تشہیر کی بڑی وجہ یہ ہوئی ہے کہ اس نے ایسے وقت میں انگریزی وضع اختیار کی جب کہ انگریزی پڑھنا کفر اور انگریزی چیزوں کا استعمال ارتداد سمجھا جاتا تھا۔ ابن الوقت جیسے ملامتی نہیں تو اس کے ہم خیال خال خال اور بھی چند مسلمان تھے جن کے لڑکے اکادکا دہلی کالج میں پڑھتے تھے۔ ان لڑکوں میں سے اگر کوئی عربی فارسی جماعتوں میں نکلتا اور آنکھ بچا کر پانی پی لیتا تو مولوی لوگ مٹکے تڑوا ڈالتے۔'' ۸۱

باغی گروہ کا دوسرا حصہ وسیع النظر تھا۔ وہ نوآبادکار کی تہذیب کے شعائر کو علامت کی شکل میں دیکھتا تھا۔ اس گروہ کے نمائندہ اکبرالہ آبادی ہیں۔ یہاں اس بات کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ دادابھائی ناروجی نے جو ''ڈرین آف ویلتھ'' کا نظریہ دیا۔ انہوں نے برطانوی حکومت کی پالیسیوں کو تنقید کا نشانہ بنایا اور کہا

کہ ہندوستان میں غریبی اور مفلسی کی وجہ یہ ہے کہ یہاں سے آمدانی کا ایک بڑا حصہ انگلستان کی تجوریوں میں چلا جاتا ہے۔انھوں نے اپنی کتاب ''پورٹی اینڈ اَن برٹش رول ان انڈیا'' میں لکھا ہے: "He called the British rule as plundering,unrighteous,despotic,destructive and un-British." اسی طرح رمیش چندر دت نے اپنی کتاب ''دی اکونامک ہسٹری آف انڈیا'' میں برٹش راج کے متعلق لکھا ہے: " verily the moisture of India blesses and fertilises other lands."

انجذابی اور باغی گرہوں کے علاوہ ایک تیسرا نقطۂ نظر بھی سامنے آتا ہے جو آفاقی ہے۔نوآبادکار اور مقامی باشندوں کی دنیا میں جو ثنویت پر قائم ہوتی ہیں، قدرِ مشترک تلاش کی جاتی ہے۔آفاقی نقطۂ نظر کو دراصل انجذابی نقطۂ نظر کی ہی توسیع خیال کیا جائے تو بہتر ہے کیونکہ یہ نقطۂ نظر برابری کی بنیاد پر قائم نہیں کیا جاسکتا۔مثلاً جب سائنس کو کسوٹی مان کر مذہب کو پرکھا جائے تو برتری تو سائنس اور مادے کی ہی ثابت ہوئی۔دونوں دنیاؤں میں اشتراکات تلاش کیے جاتے ہیں لیکن اس سب کے باوجود مشرق مشرق رہتا ہے اور مغرب مغرب۔سرسید دینیات اور ثقافت کے میدان میں اشتراکات تلاش کرنے کے باوجود بھی دونوں میں فرق اور افتراق کو کم نہیں کر سکے۔

ادھر ہندوستان میں غزل کے مقابلے پر نظم اور داستان کے مقابلے پر ناول کے لیے فضا ہموار کی گئی۔نظم کے سلسلے میں سرسید، آزاد اور حالی کی کوششوں کا ذکر ہو چکا ہے۔نظم اور ناول میں یہ خوبی ہے کہ یہ دونوں مخصوص نقطۂ نظر کے فروغ کے لیے بآسانی استعمال کی جاسکتی ہیں۔ابوالکلام قاسمی تحریر کرتے ہیں کہ انگریز سرکار نے ناول کے فروغ کے لیے باقاعدہ ترغیب دی:

> ''ان (ڈپٹی نذیر احمد) کو ناول لکھنے کی تحریک حکومت کی طرف سے انعام دیے جانے کے اعلان سے ملی۔اس لیے جس حد تک ان سے ممکن تھا انھوں نے حکومت کے ضابطے کے مطابق اپنی تحریروں کو ڈھالنے کی کوشش کی۔''۸۲

۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستانی سماج حاکم اور محکوم اور کالے اور گورے میں تقسیم ہوا اور محکوم تقسیم در تقسیم در ہوئے۔کسی بھی قوم پر طاقت سے غلبہ حاصل کرنے کے بعد اقتدار میں استحکام اور طوالت پیدا

کرنے کے لیے سیاسی ،سماجی ،ثقافتی ،تعلیمی نوعیت کے پروگرام ترتیب دیے جاتے ہیں ۔ایک طرف مراعات یافتہ طبقے اور دوسری طرف تعلیمی نظام کی بدولت ہندوستان میں ایسے خاندان اور افراد بڑی تعداد میں وجود میں آ گئے تھے جو اپنی تہذیب و تاریخ سے شرمندہ تھے اور مغربی تہذیب وفکر سے مرعوب ۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک بہت سے اردو تک بہت اردو ناولوں کا موضوع مغربی تہذیب وفکر کے اثرات ہے ۔ان میں خاص طور پر ڈپٹی نذیر احمد ،مرزا محمد ہادی رسوا ،قرۃ العین حیدر اور عزیز احمد قابل ذکر ہیں ۔یہاں ڈپٹی نذیر احمد کے ناول ''ابن الوقت'' کا مطالعہ نوآبادیاتی پس منظر میں کیا جا رہا ہے۔

اگر چہ ڈپٹی نذیر احمد کو ناول لکھنے کی تحریک حکومت کی طرف سے انعام دیے جانے کے بعد ملی ،مگر ان کا معاملہ دیگر ''ارکان خمسہ'' سے جدا تھا۔آپ کے ناولوں میں بظاہر دو متضاد باتیں یکجا ہیں ۔ایک یہ کہ آپ برطانوی راج کو ہندوستان کے لیے ایک نعمت سمجھتے تھے اور دوسرا یہ کہ آپ مغربی تہذیب کو جزوی طور پر اپنی شرائط پر قبول کرتے ہیں ۔یہی وجہ ہے کہ اپنی ثقافتی اور ادبی ورثے کے بارے میں آپ کا رویہ حالی اور آزاد سے مختلف تھا۔آپ کے ناولوں میں مشرقی اور مغربی اقدار کی کشمکش دکھائی جاتی ہے اور یہ کہنا اتنا آسان نہیں ہوتا کہ آپ کا جھکاؤ کس طرف ہے ،مثلاً ابتداء میں محسوس ہوتا ہے کہ ابن الوقت مغربی فکر اور تمدن کے سامنے پسپائی اختیار کر رہا ہے مگر آخر میں اس کی شخصیت کا کھوکھلا پن واضح ہو جاتا ہے ۔اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ وہ ان معنوں میں نوآبادیاتی فکر کے آلہ کار نہیں بنے ۔مگر جب ہم نوآبادیاتی دور گزرنے کے بعد نذیر احمد کا جائزہ لیتے ہیں تو نوآبادیاتی فکر کی ترویج میں ان کا کردار واضح نظر آتا ہے ۔تاہم حالی اور آزاد کے برعکس آپ مغرب اور مشرق کی کشمکش کامیابی سے پیش کرتے ہیں ۔اس دور کا ہندوستان فکری اور جذباتی سطح پر دو حصوں میں تقسیم ہو رہا تھا۔آپ کے ہاں دو طرح کے کردار واضح ہیں ۔ایک وہ جو اپنے آپ کو بدلتی ہوئی صورت حال کے مطابق ڈھالتے ہیں ۔اس گروہ کی نمائندگی کلیم ،مبتلا اور سید ناظر کرتے ہیں ۔دوسرا گروہ پرانی اقدار سے چمٹا ہوا ہے ۔اس کی نمائندگی نصوح ،میر متقی اور حجتہ الاسلام کرتے ہیں ۔اس دور کے ہندوستان میں مغربی اور مشرقی اقدار میں تصادم کی صورت حال 'ابن الوقت' سے بہتر شائد ہی کہیں بیان کی گئی ہو ۔ناول کی پہلی ہی فصل سے اس تصادم کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔قدرے طویل اقتباس پیش کیا جا رہا ہے:

''ابن الوقت (بطور کردار) کی تشہیر کی بڑی وجہ یہ ہوئی کہ اس نے ایسے وقت میں انگریزی وضع اختیار کی جیسا کہ انگریزی پڑھنا کفر اور انگریزی چیزوں کا استعمال ارتداد سمجھا جاتا تھا۔ دہلی کالج ان دنوں بڑے زوروں پر تھا۔ ملکی لاٹ آئے اور تمام درسگاہوں کو دیکھتے بھالتے پھرے۔ قدردانی ایسی کہ جس جماعت میں جاتے، مدرس سے ہاتھ ملاتے، بڑے مولوی، صاحب نے طوعاً وکرہاً بادل نخواستہ آدھا مصافحہ کیا تو سہی مگر اس ہاتھ کو عضو نجس کی طرح الگ تھلگ لیے رہے۔ لاٹ صاحب کا منہ موڑنا تھا کہ بہت مبالغے کے ساتھ انگریزی صابن سے نہیں بلکہ مٹی سے رگڑ رگڑ کر اس ہاتھ کو دھو ڈالا۔ سرکار بہ منزلہ مہربان باپ کے تھی اور بھولی بھالی رعیت بجائے معصوم بچوں کے۔ انگریزی کا پڑھنا ہمارے بھائی بندوں کے لئے کچھ ایسا ناسزاوار ہوا جیسا آدم اور اس کی نسل کے حق میں گیہوں کا کھا لینا۔ انگریزی زبان انگریزی وضع کو اوڑھنا بچھونا بنایا تھا۔ اس غرض سے کہ انگریزوں کے ساتھ لگاوٹ ہو مگر دیکھتے ہیں تو لگاوٹ کے عوض رکاوٹ ہے اور اختلاط کی جگہ نفرت، حاکم ومحکوم میں کشیدگی ہے کہ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ دریا میں رہنا مگر مچھ سے بیر دیکھیں آخر کار یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ انگریزی اخباروں میں جس کے ایڈیٹر انگریز ہیں بابوانہ انگریزی کی ہمیشہ خاک اڑائی جاتی ہے۔ ایک دوست ناقل تھے کہ ایک بار ان کو ایک انگریز سے ملنے کی ضرورت تھی۔ انھوں نے اپنے کانوں سے سنا کہ اندر بہت سے انگریز جمع ہیں اور ہندوستانیوں کی انگریزی کی نقلیں کر کر کے قہقہے لگا رہے تھے۔ وہ دوست یہ بھی کہنے لگے کہ جس انگریزی کی ہنسی ہو رہی تھی بے شک وہ ہنسی کے قابل بھی تھی اور اہل زبان کو ہمیشہ دوسرے ملک والوں پر ہنسنے کا حق ہے۔ مگر ہندوستانیوں کی انگریزی اگر ہنسنے کے قابل ہے تو اس کے مقابل میں انگریزوں کی اردو رونے کے لائق۔ ساری ساری عمر ہندوستانی سوسائٹی میں رہتے ہیں اور پھر بھی وہی ول کیا مانگٹا۔ انگریزی عمل داری نے ہماری دولت، ثروت، رسم ورواج لباس، وضع طور طریقہ، مذہب، تجارت، علم ہنر، شرافت سب چیزوں پر تو پانی پھیرا ہی تھا۔ ایک زبان تھی اب اس کا بھی یہ حال ہے کہ اوپر انگریزوں نے بجز واقفیت کی وجہ سے اکھڑی اکھڑی، غلط نامربوط اردو بولنی شروع کی، ادھر ہر عیب کہ سلطان بہ پسندد ہنر است ہمارے ہی بھائی بند لگے اس کی

تقلید کرنے ۔ایک صاحب کا ذکر ہے کہ اچھی خاصی ریش و بروت آغاز جوانی میں
ولایت گئے ، چار پانچ برس ولایت رہ کرآئے تو ایسی سٹی بھولے کہ انگریزی اردو میں
بہ ضرورت کبھی بات کرتے تو رک رک کر اور ٹھہر ٹھہر کر اور آنکھیں میچ میچ کر جیسے کوئی
سوچ سوچ کر مغز سے بات اتارتا ہے۔''۸۳

اس اقتباس سے درج ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

الف۔۱۸۵۷ء میں سیاسی طور پر مغلوب ہونے کے بعد برصغیر میں مغربی تہذیب وتمدن کے خلاف شدید ردعمل تھا اور اس ردعمل میں انتہا پسندی کا عنصر بھی موجود تھا۔ایک انتہا پسندی نے دوسری انتہا پسندی کو جنم دیا ۔یہ ردعمل عوام اور خواص دونوں سطحوں پر موجود تھا۔ابتداء میں مغربی تہذیب کی ظاہری علامتوں مثلاً لباس نشست و برخاست اور دیگر طور طریقوں پر ہی شدید ردعمل تھا۔انگریزی پڑھنا کفر تصور ہوتا تھا۔انگریز سے کسی بھی نوعیت کا تعلق نا قابل برداشت تھا۔اس ردعمل کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہاں سیاسی زوال کے ساتھ تہذیبی زوال اس درجے کا نہیں ہوا کیونکہ یہاں تہذیب اور مذہب کی جڑیں بہت مستحکم ہیں۔اکبرالہ آبادی اس ردعمل کے نمائندہ ہیں۔ایک دوسری سطح پر دیو بند کی تحریک اپنے مقاصد کے اعتبار سے علی گڑھ تحریک کی ضد تھی۔اس نے فکری سطح پر نوآبادیاتی عزائم سمجھ کر افرادسازی کا کام شروع کیا۔

ب۔ڈپٹی نذیر احمد اگر چہ برطانوی اقتدار کو ہندوستان کے لیے ایک نعمت سے کم نہیں سمجھتے ،تاہم وہ ان کی ہر شے کو تسلیم نہیں کرتے۔۱۸۵۷ء کے بعد جن مشرقی اور مغربی اقدار کا تصادم شروع ہوا تھا،نذیر احمد اس پر بے چین تھے۔وہ محسوس کر رہے تھے کہ وہ طبقہ جو انگریزی وضع اختیار کر رہا تھا وہ بھی انگریزوں کے ہاں مقام حاصل کرنے میں ناکام رہا۔

ڈپٹی نذیر احمد ابھی حتمی طور پر نہیں کہہ سکتے تھے کہ بالآخر اس کا کیا نتیجہ برآمد ہوگا۔ڈپٹی نذیر احمد حالی،آزاد اور اکبرالہ آبادی کا تعلق اس اولین نسل سے تھا جس کا انگریز سے ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی پڑا تھا ۔اس لیے اس نسل اور بعد کی نسلوں کے ردعمل میں فرق ہے۔اس ردعمل کے فرق کا جائزہ ایک علیحدہ مطالعہ کا تقاضا کرتا ہے۔

ج۔اردو زبان کے بگاڑ کے قصے میں ڈپٹی نذیر احمد کسی رورعایت سے کام نہیں لیتے۔کم از کم یہاں وہ

برابری کی سطح پر آ کر بات کرتے ہیں۔انگریزی عمل داری کے نتیجے میں ہندوستان کی دولت،رسم ورواج ،تجارت،مذہب علم وہنر میں گراوٹ کو کسی حد تک ایک لازمی برائی کے طور پر قبول کرتے دکھائی دیتے ہیں ۔مگر جہاں اردو زبان کا معاملہ آتا ہے تو انگریزوں اور انگریز پرستوں پر چوٹ کرتے ہیں کہ اگر ہندوستانی انگریزی ٹھیک سے بول اور لکھ نہیں سکتے تو انگریزوں کی صورت حال اردو کے معاملے میں اور زیادہ خراب ہے۔اسی طرح وہ ان لوگوں کو بھی ملامت کرتے ہیں جو مہذب بننے کے شوق میں اپنی زبان بھی بھلا بیٹھے ۔

ناول کی ساتویں فصل ''ایک ڈپٹی کلکٹر انگریزوں کی مدارت کا شاکی''، میں ایک ہندوستانی ڈپٹی کلکٹر اپنی دکھ بھری داستان سناتے ہیں۔وہ انگریزوں اور ان کے ہندوستانی عملے کے توہین آمیز برتاؤ کے شاکی ہیں۔ذہن میں رہے کہ یہ صاحب انگریز سرکار کا حصہ ہیں اور ڈپٹی کلکٹر ہیں۔عام ہندوستانی سمجھتے ہیں کہ ان کے عہدے کے باعث وہ انگریزوں سے قربت رکھتے ہیں،ان سے برابری کی بنیاد پر برتاؤ کیا جاتا ہے۔اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عام ہندوستانی اور کتے میں کیا فرق تھا: ''کتوں اور ہندوستانیوں کا داخلہ ممنوع ہے۔'' ابن الوقت کے ایک عزیز جو ڈپٹی کلکٹر ہیں،افسران بالا سے اپنی ملاقات کا حال بیان کرتے ہیں:

> ''اتنی مدت مجھے نوکری کرتے ہوئے اور چھوٹے بڑے صدہا انگریزوں سے میری معرفت ہے۔مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں خوشی سے کبھی کسی انگریز سے ملنے گیا ہوں یا کسی انگریز سے مل کر میری طبیعت خوش ہوئی ہو۔بڑے مؤدب مقطع بن کر ہاتھ باندھے،نیچی نظریں کیے ڈرتے ڈرتے،دبے پاؤں کوٹھی کی طرف کو بڑھے۔آخر نا چارستون کی آڑ میں جوتیاں اتار کر ہمت کر کے بے بلائے اوپر پہنچے۔کرسی نہیں ،مونڈھا نہیں،فرش نہیں،کھڑے شوچ رہے ہیں کہ کیا کریں؟ لوٹ چلیں،پھر خیال آتا ہے کہ ایسا نہ ہو لوٹتے کو صاحب اندر آئینوں میں سے دیکھ لیں۔غرض کوئی آدھ گھنٹے اسی طرح کھڑے سوکھا کیے۔غرض بلائے گئے،صاحب کو دیکھا تو پائپ منہ میں لیے ٹہل رہے ہیں۔سر جھکائے کوئی کاغذ یا کتاب دیکھ رہے ہیں۔اب کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی کہ کیوں کر ان کو خبر کروں کہ میں آیا کھڑا ہوں۔شائد جان بوجھ کر کھڑا

رکھا ہو۔آخر آپ ہی سر اٹھایا۔ڈپٹی صاحب حاکم بالا دست ہوکر جو اتنی آؤ بھگت
کرے تو اس کا شکر گزار ہونا چاہیے۔صاحب نے بندہ نوازی میں کچھ کمی نہیں کی
،آنکھیں چار ہوتے ہی اپنے مقابل دوسری کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔کہنے کو تو کرسی پر
بیٹھا مگر حقیقت میں بید پر چوتڑ ٹیکے ہوں تو جیسے چاہو قسم لے لو۔کرسی پر بیٹھنا تھا کہ کم
بخت چپڑاسی نے پیچھے سے ہاتھ جوڑ کر کہا، خداوند سرشتہ دار حاضر ہیں۔''۸۴

اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انگریزی سرکار میں اہم عہدوں پر فائز بہت سے افراد بھی ملازمت نیم دلی سے کر رہے تھے اور وہ کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں تھے۔دوسرا یہ کہ حکمرانوں نے اپنے اور مراعات یافتہ طبقے کے بیچ بھی اتنا فاصلہ قائم کر رکھا تھا کہ قدم قدم پر انھیں حاکم اور محکوم میں تفریق سے سابقہ پڑا تھا ۔سرکاری عہدہ داران اور نوابین صاحب بہادر کے دربار میں سلام کے لیے حاضری دیتے اور گھنٹوں توہین آمیز انتظار کے بعد خوش قسمتی سے کبھی دیدار نصیب ہوتا اور سلام قبول ہوتا اور بعض اوقات تو چپراسی کی معرفت کہلوا دیا جاتا کہ سلام قبول ہے، اب تشریف لے جایئے۔

ایسے ہندوستانی افسران کا باہر کی دنیا میں بہت رعب و دبدبہ تھا حالانکہ یہ وہ افسران تھے جن کو حکام بالا کے اردلی بھی خاطر میں نہ لاتے تھے کیونکہ وہ ان کی اصلیت سے آگاہ تھے۔

مستشرقین کے انفرادی کام اور اداروں کے قیام کی بدولت ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی ہندوستانی ذہن پر یورپ کی برتری ثابت ہو چکی تھی۔مقامی کو ذہنی طور پر مغلوب کیے بغیر امپریل ایجنڈا کامیاب نہیں ہو سکتا ۔حتیٰ کہ یہ ثابت کر دیا گیا کہ ہم اپنی زبان، ثقافت اور تاریخ کی تفہیم کے لیے ان کے رحم و کرم پر ہیں۔ایک مرتبہ یہ چیز ذہن میں بیٹھنے کے بعد ہم ہر اس تصور اور نظر کو ایک نعمت سمجھیں گے جو مغرب سے آئے۔نوبل صاحب بہت گہرے آدمی ہیں۔انھوں نے جنگ آزادی کو آنکھوں سے دیکھا ہے۔وہ ہندوستانی مزاج کے آشنا ہیں۔امن قائم ہونے کے بعد دور اندیش نوبل صاحب نے مسلمانوں کی تربیت کے لیے ابن الوقت کو بطور ایک مصلح دیکھا۔وہ ابن الوقت کو مصلح کا کردار ادا کرنے کے لیے قائل کرتے ہیں اور جن دلائل سے کام لیتے ہیں وہ حسبِ ذیل ہیں:

''آپ کو یورپ جانے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن اگر آپ گئے ہوتے تو آپ پر ثابت
ہو جاتا کہ اہل یورپ کی عظمت سلطنت میں نہیں ہے بلکہ ان کی تمام عظمت ان علوم

میں ہے جو جدید ایجاد ہوئے ہیں اور ہوتے جاتے اور جن علوم کے ذریعے سے انھوں نے ریل اور تار برقی اور اسٹیمر اور ہزار ہاقسم کی بکار آمد کلیں بنا ڈالی ہیں۔ ہندوستانیوں کے پنپنے کی اگر کوئی تدبیر ہے تو یہی کہ ان میں علومِ جدید کو پھیلایا جائے اور ان کو اس بات کی طرف متوجہ کیا جائے کہ اپنی تمام قوت عقلی واقعات میں صرف کریں۔ تمام علوم جدیدہ جن پر ملّی ترقی کا انحصار ہے انگریزی میں ہیں۔ سب سے پہلے زبان انگریزی کو رواج دینا ہوگا۔ اس کا علاوہ انگریزی زبان کے رواج دینے سے ایک غرض تو علوم جدیدہ کا پھیلاؤ ہے اور دوسری غرض اور بھی ہے یعنی عموماً انگریزی خیالات کا پھیلانا اکیلے علوم جدیدہ سے کام چلنے والا نہیں۔ جب تک خیالات میں آزادی، ارادے میں استقلال، حوصلے میں وسعت، ہمت میں غلو، دل میں فیاضی اور ہمدردی، بات میں سچائی، معاملات میں راست بازی یعنی انسان پورا پورا جنٹلمین نہ ہو اور وہ بدون انگریزی جاننے کے نہیں ہوسکتا۔ انگریزی دان آدمی کو اخباروں اور کتابوں کے ذریعے سے انگریزی خیالات پر آگہی بہم پہنچانے کے بڑی آسانی ہوسکتی ہے۔ رفارم جس کی ضرورت ہندوستان کو ترقی کے لیے ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ہندوستانیوں کو انگریز بنایا جائے۔ خوراک میں، پوشاک میں، زبان میں، طرز تمدن میں، خیالات میں ہر ایک چیز میں اور وقت اس کے لیے چپکے چپکے کوشش کر رہا ہے مگر اس کی کوشش دھیمی ہے اور اس پر نتیجے کا مرتب ہونا دیر طلب، لوگوں کے دلوں میں خود بخود اس طرح کے خیالات بہ تقاضائے وقت پیدا ہو چلے ہیں۔ کوئی رفارمر کھڑا ہو کر اس جلتی ہوئی آگ کو جلد سے بھڑکا دے۔"۸۵

نوبل صاحب ایسے اقدامات کرنے کے خواہاں ہیں جن سے ہندوستان میں برطانوی حکومت کو طوالت اور استحکام نصیب ہو۔ وہ لارڈ میکالے کے پیروکار نظر آتے ہیں، دوررس نتائج کے حصول کے لیے انگریزی زبان اور تہذیب کو فروغ دینا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ یہ بات ایک تحریک کی شکل اختیار کرے اور یہ تحریک خود ہندوستانیوں کے اندر سے اٹھے۔ نوبل صاحب کے عزائم وہ امپیریل ایجنڈا ہے جو نوآبادکاروں نے رفتہ رفتہ مختلف ذرائع کے ذریعے سے پھیلایا۔

یہ بات واضح ہے کہ اس آئیڈیالوجیکل ادارے کے بغیر طاقت کے بل بوتے پر حاصل کردہ نتائج

کو زیادہ عرصہ قائم نہیں رکھا جا سکتا۔نوبل صاحب جس قسم کے 'جنٹلمین' کو وجود میں لانا چاہتے ہیں حالی اور آزاد بھی اس کوشش میں ان کے ہم نوا ہیں اور یہ وہی 'جنٹلمین' ہے جو ہادی رسوا نے عابد حسین کی شکل میں تخلیق کیا ہے۔یعنی مغرب کی ریل کے سامنے بالکل بجھ گئے اور کلیں دیکھ کر اوسان خطا ہو گئے۔نوبل صاحب کے بقول انگریزی زبان اور خیالات کے پھیلنے سے جو جنٹلمین وجود میں آئے گا وہ درج ذیل خصوصیات کا حامل ہوگا: آزاد خیال ہوگا، پختہ ارادے کا مالک ہوگا، عالی حوصلہ ہوگا، باہمت ہوگا، فیاض ہوگا، ہمدرد اور سچا ہوگا، معاملات میں صاف ہوگا۔اور یہ وہ حقائق ہیں جو انسان میں انگریزی جانے بغیر پیدا ہونا محال ہے۔نوبل صاحب کہتے ہیں کہ وقت اس طرح کے 'جنٹلمین' کے ظہور کے لیے بے تاب ہے اور چپکے چپکے کوشش کر رہا ہے، نوبل صاحب اچھی طرح سمجھتے ہیں اگر چہ ابن الوقت نہیں سمجھتے، کہ یہ چپکے چپکے کوشش کتنے عرصے سے ہو رہی تھی۔یہ کوشش دراصل سامراجی ایجنڈا ہے اور جس کے لیے رسمی اور غیر رسمی ادارے بھی وجود میں آئے اور بہت سی تحریکیں اٹھیں۔یہ اسی کوشش کا ہی ثمر ہے کہ ہم اکیسویں صدی میں بھی جدید نو آبادیاتی دور میں رہ رہے ہیں۔ہمارے وہ اکابر جنھوں نے دانستہ یا نادانستہ امپیریل ایجنڈے کو فروغ دیا، ہم ان کے اخلاص پر شک نہیں کر سکتے۔اس دور کے معروضی حالات کو بھی نظر میں رکھنا ضروری ہے۔۱۸۵۷ء کے بعد مختلف ردعمل سامنے آئے اور مختلف حکمت عملیاں وضع کی گئیں جن میں سے ایک حکمت عملی علی گڑھ کی تحریک کی صورت میں یہ بھی تھی۔

ناول کی نویں فصل میں ابن الوقت کی تبدیلی وضع کا حال بیان کیا جاتا ہے۔نوبل صاحب کا ایک ملازم جاں نثار، تبدیلی وضع کے سلسلے میں ابن الوقت کو قیمتی مشوروں سے نوازتا ہے۔امکان ہے کہ ایسا کرنے کو خود نوبل صاحب نے کہا ہے۔جاں نثار اسم بامسمّٰی ہے۔ہر وقت انگریزوں کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔اس کے بقول انگریزوں کے برے بھی ہمارے اچھوں سے اچھے اور بہت اچھے ہیں۔ابن الوقت رفارمر بننے کے لیے رضا مند ہو گئے ہیں، لیکن جاں نثار کا مشورہ ہے کہ حلیہ بدلا جائے تا کہ انگریزوں کی ان سے اجنبیت ختم ہو۔اس موقع پر جاں نثار اور ابن الوقت میں اہم مکالموں بھی خالی از دلچسپی نہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد خود اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک اہم بات کہتے ہیں کہ اس میں نوبل

صاحب کا کوئی قصور نہیں تھا۔ابن الوقت میں اپنی قوم اور قوم کی ہر چیز کی حقارت اور انگریز اور ان کی ہر بات وقعت پہلے سے اس کے ذہن میں مرتکز تھی ۔مراد یہ کہ رفارمر کا کردار ادا کرنے کے لیے ابن الوقت کا انتخاب خواہ مخواہ نہیں کیا گیا۔لیکن سوال یہ ہے کہ اس کے دل میں اپنی قوم کی حقارت اور انگریز کی عظمت کس طرح بیٹھ گئی ۔ یہ وہی 'چپکے چپکے کی کوشش' تھی ۔ وہ جوان تھا اور یہ وہ نسل تھی جس پر انگریزی تعلیم اور تہذیب کا جادو اپنا رنگ دکھا چکا تھا۔اس کا خیال تھا کہ ظاہری وضع قطع میں تبدیلی سے انگریز اسے اپنی سوسائٹی میں قبول کر لیں گے،مگر کچھ عرصے بعد اس کی یہ بات خام خیالی ثابت ہوتی ہے۔ابن الوقت اپنی پوری توانائیاں انگریزی آدابِ معاشرت سیکھنے میں صرف کرتے ہیں۔ وہ کوّے کی طرح ہنس کی چال چل رہے تھے۔اگرچہ نذیر احمد کی ہمدردیاں ابن الوقت کے ساتھ ہیں مگر یہاں وہ اسے بطور مضحکہ خیز کردار پیش کرتے ہیں:

''ابن الوقت نے آئینے میں دیکھا تو اپنے تئیں انگریزوں کے ساتھ پایا۔ بے اختیار تن کر کپڑے بدلنے کے کمرے میں لگا پینترے بدلنے ۔ جاگا تو ہوا خوری کے کپڑے بدل باہر نکل گیا۔ڈنر کے بعد تیاری شروع ہوئی ، کچہری نہیں ،دربار نہیں ،کوئی پارٹی نہیں ،اس پر بھی دن کے گیارہ بجے سے لے کر اب یہ تیسری دفعہ ہے کہ انگریزی تہذیب کپڑے بدلنے کی متقاضی ہے۔'' ۸۶

ابن الوقت کے انگریزی وضع اختیار کرنے کے بعد نوبل صاحب ان کے اعزاز میں کھانا دیتے ہیں جس میں بڑی تعداد میں انگریز مدعو ہیں ۔ یہاں ابن الوقت کو بطور رفارمر متعارف کروانا مقصود تھا ۔کھانے کے بعد ابن الوقت ایک طویل تقریر کرتے ہیں جس کے چند نکات اہم ہیں:

''غرض ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلاط کا یہ نتیجہ ضرور ظاہر ہوا ہے کہ ایک دوسرے سے وحشت باقی نہیں رہی ۔اور پھر بھی میں اس کو اتحاد کے درجے میں نہیں سمجھتا۔دونوں کے دل بدستور ایک دوسرے سے پھٹے ہوئے ہیں ۔آج کوئی بھڑکانے والا کھڑا ہو تو مسلمانوں کے نزدیک ہندو ویسے ہی کافر اور مشرک ہیں اور ہندوؤں کی نظر میں مسلمان ویسے ہتیارے بھرشٹ اور یہ نااتفاقی گورنمنٹ کے حق میں ایک فال مبارک اور شگون نیک ہے مگر وہیں تک کہ باہم رعایا میں ہو۔'' ۸۷

وہ کہتے ہیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو آپس میں کبھی بھی لڑایا جا سکتا ہے اور رعایا کی اس نا اتفاقی کو انگریزی حکومت کے لیے نیک شگون گردانتے ہیں۔ یہ بات بہت معنی خیز ہے۔ ابن الوقت 'لڑاؤ اور حکومت' کی پالیسی کا عندیہ دے رہے ہیں۔ یہاں وہ صحیح معنوں میں امپریل ایجنڈے کا آلہ کار دکھائی دیتے ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ موقع محل کی مناسبت سے انگریزوں کے دل کی بات کر رہے ہوں۔ مگر ایک ہندوستانی کی زبان سے ایسی بات کا نکلنا باعث شرم ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں تفریق کو بڑھانا اور بڑھا چڑھا کر پیش کرنا برطانوی حکومت کی حکمت عملی کا تقاضا تھا۔ یہ وہی ہندوستان تھا جہاں مسلمانوں نے اقلیت میں ہونے کے باوجود سینکڑوں برس حکومت کی اور اب اتنی بڑی تعداد میں ہونے کے باوجود وہ اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھ رہے تھے۔ یہ تفریق پیدا کرنے میں، خاص طور پر لسانی سطح پر ایشیاٹک سوسائٹی اور فورٹ ولیم کالج جیسے اداروں کا بھی کردار ہے ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد برطانوی سرکار کے لیے سب سے بڑا خطرہ تھا، لہذا لسانی، مذہبی اور ثقافتی سطح پر ان میں موجود فرق کو مزید پاٹا گیا جس کے ٹھوس شواہد موجود ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد ابن الوقت میں ہونے والی ظاہری، ذہنی اور قلبی تبدیلیوں کا باریک بینی سے جائزہ لیتے ہیں۔ تیرہویں فصل کا عنوان ہے: ''انگریزی وضع کے ساتھ اسلام کا نبھنا مشکل ہے۔'' نذیر احمد شعائر اسلامی کی اہمیت دل و جان سے جانتے تھے۔ اس فصل میں وہ بتاتے ہیں کہ کس طرح انگریزی وضع اور طور طریقے اپنا رنگ دکھانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ یہ وہی بات ہے جو اکبر نے کہی تھی کہ:

؎ دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے ۸۹

ڈپٹی نذیر احمد انگریزی وضع اور طور اطوار کو اسلام کی ضد گردانتے ہیں کہ دونوں کو ایک ساتھ نہیں چلایا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ جوں جوں ابن الوقت انگریزی معاشرت کا حصہ بنتے گئے توں توں وہ مذہب سے دور ہوتے گئے۔ یقیناً اس کا ایک پہلو خود ابن الوقت کے کردار کی کمزوری بھی ہے لیکن تنہا فرد پر معاشرت بالآخر غلبہ پا ہی لیتی ہے، جیسا کہ ہوا:

''پھر اکثر اتفاق پیش آ جاتا تھا کہ ابن الوقت اپنے پرائیوٹ روم میں نماز پڑھ رہا ہے

اور کوئی صاحب اس کی کچہری میں آ نکلے اور اجلاس خالی دیکھ کر واپس چلے گئے یا نماز کا وقت ہے اور انگریزوں نے آ گھیرا ہے۔ان کو چھوڑ کر جا نہیں سکتے یا کوئی صاحب کچہری برخاست کر کے جانے لگا تو ابن الوقت کے پاس سے ہو کر نکلا کیوں مسٹر ابن الوقت ؟ ہوا خوری کو چلتے ہو یا چلو ذرا بلیرڈ کھیلیں ۔ یہ اور اس طرح کے دوسرے اتفاقات ہر روز پیش آتے تھے اور نماز کا انتظام ممکن نہ تھا کہ باقی رہ سکے ۔غرض نماز پر تو انگریزی سوسائٹی کا اثر یہ دیکھا کہ پہلے وقت سے بے وقت ہوئی ۔ پھر نوافل، پھر سنن جا کر نرے فرض رہے۔ پھر جمع بین العصرین والمغربین شروع ہوا پھر قضائے فائتہ پھر بالکل چٹ ۔کھانے پینے میں احتیاط کے باقی رہنے کا کوئی محل ہی نہیں تھا۔ابن الوقت کو انگریزوں کے پر چانے کی پڑی تھی اور وہ بے شراب کے پرچ نہیں سکتے تھے۔'' ۹۰

انسان پر تعلیم ،صحبت اور معاشرت کے اثرات کسی نہ کسی طور حاوی ہو کر ہی رہتے ہیں ۔اسی لیے ۱۸۵۷ء سے قبل ہی انگریزی زبان ،تعلیم اور معاشرت کے پھیلاؤ کی منظّم کوشش سامنے آ چکی تھیں اور ۱۸۵۷ء کے بعد ان کوششوں میں تیزی آ گئی اور اعتماد بڑھ گیا۔اس ضمن میں سب سے کامیاب تحریک علی گڑھ کی تھی جو تعلیم ، مذہب اور معاشرت کو محیط تھی ۔'ارکان خمسہ' کسی نہ کسی طور اسی تحریک سے وابستہ تھے ۔ایسا نہیں کہ ان میں سے کسی کو بھی ہم ابن الوقت پر قیاس کریں؟ یہ تمام افراد اپنی وضع اور اطوار میں خالص ہندوستانی تھے اور ہر تحریک کی طرح یہ تحریک بھی اپنے اندر مثبت اور منفی رجحانات لیے ہوئے تھی۔

ابن الوقت کی نئی وضع اور جدید خیالات کو معاشرے میں پذیرائی نہ مل سکی ۔انھیں جگہ جگہ خفت اٹھانا پڑی ،آہستہ آہستہ انگریز بھی ان سے بدظن ہوتے گئے ۔ناول کے ایک اور کردار حجتہ الاسلام کا جائزہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ۔ابتداء میں محسوس ہوتا ہے کہ ابن الوقت کے پردے میں نذیر احمد بول رہے ہیں ۔مگر بہت جلد وہ نذیر احمد کے طنز کا نشانہ بنتے نظر آتے ہیں ۔ حجتہ الاسلام کو ابن الوقت کی طرز زندگی اور خیالات پر سخت اعتراضات ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ انھیں اس میں بھی شبہ نہیں کہ انگریز سرکار ہندوستان کے لیے ایک نعمت ہے ۔انھیں نذیر احمد کا نمائندہ کہا جا سکتا ہے ۔اس ناول کو ایک ایسی دستاویز کے طور پر بھی دیکھا جا سکتا ہے جس میں ۱۸۵۷ء کے بعد کا ابتدائی دور محفوظ ہو گیا ہے ۔نو آبادکاروں کے عزائم اور

مقامی باشندوں کا مختلف طرح کا ردعمل اس میں موجود ہے۔ ہندوستان پر مغربی تعلیم اور تہذیب کے کیا اثرات مرتب ہوں گے۔ حاکم اور محکوم کا تعلق کس نوعیت کا ہوگا اور مقامی باشندوں کی آپس کی گروہ بندیاں کیا صورت اختیار کریں گی یہ اور اس طرح کے سوالات پیدا ہو چکے تھے لیکن جواب بعد کے دور میں ملے ۔ناول کے جائزے کو ابوالکلام قاسمی کی اس رائے پر ختم کیا جاتا ہے:

> ''اس ناول میں ابن الوقت کا کیریکٹر تمسخر کا انداز اختیار کرنے کے باعث نوآبادیاتی فکر کے معاملے میں نذیر احمد کے تحفظات کو نمایاں کرتا ہے۔اس طرح اپنے بعض دوسرے ناولوں میں بھی نذیر احمد نوآبادیاتی فکر سے کبھی مغلوب ہونے اور کبھی مزاحمت کا انداز اختیار کرنے کا تاثر دیتے ہیں،مگر جب وہ ہندوؤں کے مقابلے میں برطانوی سامراج کو ترجیحی نگاہ سے دیکھتے ہیں تو ان کا یہ خوف ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہتا کہ صدیوں سے حکمرانی کرنے والا مسلمان اس اندیشے میں مبتلا رہتا ہے کہ کہیں اس پر ہندو حکمران نہ ہو جائے اس لیے اہل کتاب کی حکمرانی ان کو بسا غنیمت اور خدا کی رحمت معلوم ہوتی ہے۔اس لیے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہو کہ نوآبادیاتی فکر جزوی طور پر سہی قبول کرنے اور فروغ دینے کے معاملے میں نذیر احمد کا رول بھی خاص غور طلب ہے۔''۹۱

ڈپٹی نذیر احمد کے ساتھ ساتھ سرسید،آزاد اور حالی کے معاصرین اور متاخرین میں یوں تو کئی اور ایسے نام لیے جا سکتے ہیں جن کی تحریروں نے نوآبادیاتی فکر کو مستحکم کرنے اور اس کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا،مگر ان کے ساتھ ہی ایسے قلم کاروں کی تعداد کچھ کم نہیں جنھوں نے لگاتار مزاحمت کا انداز اختیار کیے رکھا۔

سرسید احمد خاں،محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالی نے اردو کی شعری و ادبی نظریہ سازی کے ذریعہ اردو زبان و ادب کی جو خدمت انجام دی اس کی اساسی اور غیر معمولی اہمیت کے باوصف ان کی تحریروں کے ان محرکات کی نشان دہی ، جو برطانوی نوآبادکاری کا حصہ تھے،اردو کی کلاسیکی شعریات کی بازیافت کے لیے ضروری ہو گیا ہے۔اس سلسلے میں ان کے معاصر ڈپٹی نذیر احمد کی تحریریں بھی نوآبادیاتی فکر کی طرف ہندوستانی ردعمل کا ایک دلچسپ نقشہ پیش کرتی ہیں۔ڈپٹی نذیر احمد نے تفسیر لکھی،لکچر دیے اور اردو میں ناول کی روایت استوار کرنے میں اساسی کردار ادا کیا۔واضح رہے کہ ایڈورڈ سعید نے مغرب میں

پروردہ ناول کی صنف کو ہی اسلامی تصورِ کائنات کے منافی ثابت کیا ہے۔ڈپٹی نذیر احمد برطانوی اقتدار کو ہندوستانی کے لیے خدا کی رحمت تصور کرتے ہیں، مگر چوں کہ انہوں نے ادبی اظہار کے لیے ایسی مغربی صنف نثر کا انتخاب کیا جس کی روایت سوائے داستانوں کے اردو میں نہ ہونے کے برابر تھی۔شاید اسی لیے انہوں نے اپنے ادبی سرمائے کی تحقیر کا رویہ اختیار نہیں کیا۔مگر قصہ نگاری کے تعلیمی اور سماجی مقاصد کا بار بار ذکر کرنے کے باوجود بھی اس فکر کے منفی اثرات سے اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھ سکے۔ان کو ناول لکھنے کی تو تحریک حکومت کی طرف سے انعام دیے جانے کے اعلان سے ملی۔اس لیے جس حد تک ان سے ممکن تھا انہوں نے حکومت کے ضابطے کے مطابق اپنی تحریروں کو ڈھالنے کوشش کی تاہم وہ آسانی سے نوآبادیاتی تہذیب کی کلی برتری کو قبول کرنے پر آمادہ نظر نہیں آتے۔وہ اپنے ناولوں میں سماجی مسائل کی مرکزیت ضرور قائم رکھتے ہیں، مگر ساتھ ہی کرداروں اور مکالموں کی مدد سے اس ساری کشمکش کو بھی پیش کرنے کی کرتے ہیں جس میں وہ خود کو بحیثیت مصنف مبتلا و معلق پاتے ہیں۔وہ توبۃ النصوح میں نصوح اور کلیم کے کردار کے وسیلے سے مشرقی اقدار اور نئی مغربی فکر کے تصادم کو نمایاں کرتے ہیں اور شاید نہ چاہتے ہوئے بھی مغربی اقلیت پسندی اور آزادیٔ خیال کے نمائیدہ کردار کلیم کو زیادہ فعال، زیادہ توانا اور مستقبلیت کا نمائندہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔اپنی صفات کے اعتبار سے نصوح مشرقی طرزِ فکر کی اور کلیم نوآبادیاتی فکر کی نمائندگی کرتا ہے اور ناول پڑھتے ہوئے توبۃ نصوح کا کردار نیم خودسوانحی کردار ہونے کا بھی تاثر دیتا ہے مگر ناول کے انجام کے طور پر کلیم کی پسپائی نوآبادیاتی فکر کی پسپائی نہیں بن پاتی بلکہ اس کرادر کو ایک طرح کے المیاتی ہیرو جیسا ارتفاع مل جاتا ہے اسی طرح نذیر احمد کے ناول ابن الوقت میں ابن الوقت کا کردار دوسرے کردار نوبل کا وہ مثالی آدمی بنتا ہوا دکھایا گیا ہے جو نوآبادیاتی فکر کی سطحیت کی نمائندگی کرتا ہوا بھی معلوم ہوتا ہے، جب کہ اس کے بالمقابل حجۃ الاسلام کا کردار مشرقی اقدار یا مذہب کا نمائندہ ہے اس ناول میں ابن الوقت بقول ابوالکلام قاسمی کا کیریکچر تمسخر کا انداز اختیار کرنے کے باعث نوآبادیاتی فکر کے معاملے میں نذیر احمد کے تحفظات کو نمایاں کرتا ہے۔اسی طرح اپنے دوسرے ناولوں میں بھی نذیر احمد نوآبادیاتی فکر سے کبھی مغلوب ہونے اور کبھی مزاحمت کا انداز اختیار کرنے کا تاثر دیتے ہیں۔

☆☆☆

## حوالہ جات


۱۔مولوی بشیر احمد، مرتبہ لکچروں کا مجموعہ، لکچر نمبر ۱۵، جلد اوّل ۔ص ۲۸۱

۲۔ پروفیسر افتخار احمد صدیقی، مقدمہ فسانۂ مبتلا۔ص ۳۸

۳۔سید خواجہ حسینی، نذیر احمد اور ابن الوقت ۔ص ۳۱

۴۔لکچروں کا مجموعہ، حصّہ اوّل، لکچر نمبر ۱۱۔ص ۲۸۱

۵۔ڈپٹی نذیر احمد، ابن الوقت، ص ۸۵

۶۔لکچروں کا مجموعہ، لکچر نمبر ۱۶، جلد اول ۔ص ۴۱۲

۷۔لکچروں کا مجموعہ، لکچر نمبر ۳۶، جلد دوم ۔ص ۲۹۹

۸۔لکچروں کا مجموعہ، لکچر نمبر ۱۱، جلد اول ۔ص ۲۶۔۲۷

۹۔لکچروں کا مجموعہ، لکچر نمبر ۱۲، جلد اول ۔ص ۳۲

۱۰۔لکچروں کا مجموعہ، لکچر نمبر ۱۱ جلد اول، ص ۴۲۳

۱۱۔ڈپٹی نزیر احمد، ابن الوقت ۔ص ۱۴۷

۱۲۔عبداللہ یوسف علی، انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ ۔ص ۱۵۹۔۱۶۰

۱۳۔محمد عارف ڈاکٹر، پروفیسر، اردو ناول اور آزادی کے تصورات ۔ص ۲۵

۱۴۔ایضاً، ص ۳۰۲

۱۵۔ڈپٹی نذیر احمد، ابن الوقت، مرتبہ سبط حسن۔ص ۱۲۹

۱۶۔ڈپٹی نذیر احمد، مراۃ العروس مشمولہ مجموعہ ڈپٹی نذیر احمد۔ص ۹۳۵

۱۷۔ڈپٹی نذیر احمد، بنات النعش مشمولہ مجموعہ ڈپٹی نذیر احمد۔ص ۵۸۷

۱۸۔ڈپٹی نذیر احمد، مراۃ العروس مشمولہ مجموعہ ڈپٹی نذیر احمد۔ص ۹۲۵

۱۹۔ایضاً، ص ۹۶۷ ۲۰۔ ایضاً۔ص ۹۷۷

۲۱۔ڈپٹی نذیر احمد، ابن الوقت، مرتبہ سبط حسن، ص ۲

۲۲۔ایضاً،ص۱۰۲ ۲۳۔ ایضاً۔ص۱۰۲

۲۴۔ایضاً،ص۱۱۵ ۲۵۔ ایضاً۔ص۱۲۸

۲۶۔ڈپٹی نذیراحمد،فسانۂ مبتلا،مرتب پروفیسر افتخار احمد صدیقی،ص۱۱۳

۲۷۔ڈپٹی نذیراحمد،ابن الوقت مرتبہ سبط حسن،ص۱۳۴

۲۸۔ایضاً،ص۱۳۹ ۲۹۔ ایضاً،ص۱۳۹

۳۰۔ڈپٹی نذیراحمد،مراۃ العروس مشمولہ مجموعہ ڈپٹی نذیراحمد،ص۸۰۴

۳۱۔ایضاً،ص۸۰۴

۳۲۔ڈپٹی نذیراحمد،فسانۂ مبتلا مرتب پروفیسر افتخار احمد صدیقی،ص۱۷۸

۳۳۔ایضاً،ص۱۷۸

۳۴۔نذیراحمد،مرأۃ العروس۔ص۱۳۲

۳۵۔افتخار عالم بلگرامی،حیات النذیر۔ص۱۳۹

۳۶۔مظہر مہدی،اردو دانشوروں کے سیاسی میلات۔ص۱۳

۳۷۔بحوالہ شمیم حنفی،اردو کلچر اور تقسیم کی وراثت۔ص۱۸۶

۳۸۔پروفیسر قاضی جمال حسین،اردو ادب کا تہذیبی اور فکری پس منظر۔ص۱۷۴

۳۹۔بحوالہ محمد حسن عسکری،ستارہ یا بادبان۔ص۱۰۴۔۱۰۳

۴۰۔پروفیسر قاضی افضال حسین،داستان کی نئی قرأت۔ص۴۱

۴۱۔پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی،ہندوستان میں سماجی اصلاح کی تحریکات۔ص۱۹۔۱۸

۴۲۔بحوالہ عقیل احمد صدیقی،نذیراحمد اور کولونیل ڈسکورس کی مزاحمت۔ص۹۴

۴۳۔سید افتخار عالم بلگرامی،حیات النذیر۔ص۵۶۵

۴۴۔ناصر عباس نیر،معنی واحد اور معنی اضافی کی کشمکش،مشمولہ فکر و نظر سہ ماہی،مارچ ۲۰۱۴۔ص۲۳

۴۵۔ڈپٹی نذیراحمد،مرأۃ العروس۔ص۱۲۳

۴۶۔نذیراحمد،مرأۃ العروس۔ص۲۰

۴۷۔ایضاً،ص۱۹۳

۴۸۔ڈپٹی نذیراحمد، بنات النعش ۔ص۳۰

۴۹۔ایضاً،ص۱۲۰ ۵۰۔ایضاً،ص۱۰۷۔۱۰۶

۵۱۔ایضاً،ص۱۳۰ ۵۲۔ایضاً،ص۱۳۵

۵۳۔ایضاً،ص۱۳۷ ۵۴۔ایضاً،ص۱۳۸

۵۵۔بحوالہ شمیم حنفی،اردو کلچر اور تقسیم کی وراثت ۔ص ۱۸۶

۵۶۔ڈپٹی نذیراحمد،ابن الوقت ۔ص۵۵۔۲۵۴

۵۷۔ایضاً،ص۲۵۲

۵۸۔فرانز فینن ،افتادگان خاک ۔ص۱۴۔۱۳

۵۹۔ڈپٹی نذیراحمد،ابن الوقت ۔ص۱۴۸

۶۰۔ایضاً،ص۱۳۸

۶۱۔محمد نذیراحمد ڈپٹی کلکٹر، دیباچہ توبتہ النصوح ۔ص۸۷

۶۲۔محمد نذیراحمد ڈپٹی کلکٹر،توبتہ النصوح ۔ص۸۷

۶۳۔ایضاً،ص۱۳ ۶۴۔ایضاً،ص۲۰۸

۶۵۔ایضاً،ص۲۰۷

۶۶۔محمد نعیم،اردو ناول اور استعماریت۔ص۵

۶۷۔ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی،شعورِفن،ص۱۸۴

۶۸۔ڈاکٹر علمدار حسین بخاری،نوآبادیاتی ڈسکورس اور فکشن : مماثلتیں اور امتیازات معیار شمارہ ،۸۔ص۷۱

۶۹۔ڈاکٹر سہیل بخاری،اردو ناول نگاری۔ص۴۹

۷۰۔ڈپٹی نذیراحمد،ابن الوقت ۔ص۴۸

۷۱۔ایضاً،ص۹۰

۷۲۔ڈپٹی نذیر احمد،فسانۂ مبتلا۔ص ۳۵

۷۳۔ڈپٹی نذیر احمد،ابن الوقت۔ص ۳۱

۷۴۔ڈاکٹر علمدار حسین بخاری، برصغیر میں جدید ادب کا سماجی تناظر اور نیا متوسط طبقہ،مشمولہ تخلیقی ادب ،شمارہ ۹۔ص ۲۱۸

۷۵۔نذیر احمد،مراۃ العروس۔ص ۸۶

۷۶۔ایضاً،ص ۱۵۵

۷۷۔دیوندر اسر،نئی صدی اور ادب۔ص ۱۳۵

۷۸۔ایڈورڈ سعید،ثقافت اور سامراج مترجم یاسر جواد۔ص ۶۱

۷۹۔ڈاکٹر ناصر عباس نیر،نوآبادیاتی صورت حال مشمولہ لسانیات اور تنقید۔ص ۲۴

۸۰۔مشتاق حسین،سر سید احمد خان،خطوط سر سید احمد خان۔ص ۱۸۔۱۷

۸۱۔ابوالکلام قاسمی،نوآبادیاتی فکر اور اردو کی ادبی و شعری نظریہ سازی۔ص ۱۸۸،ص ۱۹۷

۸۲۔ڈپٹی نذیر احمد،ابن الوقت،ص ۵

۸۳۔ابوالکلام قاسمی ،نوآبادیاتی فکر اور اردو کی ادبی وشعری نظریہ سازی مشمولہ مابعد جدیدیت ،اطلاقی جہات۔ص ۱۹۶

۸۴۔ڈپٹی نذیر احمد،ابن الوقت۔ص ۹۔۵

۸۵۔ایضاً،ص ۴۹۔۴۶

۸۶۔ ایضاً،ص ۶۱۔۵۸

۸۷۔ایضاً،ص ۷۰

۸۸۔ ایضاً،ص ۹۰۔۸۴

۸۹۔اکبر الہ آبادی،کلیات اکبر الہ آبادی۔ص ۷۸

۹۰۔ڈپٹی نذیر احمد،ابن الوقت۔ص ۱۰۹

۹۱۔ابوالکلام قاسمی،نوآبادیاتی فکر اور اردو کی ادبی وشعری نظریہ سازی مشمولہ مابعد جدیدیت،اطلاقی جہات۔ص ۱۹۷۔۱۹۶

# محاکمہ

نوآبادیاتی نظام سے مراد ایسا نظام ہے جس میں کوئی ملک کسی دوسرے خودمختار علاقہ پر تسلط قائم کر کے اسے اپنی آبادی بنا لیتا ہے۔نوآبادیات کا تصور ایک ایسا تصور ہے جس میں ایک ملک، خطہ کی تاریخ و تقدیر بدل جاتی ہے۔نوآبادیات میں بنیادی طور پر دو کردار کارفرما ہوتے ہیں۔ایک فاتح کی حیثیت سے وارد ہوتا ہے جسے ''نوآبادکار'' کہا جاتا ہے اور دوسرا کردار مفتوح کا جسے نوآبادی یا نئ آبادی کہا جاتا ہے۔یہ ایک نئ آبادی جس کا اپنا مال و متاع بھی اپنا نہیں ہوتا اور نہ اپنے قوانین ہوتے ہیں، پابند ہو جاتی ہے اور نوآبادکار ایک امام کی صورت میں اور نوآبادی مقتدی بن جاتی ہے۔برصغیر میں انگریز نوآبادکار نے مختلف حوالوں سے اثرات مرتب کیے۔نوآبادیاتی عہد میں تو وہ اثرات طاقت کے زور پر جب کہ مابعد عہد میں وہ مخصوص ذہن سازی کے تحت اپنا اثر دیکھا رہے ہیں۔

مابعد نوآبادیات کا مطالعہ اصل میں ان حربوں، تدبیروں اور حکمت عملیوں کا مطالعہ ہے جن کی مدد سے یورپی ملکوں کا دنیا کے بڑے رقبے پہ قبضہ ہوا اور اس کے اثرات اتنے گہرے تھے کہ ان ملکوں کی ثقافت، معاشی ڈھانچے، سیاسی طریقہ کار اور زبان و ادب آزاد ہونے کے باوجود نہ تو اپنی شناخت قائم کر پائے ہیں اور نہ ان اثرات سے نکل پائے ہیں۔اسی طرح انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے آپ کو ہندوستان میں مظبوط کیا اور ۱۸۵۷ء میں مرکزی سرزمین پہ فتح کا جھنڈا گاڑا۔انہوں نے نوآبادیاتی کالونیاں بنائیں اور آبائی وطن کے لئے وسیع پیمانے پر اجارہ دارانہ کاروبار کیا۔ویسے تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے دورے تو سترھویں صدی سے ہی شروع ہو گئے تھے اور اس تجارتی کمپنی نے حکومتی حیثیت تک کا سفر اٹھارویں صدی نصف تک مکمل کیا۔اس عمل کا باقاعدہ آغاز جنگِ پلاسی سے ہوا۔ایسٹ انڈیا کمپنی نے یہ حکمت عملی اپنائی کہ جو علاقہ بھی فتح کرنا ہوتا سب سے پہلے وہاں کے منتخب افراد سے تعلقات قائم کئے جاتے تھے۔کیونکہ یہ افراد اس علاقے میں لوگوں کے اندر اثر و رسوخ رکھتے تھے۔ان افراد کے تعاون سے مقامی آبادی میں موجود حکمران کے خلاف فضا قائم کی جاتی تھی اور مقامی آبادی کی رائے کمپنی کے حق میں لی جاتی تھی۔

مابعد نوآبادیاتی ادب اور تنقید کا آغاز نوآبادیاتی تسلط کے دوران میں اور بعد ازاں اس کے خلاف

مزاحمت کے رویوں اور طریقوں سے ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ مابعد نوآبادیاتی رجحان کسی نہ کسی صورت میں اسی وقت سے شروع ہوا جب غلام ملکوں نے نوآبادیاتی نظام کے خلاف مزاحمتی تحریکیں شروع کیں۔ یہ رجحان تاریخی، سیاسی، تہذیبی اور ادبی سطح پر تقریباً ایک ساتھ ہی شروع ہوا اور اس کے تحت وہ تمام ممالک آتے ہیں جو تیسری دنیا کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ مابعد نوآبادیات کا بنیادی مقصد نہ صرف تہذیبی اور سیاسی سطح پر نوآبادیاتی نظام کو اُلٹ دینا ہے اور کی جگہ مقامی و ذیلی تہذیبی قدروں کا احیا ہے بلکہ اپنے ماضی کی شان دار قدروں کی بازیافت ہے۔

ایڈورڈ سعید اور دوسرے مفکرین نے اس کی ضرورت کو محسوس کیا اور ایسا مانا جاتا ہے کہ نوآبادیات کی شروعات ان کی مشہور کتاب 'اورینٹلزم' (شرق شناسی) سے ہوئی۔ اس کتاب میں انھوں نے نوآبادیاتی اندازِ فکر کو زیادہ مربوط اور منضبط انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ سعید کا ماننا ہے کہ علمی، ادبی، ثقافتی اور فنی ترقیوں کے پیچھے حکمراں قوم کی اپنی غرض و غایت ہوتی ہے اور اپنی قوت کو مستحکم کرنے کے لیے وہ علمی میدان میں بھی ایسی ہی صورت پیدا کرتے ہیں جو ان کی حکمرانی کو مزید استحکام بخشے۔

مابعد نوآبادیات ایک علمی، عقلی اور نظریاتی نظریہ ہے جو ہندوستان آزاد ہونے کے بعد ابھر کر سامنے آیا۔ جو تحریک ایشیا، افریقہ اور جنوبی امریکہ میں چل رہی تھی، جو رہنما نوآبادیات کے خلاف تھے مثلاً گاندھی، ٹیگور، سیسیر سینگھور، کیب رال، فینن وغیرہ ان کی تحریک نے لوگوں میں انقلاب پیدا کیا اور یہ نظریہ وجود میں آیا۔

مابعد نوآبادیاتی مطالعہ اس امر پر دال ہے کہ بیرونی حکومتیں نہ صرف یہ کہ دورِ حکمرانی میں ذہن و دماغ کو متاثر کرتی ہیں بلکہ حکمرانی کے خاتمے کے بعد بہت سارے ایسے دیرپا اثرات چھوڑ جاتی ہیں جن سے نکلنا مشکل ہوتا ہے، پھر نسلی امتیازات کی جو لکیریں واضح طور نظر آتی اس کی وجہ یہ ہے کہ ذہن و دماغ آج تک اس فرق کو مٹانے کے لیے تیار نہیں ہے کہ جو سفید ہیں وہ سیاہ کے مقابلے میں اہم تر ہیں۔ پروفیسر وہاب اشرفی لکھتے ہیں کہ "ہندوستان کے تناظر میں انگریزوں کی خدمت پر نگاہ ڈالی جائے تو بالائی سطح پر یہی کہا جائے گا کہ انگریزوں نے بہت سارے معاملات میں ہماری آنکھیں کھول دیں، نئے علوم کے دروازے وا کیے، نئی زندگی کے اسباق سکھائے، نئے ولولے سے ہم کنار کیا۔ ممکن ہے یہ بات

جزوی طور پر درست ہو لیکن کی اس امر سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ آزادی کے اتنے عرصے بعد ذہنی غلامی کا طوق ہم اپنی گردن سے نکال کر پھینک نہ سکے اور احساس کم تری کا جو انداز رہا وہ آج بھی اسی طرح قائم ہے بلکہ کہ ایسے رجحانات کو تقویت مل رہی ہے۔

انگریزوں کی آمد کے بعد برصغیر میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے جسے نو آبادیاتی دور کہا جاتا ہے۔نو آبادیات ایسی فتوحات ہوتی ہیں جن میں کوئی بھی طاقتور ملک اپنی سرحدوں سے باہر وسعت کی خاطر مفتوحہ اقوام کی مرضی کے خلاف اقتدار قائم کر کے ان پر اپنی مرضی و منشاء ٹھونستا ہے۔ یہ ایسا غیر ملکی تسلط ہوتا ہے جس میں براہ راست مقامی باشندوں کے بجائے کوئی ملکی یا بدیسی طاقت اقتدار پر براجمان ہو کر سیاسی ،سماجی اور معاشرتی سطح پر کئی قسم کی تبدیلیاں لے کر آتی ہے۔

برصغیر میں نو آباد کار کی آمد کے بعد ایک مختلف نوعیت کے پیٹرن نے انفرادی اور اجتماعی طور پر مقامی آبادی کو مغلوب کرنے کی کوشش کی۔ یہ عمل اٹھارویں صدی کے اواخر میں شروع ہوا۔ جب مغرب کے تہذیبی اور علمی سانچے انتشار کا شکار مشرقی تہذیب کے متبادل کے طور پر پیش کیے جانے لگے اور ایک ثقافتی فضا پر دو جذبیت ،گومگوئی اس درجہ غالب ہوئی کہ اس زمانے کی علمیت میں بھی سرایت کرتی محسوس ہوتی ہے۔ یہ اس بات کی علامت بھی تھی کہ برصغیر کی سماجی ،سیاسی اور ثقافتی دنیا پر نو آبادیات کس درجہ چھائی ہوئی تھی۔ یہ دو جذبیت یا گومگوئی ایک نفسی صورت حال ہے جو کسی ایک معروض کے دو متضاد و متصادم جذبات و خیالات سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ منتشر ،مرتکز یا تذبذب کسی بھی حالت میں ہو سکتی ہے۔اس سے ایسا احساس محرومی بھی جنم لیتا ہے جو معروضی اور موضوعی دونوں سطحوں پر نقصان دہ ہے۔

جب یورپی اقوام نے نو آبادیاتی نظام کی بنیاد ڈالی اور مختلف مما لک میں اپنے اقتدار کو مستحکم کیا تو انہیں اپنے سیاسی اقتدار اور سماجی و معاشرتی برتری کے لیے اخلاقی جواز کی تلاش ہوئی کہ جس کی بنیاد پر وہ اپنے محکوموں کے استحصال کو جائز قرار دے سکیں۔ یوں انہوں نے 'سست اور کاہل مقامی باشندے' کا نظریہ پیش کر کے مقامی باشندوں کے استحصال کا جواز حاصل کیا۔نو آبادیاتی نظام کا مشاہدہ کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ اس نظام کا نقطۂ اساس ہی یہ ہے کہ دنیا میں نسلیں اور قومیں باہم تفریق کی حامل ہیں کچھ اعلیٰ و برتر اور مہذب جب کہ کچھ پسماندہ اور غیر مہذب۔اب اس نظریے کی رو سے مہذب اور اعلیٰ اقوام کی ذمہ

داری ہے کہ وہ باقی سب اقوام کو مہذب بنائیں۔اس نظریے کے تحت اہل ہندوستان بھی غیر مہذب قرار پائے اور انگریزوں نے اس طرح کے حالات پیدا کیے کہ مقامی آبادی کو انگریزوں کی ثقافتی برتری کے احساس کا یقین ہو جائے اور ان میں اپنی تہذیب سے نفرت اور بیزاری پیدا ہو جائے۔ایسے میں وہ لوگ بھی جنھوں نے انگریزی تہذیب کو اپنانے کی کوشش کی وہ بھی انگریزوں ک طرف سے تحقیر کا شکار ہوئے۔

ان حالات میں برصغیر کے عوام میں پرانی شناختوں اور عظمتوں کے سنگ میل وقت کے سیلِ بیکراں میں بہہ کر ماضی کے تاریک اور گہرے سمندر میں گم تو ہونا شروع ہو گئے تاہم ان کے ذہنوں میں حکمرانوں کے حقارت آمیز اور منافقانہ رویے سے مایوسی سی پیدا ہوئی۔یوں مقامی نوجواں ذہنی تشکیک کا شکار ہو گیا اور ان دونوں سماجی وفکری رویوں کے نتیجے میں تہذیبی بحران نے جنم لیا۔اس تہذیبی بحران نے ہندوستانیوں کو داخلی کشمکش، روحانی کرب، اعصابی ہیجان اور احساس محرومی کے گہرے احساس میں مبتلا کر کے اس نسل کو انفرادی انتشار کے ساتھ ساتھ اجتماعی آشوب سے بھی ہم کنار کیا۔اس تہذیبی بحران کا نوآبادیاتی حکمرانوں نے بھر پور فائدہ اٹھایا کیونکہ ایک تو انہوں نے مقامی آبادی کو اپنی تہذیب سے متنفر کیا دوسری طرف ان کے اذہان میں یہ تصور بھی راسخ کیا کہ ان کی ترقی اور خوشحالی کا راستہ دساوری تہذیب کو اپنانے میں ہی ہے۔یوں اس پالیسی سے نوآبادیاتی حکمرانوں نے اپنا اقتدار تو مستحکم کیا مگر مقامی آبادی کو دوجذبیت اور گومگوئی کیفیت کا شکار کر کے ان کے لیے نئی مشکلات کھڑی کر دیں اور آنے والے دور میں اس پالیسی کے نہایت گہرے اثرات مرتب ہوتے چلے گئے۔

نوآبادیاتی عہد میں جن علمی شعبوں پر خصوصی توجہ دی گئی ان میں ایک استشراق بھی ہے۔استشراق یا اورینٹلزم (مشرق شناسی) ان مطالعات کا نام ہے جو اہل مغرب مشرقی زمین کے ادیان، زبان، تاریخ اور ادبیات کے بارے میں انجام دیتے ہیں۔یہ سامراج کی ایک ضرورت تھی کہ وہ محکوم اقوام کی ثقافت، تہذیب، تاریخ اور اذہان کو سمجھنے اور پھر ان مستشرقین کی حاصل کردہ معلومات کی روشنی میں اپنے نوآبادیاتی علاقوں کے محکوم عوام پر اپنا تسلط مستحکم کرنے کے لیے لائحہ عمل ترتیب دے سکے۔

ایڈورڈ سعید کا یہ مؤقف بھی قابل غور ہے جس میں وہ اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ ان مستشرقین اور مغربی مفکرین نے مشرق، مشرق وسطیٰ اور مسلمانوں کی تہذیبوں کا مطالعہ خالصتاً سیاسی

مقاصد کے پیش نظر کیا ہے۔ ہندوستان پر انگریزوں کی حکمرانی کے عہد میں جان گلکرسٹ، گارسیں دتاسی ،سر ولیم جونز،بنجمن شلزے، جوشوا کٹیلر ، براؤن، جان شیکسپئر، پروفیسر آرتھونی، آلوئیس شپرینگر، بامریورگ شٹال، الیگزنڈر باؤسانی وغیرہ کئی نامور مستشرقین ادبی افق پر نمایاں ہوئے۔

مگر تصویر کا دوسرا رخ بھی سامنے رکھنا ضروری ہے جس کے مطابق ہمیں اس بات کو بھی ذہن نشین کرنا چاہیے کہ سب مستشرقین کی نیت پر شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ سب نے اپنے سیاسی مفادات کو مقدم نہیں رکھا اور نہ ہی اپنے مخصوص نظریات کا پرچار کیا۔ بلکہ ان میں سے کئی مستشرقین نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ مشرق کی تاریخ، کلچر، زبان اور علم و دانش کے ماخذ کو تلاش کرنے میں صرف کیا اور قیمتی علمی سرمائے اور گم شدہ دانش کے سرمائے کا کھوج لگا کر اسے مدفون ہونے کے بجائے منظر عام پر لا کر عوام کے استفادے کے لیے پیش کیا۔ جان گلکرسٹ، گارساں دتاسی، سر ولیم جان، شیکپئر، ڈنگن فوربس، گراہم بیلی۔ جان پیلٹس وغیرہ کی طویل فہرست ہے جنہوں نے اس ضمن میں قابل قدر خدمات سرانجام دیں۔

یقیناً نوآبادیاتی عہد میں تحریر کیے جانے والے ناولوں کے صفحات پر ابھرنے والی ہر عبارت غیر ارادی نہیں بلکہ ارادی اور شعوری ہونے کے ساتھ منشائے مصنف کے تابع ہوتی ہے اور اس متن کو سمجھنے کے لیے اس کے مخصوص کوڈز کو بھی سمجھنا ضروری ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مابعد نوآبادیاتی مطالعے اس امر کے بھی شاہد ہیں کہ استعمار یا نوآبادکار اپنے عہد حکمرانی میں مقامی آبادی کے قلوب و اذہان کو نہ صرف متاثر کرتے ہیں بلکہ نوآبادیاتی عہد کے خاتمے کے بعد اپنے اثرات کچھ اس انداز میں چھوڑ جاتے ہیں کہ ان کے نقوش تادیر قائم رہتے ہیں ۔ یہ بات خالی از دلچسپی نہیں کہ اردو کا پہلا ناول مراۃ العروس (۱۸۶۹ء) نوآبادیاتی یا استعماری حکومت کی طرف سے انعامی اعلان کے جواب میں لکھا گیا۔

انگریزوں کی برصغیر میں آمد اور اسے اپنے مفتوحہ علاقہ قرار دینے کے بعد ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی نہایت اہم واقعہ ہے۔ اس نے نہ صرف ہماری سیاسی تاریخ کا رخ موڑا بلکہ ہمارے شعور اور رویوں کو بھی تبدیل کر دیا۔ ایک ایسی فضا قائم ہوئی جس کے نتیجے میں ایسے ہندوستانی تعلیم یافتہ نوجوان پیدا ہوئے جو رنگ و نسل کے اعتبار سے ہندوستانی اور کردار و روح کے اعتبار سے برطانوی سامراج کا نوآبادیاتی نمونہ تھے۔ ایسے ماحول میں ایک خاص نوآبادیاتی صورت حال وضع کی گئی جو محض عسکری قوت

کے ذریعے ممکن نہیں تھی۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی محض عسکری اور سیاسی جنگ نہیں تھی بلکہ ''مقامی اور غیر مقامی'' دو تہذیبوں کے درمیان ایسی آخری کشمکش تھی جس میں دساوری تہذیب فتح یاب ہوئی۔یہی وہ نقطۂ آغاز تھا جس نے بعدازاں تاجری سے تاجوری کی شکل اختیار کر لی۔برصغیر کے عوام اب براہ راست مغربی اثرات کی زد میں آ گئے۔نئی تہذیب کا وہ قافلہ جو آہستگی سے چل رہا تھا اچانک برق رفتاری سے رواں دواں ہو گیا اور انگریزی حکومت کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب پورے ملک پر چھا گئی۔مغربی تعلیم کے سب سے زیادہ اثرات طرزِ معاشرت پر پڑے۔زندگی کے ہر پہلو میں مغرب کی نقالی شروع ہوگئی۔معاشرت بدیسی تہذیب کا چربہ بن گئی اور مضحکہ خیز بابو والی صورت حال پیدا ہوئی۔

اس قسم کے تاثرات کا سب سے قوی محرک ذہنی غلامی ہے اس حوالے سے البرٹ میمی نے کچھ نفسیاتی عوامل کا ذکر کیا ہے جو ایک مغلوب قوم پر احساس کمتری کی وجہ سے اثر انداز ہوتے ہیں۔مغلوب قوم کے باشندوں کے بارے میں لکھا کہ چونکہ وہ ذہنی طور پر مرعوب ہوتے ہیں اور حاکموں کی تہذیب پر رشک بھی کرتے ہیں،اس لیے انہیں اپنے آقاؤں کی نقل کرنے میں ذہنی تسکین ملتی ہے۔۱۸۵۷ء کا واقعہ بھی ایک بڑا سیاسی انقلاب تھا اور جب بھی اس قسم کا بڑا سیاسی انقلاب رونما ہوتا ہے تو اپنے اقتدار کو استحکام اور دوام بخشنے کے لیے تہذیبی قوتوں کو بھی بروئے کار لاتا ہے۔اگر فاتحین کی تہذیب کسی بھی اعتبار سے جاندار ہے تو محکوم تہذیب کو پھلنے پھولنے کا موقع ملنے کے بجائے حاکمین کی تہذیب پھیلے گی۔انگریزوں کی آمد کے بعد برصغیر میں بھی کچھ اس قسم کی صورت حال پیدا ہوئی اور یہاں بھی ایک تبدیلی رونما ہوئی۔یہی وجہ تھی کہ مغربی فلسفہ،ادب،سیاست،جمہوریت اور معاشرت کے تصورات مقامی تہذیب میں نمایاں جگہ پانے لگے۔۱۸۶۹ء میں نہر سویز کے کھلنے پر ہندوستان کا رابطہ بیرونی دنیا سے آسان ہو گیا۔بیرونی دنیا میں اس وقت صنعتی انقلاب نے مذہب اور سائنس کو ایک دوسرے کا حریف بنا دیا تھا۔روحانیت کے خلاف مادیت صف آرا تھی۔جدید علوم کے ذریعے ایسے ہی تصورات نے برصغیر کے عوام کی معاشرت کو بھی متاثر کیا اور مذہب و سائنس کی یہ آویزش ادب میں بھی نمایاں ہوئی۔

نقادان فن اس امر پر متفق ہیں کہ کسی بھی تخلیق کار، فنکار، شاعر اور ادیب کی شخصیت پر اس کے

عہداور سماج کی گہری چھاپ ہوتی ہے۔اور یہ ایک فطری عمل بھی ہے کہ ہر فرد بشر جس ماحول اور عہد میں نشونما پاتا ہے اس کی شخصیت، اس کی ذات، اس کی فکر، اس کی سوچ اور اس کے فن پر اس کا گہرا عکس ثبت ہوتا ہے۔اس کی شخصیت اور اس کے کلام کو صحیح طریقہ سے سمجھنے کے لیے اس عہد کی تاریخ سے واقفیت ضروری ہے۔کسی بھی تخلیق کار کی شخصیت اور اس کے ذریعہ تخلیق کردہ ادب یا فن پارے پر کچھ تبصرہ کرنے سے پہلے یہ ضروری ہوتا ہے کہ اس کے عہد اور ماحول کا سیاسی، سماجی، ادبی، تہذیبی اور ثقافتی تجزیہ پیش کیا جائے تاکہ اس کے فن پاروں میں موجود اس عہد کے نقوش ابھر کر سامنے آجائیں۔تخلیق کار یا فن کار جس عہد میں پرورش پاتا ہے۔اس کے سیاسی و معاشرتی اثرات کو قبول کرتا ہے۔اور اس کے اردگرد اس کے افکار گردش کرتے ہیں۔اور اسی دائرہ عمل میں رہ کر وہ سماج یا معاشرے کو مثبت یا منفی انداز میں دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

یہ بات مسلم ہے کہ ہر دور اپنے سابقہ ادوار سے مربوط و منسلک ہوتا ہے۔ایسا نہیں کہ یک بہ یک زمانہ تبدیل ہو جائے اور یکبارگی کوئی ناگفتہ بہ حالات پیدا ہو جائیں بلکہ تبدیلئی ادوار کے اثرات جستہ جستہ دیکھنے کو ملتے ہیں۔جسے ایک مفکر، ایک دانشور، دوراندیش، فنکار، مئورخ و مبصر وغیرہ کی دوررس نگاہیں تاڑ جاتی ہیں۔اس تبدِ زمانہ کے اثرات کو ایک فنکار بخوبی محسوس کرتا ہے۔اور اپنے فن پاروں میں جابہ جا اس کا ذکر کرتا ہے۔

انسان سماج میں رہ کر ہی زندگی گذارتا ہے اور سماج میں رونما ہونے والی تبدیلیوں اور ضرورتوں سے بار آور رہتا ہے۔اپنے تجربوں کی بنیاد پر وہ اپنے سماج کا حال بیان ہی کرتا رہتا ہے کو شعری یا نثری شکل میں موجود تھے۔غرض یہ کہ سماج سے ادب کا رشتہ بہت گہرا ہے ہر فن کار قلم کار، شاعر وادب اپنے ارد گرد کے ماحول و حادثات سے متاثر ہو کر اپنے فن کے ذریعہ اس کا اظہار کرتا ہے۔اس لیے ادب میں بھی انسانی زندگی کی تہذیب اور کلچر کی عطاسی ہوتی ہے کو کہ ایک سماجی عمل بھی ہے۔اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ایک اچھا ادب وہی ہوتا ہے جس میں سماج کے حالات کا جائزہ لینا ہی پڑتا ہے۔کیونکہ ادیب یا شاعر کی زندگی سماج سے گھری رہتی ہے۔اور آئے دن سماج میں ہونے والی تبدیلیوں سے وہی سب سے زیادہ متاثر بھی ہوتا ہے۔

ادب براہ راست زندگی اوراس کے مسائل سے رو بہ رو ہوکر مستقبل کی راہیں ہموار کرتا ہے۔ سماج کی ترقی اور بہتری کا بہترین وسیلہ بھی ادب ہی ہے کیوں کہ وہ سماج سے فیضان حاصل کرتا ہے۔ اور پھر اسی زندگی اور سماج کو فیضیاب بھی کرتا ہے۔ ادب چاہے شاعری کی شکل میں یا نثر کی صورت میں کہیں نہ کہیں سماج سے جڑا ہوتا ہے۔ شاعری کی مختلف اصناف چاہے وہ موضوعاتی ہوں، مرثیہ یا قصیدہ، رباعی یا پھر جدید نظم یا غزل سبھی سماج کے عقائد، رسوم اور روایتوں کے غماز ہیں۔ وہیں نثری اصناف میں مضمون ہو یا داستان، ناول ہو یا افسانے، انشائیہ ہو یا خطوط یا پھر سفرنامے ہر صنف میں سماج کا عکس نظر آتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہیں کہ ادب اور سماج ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ ادب کی تعمیر و تشکیل میں ہر دور کے تقاضوں، ضرورتوں، بدلتی ہوئی سماجی، ادبی ولسانی، تہذیب کی جھلکیاں جلوہ گر ہوتی ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد کے سن شعور کو پہنچنے سے قبل اور اس کے بعد کئی اصلاحی، سیاسی، سماجی اور مذہبی تحریکیں وجود میں آ چکی تھیں۔ ان تحریکات نے اس وقت کے سیاسیات اور سماجیات پر بہت حد تک اپنا اثر چھوڑا۔ نذیر احمد کے فکر وفن اور شعور کی بالیدگی ہمیں کہیں نہ کہیں جزوی یا کلی طور پر ان تحریکات کے اثرات مرتب ہیں۔ کیوں کہ نذیر احمد بھی اس وقت کے سماج کا ایک فرد ہے اور سماج پر ان کے اثرات نمایاں طور پر دیکھنے کو ملتے ہیں۔

اردو ناول میں ڈپٹی نذیر احمد کی انفرادیت بنیادی طور پر ایک ناول نگار کی حیثیت سے مسلّم ہے۔ انھوں نے کل سات ناول لکھے ہیں۔ یہی انکا سب سے اہم کارنامہ ہے، اس سلسلے میں نذیر احمد نے صرف اتنا ہی نہیں کیا کہ اردو زبان کو اس نئی صنفِ قصہ سے روشناس کرایا بلکہ اس کو فکر وفن دونوں اعتبار سے کافی بلندی پر پہونچا دیا، اکثر نقادوں نے ان کے ناولوں کو اصلاحی اور مقصدی کہا ہے، لیکن یہ بات اس لئے درست نہیں ہے کہ یہ دونوں خصوصیات کم وبیش دنیا کے ہر قسم کے ناولوں میں مل سکتی ہیں۔ دنیا کے تمام ناول کسی نہ کسی قسم کی اصلاح ضرور کرتے ہیں اور انکا کچھ نہ کچھ مقصد ضرور ہوتا ہے، دوسرے نذیر احمد کے تیس پینتیس سال کے طویل عرصے پر پھیلی ہوئی ناول نگاری میں ناول کی متعدد قسمیں احاطۂ تحریر میں آ گئی ہیں، تعلیم، تہذیب وتمدن، معاشرت، نفسیات اور تاریخ ان کے ناولوں کے اہم موضوعات ہیں لیکن ان تمام قسم کے ناولوں میں دو ایک باتیں قدر مشترک کا درجہ رکھتی ہیں، وہ ہیں تربیت خاندان اور مذہب

،اصلاحِ معاشرہ اور تربیت خاندان کو انھوں نے زیادہ اہمیت دی ہے۔اس لیے ڈپٹی نذیر احمد کے تمام ناول گھریلو کہے جاسکتے ہیں۔اس لحاظ سے وہ انگریزی زبان کی مایۂ ناز ناول نگار جین آسٹین سے ایک طرف اور جارج ایلیٹ سے دوسری طرف بہت قریب ہوجاتے ہیں۔جین آسٹین کی ناول نگاری کا کینوس محدود ہے اور جارج ایلیٹ مذہبی اور فلسفیانہ خیالات کی مدد سے اپنے ناولوں کے کنویس کو کافی وسیع کر دیتی ہے۔دونوں کے اثر سے نذیر احمد کی یہ قدر مشترک کافی وسیع معنی اختیار کرلیتی ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں طبقاتی کشمکش ،ذہنی تصادم اور ذاتی ٹکراؤ کا احساس بھی ملتا ہے اور انسانی رشتوں کے سبھی روپ ان کے ناولوں میں پیش کئے گئے ہیں۔اس طرح نذیر احمد نے قدیم قصوں کی روش کو چھوڑ کر ایک نئی روش ہی اختیار نہیں کی بلکہ انسانی زندگی کو اپنے قصے کا موضوع بنایا اور انھوں نے ناول کے فنی رموز و اسرار کے کئی ہفت خواں بھی سر کر لئے ،ان کا فن آہستہ آہستہ ارتقائی منزلیں طے کرتا گیا اور آخر میں چند اہم ناول وجود میں آئے جو فنی اور فکری ہر دو لحاظ سے مکمل کہے جاسکتے ہیں۔

ان کے یہاں پکارسک قصے کی خصوصیت نہیں ملتی بلکہ گھریلو اور معاشرتی ناولوں کی خوبیاں ملتی ہیں ،اس لحاظ سے ان کے ناول مہماتی نہیں دراصل ان کے ناول رومان سے حقیقت نگاری کی طرف ایک واضح سفر کا احساس دلاتے ہیں ،اسی طرح ان کے ناول داستانوں کے عشقیہ واقعات سے بھی کھلا ہوا انحراف کرتے ہیں جو سرتا سر روایتی اور حقائق سے بے تعلق ہوتے تھے،یہی نہیں نذیر احمد اس بات کا اہتمام بھی کرتے ہیں کہ عشق ایک بنیادی موضوع کی حیثیت سے ان کے ناولوں میں جگہ نہ پائے۔اس لحاظ سے نذیر احمد پریم چند سے بھی بڑھ کر حقیقت نگار تھے۔نذیر احمد نے بجا طور پر رومان اور حقیقت نگاری کے امتیاز کو سمجھ لیا تھا۔اصغری و اکبری کے بعد ان کے نسوانی کرداروں میں برابر ارتقا ہوا ہے۔ان کے یہ کردار زندگی کی حقیقتوں سے زیادہ ہم آہنگ ہوتے ہیں۔محمد کامل بھی ارتقائی منزلیں طے کرتا ہوا ابن الوقت اور صادق کی منزل تک پہنچ جاتا ہے،اس طرح ان کے مردانہ کرداروں میں بھی ارتقا ہوا ہے اور وہ سادہ کردار سے مدور کردار کے درجہ تک پہنچ جاتے ہیں۔

اس طرح نذیر احمد نے ناول نگاری کی متعدد روایتیں قائم کیں۔جن سے ان کے بعد ناول نگار وں نے کافی استفادہ کیا ہے۔انھوں نے زندگی کی بہت سی صحت مند قدروں کو اپنے ناولوں میں رواج دیا

اور اس دور کے انسانوں کے ذہن سے مردہ اور بے جان خیالات کو کھرچ کھرچ کر صاف کرنے کی کوشش کی ،انسانوں کو نیک اور صالح بننے کی تعلیم دی لیکن ان کے ناولوں میں بہت سی قدیم انسانی قدروں کے ٹوٹنے کا منظر بھی دکھائی پڑتا ہے ۔وہ اپنے ہر طرح کے کردار سے ایک سچے فنکار کی طرح دلی ہمدردی رکھتے تھے ۔ یہ غلط ہے کہ بعض کردار نذیر احمد کے معتوب کردار ہیں ۔ہاں وہ حقائق سے چشم پوشی نہیں کر سکتے تھے ۔وہ سمجھتے تھے کہ جس قسم کی بنیاد رکھی جائے گی اسی قسم کی تعمیر بھی ہوگی ۔ پختہ بنیادوں پر کوئی عمارت بنے گی تو پائیدار ہوگی ، جو آشیانہ شاخ نازک پر بنایا جائیگا وہ لامحالہ ناپائیدار ہوگا ،اس میں طوفان کو برداشت کر لینے کی صلاحیت نہیں ہوگی ۔اسلئے نذیر احمد اپنے ناولوں کے ذریعہ ہمیشہ صحت مند قدروں پر زندگی کی بنیاد رکھنے کے لیے واضح طور سے زور دیتے ہیں ۔

ڈپٹی نذیر احمد نے ہم کو زندگی کے واقعات کو قصے میں ڈھالنے کے عمدہ طریقے بتائے ہیں ،مفروضات کو حقیقت بنانے کا گُر بتایا ہے ،کہانی اور قصے کو بیان کرنے کا دلچسپ انداز دیا ہے ۔ پلاٹ کی تعمیر کا عمدہ ڈھنگ سکھایا ہے کردار نگاری کی کئی اعلیٰ منزلیں طے کر کے ہمارے سامنے ہر قسم کے کرداروں کی عمدہ مثالیں قائم کی ہیں ،موضوعات کے انتخاب کا ڈھنگ بتایا ہے اور ان کو برتنے کا طریقہ بھی سکھایا ہے ۔

اپنے ناولوں کے ذریعے ڈپٹی نذیر احمد نے عورت کو سماج کا ایک قابل فخر سرمایہ ثابت کرنے کی کوشش کی اور صنف نازک کی ترقی کی راہ میں جو موانع تھے ،ان پر کڑی نکتہ چینی کی ،انھوں نے عورتوں کو تعلیم حاصل کرنے کا مشورہ دیا تاکہ وہ سماج کی تعمیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے سکیں ،اس طرح نذیر احمد کا احسان اردو زبان ہی تک محدود نہیں ہے اور نہ کسی ایک طبقہ یا مذہب کے لوگوں تک محدود رہ جاتا ہے بلکہ وہ تمام امتیازات سے بلند ہو گیا ہے اور پورے انسانی سماج کے لیے ہے ،اس لئے ان کے ناولوں کو محدود اور ایک طبقہ کے لیے وقف کر دینا درست نہیں ہے ۔اس کا کھلا ثبوت یہ ہے کہ ان کے اکثر ناولوں کو بلا تخصیص مذہب و ملت ملک اور قومیت ہر مکتبۂ فکر کے لوگوں نے پڑھا اور اس سے استفادہ کیا ۔ان کے ناولوں کا متعدد زبانوں میں ترجمہ ہوا ۔

ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کو کسی ایک طبقہ کی عکاسی تک محدود نہیں کہہ سکتے ، یہ درست ہے کہ اس

میں اکثر متوسط مسلم خاندان کی بات کہی گہی ہے لیکن مزدور، کسان اور دوسرے نچلے طبقے کے لوگوں کا ذکر بھی آتا ہے اور اس میں اعلیٰ طبقے کی باتیں بھی کی گئی ہیں۔ دیہاتی زندگی کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ اس طرح اپنے ناولوں میں اس نقش کا آغاز نذیر احمد ہی نے کر دیا تھا جسکو بعد میں پریم چند نے اپنے ناولوں کے لئے پس منظر کی شکل میں مستقل طور سے قبول کر لیا۔ اس لئے میرے خیال میں پریم چند ذہنی طور سے نذیر احمد سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ نذیر احمد اسی طرح محدود نہیں کہے جا سکتے جس طرح تھامس ہارڈی صرف ویسکس کے متعلق ناول لکھ کر بھی کسی طرح محدود نہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد نے علی گڑھ تحریک کے اثر سے مسلم طبقے کے ایک محدود کنویس کو لیا اور پریم چند نے پورے ہندوستان کو لیکن پریم چند کی طرح نذیر احمد کے اس فریم کو پورے ہندوستان ہی نے نہیں بلکہ یورپ نے بھی سینے سے لگایا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ نذیر احمد کا کنویس بادی النظر میں محدود ہوتے ہوئے بھی تمام انسانی سماج کی وسعتوں پر چھا جاتا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد ایک آزاد مفکر تھے اور ایک ایسا مفکر کسی ایک جگہ قید نہیں کیا جا سکتا ہے نذیر احمد نے چند در چند پابندیوں کے ہوتے ہوئے بھی آزادئ فکر حاصل کر لی تھی۔ یہ انکا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ بلاشبہ پریم چند نے اپنے موضوعات اور افکار کے اعتبار سے ساری قوم اور پورے ملک کے لیے تھے لیکن اس لحاظ سے نذیر احمد تو ساری دنیا کے لئے تھے، مگر فنی نقوش ان کے یہاں ضرور کچھ مدھم مدھم سے رہ جاتے ہیں جو پریم چند کے یہاں قمقموں کی طرح جل اٹھتے ہیں۔ اس لے نذیر احمد کی ارتقائی مشکل پریم چند کے یہاں ملے گی اور ان کے وارث بجا طور پر پریم چند ہیں جنھوں نے نذیر احمد کے تمام نقوش اپنے اندر اتار لئے تھے۔

ڈپٹی نذیر احمد کا زمانہ نوآبادیات کا زمانہ ہے۔ مابعد نوآبادیات کا زمانہ ظاہر ہے کہ اس کے بعد والا زمانہ ہے۔ جہاں نوآبادیات کو استعماریت کہا جاتا ہے وہاں مابعد نوآبادیات کو لامحالہ مابعد استعماریت ہی کہا جائے گا۔ یعنی استعماریت سے چھٹکارے کا دور۔ یہ کون سا دور ہے؟ دراصل استعماریت کا آغاز اگر ہیلن آف ٹرائے سے ہوتا ہے تو مابعد استعماریت کا آغاز یقیناً اس وقت کو کہا جائے گا جب دنیا سے کشور کشائی کا عملاً خاتمہ ہو گیا۔ غالباً یہ دوسری جنگ عظیم ہے جس کے بعد سے کسی ملک نے کسی دوسرے ملک پر ہمیشہ کے لیے زمینی قبضہ نہیں کیا، بلکہ پرانے قبضوں میں سے بھی اکثر ایک ایک کر کے چھوڑ دیے گئے

۔چناچہ مابعدنوآبادیات کا صحیح آغاز تو دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے کو ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔مابعدنوآبادتی ادب میں نوآبادیاتی دور میں لکھے گئے ادب کو مطالعے میں لایا جاتا ہے۔

ڈپٹی نزیراحمد کے عہد یعنی برٹش حکومت کے دور میں سماجی فضا کچھ اس قسم کی ہوگئی تھی کہ مسلمانوں ہی میں تین گروہ ہوگئے تھے۔ایک جو مغربی علوم وفنون تہذیب وتمدن میں رنگا ہوا تھا۔جس میں سرسید احمد خاں پیش پیش تھے اس مکتبِ خیال کی نمائندگی نذیراحمد کے ناول ''ابن الوقت'' کے ہیرو ابن الوقت سے ہوجاتی ہے۔دوسرا گروہ قدامت پرست علماء کا تھا جس میں اکبرالہٰ آبادی بھی شامل تھے۔اس مکتبِ خیال کی عکاسی اسی ناول کے اہم کردار حجتہ الاسلام سے ہوتی ہے اوران دونوں گروہوں کے درمیان ایک تیسرا گروہ وہ بھی تھا جو مغربی علوم وفنون سے استفادہ کرنے کے باوجود اپنی وضع قطع مذہبی احکام اور روایات کو بھی سینہ سے لگائے ہوئے تھا جس میں وہ کسی قیمت پر بھی کسی قسم کی تبدیلی نہیں چاہتا تھا۔اسی گروہ میں نذیراحمد کا شمار ہوتا ہے۔

اسی طرح ہندوستان میں برطانوی حکومت کے قائم ہونے پر انگریزوں میں بھی دومکتبِ خیال پیدا ہوگئے تھے۔ایک وہ جو ہندوستانیوں کو ترقی کی راہ پر گامزن دیکھ کر خوش ہوتا اور مسلمانوں کی تائید میں تھا۔نذیراحمد کے اسی ناول کا ایک ناول ایک معاون کردار نوبل صاحب اسی مکتبِ خیال کا آئینہ دار ہے ۔اس کے برعکس دوسرا گروہ وہ تھا جو ہندوستانیوں کو سیاسی سرگرمیوں میں آگے دیکھنا کسی قیمت پر بھی گوار نہیں کرتا تھا۔نذیراحمد کے اسی ناول کا ایک اور معاون کردار شارپ صاحب اسی مکتبِ خیال کا ایک فرد ہے ۔

غرض غدر کے بعد کا دور طبقاتی کشمکش ،مشرق ومغرب قدامت پرستی اور جدیدت ، پرانی قدروں اور نئی قدروں اور فلسفۂ جبر وفلسفۂ اختیار یعنی دوفکری معاشرتی اور اقتصادی نظاموں کے مابین ٹکراؤ ، تصادم اور کشمکش کا دور تھا جس کو ہم نذیراحمد کی تخلیقات ''ابن الوقت ،ایامیٰ اور رویائے صادقہ'' میں بآسانی محسوس کرسکتے ہیں۔

ڈپٹی نذیراحمد نہ صرف انگریز قوم اور انگریزی علوم کے دلدادہ تھے بلکہ ان کو تمام روئے زمین میں سب سے زیادہ دانش مند ،مہذب اور شائستہ قوم قرار دیتے ہیں ۔لہذا اس قوم کی طرز معاشرت سے

واقفیت پیدا کرنے کے لئے ایک انگریز خاندان کے حالات ہندوستانیوں کے لیے بطور نمونہ پیش کیے گئے ہیں کیونکہ نذیر احمد چاہتے تھے کہ اس طرز حیات کی تقلید و پیروی کی جائے یا اسے اپنا آئیڈیل بنایا جا سکے ۔اس ضمن میں ہندوستانی معاشرے میں مسلمان عورتیں اظہار رائے کی آزادی ،خلع کا حق اور عقد ثانی وغیرہ ان تمام حقوق سے محروم قرار دیتے ہوئے اس نظام حیات پر جا بجا تنقید کی ہے۔

نوآبادیاتی نظام میں محکوم طبقے کا اپنے آقاؤں سے مطابقت و مناسبت اختیار کرنا ضروری تھا لہذا اس طبقے کی اصلاح کے لیے معیاری نمونہ اپنے حاکموں کا طرز حیات تھا۔ڈپٹی نذیر احمد نے انھیں کے بتائے ہوئے طرز حیات کے مطابق اپنے معاشرے میں اصلاح وترمیم کی کوشش کی۔ان کے ناولوں میں عورتوں کی تعلیم کا معاملہ ہو یا آزادی نسواں کا ،اچھی بیوی کی صفات یا بچوں کی عمدہ تربیت کا ،انتظام و انصرام کی عمدگی کا ہر جگہ حاکم طبقے کو مثالی نمونہ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔اپنے دوسرے ناولوں کی طرح وہ ناول ''فسانۂ مبتلا'' میں مسلمانوں کی اخلاقی و معاشرتی زوال کو پیش کرنے کے لیے عورتوں کے موروثی حقوق کو تلف کر لینا ،نکاح کے معاملہ میں اظہار رائے کی آزادی کا نہ ہونا اور بیوہ کے نکاح ثانی کی ممانعت وغیرہ ہندوستانی مسلمانوں کی مختلف سماجی برائیوں کی نشاندہی کرتے ہیں اور اس ضمن میں وہ مغربی معاشرت کی خوبیوں کا ذکر کرتے ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد کی تحریریں بھی نوآبادیاتی فکر کی طرف ہندوستانی ردعمل کا ایک دلچسپ نقشہ پیش کرتی ہیں۔ڈپٹی نذیر احمد نے تفسیر لکھی ،لکچر دیے اور اردو میں ناول کی روایت استوار کرنے میں اساسی کردار ادا کیا۔واضح رہے کہ ایڈورڈ سعید نے مغرب میں پروردہ ناول کی صنف کو ہی اسلامی تصورِ کائنات کے منافی ثابت کیا ہے۔ڈپٹی نذیر احمد برطانوی اقتدار کو ہندوستانی کے لیے خدا کی رحمت تصور کرتے ہیں ،مگر چوں کہ انہوں نے ادبی اظہار کے لیے ایسی مغربی صنف نثر کا انتخاب کیا جس کی روایت سوائے داستانوں کے اردو میں نہ ہونے کے برابر تھی ۔شاید اسی لیے انہوں نے اپنے ادبی سرمائے کی تحقیر کا رویہ اختیار نہیں کیا ۔مگر قصہ نگاری کے تعلیمی اور سماجی مقاصد کا بار بار ذکر کرنے کے باوجود بھی اس فکر کے منفی اثرات سے اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھ سکے۔ان کو ناول لکھنے کی تو تحریک حکومت کی طرف سے انعام دیے جانے کے اعلان سے ملی ۔اس لیے جس حد تک ان سے ممکن تھا انہوں نے حکومت کے ضابطے کے مطابق اپنی تحریروں کو

ڈھالنے کوشش کی تاہم وہ آسانی سے نوآبادیاتی تہذیب کی کلی برتری کو قبول کرنے پر آمادہ نظر نہیں آتے ۔وہ اپنے ناولوں میں سماجی مسائل کی مرکزیت ضرور قائم رکھتے ہیں،مگر ساتھ ہی کرداروں اور مکالموں کی مدد سے اس ساری کشمکش کو بھی پیش کرنے کی کرتے ہیں جس میں وہ خود کو بحیثیت مصنف مبتلا و معلق پاتے ہیں۔وہ توبتہ النصوح میں نصوح اور کلیم کے کردار کے وسیلے سے مشرقی اقدار اور نئی مغربی فکر کے تصادم کو نمایاں کرتے ہیں اور شاید نہ چاہتے ہوئے بھی مغربی اقلیت پسندی اور آزادیٔ خیال کے نمائیدہ کردار کلیم کو زیادہ فعال،زیادہ توانا اور مستقبلیت کا نمائندہ بنا کر پیش کرتے ہیں ۔اپنی صفات کے اعتبار سے نصوح مشرقی طرزِ فکر کی اور کلیم نوآبادیاتی فکر کی نمائندگی کرتا ہے اور ناول پڑھتے ہوئے توبتہ نصوح کا کردار نیم خودسوانحی کردار ہونے کا بھی تاثر دیتا ہے مگر ناول کے انجام کے طور پر کلیم کی پسپائی نوآبادیاتی فکر کی پسپائی نہیں بن پاتی بلکہ اس کرادر کو ایک طرح کے المیاتی ہیرو جیسا ارتفاع مل جاتا ہے اسی طرح نذیر احمد کے ناول ابن الوقت میں ابن الوقت کا کردار دوسرے کردار نوبل کا وہ مثالی آدمی بنتا ہوا دکھایا گیا ہے جو نوآبادیاتی فکر کی سطحیت کی نمائندگی کرتا ہوا بھی معلوم ہوتا ہے،جب کہ اس کے بالمقابل حجتہ الاسلام کا کردار مشرقی اقدار یا مذہب کا نمائندہ ہے اس ناول میں ابن الوقت بقول ابوالکلام قاسمی کا کیریکچر تمسخر کا انداز اختیار کرنے کے باعث نوآبادیاتی فکر کے معاملے میں نذیر احمد کے تحفظات کو نمایاں کرتا ہے۔اسی طرح اپنے دوسرے ناولوں میں بھی نذیر احمد نوآبادیاتی فکر سے کبھی مغلوب ہونے اور کبھی مزاحمت کا انداز اختیار کرنے کا تاثر دیتے ہیں۔

# کتابیات

# کتابیات


1-احتشام حسین،سید،اردو ادب کی تنقیدی تاریخ،اردو بیورو،دہلی،۱۹۸۸ء

2-احتشام حسین،سید،ذوقِ ادب اور شعور،فروغ اردو،لکھنؤ،۱۹۵۵ء

3-احتشام حسین،سید،ادب اور سماج،اتر پردیش اردو اکادمی،لکھنؤ،۱۹۸۴ء

4-ارجن دیو،تہذیب کی کہانی جلد دوم،نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ،دہلی،۱۹۸۶ء

5-اشفاق احمد اعظمی،نذیر احمد۔شخصیت اور کارنامے،مکتبہ شاہراہ،اردو بازار دہلی،۱۹۷۴ء

6-اشفاق محمد خان،نذیر احمد کے ناول۔تنقیدی مطالعہ،ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ،۲۰۰۰ء

7-اشفاق سلیم مرزا،فلسفۂ تاریخ،نوآبادیات اور جمہوریت،سانجھ پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۴ء

8-اسلم پرویز،مرتبہ،مولوی نذیر احمد کی چار نایاب مطبوعات،انجمن ترقی اردو(ہند) نئی دہلی،۲۰۱۲ء

9-اعجاز علی،ارشد،نذیر احمد کی ناول نگاری،دی آرٹ پریس،پٹنہ،۱۹۸۴ء

10-افتخار عالم بلگرامی،سید،حیات النذیر،شمسی پریس دہلی،۱۹۱۴ء

11-افتخار احمد صدیقی،مولوی نذیر احمد۔احوال و آثار،مجلس ترقی ادب،لاہور،۱۹۷۱ء

12-اقبال،ڈاکٹر،ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر،مرغوب ایجنسی لاہور،۱۹۷۰ء

13-الطاف حسین حالی،مولانا،مجموعہ نظم حالی،ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ،۱۹۹۸ء

14-امتیاز عبدالقادر،علی گڑھ تحریک نوآبادیاتی مفاہمت یا مزاحمت،ھدایت پبلشرز اینڈ ڈسٹی بیوٹرس،نئی دہلی ،۲۰۱۹ء

15-اکبرالہ آبادی،کلیات اکبرالہ آبادی،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۳ء

16-انور سدید،ڈاکٹر،اردو ادب کی تحریکیں ابتدا تا ۱۹۷۵ء،کتابی دنیا،دہلی،۲۰۰۸ء

17-انور سدید،ڈاکٹر،اردو ادب کی مختصر تاریخ،عالمی میڈیا پرائیوٹ لیمٹیڈ دہلی،۲۰۱۴ء

18-ای۔ایم فارسٹر،ناول کا فن،مترجم ابوالکلام قاسمی،ایجوکیشنل بُک ہاؤس،علی گڑھ،۲۰۱۰ء
19-ایس پی گپت،ڈاکٹر گوپال کرشن اگروال،سماج شاستر،ایس بی پی ڈی پبلیشنگ،آگرہ،۲۰۰۹ء
20-ایڈورڈسعید،ثقافت اور سامراج،مترجم یاسر جواد،مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد،۲۰۰۹ء
21-ایڈورڈسعید،شرق شناسی،مترجم محمد عباس،مقتدرہ قومی زبان،پاکستان،۲۰۱۲ء
22-باری علیگ،کمپنی کی حکومت،دارالشور،لاہور،۱۹۹۹ء
23-بدرالنساءشہاب،ڈپٹی نذیراحمد کے ناولوں میں سماجی اقدار،دارالادب،۱۹۸۵ء
24-بشیراحمد،مولوی،مرتبہ،نذیراحمد کے لکچروں کا مجموعہ،مکتبہ جامعہ لیمیٹڈ دہلی،۱۹۰۸ء
25-بیورے نکولس،برطانوی ہندوستان کا مستقبل،مترجم ثمینہ راجہ،عظیم الرحمٰن فرقان،مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد،۲۰۰۷ء
26-قمر رئیس،ڈاکٹر،تلاش وتوازن،خرام پبلی کیشنز،۱۹۶۸ء
27-ٹائن بی،پروفیسر،دی ورلڈاینڈ دی ویسٹ،'دنیااور مغرب' مترجم ڈاکٹر حسین احمد پراچہ،نشریات لاہور ،۲۰۰۶ء
28-جیلانی کامران،انگریزی زبان اورادب کی تدریس میں قومی زبان کا کردار،مقتدرہ قومی زبان ،اسلام آباد،۱۹۸۵ء
29-حسین احمد،مدنی،برطانوی سامراج نے ہمیں کیسے لوٹا،طبع ششم،طیب پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۲ء
30-حمزہ علوی،جاگیرداری اور سامراج،مترجم،طاہر کامران،فکشن ہاؤس،لاہور،۲۰۱۲ء
31-ریاض ہمدانی،ڈاکٹر۔اردو ناول کا نوآبادیاتی مطالعہ،فکشن ہاؤس،لاہور،۲۰۱۸ء
32-ڈاکٹر ابوالیث صدیقی،آج کا اردوادب،انجمن ترقی اردو،علی گڑھ،۱۹۷۱ء
33-زینت احمد،ڈاکٹر،ڈپٹی نذیراحمد کے ناول،الیاس ٹریڈرس اینڈ بک سیلرس،حیدرآباد،۱۹۹۳ء
34- سلیم اختر،ڈاکٹر،داستان اور ناول تنقیدی مطالعہ،ایم ایم پبلی کیشنز دہلی،۲۰۱۲ء
35- سنبل نگار،ڈاکٹر،اردونثر کا تنقیدی مطالعہ،ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ۲۰۱۹ء
36- سہیل بخاری،اردو ناول نگاری،الحمراپبلی شرز،دہلی،۱۹۷۲ء

37- شبنم سبحانی، ہندوستان کی تہذیبی ترقی میں اردو کا حصّہ، جامعہ اردو علی گڑھ، ۱۹۶۷ء
38- شجاع احمد زیبا، مولانا نذیر احمد اور علی گڑھ تحریک، مکتبہ اسلوب، کراچی، ۱۹۸۷ء
39- شمس الرحمٰن فاروقی، جلد سوم، شعر شور انگیز، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، ۲۰۰۶ء
40- صدیق الرحمٰن قدوائی، پروفیسر، ہندوستان میں سماجی اصلاح کی تحریکات اوران کے اثرات، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۲۰۱۱ء
41- طیبہ خاتون، ڈاکٹر، اردو میں ادبی نثر کی تاریخ ۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء، مرکزی پرنٹرز، چوڑی والان، دہلی، ۱۹۸۹ء
42- عابد حسین، ڈاکٹر سید، قومی تہذیب کا مسئلہ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، ۱۹۹۸ء
43- عبادت بریلوی، اردو تنقید کا ارتقا، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۷ء
44- عبدلقادر سروری، دنیائے افسانے، مکتبہ ابراہیمیہ، حیدرآباد دکن، ۱۹۶۹ء
45- عبداللہ، سید، سرسید اوران کے نامور رفقاء، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڈھ، ۲۰۱۶ء
46- عبداللہ سید، ڈاکٹر، کلچر کا مسئلہ، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۷۷ء
47- عطش درانی، ڈاکٹر، اردو زبان اور یورپی اہل قلم، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۷ء
48- عطش درانی، ڈاکٹر، اسلامی فکر وثقافت، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۸۷ء
49- علی احمد فاطمی، پروفیسر، عبدالحلیم شرر بحیثیت ناول نگار، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۷ء
50- علی حیدر، سید، اردو ناول سمت ورفتار، نیشنل آرٹ پرنٹرس، الہ آباد، طبع دوم، ۱۹۷۸ء
51- علی عباس حسینی، ناول کی تاریخ اور تنقید، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۱۱ء
52- عظیم الشان صدیقی، اردو ناول، آغاز وارتقا (۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء)، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۰۸ء
53- فرحت اللہ بیگ، مرزا، مولوی نذیر احمد کی کہانی کچھ اُن کی کچھ میری زبانی، ایجوکیشنل بُک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۱۶ء

54- فرزانہ نسیم، اردو ناول میں متوسط طبقہ کے مسائل، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۰۶ء
55- فرمان فتح پوری، اردو نثر کا فنی ارتقا، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۱۷ء
56- فخر الاسلام اعظمی، ڈاکٹر، ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی، شعور فن۔شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ، یو پی، ۲۰۰۴ء
57- فینن فرانز۔ افتادگانِ خاک، مترجم محمد پرویز، سجاد باقر رضوی، نگارشات، لاہور، ۱۹۶۹ء
58- فینن فرانز۔ سامراج کی موت، مترجم خالد محمود ایڈووکیٹ، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۲ء
59- فہمیدہ کبیر، اردو ناول میں عورت کا تصور (نذیر احمد سے پریم چند تک) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی، ۱۹۹۲ء
60- قاضی جمال حسین، پروفیسر، اردو ادب کا تہذیبی اور فکری پس منظر (۱۸۵۷ سے ۱۹۱۴ء تک)، مسلم ایجوکیشنل پریس، علی گڑھ، ۱۹۸۹ء
61- قاضی جمال حسین، پروفیسر، داستان کی نئی قرأت، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۰ء
62- قاسمی، ابوالکلام معاصر تنقیدی رویئے، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۷ء
63- قاسمی، ابوالکلام، نوآبادیاتی فکر اور اردو کی ادبی وشعری نظریہ سازی، مشمولہ مابعد جدیدت
64۔ اطلاقی جہات، ناصر عباس نیئر مرتب، لاہور، ۲۰۰۸ء
65- گوپی چند نارنگ، ادرو مابعد جدیدت پر مکالمہ، اردو اکادمی، دہلی، ۱۹۹۸ء
66- مبارک علی، ڈاکٹر، آخری عہد کا مغلیہ ہندوستان، تاریخ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء
67- مبارک علی، ڈاکٹر، برطانوی راج، تاریخ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء
68- محمد احسن فاروقی، اردو ناول کی تنقیدی تاریخ، ادارہ فروغ اردو لکھنؤ، ۱۹۸۱ء
69- محمد اقبال، علامہ، جاوید نامہ، اقبال اکادمی، لاہور، ۱۹۸۲ء
70- محمد اقبال، علامہ، کلیات، بانگِ درا، اقبال اکادمی، لاہور، ۲۰۰۷ء
71- محمد احسن فاروقی، ڈاکٹر، سید نور الحسن ہاشمی۔ ناول کیا ہے؟ ایجوکیشنل بُک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۱۱ء
72- محمد حسن عسکری، ستارہ یا بادبان، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، باراول، ۱۹۷۷ء
73- محمد رؤف، اردو غزل مابعد نوآبادیاتی مطالعہ، روہی بکس، فیصل آباد، ۲۰۱۵ء
74- محمد عارف ڈاکٹر، پروفیسر، اردو ناول اور آزادی کے تصورات، پاکستان رائٹرز سوسائٹی، لاہور

75- محمد عامر سہیل، نوآبادیات و مابعدنوآبادیات (نظریہ، تاریخ، اطلاق) عکس پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۹ء
76- محمد عباس، ثمینہ راجہ مترجم، شرق شناسی از ایڈورڈ سعید، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، ۲۰۱۲ء
77- منظر اعظمی، اردو ادب کے ارتقاء میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۲۰۰۹ء
78- نذیر احمد، ڈپٹی، ابن الوقت، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، ۱۹۷۳ء
79- نذیر احمد، ڈپٹی، توبتہ النصوح، کتابی دنیا، دہلی، ۲۰۰۳ء
80- نذیر احمد، ڈپٹی، مراۃ العروس، کتابی دنیا دہلی، ۲۰۰۳ء
81- نذیر احمد، ڈپٹی، بنات النعش، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۱۹۸۳ء
82- نذیر احمد، ڈپٹی، فسانۂ مبتلا، کتابی دنیا دہلی، ۲۰۰۳ء
83- نذیر احمد، ڈپٹی، ایامیٰ، اتر پدیش اردو اکادمی، ۱۹۹۷ء
84- نذیر احمد، ڈپٹی، رویائے صادقہ، کتابی دنیا، دہلی، ۲۰۰۳ء
85- نذیر احمد، ڈپٹی، کلیّات، کتابی دنیا دہلی، ۲۰۰۳ء
86- نذیر احمد، ڈپٹی، ابن الوقت، مرتبہ سبط حسن، مجلس ترقی ادب، لاہور
87- نذیر احمد، ڈپٹی، مراۃ العروس مشمولہ مجموعہ ڈپٹی نذیر احمد، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۸ء
88- نذیر احمد، ڈپٹی، بنات النعش مشمولہ مجموعہ ڈپٹی نذیر احمد، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۸ء
89- نذیر احمد، ڈپٹی، فسانۂ مبتلا، مرتب پروفیسر افتخار احمد صدیقی، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۰۷ء
90- نذیر احمد، ڈپٹی، ابن الوقت، مکتبہ جامعہ لیمیٹڈ، نئی دہلی، ۲۰۱۷ء
91- نذیر احمد، لکچروں کا مجموعہ، طبع دوم، مفید عام پریس، آگرہ، ۱۹۱۸ء
92- ناصر عباس نیرّ، ڈاکٹر، ثقافتی شناخت اور استعماری اجارہ داری نوآبایاتی عہد کے اردو 93- نصابات کا مابعد نوآبادیاتی مطالعہ، کتابی دنیا، دہلی، ۲۱۰۴ء
94- نورالحسن نقوی، تاریخ ادب اردو، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۱۸ء
95- نورالحسن نقوی، ہندوستانی ادب کے معمار، ساہتیہ اکادمی، دہلی، ۱۹۹۱ء

96-ناصرعباس نیرّ، مرتب: مابعد جدیدت۔اطلاقی جہات، لاہور، ۲۰۰۷ء
97-ناصرعباس نیرّ، ڈاکٹر، مرتب، مابعد جدیدت نظری مباحث، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۸ء
98-ناصرعباس نیرّ، ڈاکٹر، لسانیات اور تنقید، پورب اکادمی، اسلام آباد: ۲۰۰۹ء
99-ناصرعباس نیرّ، مابعد نوآبادیات اردو کے تناظر میں، اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۲۰۱۳ء
100-ناصرعباس نیرّ، اردو ادب کی تشکیل جدید نوآبادیاتی اور پس نوآبادیاتی عہد کے اردو ادب کے مطالعات، اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۲۰۱٦ء
101- منتظر مہدی، ڈاکٹر، ترقی پسند اردو ناول، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱٦ء
102-محمد مسعود خالد، نوآبادیاتی نظام کا تعارف، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء
103-محمد صدیق قریشی، مرتب: کشاف اصطلاحاتِ تاریخ، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۸۸ء
104-محمد نعیم، اردو ناول اور استعماریت (انیسویں صدی کے ناول کا مابعد نوآبادیاتی مطالعہ)، کتاب محل لاہور، ۲۰۱۷ء
105-مظہر مہدی، اردو دانشوروں کے سیاسی میلانات (نوآبادیاتی ہندوستان ۱۸۵۷۔۱۹۱۴ء) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۹۹ء
106-وقار عظیم، داستان سے افسانے تک، مکتبہ الفاظ، علی گڑھ، ۱۹۸٦ء
107-وہاب اشرفی، مابعد جدیدیت: مضمرات وممکنات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۴ء
108-یوسف سرمست، عرفان نظر
109-یوسف سرمست، بیسویں صدی میں اردو ناول، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۹۵ء

☆☆☆

# انگریزی کتب

1- Ania Loomba,colonialism,Post colonialism,Routledge,New York,1998.

2- Bill Ashcroft,Gareth Griffiths,HelenTiffin,Key concepts in post colonial studies by Routledge 11,New Fetter Lane ,London,2010.

3- Bill Ashcraft ,Gareth Griffiths,Helen Tiffin,The Empire writes back ,Routledge,1989.

4- G.M.Travelyan,History of England,O.M.1952.

5- Justin D,Edward ,Post Colonail Literature,A Reader,s Guide:Macmillan ,New York,2008.

6- Lokangaka Losambe and Devi Sarinjeive,Pre colonial and post colonial Drama and theatre in Africa,New Africa books ,Claremont,South Africa,2001.

7- Pramod K Nayar,Postcolonialism A Guide for the perplexed,Continuum Publishing Corporation,New York,2010.

8- Said Edward ,Orientalism ,Penguin Books London,1978.

9- Susan Vanzanteri Gallaghar(ed),Post colonial literature and the biblical call for justice ,USA,1994.

10- Frantz Fanon,The Wretched of the Earth ,London 1965.

# رسائل وجرائد


1- آج کل، نئ دہلی، جلد: ۸۷، شمارہ: ۰۷، فروری ۲۰۲۰ء

2- آج کل، نئ دہلی، جنوری، ۲۰۰۴ء

3- آج کل، نئ دہلی، فروری، ۲۰۰۵ء

4- اردو دنیا، نئ دہلی، جلد: ۱۹، شمارہ: ۱۲، دسمبر ۲۰۱۷ء

5- اردو دنیا، نئ دہلی، جلد: ۲۴، شمارہ: ۰۳، مارچ ۲۰۲۲ء

6- اردو دنیا، نئ دہلی، جلد: ۲۰، شمارہ: ۸، ستمبر ۲۰۱۸ء

7- اردو دنیا، نئ دہلی، جلد: ۱۶، شمارہ: ۱، جنوری ۲۰۱۵ء

8- ادراک، شمارہ، ۱۲، ہزارہ یونیورسٹی، مانسہرہ

9- ادراک، شمارہ، ۱۳، ہزارہ یونیورسٹی، مانسہرہ، پاکستان

10- الماس، تحقیقی جرنل شمارہ: ۲۰

11- بازیافت۔ ۳۱ (جولائی تا دسمبر ۲۰۱۷ء)، شعبۂ اردو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

12- تخلیق (ماہنامہ)، لاہور، جلد: ۰۳، شمارہ، ۲۱، مارچ ۲۰۰۰ء

13- تسطیر، راولپنڈی، پاکستان، اپریل، ۱۹۹۸ء

14- جرنل آف ریسرچ (اردو)، شمارہ: ۳۱، جون ۲۰۱۷ء

15- جرنل آف ریسرچ، شمارہ، ۲۹، جون ۲۰۱۶ء

16- جرنل آف ریسرچ، شمارہ۔ ۳۱، مئی ۲۰۱۷ء

17- جرنل آف ریسرچ، شمارہ۔ ۳۲، دسمبر، ۲۰۱۷ء

18- دانش، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، شمارہ: ۷، ۲۰۱۰۔ ۲۰۱۱ء

19- فکر ونظر سہ ماہی، علی گڑھ، جلد: ۵۱، شمارہ: ۰۱، مارچ ۲۰۱۴ء

20- فکر ونظر سہ ماہی، علی گڑھ، ڈپٹی نذیر احمد خصوصی شمارہ، جون ۱۹۹۴ء

21- قومی زبان (ماہنامہ)، کراچی، نومبر ۲۰۲۰ء

22- کوہسار جرنل بہار، شمارہ: ۱۷۹، جون ۲۰۱۹ء

23- معیار، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد، شمارہ: ۸، ۲۰۱۲ء

☆☆☆

# باب چہارم

# ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کا مابعد نوآبادیاتی مطالعہ

## ہندوستان میں نوآبادیاتی نظام

جب کوئی طاقتور ملک اپنی افواج کے زور پر کسی نسبتاً کمزور ملک / ریاست اور اس کے افراد پر غاصبانہ قبضہ کر لے اور وہاں کے قدرتی وسائل اور افراد کی قوت کو اپنی اقتصادی و معاشرتی ترقی کے لیے استعمال کرے تو وہ مقبوضہ ریاست اس قابض ریاست کی نوآبادی کہلائے گی۔ قابض حکومت کا غلبہ مقبوضہ ریاست کے قدرتی وسائل، تجارتی منڈیوں اور افرادی قوت پر ہوتا ہے جس کی مدد سے وہ اپنی معاشی اور اقتصادی ترقی یقینی بناتی ہے۔ تجارت، صنعت و حرفت اور دوسرے معاشی شعبوں کے علاوہ مقبوضہ ملک کے تمام تر شعبے یہاں تک کہ حکومتی انتظام و انصرام چلانے والے ادارے بھی غالب ریاست کے قبضے میں آ جاتے ہیں اور یہ ریاست اپنی نوآبادی پر قانونی بالادستی قائم کرتی ہے جس کے لیے وہ اپنی فوجی طاقت کا استعمال کرنے سے بھی گریز نہیں کرتی۔ غالب ریاست مغلوب ریاست سے معاشرتی، معاشی اور سائنسی میدان میں زیادہ ترقی یافتہ ہوتی ہے۔ اس لیے وہ خود کو بہتر نسل انسانی سمجھتی ہے یہی ترقی اسے دوسرے اقوام عالم کو زیرنگیں کرنے اور ان کے وسائل کو استعمال کر کے مزید ترقی یافتہ ہونے کی خواہش کو ہوا دیتی ہے۔ اٹھارویں، انیسویں اور بیسویں صدی میں برطانوی قوم نے دنیا کی مختلف اقوام کو زیرنگیں نوآبادی بنایا اور ایک مربوط نوآبادیاتی نظام قائم کر کے دنیا کے ایک چوتھائی حصے پر اپنا تسلط قائم رکھا۔ ہندوستان کی اہمیت اس کی زرخیزی، خام مال کی بہتات، معدنیات کی بکثرت موجودگی اور سب سے بڑھ کر ہندوستانی قیادت کی باہمی ناچاقی، افواج کی ناقص تربیت، جدید ٹیکنالوجی، تعلیمی پس ماندگی اور ہتھیاروں کا فقدان اور بحری بیڑے کی عدم موجودگی کی وجہ سے تھی۔ ہندوسان کے وسیع معدنی ذخائر اور قدرتی وسائل یورپی اقوام کے لئے لالچ کی سب سے بڑی وجہیں تھیں۔ کپاس، گنا، مصالحے، رم، تمباکو، چائے اور مختلف قیمتی دھاتیں اور قیمتی پتھر وہ اپنی نوآبادیوں سے لوٹ کھسوٹ کے لے جاتے۔ برطانیہ نے ہندوستان میں داخل ہونے کے لیے بحری راستے کا انتخاب کیا اور ساحلی علاقوں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ ہندوستان برطانیہ کی ایسی نوآبادی تھی جہاں افواج اور مبلغین سے پہلے تاجر آئے۔

## نوآبادیاتی عہد کے عظیم مفکّر اور مصلح: ڈپٹی نذیر احمد

ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے ناولوں میں پہلی بار دلچسپ اور تفریحِ طبع کے مقصد کو نظر انداز کر کے سماجی اور معاشرتی مسائل کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔انہوں نے مختلف موضوعات پر لکھا ہے۔۔انہوں نے تعلیمِ نسواں، ہُنر مندی، بچوں کی تربیت اور نگہداشت، صبر وقناعت، عفّت وعصمت، اخلاقی تعلیم، تعلیم کی اہمیت، خانہ داری ، مذہب کی اہمیت اور مذہبی تربیت، کثرتِ ازدواج کے مُضر اثرات، انگریزی معاشرت کی اندھی تقلید، بیوہ عورتوں کی دوسری شادی ، اولاد کی اصلاح اور خاندان کی اصلاح جیسے موضوعات اور مسائل کو فنکارانہ بصیرت کے ساتھ اپنی تخلیقات میں موضوع بحث بنادیا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد ۱۸۳۶ء میں ضلع بجنور (اتر پردیش) میں پیدا ہوئے۔اور ۱۹۱۲ء میں دہلی میں اس دنیا سے انتقال کیا۔ان کی شخصیت بڑی پہلودار تھی۔اردو میں ناول کی داغ بیل نذیر احمد نے ہی ڈالی۔ انہوں نے پہلی بار ''مراۃ العروس'' (۱۸۶۹ء) کے نام سے ایک ناول لکھا جس سے اردو ادب میں ناول کی صنف کی بنیاد پڑی۔اس ناول کے بعد ڈپٹی نذیر احمد نے بہت سارے ناول لکھے۔ان میں بنات النعش (۱۸۷۲ء)، توبتہ النصوح (۱۸۷۷ء)، فسانہ مبتلا (۱۸۸۵ء)، ابن الوقت (۱۸۸۸ء)، ایامیٰ (۱۸۹۱ء)، اور رویائے صادقہ (۱۸۹۴ء) شامل ہیں۔

مابعد نوآبادیاتی ادب میں نوآبادیاتی دور میں تخلیق کئے گئے ادب کو زیرِ بحث لایا جاتا ہے۔مابعد نوآبادیات ایک ایسے طرزِ تحقیق اور مطالعہ کا نام ہے جس میں نوآبادیاتی دور کی تاریخ ،ثقافت ،معاشرت ،نفسیات ،تہذیب اور زبان وادب کا مطالعہ کیا جاتا ہے ۔اس مابعد نوآبادیاتی تحقیق میں نوآبادیاتی دور کے سیاسی ،سماجی ،ثقافتی اور معاشی غرض ہر پہلو کی گہرائی میں جا کر نوآبادکاروں کے ظلم و تشدد، بربریت اور طاقت کے غلط استعمال اور کالے منصوبے اور قوانین سے پردہ ہٹایا جاتا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کا زمانہ نوآبادیات کا زمانہ ہے۔مابعد نوآبادیات کا زمانہ ظاہر ہے کہ اس کے بعد والا زمانہ ہے۔جہاں نوآبادیات کو استعماریت کہا جاتا ہے وہاں مابعد نوآبادیات کو لامحالہ مابعد استعماریت ہی کہا جائے گا۔یعنی استعماریت سے چھٹکارے کا دور۔یہ کون سا دور ہے؟ دراصل استعماریت کا آغاز اگر ہیلن آف ٹرائے سے ہوتا ہے تو مابعد استعماریت کا آغاز یقیناً اس وقت کو کہا جائے گا جب دنیا سے کشور

کشائی کا عملاً خاتمہ ہوگیا۔ غالباً یہ دوسری جنگ عظیم ہے جس کے بعد سے کسی ملک نے کسی دوسرے ملک پر ہمیشہ کے لیے زمینی قبضہ نہیں کیا، بلکہ پرانے قبضوں میں سے بھی اکثر ایک ایک کر کے چھوڑ دیے گئے ۔چنا چہ مابعد نوآبادیات کا صحیح آغاز تو دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے کو ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔

ڈپٹی نذیراحمد کا عہد انیسویں صدی کا نوآبادیاتی عہد ہے۔ ڈپٹی نذیراحمد نے اپنے ناولوں کا مواد اسی نوآبادیاتی دور کے شمالی ہند کے متوسط معاشرے سے حاصل کیا ہے۔انیسویں صدی کا ہندوستان جن سیاسی ،سماجی ،علمی اور ادبی پیچ وخم سے گزر رہا تھا اور جس سمت اور رفتار کا حامل تھا اس کے باقاعدہ نقوش ہمیں نذیراحمد کے ناولوں میں واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔یہی بات ہے کہ نذیراحمد کے ناولوں کے تمام کرداروں کے حرکات وسکنات سے حقیقت کی بو آنے لگتی ہے۔ڈپٹی نذیراحمد کی ناول نگاری کا دور انیسویں صدی کے نصف دوّم پر محیط ہے اور نذیراحمد کے ناولوں کے کردار اس عہد کے ہندوستان بالخصوص شمالی ہند کے مسلم متوسط گھرانوں کی مستورات کی نفسیات ،ان کے خیالات اور نظریات ورجحانات کی منہ بولتی تصویریں اور اس عہد کی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہیں ۔بایں وجہ نذیراحمد کے ناولوں کا مابعد نوآبادیاتی مطالعہ کرنے اور اس کا تنقیدی جائزہ لینے سے قبل اس عہد کے پس منظر پر بھی تھوڑی بہت روشنی ڈالنی مناسب ہے۔

انیسویں صدی کا دور نہ صرف ہندوستان ، بلکہ عالمی تاریخ میں بھی ایک اہم تریں باب کی حیثیت رکھتا ہے۔تباہی وبربادی اور خونریزی کے لحاظ سے بھی ترقی اور کامرانی کے زاوئے سے بھی۔اگر چہ یہ دور کرب وبلا سے دوچار رہا لیکن اس کرب نے کئی ایک مصلحین کو بھی جنم دیا۔ایک طرف قدامت پرستی ،توہم پرستی ،کہنہ رسم ورواج اور قدیم قدروں کا خاتمہ ہو رہا تھا۔تو دوسری طرف عقلیت پسندی ،نئی قدریں اور نئی طرزِ زندگی کا آغاز ہو چکا تھا۔ایک قدیم تہذیبی اقدار، ماضی کی تاریکی میں روپوش ہو رہی تھیں تو اس کی جگہ مغربی تہذیب غیر محسوس طور پر اُبھر کر ان تاریک گوشوں کو منور کرتی جارہی تھی ۔غرض یہ دور مشرقی تہذیب اور مغربی تہذیب کے سنگم اور تصادم کا دور تھا۔جس نے ایک نئے طبقے کو جنم دیا تھا۔گویا یہ دور تعلیمی ،صنعتی اور معاشرتی طور پر اصلاحی اور انقلابی دور تھا اور نذیراحمد نے اسی دور میں آنکھیں کھولی تھیں۔

۱۸۵۷ء کے واقعات نے مغلیہ سلطنت کے اقتدار کا مکمل خاتمہ کر دیا تھا۔ ہندوستانیوں کا سیاسی

اقتدار چھن چکا تھا۔اقتصادیات انگریزوں (نوآبادکاروں ) کے ہاتھوں میں آ چکی تھیں اور وہ اب پوری طرح ہندوستان کے حکمران بنے ہوئے تھے ۔نوآبادکاروں یا انگریزوں کا سیاسی اقتدار سرزمینِ ہند پر مشرق سے مغرب تک پھیلا ہوا تھا۔اورانہیں ہرشعبہ میں کامیابی حاصل ہوچکی تھی ۔اختراعی ذہنیتوں کی بنا پر وہ جاہ وحشمت سے مالا مال تھے ۔ان کی سلطنت دنیا کی وسعتوں میں نہایت تیز رفتاری کے ساتھ پھیلتی جارہی تھی جس کے اسباب علومِ جدیدہ ،سائنس ،ٹکنالوجی اور تجارت تھے ۔انہوں نے وہ نئ ایجادات کی تھیں کہ جس کو دیکھ کر دنیا انگشت بدنداں تھی ۔انگریزوں کے علم وہنر کی بنیادعقلیت پسندی پر رکھی گئ تھی ۔اس کے برخلاف ہندوستانی احساس کمتری کا شکار تھےاور عجیب وغریب خوش فہمیوں میں مبتلا ،اس لیے وہ بجائے اپنی ناکامی کا ماتم کرنے کے عیاشی میں پڑے ہوئے تھے۔''توبتہ النصوح'' کا ہیروکلیم اور''فسانۂ مبتلا'' کا ہیرو مبتلا اسی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں ۔قطع نظر بیشتر ہندوستانی ایسے بھی تھے جو دن بدن اخلاقی قدروں سے بیگانے ہوتے جارہے تھے ۔رسومِ کہنہ میں جکڑے ہوئے تھے ۔سب کچھ لٹ جانے کے باوجودقدیم اقدار،روایات،رسوم ورواج اور پرانی طرزِ معاشرت پر چلنے کی ناکام کوشش کررہے تھے روح ِ مذہب سے وہ عاری ہو چکے تھے ۔ظاہرداری اور مذہب کے رسم ورواج جوحقیقی مذہب سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے تھے ۔ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔وہ ہرمعمولی سے معمولی چیز کوبھی رسم ورواج کی عینک سے دیکھنےاوراسی میں اپنی زندگی کے ہرممکن اور غیرممکن مسئلے کا حل تلاش کرنے کے خواہاں تھے۔گویا مذہب کا یہ مردہ تصوران کے نزدیک زندگی کا جزولاینفک تھا۔یہ تو عامیوں کا حال تھا لیکن خودعلماء میں بھی ایک طبقہ ایسا پیدا ہو چکا تھا جو باوجود اپنا اقتدار چھن جانے کے قدامت پرستی ،علم کی کمی اور ذہنی اُپج سے محرومی کی بنا پر انگریزی علوم ،ان کی طرزِ زندگی اوران کے کلچراور نظامِ حیات کو متنفراور مشتبہ نگاہوں سے دیکھتا تھااوران کی ہر بات کو کفر سے تعبیر کرتا تھا۔ان کے نزدیک انگریزوں کے ساتھ کھانا کھانا کرسٹان ہوجانے کے مترادف تھا۔ یہاں تک کہ انگریزی تعلیم کا نام تک زبان پر لانا خارج ازاسلام اور سورکا گوشت کھانے کے برابر تھا۔ڈپٹی نذیر احمد کے والداوران کے استادِمحترم بھی انہیں بزرگوں میں شامل تھے ۔نذیر احمد ۱۸۹۳ء میں حمایت اسلام ،لاہور کے آٹھویں سالانہ اجلاس میں لکچر دیتے ہوئے بیان کرتے ہیں:

''اب سے چالیس برس پہلے ایک ایک بات کفروزندقہ سمجھی جاتی تھی ۔میں ایسے باپ کا بیٹا ہوں کہ دہلی کالج کے پرنسپل نے ہر چند چاہا کہ میں انگریزی پڑھوں والدمرحوم نے جوایک غریب آدمی تھےمگراپنے وقت کے بڑے دین دار،صاف کہہ دیا کہ اس کا مرنا منظور،اس کا بھیک مانگنا قبول مگر انگریزی پڑھنا گوارانہیں ۔میں ایسے مولوی کا شاگردہوں جنھوں نے لاٹ صاحب سے باشکراہ ہرچہ تمام تر اور بہ مجبوری ہاتھ ملاکر اس ہاتھ کومٹی سے رگڑ رگڑکر دھوڈالا ۔انگریزی صابن سے نہیں ۔جنہو ں نے پانی پینے کا مٹکا جو جماعت میں رکھارہتا تھاتڑواڈالا تھا۔اس واسطے کہ اس میں ایک شامت زدہ انگریزی خواں مسلمان، پانی پی گیا تھا''۔ ۱

ڈپٹی نذیراحمد کے بڑے بھائی علی احمد کوبھی مرنا منظور تھا لیکن انگریزی دوائی کھانا منظور نہ تھا ۔غرض اس دور کے ہندوستانی اپنے آباواجداد کے رسم ورواج ان کی طرزِ زندگی اور طرزِ معاشرت پر چلتے تھے ۔اس دھن میں وہ اپنے آپ کو بھلائے ہوئے تھے ۔گویا وہ پانی میں رہ کرمگر مچھ سے بیر کررہے تھے ۔وہ اپنے انجام سے بالکل بےخبر تھے۔ مذہبی تعصب ان میں کوٹ کوٹ کربھرا ہوا تھا۔اور نیز مسلمانوں ہی میں آپس میں اختلاف پیدا ہوگئے تھے ،مذہبی بحث ومباحث ،چھیڑ چھاڑ ،فرقہ وارانہ آویزش میں لوگ جکڑے ہوئے تھے ۔مذہب کے نام پرلڑنا اور جان دینا شہادت کا مرتبہ پانے کے برابر سمجھا جاتا تھا۔شاید ہی کوئی پولیس ،فوجداری ،دیوانی یا کچہری اس زمانے میں ایسی رہی ہوگی جہاں اس سلسلے میں ان کے مقدمات دائر نہ ہوئے ہوں۔

اس زمانے میں بالخصوص دہلی میں وعظ گوئی اور خطابت انتہائی عروج کو پہنچ چکی تھی یہاں تک کہ پیشہ ور واعظوں کا ایک مستقل طبقہ تھا۔اس زمانے میں شاید ہی کوئی غم ،نہ خوشی کی تقریب ایسی رہی ہو جس میں وعظ نہ کیا جاتا ہو۔نذیراحمد کے ناول ''ایامیٰ'' میں بیوگی کے بعد آزادی کے نانا مولوی مقتدیٰ کا وعظ اور ''فسانۂ مبتلا'' میں میر متقی کا بھائی کے انتقال کی خبرسن کرتعزیتی وعظ کرنا اور موقع بہ موقع پند ونصیحت کے تعلق سے ان کی طول طویل تقریریں، عارف اور مبتلا کے بحث ومباحث اور خود نذیر احمد کا ناولوں میں بات بات پر پند ونصیحت کے دفتر کھولدینا اس دور کی مروجہ مناظرہ بازی اور خطابت پسندی کی یاد تازہ کردیتے ہیں (۲)۔

اس عہد میں تعلیمی معیار بالکل پست اور گھٹیا قسم کا تھا۔نصابِ تعلیم بھی غیر مطمئن اور غیر تشفی بخش تھا جس سے لڑکوں کے اخلاق سدھرنے کی بجائے بگڑتے ہی جا رہے تھے۔اس خصوص میں نذیر احمد نے ’’فسانۂ مبتلا‘‘ میں مبتلا کے مکتب کا ذکر کرتے ہوئے غیر معمولی تنقید سے کام لیا ہے۔

لڑکیوں بالخصوص مسلم کی تعلیم کا کوئی خاص انتظام نہیں تھا۔بچپن کی شادی اور تعددِازدواج کی رسمیں عام تھیں۔ہندو تہذیب کے اثر سے عقدِ بیوگان کو معیوب ہی نہیں دشنام سمجھا جاتا تھا جس کی وجہ سے بیواؤں کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔۱۸۵۷ء کے سانحہ میں کئی مرد اپنی زندگیاں گنوا چکے تھے ۔یوں بھی بیواؤں کی تعداد فزوں ہو چکی تھی۔عقدِ بیوگان پر پابندی کی وجہ سے معاشرہ میں اس کے برے اور بھیانک نتائج ظہور پذیر ہو رہے تھے۔نامناسب اور ناسازگار حالات میں بیوہ کے قدم گھر کی چوکٹ سے نکل کر قحبہ خانوں کی طرف بھی جا رہے تھے۔مرد کو عیاشی کے نت نئے راستوں کی تلاش تھی اور طوائف عیش و عشرت کا سہل الحصول ذریعہ تھی۔سچ پوچھئے تو اس دور میں مرد کے اعصاب پر عورت سوار تھی۔

عورت کی سماجی حیثیت ،قدامت پسندی ،توہم پرستی ،رسم و رواج کی پابندی اور جہالت کی وجہ سے پست تھی ہی لیکن غدر کے سانحہ عظیم نے اس کی پستی میں اضافہ کر دیا تھا اس کا پیدائشی حق اس سے چھن چکا تھا اور وہ مرد ظلم و ستم کا شکار ہو چکی تھی۔نذیر احمد کے عہد میں مسلم معاشرے کی پستی میں عورت کی زبوں حالی کو بڑا دخل تھا۔اگر چہ اس زمانے میں چند ایک مثالیں پڑھی لکھی خواتین کی بھی مل جاتی ہیں جن میں شواعر بھی تھیں اور علوم و فنون ،فن موسیقی کی ماہر بھی۔اس خصوص میں فن موسیقی میں راجہ مان سنگھ کی بیوی مرگ نینا اور بھجنوں اور گانوں میں میرابائی قابلِ ذکر ہیں لیکن ان کا تعلق امرا و روساء اور شاہی خاندان سے تھا جو ایک خاص تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا۔لیکن ایسی مثالیں مسلم معاشرہ میں نہ ہونے کے برابر تھیں۔

مختصر یہ کہ غدر کے بعد ہندوستانیوں ،بالخصوص مسلمانوں کی سماجی ،سیاسی ،معاشی اور اخلاقی حالت گرتی جا رہی تھی۔قدیم روایات سے چمٹے رہنے کی بنا پر وہ احساس کمتری کا شکار ہو چکے تھے۔ان کی صلاحیتیں مفلوج ہو چکی تھیں۔بقول نذیر احمد ’’سپہ گری کے وہ فن اور کرتب جو کبھی سلطنتوں کی قسمتوں کا فیصلہ کیا کرتے تھے اب تعزیہ داری کے جلوس کے سوائے اور کسی مطلب کے نہ رہے تھے‘‘۔دنیوی سرمائے کے ساتھ ساتھ ان کا نفسیاتی ،ذہنی اور فکری سرمایہ بھی پوری طرح لُٹ چکا تھا۔اندھی تقدیر پرستی عام تھی

۔مناسب علم نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنے اندر چھپی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے سے یکسر قاصر تھے اور جامد تصوف اور بے بنیاد روحانیت کے دامن میں پناہ لے رہے تھے۔

''خارجی حالات کا دھارا اتنا تیز و تند تھا کہ انسان کو اپنی داخلی قوتوں پر اعتماد نہ رہا ۔تخریبی سرگرمیوں نے وہ اودھم مچا رکھی تھی کہ کسی کو اپنی صلاحیتوں کا احساس نہ رہا ۔یہی وجہ ہے کہ وہ 'بندگی' کو بے چارگی اور 'قیدِ حیات' کو بندِ غم سمجھتے رہے۔ان حالات میں وہ سوچ بھی نہ سکے تھے کہ انسان خودی کے زور سے دنیا پہ چھا سکتا ہے۔مگر انہیں اس کا ضرور یقین تھا کہ خودی کو کھو کر ہی خدا کو پایا جا سکتا ہے۔غیر یقینی حالات کا طویل سلسلہ شروع ہو چکا تھا کہ رک کر واقعات کے پیچھے کام کرنے والے اسباب کا پتہ لگانا کارے دارد والی بات تھی۔اس لئے وہ عالم اسباب پر غور کرنے کی بجائے آسانی کے ساتھ تقدیر پر یقین کر لینا چاہتے تھے۔'' ۳

اسی باعث مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔جادۂ کہن پر اڑے رہنے کی وجہ سے وہ ترقی کی راہ میں آگے نہیں بڑھ سکتے تھے۔قومی خیالات سے ان کو دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔جس کی وجہ سے سوسائٹی میں بے ہنروں اور نکمّوں کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہو رہا تھا۔

حکومت برطانیہ میں مسلمانوں کی زبوں حالی پر نظر ڈالتے ہوئے نذیر احمد نے اپنے ایک لکچر میں کہا ہے:

''انگریزی عملداری میں مسلمانوں کی ایسی مثال ہے کہ ایک دریائے مواج بہہ رہا ہے ۔اور مردم و مرغ و مور سب اپنے اپنے حوصلے کے موافق اس سے سیر یاب ہوتے چلے جاتے ہیں اور مسلمان ہیں کہ موسمِ تابستان میں دریا کی ریتی پر پیاسے پڑے تڑپ رہے ہیں''۔۴

ادھر نوآبادکار یا انگریز ہندوستانیوں کی کمزوری اور خامیوں کا استحصال کر رہے تھے۔وہ ہندوستانیوں کو ان کے مذہب سے بھی دور کر کے مذہب عیسوی میں شامل کر لینا چاہتے تھے تاکہ ان کے مذہب پر بھی کاری تازیانہ لگے ۔اسی مقصد کے تحت جگہ جگہ انگریزی مدارس کھولے گئے اور ہر طرف مشنریوں کا جال بچھا دیا گیا۔تاکہ انگریزی تعلیم کی وساطت سے وہ عیسائیت کی تبلیغ کر سکیں۔ہندوستانیوں

کو جبراً عیسائی بنانے کی تحریک شد و مد کے ساتھ شروع ہو چکی تھی جس کو ۱۸۳۰ء میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔

مذہب عیسوی کی غرض سے مدارس میں انجیل پڑھانے کی تجویز عمل میں لائی گئی کالج میں پڑھائی جانے والی کتابوں میں انجیل کے حوالے دیئے گئے کہ طلباء انجیل پڑھنے پر مجبور ہو جائیں۔ مذہب عیسوی کے مطابق جوابات دینے والے طلباء کو انعامات دیئے جاتے تھے تاکہ وہ اس کالج میں اپنے مذہب کو بھول جائیں۔ اس طرح انگریزوں نے ہندوستانیوں کے ایک بہت بڑے طبقے کو عیسائیت میں شامل کرلیا۔ نذیر احمد بھی ابتدا میں عیسائیت سے متاثر تھے لیکن بعد میں وہ حقیقت کو جان کر راسخ العقیدہ مسلمان ہو گئے۔

ابھی انگریزوں کے ہندوستانیوں کو مکمل طور عیسائی بنانے کے خواب پورے ہو نہیں پائے تھے کہ ہندوستان کے روشن دماغ طبقے میں بیداری پیدا ہو گئی۔ راجہ رام موہن رائے بڑی ذہین فعال اور متحرک شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے 'برہمو سماج' کی بنیاد ڈالی اور قدیم ہندو دھرم کی اصلاح کا بیڑا اُٹھایا۔ عورت کی زبوں حالی کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ 'ستی' کی وحشیانہ اور اخلاق سوز رسم کو جو انسانیت پر بدنما داغ تھی، مخالفت کی۔ بڑے بڑے پنڈتوں سے ہمت اور بہادری سے مردانہ وار مقابلہ کیا اور عورت کو مرد کی چِتا کے جلتے ہوئے شعلوں سے نکال کر جینے کا حق دیا۔

ہندوؤں میں راجہ رام موہن رائے کے بعد بنکم چٹرجی ہندو دھرم کے احیاء میں سرگرم نظر آنے لگے۔ دیوندر ناتھ ٹیگور، کیشپ چندر سین اور ودیا ساگر کی تحریک کا مقصد بھی قدیم مذہب اور سماج کی اصلاح تھا۔ کشیپ چندر نے اس کی تعلیم اور ترقی ترویج کے لیے ہندوستان کا کونہ کونہ چھان مارا اور اپنی زوردار پُر اثر خطابت سے نوجوان طبقے کو متاثر کیا۔ ذات پات فرسودہ بندھنوں کے خلاف آواز بلند کر کے اس تفریق کو مٹانے کی کوشش کی اور مختلف ذاتوں میں شادی بیاہ کو رواج دیا۔ عورتوں اور لڑکیوں کی اصلاح کے پیش نظر جگہ جگہ اسکول قائم کئے اور عقد بیوگان کے لیے معاشرہ کو راغب کیا۔

اسی زمانے میں شمالی ہند میں دیانند سرسوتی نے 'آریہ سماج' کی بنیاد ڈالی۔ انہوں نے بھی اس تحریک کے ذریعہ ذات پات کے فرق کو مٹانے کی کوشش کی۔ مرد اور عورت کے مساوات پر زور دیا۔ اس لحاظ سے یہ شمالی ہند کی پہلی مذہبی اور اصلاحی تحریک سمجھی جاتی ہے جس نے عوام کے منجمد خیالات میں تحریک پیدا کی۔ ان کی پُر اثر اصلاح نے عوام کے دل و دماغ میں۔ قومی بیداری کا جذبہ پیدا کر دیا۔ جسٹس

مہادیوگوبندرناڈے نے دکن میں ''پرارتھنا سماج'' کی بنیاد ڈالی۔غرض برہموسماج ہوکرآریہ سماج ان دونوں تحریکوں کا مقصد قدیم ہندو دھرم کے فرسودہ رسم و رواج کی اصلاح اوراس کو سماجی برائیوں سے پاک وصاف کرنا تھا اور ساتھ ہی اس کو سائنسی تقاضوں سے بھی روشناس کرانا۔اگر چہ بیشتر تحریکوں کو کامیابی حاصل ہوئی تھی لیکن برہموسماج کو اس خصوص میں زیادہ کامیابی حاصل ہوئی جس کی بنیاد انسانیت کے مثبت اوراعلیٰ اقداراور عقلی دلائل پر رکھی گئی تھی۔اس طرح ہندوستان میں مشرقی علوم کے ساتھ ساتھ علوم جدیدہ کی روشنی کرن بہ کرن پھیلتی جانے لگی۔اسی زمانے میں مسلمانوں میں بھی مذہب اسلام کو غیر مذہب کے حملوں سے بچانے کا جذبہ مصلحین قوم میں بیدار ہو چکا تھا۔ان مصلحین میں سرسید احمد خان پہلے شخص تھے جنھوں نے مسلمانوں کی گرتی ہوئی حالات کو سدھارنے اوران کو زبوں حالی سے نکالنے کے لیے اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔اگر چہ سرسید احمد خاں کی اصلاحی تحریک سے قبل انیسویں صدی کے آغاز میں سید احمد بریلوی کی مذہبی تحریک کی مذہبی تحریک شروع ہوچکی تھی۔یہ خالص دینی اور مذہبی تحریک تھی جس کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح تھا جس میں بدعات،قبر پرستی اور غیر شرعی رسومات کو جوعقیدہ بن کرآئین کی صورت اختیار کر چکی تھیں اور اسلام کی پاکیزگی پر بدنما داغ بنی ہوئی تھی۔پاک کر کے قرآن وسنت کے احکام پر مسلمانوں کو کاربند کرنا تھا۔اس کے برعکس سرسید احمد خاں کی تحریک کا مقصد ہمہ گیراور وسیع تھا۔جس سے مسلمانوں کی سماجی،معاشی اور علمی اصلاح بھی مقصود تھی۔سرسید احمد خاں کی نظر زمانے کے نشیب وفراز پر بڑی گہری تھی۔وہ زمانے کے بڑے نبّاض تھے۔ان کے سامنے ایک طرف مسلمانوں کی قدامت پرستی اور زبوں حالی تھی تو دوسری طرف یوروپین قوموں کی بلند خیالی،تجارت،عقلیت پسندی،سائنسی ایجادات،صنعتی ترقی اور زندگی کے مثبت اقدار پران کی نظر بالکل غیر جانبدارانہ تھی۔سرسید احمد خاں نے سمجھ لیا تھا کہ مغربی ممالک کی ترقی کا راز علوم جدیدہ میں مضمر ہے۔نذیر احمد نے خود''ابن الوقت''میں یورپین قوموں کی ترقی کے راز پر روشنی ڈالتے ہوئے نوبل صاحب کی زبانی کہلوایا ہے:

''اہل یورپ کی عظمت سلطنت نہیں ہے بلکہ ان کی تمام عظمت ان علوم میں ہے جو جدید ایجاد ہوئے ہیں اور ہوتے جا رہے ہیں۔اور ان علوم کے ذریعہ سے انہوں نے ریل اور تار برقی اور اسٹیمر اور ہزار ہا قسم کی بکار آمد کلیں بنا ڈالی ہیں اور بناتے چلے جاتے ہیں اور ہر طرح کی کاریگری میں دوسرے ملکوں پر سبقت لے جا کر روئے زمین کی دولت اپنے ملک گھسیٹ لے گئے اور گھسیٹے لیے چلے جا رہے ہیں۔جس جس طرح کے ہنر اور کمال اہلِ یورپ میں ہیں ان کے ہوتے ممکن نہ تھا کہ ان کو سلطنت نہ ہو۔سلطنت ان کے کمالات کی قیمت نہیں بلکہ روکھن میں ہے اور ان کا حق لازمی ہے''۔۵

سرسید اچھی طرح جانتے تھے کہ مسلمانوں کی سیاسی ،معاشی ،سماجی پستی اور احساس کمتری سے نکالنے اور ان کا کھویا ہوا اقتدار حاصل کرنے کے لیے علومِ جدیدہ ،اور اعلیٰ درجے کی انگریزی تعلیم کی اشد ضرورت ہے تاکہ وہ اس کی بدولت اپنے اندر چھپے ہوئے جوہر کو اُجاگر کر کے بروئے کار لا سکے،اپنے آپ کو پہچان سکیں جہاں بقول اقبال خدا خود بندے سے اس کی رضا پوچھتا ہے۔گویا سرسید احمد خان نے مسلمانوں کی پستی اور زبوں حالی کی دُکھتی ہوئی رگ کو چھو لیا تھا۔جس پر کسی مصلح قوم کی نظر نہیں پڑی تھی ۔اس سلسلے میں نذیر احمد نے سرسید احمد خاں کی اس دور بین نظر کا ذکر اپنے ایک لکچر میں بڑے فخر کے ساتھ کیا ہے:

''نہ صرف ہم معدودے چند مسلمانوں میں بلکہ نارتھ وسٹرن پراونسز بلکہ شاید انڈیا کی ہول محمڈن کمیونٹی میں سرسید ہی ایک ایسے مسلمان ہیں جنہوں نے سمجھا کہ مسلمانوں کا یہ مرضِ افلاس زوال پذیر ہے اور جہالت سے پیدا ہوا ہے۔اور اگر ان کو علومِ مفیدہ سکھا پڑھا کر ان کی جہالت دور کر دی جائے تو یہ خاصے بھلے چنگے جنٹلمین ہو سکتے ہیں ''۔ ٦

سرسید چاہتے تھے کہ مسلمان جو حکمران قوم کی نظر میں حقیر و ذلیل ہیں ۔ان میں علومِ جدیدہ کی وساطت سے شعور کی پختگی ،اعلیٰ ذہنیت ، بلند حوصلگی اور تہذیب و شائستگی پیدا ہو۔وہ اس قابل نہیں کہ انگریز اعلیٰ عہدیداروں ،اسسٹنٹ جوئنٹ کلکٹر تو کجا لاٹ صاحب کے سامنے بھی ہاتھ نہ جوڑیں بلکہ ان سے شیک

ہینڈ کریں۔اس لیے کہ انگریز ہاتھ جوڑنے والے سے اتنے خوش نہیں ہوتے جتنا کہ ''شیک ہینڈ'' کرنے والوں سے خوش ہوتے ہیں اور وہ انگریزوں سے اس طرح ملیں جیسے ایک جنٹلمین دوسرے جنٹلمین سے ملتا ہے۔اس طرح نئے علوم سے مسلمانوں کی تلافئ مافات ہوجائے۔اسی مقصد کے تحت سرسید احمد خاں نے نامناسب اور ناسازگار حالات میں بھی مسلمانوں کی اصلاح پر کمر باندھی۔بقول نذیر احمد ''ان کو اگر خیال آجاتا کہ فرہاد کی طرح جوئے شیر لانے سے مسلمانوں کی حالت درست ہوتی ہے تو وہ ہرگز یہ نہ سوچتے کہ جوئے شیر لانا ممکن بھی ہے یا نہیں، کدال، پھاوڑا لے کے کوہ ہمالیہ کو کاٹنا شروع کردیتے''(۷)۔چناچہ معاشرے کی اصلاح اور اس کی ترقی کے لئے سرسید احمد خاں نے ۱۸۵۹ء میں مرادآباد میں فارسی مدرسہ قائم کیا۔۱۸۶۳ء میں غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی۔جس کا مقصد اعلیٰ انگریزی کتابوں کا اردو رترجمہ کرنا تھا۔تاکہ مسلمانوں میں اس کا مذاق پیدا ہو۔سائنٹفک سوسائٹی سے قبل قدیم دہلی کالج میں انگریزی کتابوں کے ترجمے کے لیے ''دارالترجمہ'' قائم ہوچکا تھا جس میں اردو نثر کے ان پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا تھا جو فورٹ ولیم کالج میں اجاگر ہونے سے رہ گئے تھے۱۸۶۴ء میں غازی پور میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے ایک مشترکہ اسکول قائم کیا جس میں اردو، عربی، فارسی اور سنسکرت کے ساتھ ساتھ انگریزی بھی پڑھائی جاتی تھی۔جب ۱۸۶۴ء میں سرسید کا تبادلہ علی گڑھ ہوا تو سائنٹفک سوسائٹی کو بھی وہ اپنے ساتھ علی گڑھ لے گئے۔ہندوستانیوں کو خواب غفلت سے جھنجھوڑ کر بیدار کرنے اور انہیں قومی ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے لیے انہوں نے ۱۰ رمئی ۱۸۶۶ء کو علی گڑھ میں ''برٹش انڈیا اسی ایشن'' قائم کی ۔مسلمانوں کو علوم جدیدہ سے فیض یاب کرانے اور ان کی ذہنی اور فکری آبیاری اور یورپین قوم کی سلطنتوں او رترقی کے راز سربستہ سے ان کو واقف کرانے کے لئے سائنٹفک سوسائٹی کی جانب سے ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' جاری کیا۔سرسید نے مقاصد کے علاوہ مغربی تعلیم اور تعلیمی اداروں کا جائزہ لینے کیلئے انگلستان کا سفر کیا اور وہاں سے واپسی پر ۱۸۷۰ء میں ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا۔اس رسالہ کی اجرائی کا مقصد مسلمانوں کی خاطر ایک معیاری تعلیم گاہ کے لیے عوام کو نفسیاتی طور پر تیار کرنا تھا۔سرسید نے اپنے کوششوں کو تیز کرتے ہوئے آخر کار ۲۲ رمئی ۱۸۷۵ء کو علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم قائم کیا۔جو آگے چل کر کالج بنا جس کی موجودہ شکل علی گڑھ یونیورسٹی ہے۔نذیر احمد نے اپنے لکچروں کے ذریعہ کالج کی بنیادوں

کو مستحکم کرنے میں سرسید کا بہت زیادہ ساتھ دیا ہے۔ یہاں تک کہ قومی گداگری بھی کی تھی اور اس سے بڑھ کر قومی وملکی ترقی کے لیے نیک صلاح اور مشورے بھی دیا کرتے تھے۔

علی گڑھ تحریک نے نوجوان پڑھے لکھے طبقے کو بہت متاثر کیا تھا۔نذیر احمد کے ناول ''رویائے صادقہ'' کا ہیرو محمد صادق ہو بہو اسی طبقے کی نمائندگی کرتا ہے۔خود سرسید کے انگریزی وضع قطع اور طرزِ معاشرت کو اپنانے اور انگریزوں سے راہ ورسم ،ربط وضبط بڑھانے ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کھانے پینے سے بالخصوص اس زمانے کا رجعت پسند طبقہ سرسید احمد خاں سے بدظن ہو گیا تھا۔ان کو کافر وملحد اور کرسٹان کے ناموں سے یاد کیا جاتا تھا۔اگرچہ سرسید کے مذہبی خیالات سے اختلاف کرنے والوں میں نذیر احمد بھی شامل تھے لیکن نذیر احمد کی علمی تحریک کو وہ بہ نظر استحسان دیکھتے تھے۔یہاں تک کہ انہوں نے سر سید کے اصلاحی کارناموں سے متاثر ہو کر ایک موقع پر کہہ دیا تھا کہ:

''مجھ کو پیر کی تلاش بھی ہوتی تو میں ضروران کے ہاتھ پر بیعت لیتا''[7]

لیکن بعض لوگوں نے سرسید احمد خاں کو مسلمانوں کا غلط رہنما سمجھا اور ان پر نوجوان طبقہ کو مذہب سے بے راہ رو کر کے عیسائی بنانے کا الزام لگایا۔

ڈپٹی نذیر احمد کے عہد یعنی برٹش حکومت کے دور میں سماجی فضا کچھ اس قسم کی ہو گئی تھی کہ مسلمانوں ہی میں تین گروہ ہو گئے تھے۔ایک جو مغربی علوم وفنون تہذیب وتمدن میں رنگا ہوا تھا۔جس میں سرسید احمد خاں پیش پیش تھے اس مکتبِ خیال کی نمائندگی نذیر احمد کے ناول ''ابن الوقت'' کے ہیرو ابن الوقت سے ہو جاتی ہے۔دوسرا گروہ قدامت پرست علماء کا تھا جس میں اکبرالہٰ آبادی بھی شامل تھے۔اس مکتبِ خیال کی عکاسی اسی ناول کے اہم کردار حجتہ الاسلام سے ہوتی ہے اور ان دونوں گروہوں کے درمیان ایک تیسرا گروہ وہ بھی تھا جو مغربی علوم وفنون سے استفادہ کرنے کے باوجود اپنی وضع قطع مذہبی احکام اور روایات کو بھی سینہ سے لگائے ہوئے تھا جس میں وہ کسی قیمت پر بھی کسی قسم کی تبدیلی نہیں چاہتا تھا۔اسی گروہ میں نذیر احمد کا شمار ہوتا ہے

اسی طرح ہندوستان میں برطانوی حکومت کے قائم ہونے پر انگریزوں میں بھی دو مکتبِ خیال پیدا ہو گئے تھے۔ایک وہ جو ہندوستانیوں کو ترقی کی راہ پر گامزن دیکھ کر خوش ہوتا اور مسلمانوں کی تائید میں

تھا۔نذیر احمد کے اسی ناول کا ایک ناول ایک معاون کردار نوبل صاحب اسی مکتبِ خیال کا آئینہ دار ہے ۔اس کے برعکس دوسرا گروہ وہ تھا جو ہندوستانیوں کو سیاسی سرگرمیوں میں آگے دیکھنا کسی قیمت پر بھی گوار نہیں کرتا تھا۔نذیر احمد کے اسی ناول کا ایک اور معاون کردار شارپ صاحب اسی مکتبِ خیال کا ایک فرد ہے۔

غرض غدر کے بعد کا دور طبقاتی کشمکش ،مشرق و مغرب قدامت پرستی اور جدیدت ،پرانی قدروں اور نئی قدروں اور فلسفئہ جبر و فلسفئہ اختیار یعنی دو فکری معاشرتی اور اقتصادی نظاموں کے مابین ٹکراؤ، تصادم اور کشمکش کا دور تھا جس کو ہم نذیر احمد کی تخلیقات ''ابن الوقت،ایامیٰ اور رویائے صادقہ'' میں بآسانی محسوس کر سکتے ہیں۔

حقیقت میں دیکھا جائے تو غدر کے بعد کا دور اصلاحی دور تھا اور تحقیقات اور تخلیقات کا دور بھی اگرچہ انگریزوں کے تعلیمی اداروں کو عام کرنے اور فورٹ ولیم کالج کے قیام کا مقصد انگریزوں کو ہندوستانی زبانوں سے روشناس کرانا تھا۔انگریزوں کی ان تعلیمی کوششوں اور ان کے اقتدار کا مقصد صحیح ہے کہ ہندوستان کو اپنی نوآبادی بنانا اور اس کا معاشی استحصال کرنا تھا۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی بڑی حد تک اہمیت کی حامل ہے کہ انگریزوں کی ان کوششوں سے ہندوستان کو بعض فائدے بھی حاصل ہوئے۔سماج بیداری اور اصلاحی تحریکیں عام ہوئیں۔پرانی قدروں میں ایک انقلابِ عظیم آ گیا۔مغربی اثرات نے ہندوستان کے ہر شعبہ اور ادارے کو بڑی ہی تیزی کے ساتھ متاثر کر کے صدیوں کے جمود کو توڑ دیا۔انگریزوں اور ان کی تقلید میں خود کئی ہندوستانیوں نے تعلیمی اداروں کو قائم کیا۔سائنس اور ٹکنالوجی کے ساتھ ساتھ اردو ادب میں بھی زندگی کی ایک لہر دوڑ گئی۔یہی وہ زمانہ تھا جس میں سر سید احمد خاں ڈپٹی نذیر احمد،الطاف حسین حالی،شبلی نعمانی اور محمد حسین آزاد جیسے اردو ادب کے چاند ستارے آسمان اردو ادب پر ابھر کر آئے۔جنہوں نے مغربی علوم سے استفادہ کر کے اردو ادب کو جس کی بنیاد ''ادب برائے ادب'' پر رکھی گئی تھی ایک نیا موڑ،ایک نیا رنگ و آہنگ دیکر اس کی بنیاد ''ادب برائے زندگی'' پر رکھی اور اس کو ہماری زندگی کا عکاس بنایا۔جہاں سر سید نے اپنے سادہ لیکن دلپذیر اور مؤثر انداز بیان سے اردو زبان کو استدلالی حیثیت بخش کر اخلاق،تعلیم اور مذہب کے اہم ترین شعبوں کی طرف متوجہ کیا۔آزاد نے اپنی انشاپردازی سے اردو ادبیات میں ایک درجہ متعین کیا۔حالی نے جدید تنقید کی بنیاد ڈالی اور سوانح نگاری کا آغاز کیا اور

پھر اپنی شاعری سے سوئی ہوئی قوم کو بیدار کیا۔اور مولانا شبلی نے خالص ادبی خدمات پر فلسفہ و تاریخ اور فن شاعری کے راز ہائے سر بستہ کھولے۔وہیں نذیر احمد نے اپنے زور بیان سے اصلاحی ناول لکھے جو زندگی سے ہم آہنگ بھی تھے اور ہماری زندگی کے بننے سنورنے میں معاون و مددگار بھی۔یہی مغربی اثرات کا نتیجہ تھا کہ روشن دل و دماغ قوم میں ذمہ داری اور فرض شناسی کا احساس اور زمانے کے ساتھ چلنے کے لیے نئے تقاضوں کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی تھی۔مغربی اثرات کی وجہ سے ہندوستان میں بھی آزادیٔ نسوان اور خواتین میں تعلیم کو عام کرنے اور ان کی اقتصادیات کو بہتر بنانے کی تحریکات کا آغاز ہوا۔اس خصوص میں رام بائی، رکما بائی، راما بائی رانڈے نے بہت اہم رول ادا کیا۔ایشور چندر ودیا ساگر اور پونا کے پروفیسر کاروے نے ودھوا آشرم کھولے۔پارسیوں نے مختلف قسم کی تعلیم دینے میں سب سے پہلے قدم بڑھایا۔انڈین سوشل کانفرنس نے عورتوں کی ترقی کے لیے مختلف قسم کے کام کئے۔مسلمانوں میں بھی خواتین کی اصلاح کا خیال پیدا ہوا۔نذیر احمد پہلے شخص تھے جنہوں نے معاشرے کی ترقی کے لیے عورتوں کی اصلاح کو اہم بنیادی اہمیت دی اور اپنے ناولوں کی توسط سے اس کا بیڑا اٹھایا۔ویسے قبل ازیں 'تہذیب الاخلاق' میں بھی عورتوں کی تعلیم، تعدد ازدواج کی خرابیوں اور عقد بیوگاں کے بارے میں تھوڑے بہت مضامین شائع ہونے لگے تھے۔۱۹۰۴ء میں تعلیم نسوان کی تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے ''خاتون'' کے نام سے ایک رسالہ بھی جاری کیا تھا اور پھر عبداللہ صاحب نے تعلیم نسواں کو فروغ دینے کے لئے علی گڑھ میں عورتوں کیلئے ایک مدرسہ قائم کیا تھا جو آگے چل کر ویمنس کالج بنا۔آریہ سماج اور برہمو سماج نے بھی عورتوں کی اصلاح اور انکی ترقی کے لیے فضا تیار کی تھی۔

مختصر یہ کہ نو آبادکار (انگریز) جہاں ہندوستان میں اپنے ساتھ نحوستیں لے کر آئے وہاں ان کا وجود ہندوستانیوں کے لیے بابرکت بھی ثابت ہوا۔جس کا نذیر احمد نے اپنے کئی لکچروں میں ذکر کیا ہے۔اس سلسلے میں ۱۵/اکتوبر ۱۸۸۸ء کو اپنا پہلا لکچر انڈین نیشنل کانگریس پر دیتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''زیادہ نہیں ۱۸۵۷ء کے غدر سے پہلے کے زمانے کو اس وقت سے مقابلہ کرو تو ظلمت و نور کا فرق پاؤ گے۔اب ہم پوچھتے ہیں کہ یہ ریل یہ تار برقی یہ سررشتۂ تعلیم، یہ منی آرڈر، یہ پوسٹ کارڈ، یہ ویلیو پی ایبل، یہ میونسپلٹی، یہ سڑکیں، یہ صفائی، یہ نہر

، یہ سفر بحری و بری کی آسانیاں، یہ پولیس، یہ اخباروں کی آزادی، یہ ہندوستانی والیان ملک کے اختیارات تنبیت ، یہ نمائش ، یہ معدلت گستری کے قوانین اور ضابطے ، یہ ہندوستانیوں کی کونسلوں میں شرکت ، یہ تعزیری خطاب اور یہ تجارت کی ترقی ،غرض یہ سارے انتظام کس نے سوچے؟ کس نے نکالے؟'' ۸

آ گے چل کر موصوف یوں کہتے ہیں:

''بارہ برس ہوئے محکمہ برٹش گورمنٹ سے ایک بے تعلقی سی ہے مگر مجھ پر برٹش گورمنٹ کے حقوق ہیں۔ برٹش گورمنٹ نے مجھ کو پڑھایا عزت دی ،نوکری دی ، میں اس کی رعیت ہوں اور امن و آسائش اور آزادی سے علی وجہ الکمال متمتع ۔ بایں ہمہ میں برٹش گورمنٹ کا بھاٹ نہ کبھی تھا اور نہ اب ہوں ۔ میں جانتا ہوں کہ برٹش گورمنٹ کے بہت سے انتظام اصلاح طلب ہیں ''۔ ۹

اسی طرح کے خیالات کا مظاہرہ نذیر احمد نے اپنے ایک لکچر میں بھی کیا ہے:

''انگریزی عملداری کے بے شمار احسان ہیں ۔ ریل اور تار برقی اور ڈاک اور اسٹیمر اور سڑکیں اور نہریں اور مدارس اور شفاخانے اور کیا کیا لیکن سب میں بڑا احسان وہی تھا جو لارڈ میکالے ہندوستانیوں پر کر گیا ۔ وہ ہمارے لیے تمام دنیاوی برکتوں کو شُور (sure) اور سرٹین (certain) کر گیا ہے۔'' ۱۰

ڈپٹی نذیر احمد اگر چہ انگریزوں کی عملداری پر تنقید بھی کرتے تھے تاہم وہ ہر لحاظ سے اس کو دنیا کی دوسری عملداریوں پر ترجیح دیتے تھے ۔ انھوں نے ہر جگہ اس کی ستائش ہی کی ہے ۔ اپنے ناول کے ایک کردار ابن الوقت کی زبانی بھی اپنے تاثرات یوں پیش کرتے ہیں:

''اگر چہ اس سے تھوڑی دیر پہلے میں نے گورمنٹ کے انتظام پر سختی کے ساتھ نکتہ چینی کی ہے بایں ہمہ میں اقرار کرتا ہوں کہ انصاف میں ،انسانی ہمدردی میں ، رعایا کی آزادی میں ، رعایا کو مہذب بنانے میں ، ملک کی فلاح و بہبودی میں ، ملک کی ترقی میں دنیا کی کوئی گورمنٹ انگریزی کو نہیں پاتی ۔ انگریزی گورمنٹ میں جو نقصان ہیں عملی قسم کے ہیں ۔ ورنہ اس گورمنٹ کے اصول ایسے عمدہ ہیں کہ ان سے بہتر نہ بھی ہوئے اور نہ اب روئے زمین کے کسی حصہ میں ہیں ۔ میں انگریزی گورمنٹ کو

ہندوستان کے حق میں خدا کی رحمت اور برکت سمجھتا ہوں‘‘۔۱۱

سرسید احمد خاں بھی برٹش گورمنٹ کو مسلمانوں کے حق میں خدا کی رحمت سمجھتے تھے۔انگریزوں کی ہندوستان میں آمد سے اگرچہ ہندوستانیوں کے سیاسی نظم ونسق کا شیرازہ بکھر گیا۔انہیں جان و مال کا کافی نقصان پہنچا،لیکن بقول عبداللہ یوسف علی:

’’اس سے ہمارے اقتصادیات اور جدید حالات میں مطابقت پیدا ہوگئی اورہمیں ایسے اقتصادی سامان بہم پہنچے جن سے ہمارے تعلقات دنیا کی تحریکات کے ساتھ مظبوط ہوگئے‘‘۔۱۲

مختصر یہ کہ نوآبادکاروں کی آمد سے ہندوستانیوں کو نقصان کم اور فائدہ زیادہ پہنچا اور آنے والی نسلوں کو اس سے کہیں زیادہ فائدے پہنچے جس سے ہم آج بھی فیضیاب ہورہے ہیں ۔اگر انگریز ہندوستان نہ آئے ہوتے تو مصلحین قوم میں بیداری پیدا نہ ہوتی ۔اس خصوص میں مسلمانوں کی اصلاح کی سرسید نے سعی نہ کی ہوتی اوران کا بھرپور تعاون نہ دیا ہوتا تو کہا نہیں جاسکتا کہ مسلمان آج کس مقام پر ہوتے ۔شاید وہیں ہوتے جہاں آج سے ایک صدی قبل تھے۔وہی جہالت وہی توہم پسندی اور وہی رسم پرستی کی گھٹن میں اپنے آپ کو تڑپتا ہوا بے چین پاتے اور علم و ہنر میں دنیا کے دیگر مما لک سے سب سے پیچھے رہتے اور مفلسی ،زوال پذیری میں سب سے آگے ۔اس پس منظر میں ناول نگاری کا آغاز کرتے ہوئے نذیر احمد نے سرسید احمد خاں کی تحریک کو آگے بڑھایا ہے بلکہ مجموعی طور پر اپنے عہد کے ترقی پسند ذہن کا ساتھ دیا۔ان کی مساعی سرسید احمد خاں ،راجہ رام موہن رائے اور انہیں جیسے دوسروں کی سی نہ رہی ہوں لیکن ان کے ناولوں کے قارئین کی تعداد کچھ کم نہیں تھی وہ نہ صرف مقبول تھے بلکہ مؤثر بھی اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ نذیر احمد کے قلم کا رشتہ اپنے عہد سے استوار تھا۔ان کے ناولوں کا مواد، پلاٹ اور کردار وغیرہ ان کے پس منظر سے ابھر کر آئے تھے اوران کے تانے بانے اس پس منظر ہی سے بنے گئے تھے۔ان کے عہد کا بخوبی مطالعہ کے بعد ہی ہم ان کے ناولوں کے مقصد ومنہاج اور معنی ومفہوم کو کماحقہ سمجھ سکتے ہیں۔

ہندوستان میں استعماریوں یا انگریزوں کی آمد اور انقلاب ۱۸۵۷ء کی ناکامی اوراس کے بعد کے حالات نے ہندوستانی معاشرے کو تہ وبالا کر کے رکھ دیا تھا۔مغربی تہذیب آہستہ آہستہ پورے معاشرے

پر اثر انداز ہورہی تھی۔ انگریزوں کے تسلط اوران کے غلبہ کی وجہ سے بھی شکست خوردہ مسلم اقوام میں پست ہمتی پیدا ہوئی اور نفسیاتی طور پر وہ دن بدن کمزور ہوتے چلے گئے اور تنزلی کی انتہا کو پہنچ گئے۔ جس کے نتیجے میں مسلمانوں کا زوال ہونا شروع ہوگیا۔ زوال آمدہ قوم میں احتجاج اور رد کی صلاحیت دن بدن کمزور پڑتی جاتی ہے اور وہ مغلوب طبقے کے زیر اثر چلا جاتا ہے۔ یہی حال ہندوستانی مسلمانوں کا بھی ہوا۔ مغربی تہذیب کے اثرات سے یہ قوم اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھ سکی۔ نتیجتاً تہذیب و معاشرت اور مذہب سبھی پر اس کا گہرا اثر پڑا جو آج تک باقی ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کا عہد ان ہی تبدیلیوں کا عہد تھا۔ معاشرے میں کافی تبدیلیاں رونما ہوچکی تھیں اور ہورہی تھیں۔ نذیر احمد نوآبادیاتی دور کے ایک بہت بڑے مصلح اور مفکر تھے۔ لہٰذا انہوں نے نئی تبدیلیوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والے نت نئے مسائل پر نہ صرف خود غور وخوض کیا بلکہ اپنے خیالات کا اظہار بھی بہت مؤثر انداز میں کیا۔ انہوں نے اپنے ناولوں اور لکچروں کے ذریعے اصلاح معاشرہ کی تحریک شروع کی اور موجودہ معاشرتی صورت حال کو مدنظر رکھ کر ہی ناول لکھے۔ معاشرے میں راہ پانے جانے والی مختلف خرابیوں کو اپنے ناولوں میں نت نئے انداز سے پیش کیا۔ انہوں نے غلط رسم ورواج، مغربی تہذیب کی اندھی تقلید، توہم پرستی اور بے جا پابندیوں جیسے عیوب سے معاشرے میں جو خرابی پیدا ہورہی تھی اس کو اپنے مختلف ناولوں میں اس طرح اجاگر کیا کہ لوگ ان برائیوں کو سمجھ سکیں اوران سے بچنے کی کوشش کریں۔ چوں کہ نذیر احمد اپنے ناولوں میں زندگی کی صداقتوں کو پیش کرتے تھے لہٰذا لوگ ان کی طرف ملتفت ہوئے۔

## نوآبادیاتی ہندوستان میں اردو ناول، نوآبادیاتی نظام کی اصلاحات اور استحصال کے تناظر میں

اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں اردو ادب کی جو داستانیں ضبطِ تحریر میں آئیں وہ داستان کے ضخیم پیرائے سے نکل کر ناول کے وجود میں ڈھلتی نظر آتی ہیں لیکن ان کے موضوعات، کردار اور ماحول مافوق الفطرت اور رومانوی ہی ہیں۔ ماحول بھی داستانوی ہے لیکن یہ دور داستان سے ناول کی سمت سفر کا دور ہے۔ سترھویں صدی کے ربع آخر، انگلستان کے شاندار جمہوری انقلاب اور اٹھارویں صدی کے آخری برسوں میں انقلابِ فرانس نے تخت اچھال دئے اور تاج گرادئے

تھے اس سماجی تبدیلی کے نتیجہ میں متوسط طبقہ کے ہاتھوں میں قیادت آ گئی۔شہنشاہیت کا اختتام ہوا تو ادبی فن پاروں میں بھی شہزادوں،شہزادیوں کی جگہ ناول جیسی حقیقت پسندانہ صنف نے لے لی جو جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ تھی۔

> ''سترہویں اور اٹھارویں صدی کے انقلابات نے مغرب بالخصوص یورپ کے فرد، سماج ،تہذیب اور تمدن میں زبردست ہلچل پیدا کر دی تھی ۔مسلمہ اخلاقی و جمالیاتی نظام اقتدار متزلزل ہو گیا تھا۔نئے ماحول میں نئے انسان کے لیے روایتی اصنافِ ادب، داستان ،رومان ،رزمیہ، بزمیہ اور المیہ طربیہ، غیر متعلق ہو چکی تھیں ۔اشرافیہ اور رعیت کی جگہ متوسط طبقے نے لے لی تھی ۔ ہیرو کی بجائے فرد انگڑائی لے کر عالمِ بیداری میں آیا۔ مافوق الفطرت پر عناصر نے فتح پائی ۔ یوں داستان سمیت روایتی اصنافِ ادب قصئہ پارینہ ہوئیں اور ناول عہدِ جدید کا ترجمان ٹھرا۔''۱۳

کرہ ارض پر ناول کے جنم کے لیے سازگار ماحول سب سے پہلے یورپ نے فراہم کیا۔سو یورپی ماحول میں جنم اور نشو ونما پانے کے بعد یہ صنف یورپی اقوام کے ساتھ ان کی نوآبادیوں میں آئی اور حالات سازگار پا کر مقبولِ عام ہوئی۔ برصغیر میں شاید ادبی فضا داستان کے بوجھل وجود کو چھوڑ کر ناول کے چُست پیرائے کو اپنانے والی تھی لیکن مغربی ناول کے اثرات انگریزوں کے ہمراہ برصغیر آنے سے ناول کو فروغ ملا۔

ناول مافوق الفطرت ماحول کی بجائے حقیقی دنیا کے مسائل کے اظہار کا وسیلہ بنا۔سماجی اور سیاسی انقلاب ، نفسیاتی گھٹن ،سماجی مسائل ،مذہبی تنگ نظری ،پسی ہوئی انسانیت کا غم ،غربت و افلاس ،جاگیردارانہ نظام ،سرمایہ دارانہ نظام ،عورت کی بے وقعتی یہ سب وہ موضوعات تھے جو ناول کے پیرائے کے منتظر تھے۔سو مغرب سے آنے والی صنف ادب کو سندِ قبولیت ملی۔نوآبادیاتی نظام نے جہاں برصغیر کے عوام کی نفسیات کو مسخ کیا،ان کے معدنی اور طبعی وسائل کو لوٹا،ان کے سیاسی تشخّص کو مسمار کیا وہیں ناول جیسی صنف بھی عطا کی۔

پرتگیزی ،فرانسیسی اور برطانوی تاجر پندرھویں صدی عیسوی سے تجارت کی غرض سے ہندوستان آ رہے تھے۔ برطانوی انگریزوں نے اپنے قدم ہندوستان کی زمین پر جما لیے۔ان تاجروں کی نظر اس سونا

اگلنے والی سرزمین پر تھی اور یہاں کے معدنی وسائل اور کمزور سیاسی اقتدار ہندوستان کو برطانوی نوآبادی بنانے کے لیے کافی تھا۔ ۱۷۵۷ء میں سراج الدولہ کی شکست سے ۱۸۵۶ء سقوط لکھنؤ اور ۱۸۵۷ء فتح دہلی نے انگریزوں کو ہندوستان پر باقاعدہ قابض کر دیا۔ اب ہندوستان کو تاراج کرنے، یہاں کے وسائل کو یورپ پہنچانے اور یہاں کی عوام سے غلامانہ مشقت کرانے میں کوئی دقیقہ نہ رہا۔ ہندوستان باقاعدہ یورپی نوآبادی بن گیا اور ہندوستانیوں کا استحصال نوآباد مملکت کی عوام کی طرح ہونے لگا اس دور کا ایک مثبت پہلو بقول چیٹر جی یہ تھا کہ اس دور میں انگریزی ادب کے ذریعے سے ہندوستان کی روحِ عصر بھی نشاۃِ ثانیہ سے متعارف ہوئی۔ انگریزی تعلیم کا سلسلہ تو ۱۸۵۷ء کافی بیشتر چل نکلا تھا۔ تاہم ناول کے لیے سازگار مخصوص حالات ہنوز پیدا نہیں ہوئے تھے۔ یہ صورت حال ۱۸۵۷ء کے بعد ہی پیدا ہوئی، سو برصغیر کا پہلا ناول ''کرن گھیلو'' ۱۸۶۶ء مراٹھی زبان میں لکھا گیا۔ تاہم اردو میں ناول نگاری کا آغاز ڈپٹی نذیر احمد کے ناول مراۃ العروس سے ہوا۔ سرسید کی مقصدی تحریک نے غلام ہندوستان کو علم وادب کے ذریعے انگریز حکمرانوں کے قریب لانے کی کوشش کی۔ اب ہندوستان میں ایک ایسا رجحان پایا جا رہا تھا جس میں ہندوستانی ذہن خود کو نوآباد عوام تسلیم کرتے نظر آئے۔ بقول ڈاکٹر محمد عارف:

> ''غلامی کے اعتراف کا مطلب تھا، جدید خیالات کی برتری تسلیم کر لینا، یورپ کی مادی ترقی کی طرف دھیان دینا، سائنسی اکادمیوں اور جدید درس گاہوں کو روشن خیالی کا سرچشمہ مان لینا اور مغرب کے جمہوری نظام کی نئی قدروں کے آگے سرتسلیم خم کرنا ہے'' [۱۳]

انگریزی تعلیمی اداروں کی بدولت عام عوام تعلیم یافتہ ہو رہے تھے انہیں ریلوے، محکمہ مال، عدالتوں اور انتظامیہ میں ڈپٹی تک کی ملازمتیں ملنے لگیں تھیں۔ یوں، متوسّط تعلیم یافتہ طبقہ وجود میں آیا اور فروغ پانے لگا۔ حالؔی کی ''مجالس النساء'' جیسی تصانیف نے تعلیمِ نسواں کے رجحان کو تقویت دی۔

## نوآبادیاتی نظام کے اثرات اور ڈپٹی نذیر احمد کے ناول

ڈپٹی نذیر احمد (۱۸۳۶ء تا ۱۹۱۲ء) اردو کے اولین ناول نگار اور اردو کے ارکانِ خمسہ میں سے ایک ہیں اور سرسید کے رفیق اور ان کے مقصدی تحریک کے داعی ہیں۔ گو وہ سرسید کی طرح مذہبی طور پر

لبرل ازم کے قائل نہیں تاہم مادیت پرستی پر مذہب کو فوقیت دیتے ہیں اور عملی زندگی میں افادیت پسندی کی راہ پر گامزن تھے۔نذیر احمد ۱۸۳۶ء میں بجنور، اتر پردیش میں پیدا ہوئے اور مئی ۱۹۱۲ء میں دہلی میں انتقال کر گئے ۔ڈپٹی نذیر احمد نے ۱۸۴۶ء سے ۱۸۵۳ء تک دہلی کالج میں تعلیم حاصل کی ۔ ۱۸۵۷ء کے پُر آشوب دور میں بھی ان کا قیام دہلی میں ہی تھا۔ڈپٹی کلکٹری کا امتحان پاس کرنے کے بعد وہ کانپور اور بعد ازاں گورکھ پور کے ڈپٹی کلکٹر رہے۔ڈپٹی نذیر احمد نے کل سات (۷) ناول تخلیق کئے جن کے نام یوں ہیں ۱) مراۃ العروس (۱۸۶۹ء)،۲) بنات النعش (۱۸۷۲ء)،۳) توبۃ النصوح (۱۸۷۴ء)،۴) فسانۂ مبتلا یا محصنات (۱۸۸۵ء)،۵) ابن الوقت (۱۸۸۸ء)،۶) ایامیٰ (۱۸۹۱ء)،۷) رویائے صادقہ (۱۸۹۲ء)

ڈپٹی نذیر احمد کے تمام ناول ۱۸۵۷ء ناکام جنگِ آزادی کے بعد لکھے گئے ۔ان کا بنیادی مقصد مصلحت پسندی، مذہب سے رغبت، حصولِ تعلیم، مغرب کی اندھی تقلید کی مخالفت، مشرقی اقدار کا فروغ اور مغربی طرزِ رہن سہن کو اپنانا تھے۔مراۃ العروس اور بنات النعش میں عورتوں کی تعلیم و تربیت کو موضوع بنایا۔ بدلتے معاشرتی نظام میں عورتوں کا کیا کردار ہونا چاہیۓ۔توبۃ النصوح میں مصنف نے نئی نسل کو بے دینی کی دلدل سے بچانے کی کوشش کی ہے۔اس میں یہ اشارہ بھی موجود ہے کہ مسیحی مبلغین بھی دہریت کی روک تھام کی غرض سے اہم فریضہ ادا کر رہے ہیں ۔فسانۂ مبتلا میں مسلمان مرد، عورت کو سبق دیا گیا ہے کہ عقدِ ثانی کی صورت حال ہر گز پیدا نہ ہونے دی جائے یہ موضوع بھی سماجی اصلاح ہی کی ذیل میں آتا ہے ۔یہی حال ایامیٰ اور رویائے صادقہ کا ہے۔ بہر حال سیاسی و سماجی غلامی کی نئی صورت حال کو نذیر احمد نے جس ناول کا موضوع بنایا وہ ابن الوقت ہے۔

انگریزوں نے نام نہاد اقتدار مسلمانوں سے چھینا تھا۔سو مسلمانوں کا سیاسی و سماجی استحصال ان پر واجب تھا۔اگر نو آبادی کی عوام کو برابری کے حقوق دے دیئے جاتے تو وہ ریاست کہلاتی، نہ کہ نو آبادی ۔ہندوستان کی عوام کو بھی اس امتیازی سلوک سے گزرنا پڑا جو نو آبادیوں کی عوام کا مقدر ہوتا ہے۔ان کی مذہبی عبادت گاہوں اور رسم و رواج کو پامال کیا گیا جس کا ذکر نذیر احمد کے ناولوں میں بار ہا ملتا ہے۔

> ”دہلی کی جامع مسجد ایک مشہور عمارت ہے۔ایسا کون سا مردہ دل انگریز ہوگا کہ اس شہر میں کسی تقریب میں آنا ہوا اور وہ اس مسجد کو دیکھنے نہ جائے ۔ یہاں تک کوئی حرج

نہیں۔ مگر جب مسلمان جوتیاں پہن کر مسجد میں جانا اپنی توہین کا موجبِ خیال کرتے ہیں تو اگر چہ انگریزوں کے ہاں جوتی کا اتارنا خلافِ تہذیب ہومگر اس میں کیا حرج ہے کہ یا تو دروازے میں سے دوربین لگا کر دیکھ لیا جائے یا جوتی اتار کر اندر چلیں پھریں ۔ مانا کہ عمدہ اور مشہور عمارتوں کا دیکھنا ایک طبعی شوق ہے مگر شوق کے لیے دوسروں کی دل آزاری کیا ضروری ہے۔'' ۱۴

مذہبی تقدس اور معاشی اور معاشرتی زبوں حالی کا دور دیکھنے کے بعد باشعور مسلمانوں کو یہ احساس ہوا کہ اقتدار کا واپس حصول ناممکن ہے ۔ چنانچہ اگر ہم اچھے حاکم نہ بن سکیں تو اچھے محکوم بننے کی کوشش کرنی چاہیے یہ احساس سرسید اور ان کے رفقاء نے اپنی تحریروں سے اجاگر کیا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے تقریباً تمام ناول اس شعور کی تشریح وتفسیر کرتے نظر آتے ہیں۔

''اصغری: ہم کو تو بس اتنا کرنا ہے کہ ملکہ کی عمل داری میں ( خدا ان کو سلامت رکھے )امن وچین سے بیٹھے ہیں کسی طرح کا زور نہیں ، بھینٹ نہیں ، بیگار نہیں ،لوٹ نہیں ،کھسوٹ نہیں ، مار نہیں ، ڈھار نہیں ، جھگڑا نہیں ،تم کو اس عمل داری کی جب قدر آئے کہ کسی دوسری عمل داری میں جا کر رہو،اور گئی تو میں بھی نہیں اور خدا نہ لے جائے لیکن تاریخ کی کتابیں میں دیکھتی ہوں ،اخبار پڑھتی ہوں ،بعض ظالم بادشاہوں نے لوگوں کو ایسا ایسا ستایا کہ ان کے حالات دیکھ کر کلیجہ تھر تھر کانپنے لگتا ہے اور اب بھی دنیا میں سبھی دنیا میں سبھی طرح کے بادشاہ ہیں لیکن خلق اللہ کو جیسا کچھ آرام ہماری وکٹوریہ کی عمل داری میں ہے روئے زمین پہ کہیں نہیں ۔ یہ سچ ہے کہ ملکہ یہاں ہمارے پاس رہتی ہوتیں تو ہم لوگوں کو ان کی ذات سے بہت فائدے پہنچتے ۔ پھر بھی میں نے تحقیق سنا ہے کہ جب یہاں کی رعایا کو ذرا سی تکلیف میں بھی سن پاتی ہیں تو ان کا دل بے چین ہو جاتا ہے اور ملکہ کی رحم دلی اور خدا ترستی کی حکایتیں جو کبھی کبھی اخبار میں سے نظر سے گزری ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بے شک ان لوگوں کی پرداخت کا بہت بڑا خیال ہے اور سمجھتی ہوں کہ ہو نہ ہو ملکہ نے اپنے بیٹے کو بھی اسی غرض سے بھیجا ہے کہ اپنی آنکھوں سے رعیت کا حال دیکھو اور مجھے آکر بتاؤ۔'' ۱۵

ڈپٹی نذیر احمد اُن اکابرین ادب میں سے تھے جو انگریزوں کی بالا دستی کو تسلیم کر چکے تھے اور ان

کے احکامات کوتسلیم کرنے اور اچھی رعایا بننے کی سوچ کو ترویج دے رہے تھے۔انگریزوں کی حمایت میں بعض اوقات زمین آسمان ایک کردیتے ہیں۔لیکن ساتھ ساتھ اس بات کا بھی احساس ہوتا ہے کی ڈپٹی نذیر احمدقوم کی ترقی اور حصولِ آزادی کے لئے علم کو حاصل کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔کیونکہ کہ علم کی دولت سے عقل کے دروازے کھل جاتے ہیں۔جب تک قوم تعلیم یافتہ نہ ہوتب تک کوئی ترقی ممکن نہیں،علم کے بغیر قوم جہالت ،گمراہی ،توہم پرستی ،تنزلی اور دیگر برائیوں کی ہدف بنتی ہے۔وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ جدید سائنسی علوم اورٹیکنولوجی کے بغیر قوم ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جائے گی۔اسی لیے وہ جدید علوم کو حاصل کرنے کی وقت کی اہم ضرورت سمجھتے ہیں۔کیونکہ وہ ان نئے علوم کی افادیت اور اہمیت سے پوری طرح باخبر تھے۔اس قسم کے خیالات اور نظریات ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کے متن میں ملتے ہیں:

استانی جی:

> ''قوم کی قوم کا یہی حال ہے کہ عقل کے پتلے نہ ہوتے تو کالے کوسوں کو آکر بادشاہ کس طرح بن بیٹھے؟ ذرا انگلستان کی تاریخ پڑھو تو تم کو معلوم ہو کہ ابتدا ان لوگوں کی کیا تھی۔نرے وحشی تھے، جانوروں کو مار کر ان کا گوشت کھاتے اور چمڑا پہنے، پہاڑوں کی کھوؤں میں رہتے ،کھیتی باڑی اور مکان بنانے کی عقل نہ تھی۔رومیوں کی سلطنت تھی۔انھی سے انگریزوں نے عقل وسلیقہ سیکھا یہاں تک کہ رومیوں کو اپنے ملک سے نکال باہر کیا اب یہ وہی انگریز ہیں کہ روئے زمین پر کوئی قوم ایسی دانش مند اور ایسی شائستہ نہیں ہے۔'' ۱۶

حسن آرا:

> ''اب تک میں یہ سمجھتی تھی کہ خدا نے سب انسانوں کو برابر عقل دی ہے مگر آپ کے فرمانے سے معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں کے ملک کی آب وہوا میں ایک خاص تاثیر ہے کہ وہاں کے لوگ زیادہ عقل مند ہوتے ہیں میری کتاب میں بھی کئی جگہ دانش مندانِ فرنگ آیا ہے۔'' ۱۷

انگریزوں کی تقلید فقط کورانہ پیروی نہیں تھی ۔ڈپٹی نذیر احمد ان کے علوم وفنون کے حصول کو بھی لازمی سمجھتے تھےان کے خیال میں مغربی عوام کی ترقی کی وجہ ان کے علم وہنر ہے۔اور مسلمانوں کی ترقی بھی

اسی میں مضمر ہے کہ جدید علم حاصل کریں۔ برصغیر کی دوسری اقوام ہندو اور سکھ وغیرہ انگریزی تعلیم حاصل کر رہے تھے صرف مسلمان ہی اس میدان میں پیچھے تھے۔ نذیر احمد مسلمانوں کی علمی ترقی اور بالخصوص عورتوں کی تعلیم حاصل کرنے کے پرزور حمایتی تھے۔ ان کے پہلے دونوں ناول مراۃ العروس اور بنات النعش اسی موضوع کے حامل ہیں:

''جن عورتوں نے وقت کی قدر پہچانی اور اس کو کام کی باتوں میں لگایا، ہُنر سیکھا ،لیاقت حاصل کی وہ مردوں سے کسی بات میں ہیٹی نہیں رہیں۔ ملکہ وکٹوریہ کو دیکھو، عورت ذات ہوکر بھی کس دھوم دھام، کس شان اور کس ناموری اور کس عمدگی کے ساتھ اتنے بڑے ملک کا انتظام کر رہی ہیں کہ دنیا میں کسی بادشاہ کو آج تک یہ بات نصیب نہیں ہوئی۔ جب ایک عورت نے سلطنت جیسے کٹھن کام کو اور سلطنت بھی ماشاء اللہ اس قدر وسیع ہے کہ ایسے نازک وقت میں بات منہ سے نکلی اور اخباروں نے بتنگڑ بنایا یا اتنی مدت دراز تک سنبھالا اور ایسا سنبھالا کہ جو سنبھالنے کا حق ہے تو اب عورتوں کی خداداد قابلیت میں کلام کرنا بڑی ہٹ دھرمی ہے۔''۱۸

عورتوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ڈپٹی نذیر احمد انگریزوں کے ایک اور عمل سے بڑے مرعوب نظر آتے ہیں وہ معذوروں کی تعلیم ہے:

''انگیریزوں کی ولایت میں تو اندھوں کی تعلیم کا ایک ایسا عمدہ نظام ہے کہ اندھے ٹٹول ٹٹول کر اچھی طرح اخبار اور کتابیں پڑھ لیتے ہیں۔''۱۹

ناول ابن الوقت کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر خلیق انجم کا کہنا ہے کہ ابن الوقت اردو کا پہلا ناول ہے جس میں اپنے دور کی سیاست، تہذیبی و معاشرتی کش مکش، مذہبی رجحانات، برطانوی حکومت کے موافقین اور مخالفین کے سیاسی عقائد، حاکم و محکوم کے رشتے اور فرد کی خارجی اور سماجی زندگی کو تاریخی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد ابن الوقت میں عقیدت کی انتہا کو چھوتے نظر آتے ہیں۔ انگریزی تعلیم اپنانے کے ساتھ ساتھ انگریزی وضع اختیار کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں سمجھتے۔ نوآبادعوام شعوری اور لاشعوری طور پر اپنے حاکموں کے قریب آنے کی کوشش کرتی ہے بھلے انھیں دوسری جانب سے پسندیدگی یا ناپسندیدگی کا

سامنا کرنا پڑے۔ان کا کردار ابن الوقت ایک ایسا ہندوستانی باشندہ ہے جو انگریزی تہذیب وتمدن کو اپنا رہا ہے۔ ناصر عباس نیرؔ کے مطابق ڈپٹی نذیر احمد اصل میں دو جذبیت کے شکار ہیں کبھی وہ انگریزوں کی تقلید کرنے کو کہتے ہیں کبھی وہ مغرب کی پیروی کرنے کی مخالفت یا مذاحمت کرتے نظر آتے ہیں۔ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں اس نوآبادیاتی فکر کا مطالعہ قاری کو پڑھنے کو ملتا ہے۔وہ کبھی مذاحمت پر اتر آتے ہیں تو کبھی مفاہمت کی تلقین کرنے کو کہتے ہیں:

''آج کل کا سا زمانہ ہوتا تو کانوں کان کسی کو خبر بھی نہ ہوتی ابن الوقت کی تشہیر کی بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس نے ایسے وقت میں انگریزی وضع اختیار کی جب کہ انگریزی پڑھنا کفر اور انگریزی چیزوں کا استعمال ارتداد سمجھا جاتا ہے۔'' ۲۰

مسلمانوں کی علمی ترقی اور انگریزی تہذیب اختیار کرنے کا درس دینے والے ڈپٹی نذیر احمد ایک بہت ہی نازک مسئلے پر قلم اٹھاتے ہیں۔اس دور میں محکوم مسلمانوں اور حاکم عیسائیوں کے مابین کئی مذہبی اختلافات تھے جن میں سے ایک اکھٹے کھانا کھانا کا مسئلہ تھا۔مسلمانوں کی محکومیت انہیں حاکموں سے نفرت کرنے پر مجبور کرتی تھی ۔ ایسے میں نذیر احمد اور ان کی مقصدی تحریک کے دوسرے رفقاء نے مسلمانوں کو عیسائیوں کے قریب لانے کی کوشش کی تا کہ ان کے معاشی اور معاشرتی استحصال میں کچھ کمی آئے:

''ہم نشین: آپ نے ان کے برتن الگ کر دیئے ہوں گے۔

ابن الوقت: بھائی سچی بات تو یہ ہے کہ ہم نے برتن بھانڈا کچھ الگ نہیں کیا۔کھانا ہمارا، برتن ہمارے، پکانے والے ہم ، پھر الگ کرنے کی وجہ۔

ہم نشین: آخر وہ تھا تو انگریز۔

ابن الوقت: انگریز تھا تو ہونے دو۔کھانے میں کوئی حرام چیز نہیں ہوتی تھی۔'' ۲۱

نوآبادریاست کے محکوم اور حاکم باہم منافرت کے رشتے میں بندھے ہوتے ہیں جس کی بڑی وجہ وعوام کا استحصال ہے۔ڈپٹی نذیر احمد نے اس نفرت کو کم کرنے کی کوشش کی ہے۔

''جان نثار: صاحب کے منہ سے سنا ہے کہ روم اور مصر اور ایران اور عرب کہیں مسلمان پرہیز نہیں کرتے ۔ بے تکلف انگریزوں کے ساتھ کھاتے پیتے مگر ہمارے

ملک کے لوگ تو بڑی چھوت مانتے ہیں۔'' ۲۲

ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے عہدے کی مدد سے ہمیشہ کوشش کی کہ انگریز سرکار کے دل میں سے بھی مسلمانوں کی نفرت کو کم کریں اور اپنی تحریروں سے بھی اس کی تقویت دی:

''جو نفرت ہندوستان کے مسلمانوں کو انگریزی سے ہے ہرگز مذہبی نہیں ہے بلکہ ایک رسم ہے جو انہوں نے ہندوؤں سے اخذ کی ہے اور جتنے مسلمان اپنے مذہب سے بخوبی آگاہ ہیں ہرگز اس نفرت میں شریک نہیں۔'' ۲۳

انگریزں نے ہندوستان پر قبضہ کر کے یہاں کی عوام کو جسمانی و ذہنی طور پر اپنا محکوم بنالیا تھا۔اب ان کی مذہبی حیثیت کو مجروح کرنا مقصود تھا چناچہ انگریز پادری انگلستان سے ہندوستان آئے اور عیسائیت کی بھرپور تبلیغ کی جس کا ذکر اس دور کت کم وبیش سبھی ناول نگار کے ہاں ہے۔

''مذہب کو پھیلانے میں سرگرمی اس درجے کی کہ گلی گلی پادری وعظ کہتے، مذہبی کتابیں مفت بانٹتے پھرتے ہیں۔چمار ہو یا بھنگی ہوان کو اپنی ذات میں ملالینے سے انکار نہیں یوں ہندوستانیوں کے دلوں میں از خود سرکار انگریز کی طرف سے مذہبی بدگمانی پیدا ہوئی۔'' ۲۴

مذہبی نکات پر جو سوال عوام کے ذہنوں میں اٹھ رہے تھے اس کا محرک مذہبی اختلاف تھا یعنی عوام اور حکمرانوں کا الگ الگ مذہب، دوسرا جدید تعلیم حاصل کرنے سے عوام سرکاری ملازمتیں حاصل کر رہے تھے جس سے یہ سوچ ابھر رہی تھی کہ مسلمان انگریز حکومت کے کارندے بننے اور انگریزی تعلیم حاصل کرنے سے لادین ہوتے جارہے ہیں۔

''یہ کیوں کہ حضرت ہندوستان آپ کے نزدیک دارالحرب ہے یا نہیں؟ انگریزوں سے اور ہنود سے سود لینا روا ہے یا نہیں؟ انگریز اگر کابل میں چڑھائی کریں اور ایک پلٹن کو امیر کے مقابلے میں لڑنے کا حکم دیں اور ایک مسلمان اس پلٹن میں پہلے سے نوکر ہو تو اس کو کیا کرنا چاہیے۔جنھوں نے مصر میں خروج کیا ہے، میر موعود ہے یا نہیں اور ان کو مدد دینا از روئے شرح شریف کیا حکم رکھتا ہے؟ انگریزی دواؤں کا استعمال درست ہے یا نہیں؟ کچہری سے برابر سود کی ڈگریاں ہوتی ہیں سود کا دینا گناہ ہے یا نہیں؟ انگریزوں کے ساتھ کھانا اور لباس کا طرزِ تمدن کیا حکم رکھتا ہے۔'' ۲۵

انگریزی تہذیب، انگریزی زبان اور انگریزی مذہب کے لیے نرم گوشہ رکھنے کے باوجود ڈپٹی نذیر احمد نوآباد ہندوستان کی بدحالی اور انگریزوں کے ہاتھوں ہونے والے استحصال کو چھپا نہ سکے اور وہ اُن کی تحریروں میں در آیا۔ ہندوستان ایک زرعی ملک ہے جس کی آمدنی کا بڑا حصہ زراعت سے حاصل ہوتا ہے انگریزوں نے اس سونا اگلنے والی سرزمین کو اچھی طرح نچوڑا اور کسانوں کو جو کم علم تھے اپنے زیرِ نگیں کر لیا۔

''اب گورنمنٹ انگریزی انتظام کو دیکھنا چاہیے کہ اول کو افتادہ، بنجر چپے چپے زمین کی پیمائش کرائی پھر مٹی کی ذات اور کھاد اور آب پاشی کے لحاظ سے کھیت کھیت کی حقیقت دریافت کی پھر کاغذات بہی اور لوگوں کی گواہی اور ذاتی تجربے سے یہاں تک تحقیق کیا کہ اس کھیت میں اس قدر پیداوار کی قابلیت ہے اس طرح واقع میں اچھا خاصا کسا ہو، دو تہائی حق سرکار ٹھہرا دیا اور اتنی کاوش پر بھی ہمیشہ کے لیے بلکہ غائیت درجہ صرف تیس برس کے لیے کہ اتنے میں زمین دار پھر پیچے گا، پھر نچوڑیں گے۔'' ۲۶

انگریزوں نے ہندوستان کی معیشت کا استحصال ایسا کیا کہ کمر توڑ کے رکھ دی، یہاں سے خام مال برطانیہ پہنچایا اور وہاں کی تیار مصنوعات ہندوستان کی منڈیوں میں بیچیں جس سے یہاں کی صنعت و حرفت پر دائمی زوال آ گیا اور وہ بھی زراعت کی طرح انگریزوں کے ہاتھوں تاراج ہو گئی۔

''اہلِ حرفہ کی کیفیت کسانوں سے کہیں بدتر ہے یہ سچ ہے کہ گورنمنٹ ان کے حال سے کم تعرض کرتی ہے بلکہ، یوں کہنا چاہیے کہ نہیں کرتی مگر یورپ کے ملکوں نے ان کو مار بڑا کر دیا ہمارے دیکھتے دیکھتے بہت سے عمدہ ادویات کے پیشے معدوم ہو گئے اور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اب کہاں ہے وہ ڈھاکے کے ململ، بنارس کے مشروب ،اورنگ آباد کے کمخواب، بیدر کے برتن، کاپی کے کاغذ، کشمیر کی شالیں، لاہور کے ریشمی ڈورے، اہل یورپ کیا اس پر بند ہیں کہ جس چیز کی مانگ ہندوستان سے ہوئی، بنائی، بھیج دی؟ نہیں وہ لوگ رات دن اس ٹوہ میں لگے ہیں کہ ہندوستان میں کیا کیا چیز پیدا ہوتی ہے اور وہ انسان کے کس مصرف کی ہے اور اس ملک کے لوگوں کو کیا درکار ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان سے ہر طرح کی پیداوار ولائیت ڈھلی چلی جاتی ہے۔ کچھ تو یورپ میں کھپی اور کچھ ہندوستان کی مصرف بن کر آ گئی۔ ہندوستانی اہل

حرفہ تھکے تو یوں تھکے کہ انسان کی قوت کا اندازہ معلوم ہے۔اور وہ یورپ میں ملیں ہیں
کہ سارے سارے دن، ساری ساری رات برابر بے تکان پڑی چل رہی ہیں
۔ہندوستان میں ملوں کا ایجاد کرنا تو کجا۔انہیں تو ملوں سے کام لینے کے سلیقے کو بھی
عمریں چاہئیں۔'' ۲۷

زراعت پر انگریزوں کا ایسا قبضہ ہوا کہ تمام خام مال ہندوستانی غلاموں کے ہاتھوں کاشت ہونا اور برطانیہ چلا جاتا۔نیل، کپاس، تمباکو، چائے، مصالحہ جات وغیرہ برطانیہ جاتے اور وہاں سے تیار مصنوعات ہندوستانی منڈیوں میں مہنگے داموں بیچی جاتیں ۔ ہندوستانی کاریگر فارغ ہوگئے، تاجر انگریزوں کی شرائط پر تجارت کرنے لگے، یوں کسان غریب سے غریب تر ہوتے چلے گئے۔

''ہمارے ملک کی صنعت پر اوس پڑی چلی جاتی ہے پس اسی نسبت سے تجارت میں
بھی کمی، سچ پوچھئیے تو ساری تجارت اہل یورپ کی مٹھی میں، ہندوستانیوں کو تاجر نہیں
بلکہ تاجروں کا دلال سمجھتا ہوں، ولایت سے مال منگواتے ہیں اور اس کے طفیل روپے
پیچھے دھیلا دمڑا آپ بھی جھاڑ کھاتے ہیں۔'' ۲۸

نوآبادکاروں نے پورے ہندوستان میں خام مال اٹھانے کے لیے شمال سے جنوب تک ریل کی پٹریاں بچھادیں،نوآبادیاتی دور کی یہ بہت بڑی عطا ہے۔اس کا ذکر بھی ڈپٹی نذیر احمد کے ناول میں آیا ہے:

''انگریزوں کی عمل داری سے ہزاروں قسم کی نئی چیزیں چل پڑی ہیں،ان میں سے
ایک عجیب اور بڑے کام کی ریل ہے جس کی وجہ سے مہینوں کا سفر گھنٹوں میں طے کیا
جائے اور وہ بھی سہولتوں اور آسائش کے ساتھ سفر کا سفر اور تفریح کی تفریح۔یہی سبب
ہے کہ لوگ جیسے پر دیس گئے کام سے گھبراتے تھے، اب سفر کے لیے بہانے
ڈھونڈتے ہیں۔'' ۲۹

ریل جیسی نعمت بھی نوآبادیاتی عوام اور حکمرانوں کو قریب نہ لاسکی۔مذہبی اختلافات اور معاشرتی و معاشی استحصال، اقتصادی زبوں حالی، اہل حرفہ کی تباہی اور دینی مدارس کی بے حرمتی ایسے عوامل تھے جنھوں نے مسلمانوں کو انگریزوں، ان کی زبان، ان کی تہذیب وتمدن سے نفرت کرنے پر مجبور کیا اور ہندوستان میں حاکموں اور محکومین کے درمیان اچھے روابط استوار نہ ہوسکے:

''انگریزی گورنمنٹ میں جتنے نقصان ہیں آخر کو سب کا یہی ایک سبب جا کر ٹھہرتا ہے

کہ حاکم ومحکوم میں اختلاط نہیں اور ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف نہیں۔'' ۳۰

ڈپٹی نذیر احمد اپنے دور کے ماہر عکاس ناول نگار ہیں انہوں نے اپنے عہد کے غلام ہندوستان کی تصویریں اپنے ناولوں میں پیش کی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ وہ اس باشعور طبقے کی ذہنی اُپج کو بھی پیش کرتے ہیں جونوآبادیاتی عوام اور انگریز حاکموں کو بھی ایک دوسرے کے قریب لانا چاہ رہے تھے اور دونوں قوموں کے مابین مذہبی، ثقافتی، تعلیمی اور معاشرتی بدگمانیوں کو ختم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔حالی کے دیوان کے چہرے پہ لکھا ہے:

'' چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی''

یعنی وہ عوام کو حکمرانوں کی تقلید کرنے کو کہہ رہے ہیں یہی موضوع ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں اور سر سید کے مضامین کا ہے۔انگریز حکومت نے ہندوستان کا انتظام وانصرام چلانے کے لیے حکومت کے انتظامی ڈھانچے میں بہت سی تبدیلیاں کیں ان میں ان کے ذاتی مفادات تھے لیکن بہرحال اس میں ہندوستان کی اور ہندوستانیوں کی فلاح بھی تھی۔مثلاً عدالتی نظام میں تبدیلی، تعلیم کے محکمے میں تبدیلیاں، اردوزبان کی سرپرستی، جاگیرداری کا خاتمہ وغیرہ۔انگریزوں نے مقنّنہ، عدلیہ اور انتظامیہ کو الگ الگ شعبہ بنادیا جبکہ اس سے پہلے تمام اختیارات ایک ہی شعبے پولیس کو حاصل تھے:

> ''اصل بات یہ ہے کہ پہلے کوتوالی اور فوج داری ایک تھی۔جب یہ لوگ لگے اظہار کار گزاری کے لیے، ہر واردات بے سراغ کے لیے مجرم بنانے اور اصل مجرموں سے سازش کرکے، بے گناہوں کو ناحق پھنسانے، تو سرکار نے کوتوالی اور فوج داری کو الگ کردیا۔اب کوتوالی کا اتنا ہی اختیار تھا کہ جس کو اپنے نزدیک مجرم سمجھتے حاکم عدالت، مدعی اور گواہوں کے اظہار قلم بند کرتا ہے اور اپنے بیان کی روداد پر سزا پایا کرتا ہے۔'' ۳۱

مسلمانوں کے مخصوص پڑھے لکھے طبقے کو متاثر کرنے کے لیے نوآبادکاروں کا ہندوستانیوں کی تعلیمی سرپرستی کرنا ہی کافی تھا اور پھر انہوں نے بلاشبہ اپنے فائدے کی خاطر اردو کو فروغ دیا لیکن اس مسلمان متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔فورٹ ولیم کالج، دہلی کالج اور علی گڑھ کالج، جو بعدازاں یونیورسٹی بنا، جیسے اہم اقدامات اور انگریزوں کی تعلیمی اصلاحات نے انہیں ہندوستانی مسلمانوں کے قریب کردیا:

> ''اللہ! اللہ وہ بھی کیا دن تھے کہ سر ولیم میور ممالک مغربی وشمالی کے لیفٹیننٹ گورنر تھے

،مسٹر ولیم کمپنی کے ڈائریکٹر تھے۔تعلیم کے اعتبار سے یہ دونوں صاحب مسلمانوں کے گویا ہارون الرشید اور منصور تھے۔اور ہنود کے بکر ماجیت اور بھوج۔انگریزی جتنی پڑھی جائے اتنی تھوڑی ،مگر کتنی ہی کیوں نہ پھیلے۔ ہندوستان کی ملکی زبان تو بن بیٹھنے سے رہی۔قوم من حیث القوم اوپر سوا اوپر جب کبھی ترقی کرے گی۔اپنی زبان میں پڑھنے لکھنے سے سر ولیم میور کا یہی گُر تھا۔زبانِ اردو کی سرپرستی کے پیرائے میں ہماری فلاح کی فکر میں تھے۔انہی قدر دانی مجھے تصنیف وتالیف کی باعث ہوئی یہاں تک کہ عورتوں کی تعلیم کا سلسلہ مرتب ہوگیا۔'' ۳۲

## نوآبادیاتی ہندوستان میں غلط رسومات اور ڈپٹی نذیر احمد کا ردّعمل

ڈپٹی نذیر احمد نے سب سے پہلے اپنے ناول مراۃ العروس میں معاشرے کے غلط رسم ورواج کی طرف اشارہ کیا۔مذہب کے نام پر ہونے والی فضول خرچی جوتنگ دستی کا ذریعہ بن جاتے ہیں سے لوگوں کوخبردار کیا۔شب برأت کے موقع پر لوگ عبادت سے زیادہ نام ونمود اصراف بے جا اور آرائش بازی وغیرہ پرتوجہ صرف کرتے ہیں جس کی مذہبی حیثیت کچھ بھی نہیں۔لہذا ایسی مقدس اور معتبر رات جو عبادت میں بسر ہونی چاہئے توہمات اور خرافات کی نذر ہوجاتی ہے اور توہمات کے بدلے ثواب کے بجائے گناہ ہی کماتے ہیں۔

ایسی ہی ایک شب برأت کا ذکر نذیر احمد نے مرأۃ العروس میں کیا ہے۔اصغری کی ساس جن کے پاس روپے نہیں ہیں قرض لے کر آتش بازی اور حلوے کا انتظام کرنا چاہتی ہیں لیکن اصغری ان باتوں کو غلط سمجھتی ہے اور سسرال آتے ہی ایسی تمام توہمات اور بدعتوں کو ختم کروادیتی ہے۔ڈپٹی نذیر احمد ایسی تمام رسموں کو جوان کی نگاہ میں بدعت تھیں ان کو اصغری کی ساس کی زبان سے گنوادیتے ہیں اور مسلم معاشرے کو اس قسم کی تمام رسموں سے باز رکھنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں:

''اصغری کی ساس۔''شب برأت کا حلوہ، بیوی کا کونڈا،صحنک منت،عرس،قبروں کی چادر پنکھا، پھولوں کی سیر،سلطان بی کی سترہویں سہرا، کنگنا،نوبت،نقارہ،ڈھولک

،آرائش موری تو سب ہی چیزوں کو منع کرتے ہیں۔'' ۳۳

ڈپٹی نذیراحمد کے عہد میں یہ رسمیں صرف دہلی ہی میں نہیں بلکہ کم وبیش پورے ہندوستان کے مسلم معاشرے میں جاری تھیں۔جن میں بعض رسومات آج بھی رائج ہیں۔ ذات پات کی تقسیم ،اونچ نیچ ،سماجی نابرابری کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔نذیراحمد بھی سماج کی اس بے جا تقسیم اور تفریق کے خلاف تھے۔اسلام نے اخلاق وکردار کی بنیاد پر شرافت کا جو معیار قائم کیا ہے وہ اس کی حمایت کرتے نظر آتے ہیں ۔کم سنی کی شادی معاشرے میں عام تھی ۔نذیراحمد کم سنی کی شادی کو معاشرتی زندگی کے لیے مفید نہیں سمجھتے تھے لہذا وہ اس کی مخالفت کرتے نظر آتے ہیں۔''فسانۂ مبتلا'' میں انہوں نے کم عمری کی شادی کے برے نتائج پیش کیے ہیں۔

ڈپٹی نذیراحمد عقد بیوگان کے پُر زور حامی تھے جب کہ اس وقت کا معاشرہ ہندوستانی تہذیب کے زیر اثر عقد بیوگان کو عیب قرار دیتا تھا۔اسلامی اصولوں کے پیش نظر ،سماجی حالات کو بہتر بنانے کے لیے نذیراحمد نے عقد بیوگان کی پُر زور حمایت کی۔''ایامیٰ'' کا موضوع یہی ہے۔

ڈپٹی نذیراحمد تعداد ازدواج کے قائل نہیں تھے۔وہ ایک شادی کو ہی معاشرے کے لیے بہتر سمجھتے تھے۔دو شادیوں کے برے انجام کو انہوں نے اپنے ناول ''فسانۂ مبتلا'' میں پیش کیا ہے۔

ڈپٹی نذیراحمد نے ازدواجی زندگی کو خوش گوار بنانے اور تجرد کی زندگی نہ اختیار کرنے کی تلقین کی ہے اور مسلمانوں کو کاہلی ،سستی اور آرام طلبی ترک کرنے کا مشورہ دیا ہے اور عمل کے لئے ابھارا ہے۔اس لیے کہ ان کی بے عملی سے معاشرے میں جمود پیدا ہو گیا اور ترقی رک گئی تھی اسے دور کرنے کی کوشش کی ہے ۔مسلمانوں کو ترقی حاصل کرنے کے لیے تجارت کی ترغیب دی ہے۔ان کا ماننا تھا کہ جب تک مسلمان تجارت کی طرف راغب نہیں ہوں گے اس وقت تک معاشرہ ترقی نہیں کرسکتا ۔مغربی قوموں کی ترقی تجارت سے ہوئی۔لہذا مسلمان قوم کو کاہلی اور آرام طلبی کو ترک کر کے تجارت میں لگ جانا چاہئے ۔تبھی ترقی ممکن ہے۔

## ڈپٹی نذیراحمد کے تعلیمی نظریات کا مابعد نوآبادیاتی مطالعہ

ڈپٹی نذیراحمد سخت گیر مولوی تھے۔وہ مذہبی تعلیم کو ضروری سمجھتے تھے لیکن اس میں بے جا قدامت

پرستی اور نری مولویت سے انہیں نفرت تھی۔ وہ صرف مدرسے کی تعلیم کو انسان کے لیے نامکمل سمجھتے تھے۔ وہ مغربی علوم و افکار کو مسلمانوں کے لیے اہم سمجھتے تھے۔ وہ ایسی تعلیم کے حامی تھے جس میں تعلیم سے زیادہ تربیت شامل ہو۔ نذیر احمد لکھتے ہیں:

> ''گورمنٹ کو ایسی تعلیم دینی چاہئے جس میں تعلیم سے زیادہ تربیت شامل ہو۔ اور بی اے اور ایم اے کی جگہ یا اس کے بعد انجینئری، ڈاکٹری، ایگریکلچر، باٹنی، طبیعات، جیالوجی جن کے ذریعے سے صنعت اور دست کاری اور ایجاد کی قدرت حاصل ہوتی ہے سکھائی جائے۔ ہندوستان میں یورپ کی طرح صنعت و حرفت کے اسکول کھول دئے جائیں اور جتنی ضرورت کی اشیاء باہر سے آتی ہیں وہ ہمارے ملک میں تیار ہوں ۔''۳۴

تعلیم سے ترقی نو آبادیاتی دور میں ڈپٹی نذیر احمد کا خواب اور مقصد تھا اور ان کے درسگاہ میں ایسی ہی تعلیم کا سبق دیا جاتا تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد تعلیم و تربیت سے سماج کو بدلنے کے حق میں تھے اور ایک ذہنی اور فکری انقلاب لانے کے خواہشمند نظر آتے ہیں۔ وہ ایک مثبت سماجی تبدیلی لانے کا ارادہ رکھتے تھے جو تعلیم کے بغیر ممکن نہیں۔ وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ ایک فرد کی زندگی، اس کی سوچ و فکر کو بدلنے میں تعلیم کا کردار بہت اہمیت رکھتا ہے۔ قومی ترقی کے ساتھ ساتھ قومی شعور کو بیدار کرنے میں وہ تعلیم کو اہمیت دیتے ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد تعلیم، ہُنر، تعلیم نسواں اور خانداں کی اصلاح اور تربیت پر زیادہ زور دیتے تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ نو آبادکاروں کی ترقی کا راز انہی باتوں میں ہیں۔ وہ انگریزوں کے تعلیم اور ترقی سے متاثر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ نذیر احمد ایک فرد، سماج اور قوم کی ترقی میں نئے افکار اور سائنسی علوم و فنون کو حاصل کرنا بہت ضروری سمجھتا ہے۔ اور ان کو یہ احساس ہے کہ ان کے تحصیل کے بغیر قوم پیچھے رہ جائے گی۔ اس لئے وہ اپنے مکتب میں ان پر بار بار بحث کرتے نظر آتے ہیں اور ہر زاویہ سے قوم کو سمجھانے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔

لہذا وہ ایسی تعلیم کے حمایتی تھے جس کے حاصل کر لینے کے بعد فارغ طالب علم ملک، قوم اور معاشرے کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید اور کارآمد ہو سکے۔

ڈپٹی نذیر احمد نے اصلاح معاشرہ کی مہم میں مذہب کو بنیاد بنایا اور مذہب کے مثبت پہلو کو اجاگر کر

کے عیوب سے پاک معاشرے کی تمنا کی ۔سارے عیوب ایک ایک کر کے گنایا اور کہا کہ اگر یہ ساری برائیاں معاشرے سے دور ہوجائیں تو یہ معاشرہ صالح بن سکتا ہے ۔نذیر احمد کی اصلاحی کوششوں کا معاشرے پر خاطر خواہ اثر ہوا۔

ڈپٹی نذیر احمد کے ناول کے کردار صاف طور پر دو تہذیبوں کے ٹکراؤ کی کہانی بیان کرتے ہیں ۔ ہندو اور مسلمان دونوں ہی ملک پر نوآبادکاروں کے تسلط سے چھٹکارا چاہتے تھے اور اپنے اپنے طور پر تنظیمیں بنا رہے تھے جو ہندوستانی عوام کو بیدار کریں ۔غلامی کی لعنتوں سے روشناس کرائیں اور انگریزی کے طور طریقوں ، رہن سہن ، کھانے پینے اور پوشاک کی خرابیوں کو بیان کر کے ان سے نفرت پیدا کرنے کی راہیں ہموار کریں ۔ڈپٹی نذیر احمد نے بھی اپنے ناول انہیں مقاصد کو سامنے رکھ کر لکھے ۔

عالمی مسائل میں نوآبادیاتی نظامِ حیات کی تشکیل و تعمیر بھی مطالعہ کا ایک اہم موضوع ہے ۔نوآبادیاتی نظام حکم ومحکوم ، فاتح و مفتوح قوم اس صورت حال کا نام ہے جس میں حاکم طبقہ محکوم قوم کو اپنا غیر تصور کرتے ہوئے اس سے اس طرح معاملہ کرتا ہے جس میں وہ خود کو بہتر و برتر اور محکوم قوم کو حقیر و کم تر سمجھتا ہے ۔یہ نوآبادکار یا حاکم طبقہ اپنے محکوم طبقہ کے طرزِ حیات کو بے معنی قرار دیتے ہوئے اپنی مقتدرہ حیثیت کی بنا پر اپنے تصورات کو اعلیٰ ، افضل اور قابل قبول بنا کر پیش کرتا ہے ۔نوآبادیات کی تعریف بیان کرتے ہوئے مظہر مہدی لکھتے ہیں :

> ''نوآبادیات حاکم اور محکوم کے قدیم اور روایتی رشتے کے برعکس اس نئے رشتے کا نام ہے جو کوئی غیر ملکی حکمراں طبقہ ایسے لوگوں کے ساتھ قائم کرتا ہے جو اس کے نزدیک کسی ملکی یا طبقاتی امتیاز کے حامل نہیں ہوتے ۔اس رشتے کی رو سے یہ محکوم آبادی نوآبادی کہلاتی ہے اور یہ حکمراں طبقہ پوری محکوم نوآبادی کا استحصال کرتا ہے اور وہاں کی معیشت کے تابع بنا کر اپنے مقاصد کے حصول کی ہر ممکن سعی کرتا ہے ۔'' ۳۵

ہندوستان میں نوآبادیات کو ممکن اور مستحکم بنانے کے لیے نوآبادکاروں نے جو تدابیر اور حکمت عملیاں اختیار کیں ، انھوں نے ہندوستانی قوم کے مختلف شعبہ حیات پر گہرے اثرات قائم کیے ۔انھوں نے اس تصورِ حیات کو فروغ دینے کے لیے مقامی افراد کی شناخت کو مٹانے یا منقلب کرنے ، ان کے علوم

،زبان،ادب،تہذیب،ثقافت،معاشرت،مذہب وعقائد کے بارے میں مصنوعی تصورات عام کیے جس سے نہ صرف اس قوم کے تابناک ماضی اور علمی و ادبی سرمائے کو مٹانے کی کوشش کی گئی بلکہ انھیں قابل اصلاح قرار دیتے ہوئے نئے پیمانوں کے مطابق اپنا محاسبہ کرنے کی طرف مائل کیا۔ چناچہ ہندوستان میں اصلاح پسند طبقے نے مغرب کو معیار قرار دیتے ہوئے علوم وادب،تہذیب وثقافت،مذہب وعقائد کی نئی نئی تعبیریں بیان کیں۔

نوآبادکار کے نزدیک ہندوستانی قوم کے علوم،افکار،تہذیب،معاشرت اور ادب ہر شعبے میں اصلاح کی ضرورت تھی۔جس کا وسیلہ انھوں نے انگریزی تعلیم کو قرار دیا۔گویا یہ نئی تعلیم وہ بنیادی محرک تھی۔جس کے ذریعے مسلمانوں کی معاشرت،مذہب اور اخلاق کی اصلاح کی جاتی تھی،اور یہی اصلاح ان کی ترقی کی راہ ہموار کرنے والی تھی۔اس طرح ہندوستان میں مغربی تہذیب اور مغربی علوم کے ذریعے نہ صرف فکری،تہذیبی اور تعلیمی سطح پر تبدیلی آئی بلکہ ہندوستان کو اپنے تحفظ وارتقاء کے لیے سامراجی نظام کی پیروی کرنا ضروری ہوگیا۔ پرسیول اسپئیر کا خیال ہے کہ:

> ''دربار مغلیہ کے خاتمے کے بعد ہندوستانی معاشرے میں تعلیم کا مطلب انگریزی زبان سے معمولی واقفیت حاصل کرلینا اور تہذیب کا مطلب مغربی طرز زندگی کی کورانہ تقلید ہوکر رہ گیا تھا۔'' ۳۶

یہ امر پیش نظر رہے کہ نوآبادیات کے استحکام اور نوآبادیاتی معاشرے کی تقلیب میں سب سے مؤثر حربہ تعلیم وتربیت کا تھا۔ ہندوستان میں اس نظام کے مطابق جو نصاب تیار کیا گیا وہ برطانوی سامراج سے مرعوبیت اور اثر انگیزی کا نتیجہ ہے۔مشرقی علوم کے مقابل علوم عقلیہ کی تحصیل پر زور دیا گیا کیوں کہ اب یہی علوم انسان کی ترقی اور اس کی معاشی کفالت کا ذریعہ تھے۔ پروفیسر قاضی جمال حسین اس اقدام کا محاکمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''عقلیت اور حقیقت پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ ذہنوں کو اگر بدلتی ہوئی دنیا کا احساس نہ دلایا گیا اور انھیں زندگی کے مطالبات و نئے حقائق سے ہم آہنگ نہ کیا گیا تو قوم زندگی کے اس دوڑ میں بہت پیچھے رہ جائے گی گویا نظامِ حیات کی اس نئی بساط پر تعمیر و ترقی کے لیے اس کے اصول ومعیار پر اترنا ناگزیر ہے۔ چناچہ ہوا یہ کہ جدید افکار و

اقدار کے لئے ہمیں اپنے اصولوں سے مفاہمت کرنی پڑی۔خارجی و مادی راحتوں کی خاطر اپنے مسلک زندگی ونشان راہ سے ہٹنا پڑا اور اس طرح بالآخر ہمارا معنوی وجود خطرے میں پڑ گیا۔'' ۳۷

برصغیر کے مصلحین میں برطانوی نوآبادکار سے مرعوب حلقے نے اس کا گہرا اثر قبول کیا۔انھوں نے نوآبادیاتی نظام میں آقا اور غلام کے درمیان اتحاد و یگانگت پیدا کرنے کے لیے مغربی طرزِ حیات سے مناسبت کو ناگزیر قرار دیا سرسید اوران کے رفقاء کار نے مغربی خطوط کی روشنی میں ادب وعلوم میں اصلاح کی تحریک شروع کی۔انھوں نے مشرقی نظم حیات کے مقابل مغربی طرزِ فکر کی برتری کو تسلیم کرلیا تھا اور یہ نقطہ نظر کی ایسی تبدیلی تھی جس نے مشرقی نظام تعلیم ،تہذیب اور ادب کے ہر شعبہ کے روایتی اوصاف و امتیازات کو بے اعتبار کر دیا۔سرسید اوران کے رفقاء نے ہندوستانی نظم حیات کی تشکیل نو کا کام انجام دیا ۔انھوں نے اپنی تعلیم ،تہذیب ، مذہب ،معاشرت اور ادب میں ایک مصالحتی رخ اختیار کیا۔اور مشرق کے ادبی تصورات کو غیر معیاری قرار دیتے ہوئے کلیتاً مغرب کے ادبی تصورات کو رائج کرنے کی کوشش کی ۔محمد حسن عسکری اپنے مضمون 'پیروی مغرب کا انجام' میں مغرب سے اخذ و استفادے کی صورت حال کے متعلق حالی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''جو چیز ایک ادب کو دوسرے ادب سے الگ کرتی ہے وہ طرز احساس کا فرق ہے ۔لیکن حالی کے زمانے میں لوگوں نے پیروی مغرب کے معنی یہ سمجھے کہ چڑیوں اور پھولوں پر نظمیں لکھی جائیں کیونکہ مسٹر ورڈز ورتھ بھی یہی کرتے تھے۔یا پھر شاعری کے ذریعے لوگوں کا اخلاق درست کیا جائے کیونکہ یہ میکالے نے کہا ہے۔۔۔غرض حالی کے زمانے سے لے کر آج تک ہمارے یہاں پیروی مغرب اس طرح ہوئی ہے اوراس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہمارے ادب سے ہر قسم کے معیار بالکل ہی غائب ہو گئے ۔ہمارے نقاد کہتے رہے ہیں کہ ہمارے پاس جو کچھ تھا وہ بھی گنوا بیٹھے ہیں ۔۔۔پیروی مغرب کے صرف ایک ہی معنی ہوسکتے تھے اور یہ کہ ہم مغرب کا طرز احساس قبول کرلیں ۔لیکن ہم نے تھوڑی دیر کے لیے رک کے یہ بھی نہیں سوچا کہ ہمارا طرزِ احساس کیسا تھا اوراس میں کوئی تبدیلی آئی یا نہیں۔'' ۳۸

شعر وادب کے سلسلے میں یہ امر ملحوظ نظر رہے کہ نوآبادیاتی نظام نے اپنی سیاسی ضرورتوں کے تحت مشرقی ادب کے تصورات متعین کیے اور ہمارے ادب کی شعریات کو رد کر کے مغربی ادب کو مفید و توانا قرار دیا۔مغرب کے اصولِ نقد کو معتبر اور آفاقی قرار دیتے ہوئے مشرقی ادب کی نئی نئی تعبیریں بیان کی گئیں ۔اس سے ان کا ایک مقصد جہاں ہندوستانی ادب وثقافت کو مسترد کر کے اپنے ادب وثقافت کو بہتر و برتر ثابت کرنا تھا وہیں ان کا ایک بڑا مقصد ہندوستانیوں کی ذہنی واختراعی قوت کو سلب کر کے اپنا پابند بنانا تھا ۔لہٰذا مشرقی شعر وادب کو بیہودہ ،لغو اور مخرب اخلاق قرار دیا اور اس مجرد ایقان کو حقیقت میں بدلنے کے لئے انھوں نے ادب کے افادی پہلو پر زور دیا اور شاعری ونثر میں حقیقت کی ترجمانی پر اصرار کیا کیونکہ ان کی ضرورت کی مناسبت سے مغرب میں ادب کا یہی تصور ہے۔

مغرب پرستی میں اردو شعر وادب کی تفہیم وتعبیر کا واحد طریقہ مغربی اصولوں کو سمجھا گیا اور مشرقی ادبی وتہذیبی روایات کو ناقص اور غیر معیاری قرار دیا گیا مغرب سے استفادہ کا یہ رجحان اردو زبان وادب کے لیے کس حد تک کار آمد تھے اس پر سوالیہ نشان لگایا گیا ایک حلقہ صاف صاف کہنے لگا کہ جزوی خصوصیات کے اخذ واستفادہ تک تو کوئی حرج نہیں لیکن ادب کا بنیادی تصور ہر زبان کے اپنے لسانی و معاشرتی امتیازات سے مرتب ہوتا ہے۔اس سلسلے میں پروفیسر قاضی افضال حسین کا یہ بیان قابلِ ذکر ہے کہ:

> ''متن کی قرأت یا اس کی تقدیر کے ایسے اصول ممکن ہی نہیں ،جن کی رو سے ہر زبان اور ہر زمانے کے ادب کا محاکمہ کیا جا سکے۔مزید یہ کہ اگر ادب کے اصول آفاقی نہیں ، بلکہ ہر زبان ، ہر معاشرہ اور بعض صورتوں میں مخصوص زمانی عرصہ کی اپنی فکری وفنی ترجیحات سے نمو کرتے ہیں تو ان میں کوئی ترجیحی ترتیب قائم ہی نہیں ہو سکتی۔یعنی کسی ایک زبان یا ادبی روایت کے اصول دوسری زبان یا روایت کے اصولوں سے برتر یا فروتر نہیں ہو سکتے۔'' ۳۹

نوآبادیات نے فکر وتہذیب کے دوسرے شعبوں کی طرح ادب کی اصلاح کے لیے بھی بعض بنیادی اصول مقرر کیے۔اس میں کلام کو فطرت سے قریب کرنے کی تلقین کی گئی۔اس میں کوئی بات خلاف عقل یا قیاس بیان نہ ہو بلکہ ادب کا مواد فطرت کے تجربے پر مشتمل ہونا چاہیے۔لہٰذا مشرق کے ادبی

سرمایہ کا احتساب کرتے ہوئے مغربی نظریہ ادب کو واحد معیار نقد قرار دیا۔اور ہمارے شعری ،ادبی اور تہذیبی سرچشموں کوخشک اور ساقط الاعتبار ثابت کیا گیا۔اس پس منظر میں شمیم حنفی ان ادبی اصلاحات کا محاکمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قومی تعمیر اور معاشرتی اصلاح کے جوش میں یہ سمجھ لیا گیا کہ ہماری پرانی شعریات کا دائرہ نئی تہذیبی ضرورتوں کے حساب سے شاید ناکافی ہے۔یہ سچائی نظرانداز کردی گئی ہماری کلاسیکی شعریات میں اور پیش رو ادبی روایت میں اخلاقی مضامین باندھنے کی روش عام رہی ہے اور زندگی یا کائنات کی کوئی حقیقت ایسی نہیں جس کے بیان کی گنجائش عہد قدیم سے عہد وسطیٰ تک کی ادبی تاریخ ناپید رہی ہو۔۔۔مشرق کی مجموعی ادبی روایات اور شعریات میں انسان اور اس کی کائنات سے متعلق حقائق کی تفتیش ،تفہیم اور تعبیر کا جو چلن صدیوں سے جاری تھا،اس کے پیش نظر مغرب کے تنقیدی تصورات بہت کم مایہ تھے۔لیکن مغربی علوم وافکار اور طرزِ احساس کا جادو ایسا پھیلا کہ ہم اپنی معاشرتی ترجیحات اور امتیازات سے بخوشی دست بردار ہونے لگے۔'' ۴۰

متن کی تشکیل میں اس معاشرے کے تصور کائنات کو بنیادی حیثیت حاصل ہے جس کی رو سے فن پارہ کسی مخصوص معاشرے میں بامعنی بنتا ہے۔اور اسی کے ذریعے اس متن کے حسن وقبح کا جائزہ لیا جاسکتا ہے۔لہٰذا ہنداسلامی معاشرے کے تصور کائنات کے سبب داستان میں فوق الفطرت عناصر اور محیرالعقول واقعات کی روداد داستانوں کا امتیازی وصف ہے وہیں مغربی معاشرے کے تصور کائنات کے سبب ناول میں واقعہ خیالی وفرضی ہونے کے باوجود ناممکن الوقوع نہیں ہوسکتا۔انسانی منطق وفہم کے مطابق اس کا وقوع پذیر ہونا لازمی ہے۔چونکہ فارسی اور اردو ادب اس اصول کے تحت تخلیق بھی نہیں کیا گیا تھا اس لیے اس بنیادی شرط کی مثالیں مغرب میں تلاش کی گئیں۔ناول کا پودا،مغرب سے لاکر محکوم قوم کی زمین میں لگایا گیا۔اس میں واقعہ کا تصور،ترتیب اور ان کا مقصود،سب نئے اور حاکم کی سیاسی ضرورتوں کے پابند تھے۔نوآبادیاتی نظامِ حکومت نے مشرقی ادب،تہذیب اور تصور کائنات کو مہمل،خلاف عقل اور مخرب اخلاق قرار دیتے ہوئے نئی طرز کی کتابیں لکھوائیں۔نوآبادکار نے مغربی نظریہ حیات کو تشکیل دینے کے لیے متعدد علمی وادبی اداروں کو سیاسی حربے کے طور پر استعمال کیا۔اور اسی نقطۂ نظر کے تحت تیار کردہ ان تخلیقات

میں ' باغ و بہار' اور  فسانہ' آزاد' جیسی کتابوں کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ مشرقی معاشرے میں مغربی تصور کائنات کی اشاعت کے لیے نئے طرز کے قصوں میں ' ناول کی صنف کو فروغ دیا گیا اس کے متعلق پروفیسر عقیل احمد صدیقی، ایڈورڈ سعید کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مغرب میں ناول کا ارتقاء جس نہج پر ہوا ہے اس سے یہی لگتا ہے کہ یہ صنف بنیادی طور پر ''اسلامی تصور کائنات کی دشمن ہے۔'' [۴۱]

اردو ادب میں ناول انگریزی ادب کی دین ہے اور اس پر مغربی فکر و ادب کے اثرات نمایاں ہیں ۔کولونیل معاشرہ میں اس صنف کے ارتقا اور قبول عام ہونے کی وجہ یہی تھی ۔ یہ نوآبادیاتی نظام حیات کی عکاس و ترجمان تھی ۔اس ضمن میں علی عباس حسینی انگریزی میں صنف ناول کے بنیاد گزار ڈینیل ڈفو کا تذکرہ کرتے ہیں کہ وہ فن ناول نگاری میں دو باتوں کے التزام کو ضروری خیال کرتا ہے، ایک تو یہ قصہ گو کو حقیقت نگار ہونا چاہیے دوسرا یہ کہ اسے کوئی نہ کوئی اخلاقی سبق دینا چاہیے۔

ڈپٹی نذیر احمد اور ان کے متبعین نے اسی طرز پر ناول نگاری کی بنیاد رکھی ۔ان کے زیرِ اثر لکھے جانے والے ناولوں کی غرض و غایت ان کے مقدموں اور دیباچوں سے بخوبی ہوتی ہے کہ ان مصنفین نے اپنی ان تخلیقات کے ذریعے تعلیم ،ترقی اور اصلاح کا جو تصوّر پیش کیا وہ نوآبادیاتی حکمرانوں کے وضع کردہ اصولوں کے مطابق تھا اور اس کے ذریعے کولونیل معاشرہ سے ارتباط اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی ۔ان مصنفین نے اپنے عہد کے تقاضوں کے مطابق اپنی علمی ،تہذیبی اور معاشرتی صورت حال کو بدلنے اور اس کے ذریعے اپنے وجود کو باقی رکھنے کی کوشش کی۔

ناول کا آغاز استعماری حکمرانی میں ہوا جو کسی صورت استعماری مفاد سے الگ نہیں ہوسکتا۔اردو ادب میں صنف ناول کی ابتدا ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں سے ہوتی ہے جو واضح طور پر مقصدی اور اصلاحی قصے تھے اور جس میں تعلیم ،تہذیب اور ترقی کا نیا تصور پیش کیا گیا۔نذیر احمد ایشیائی لٹریچر کے سخت مخالف تھے ۔اس لیے کہ یہ خیالی اور مبالغہ آمیز بیانات کے سبب ان خیالات کو پیش کرتا ہے یا ان جذبات کو تحریک دیتا ہے جو مخرب اخلاق ہیں ۔انھوں نے نہایت بے باکی سے اپنے خیالات کا اظہار کیا:

''علوم قدیمہ میں لٹریچر کا سخت مخالف ہوں۔مسلمانوں میں ایز اے نیشن (بحثیت قومی) جتنی خرابیاں کل تو نہیں اکثر اسی لٹریچر نے پیدا کی ہیں۔یہ لٹریچر جھوٹ اور خوشامد سکھاتا یہ لٹریچر۔۔۔موجودات کی اصلی خوبی کو دباتا اور مٹاتا۔۔۔یہ لٹریچر توہمات اور مفروضات بے اصل کو فیکٹس (واقعات) بناتا۔یہ لٹریچر نالائق ولولوں کو شورش دلاتا۔۔۔انگریزی پڑھنے سے اتنا تو ہوا کہ مجھ کو اپنے ہاں کے لٹریچر کے عیوب معلوم ہونے لگے مگر میں وہی کا وہی رہا۔'' ۴۲

ڈپٹی نذیر احمد اپنے دور کے محرکات و رجحانات اور معاشرتی پس منظر کے تحت ادب میں انقلابی تبدیلی کے خواہشمند تھے۔انھوں نے جدید خیالات و افکار کی نشر و اشاعت کے لیے نیا اسلوب و آہنگ اختیار کیا۔جو اصلاحی و اخلاقی نقطۂ نظر کے ساتھ ساتھ واقعیت و افادیت کا بھی حامل تھا۔انھوں نے اپنے ناولوں میں زبان و بیان کا وہی طریقہ اختیار کیا جو نوآبادیاتی نظام کے وضع کردہ اصولوں کے مطابق تھا۔ناصر عباس لکھتے ہیں:

''ایک تو نذیر احمد کی 'قصہ گوئی' کو معاصر عہد میں قابلِ قبول ہونے کے لئے وہ زبان اور محاورہ اختیار کرنا پڑا جو دیسی زبانوں میں 'حقیقت نگاری' کی مثال ہو۔دوسری طرف انھیں اپنے ناولوں کا معنیاتی نظام ان خیالات و تصوّرات پر استوار کرنا پڑا جن کا ناک نقشہ اور جن کی ضرورت و افادیت نوآبادیاتی حکمرانوں کے وضع کی تھی۔'' ۴۳

انیسویں صدی کے وسط میں انگریز حکومت نے مختلف صوبوں میں جدید نظام تعلیم رائج کرنے خصوصاً تعلیم نسواں کی غرض سے نئے طرز کے مدارس قائم کئے۔اس تعلیمی مشن کے تحت محکمۂ تعلیم کے حکمرانوں کی رہنمائی میں نہ صرف علمی تصانیف کے ترجمے ہوئے بلکہ ان نئے مدارس کی نصابی ضروریات کے تحت خاص قسم کی کہانیاں رکتابیں لکھوائی گئیں۔نذیر احمد خود اس نظامِ تعلیم کے پروردہ اور اس کے قدرداں تھے۔دوسرے زمانۂ ملازمت میں محکمۂ تعلیم سے وابستگی کے سبب ان تعلیمی و اصلاحی سرگرمیوں سے بخوبی واقف تھے جو نوآبادیاتی حکمرانوں کے پیش نظر تھے اور وہ خود بھی اس قسم کی ترمیم و اصلاح کے حامی و مبلغ تھے۔لہذا انھوں نے شعوری طور ایسے قصے لکھے جو اس نظام فکر کی مقصدیت و افادیت سے اس درجہ مطابقت رکھتے تھے، انھیں ان کے تین ناولوں پر یکے بعد دیگرے سرکاری انعام و اکرام سے نوازا گیا

۔گویا نذیر احمد کے ناول ان مقاصد کی ترجمانی کر رہے تھے جو نئے مدارس کے درسی نصابات کے ذریعے تشکیل پا رہے تھے۔

مرأۃ العروس (۱۸۶۹ء) اردو کا پہلا انعام یافتہ ناول ہے جسے ڈپٹی نذیر احمد نے اصلاحی مقصد کے پیش نظر لکھا۔انھوں نے دیباچہ میں ناول کی وجہِ تخلیق یہ بیان کی ہے کہ اپنی بچیوں کو پڑھانے کے لیے ایسی کوئی کتاب موجود نہیں تھی جو اخلاق ونصائح سے بھری ہو۔یہاں وہ نہ صرف مشرقی طرزِ حیات کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں بلکہ اس کی خرابیوں اور خامیوں کی نشاندہی بھی کرتے ہیں جس کی ایک مثال طبقہ نسواں کو جاہل ،توہم پرست اور بے اخلاق قرار دینا ہے۔جب کہ یہاں مذہبی کتابوں کے ذریعے عورتوں کی تعلیم و تربیت کا رواج ملتا ہے۔لیکن یہ تعلیمی نظام نذیر احمد کے مقاصد کے مطابق نہیں تھا۔یہاں دراصل ناول نگار کا مسئلہ صرف لڑکیوں کی تعلیم وتربیت کا نہیں ہے بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ لڑکیاں نوآبادیاتی نظام کے استحکام میں کس طرح معاون ومددگار ثابت ہوں۔

اس ناول کا واضح مقصد یہ نظر آتا ہے کہ ہندوستان میں انگریز حکومت قائم ہونے کے بعد نوآبادکاروں کی عمل داری میں جو نئی اسامیاں قائم ہوئیں ،ان پر کام کرنے کے لیے رفتہ رفتہ ایک نوکری پیشہ نچلا متوسط طبقہ وجود میں آرہا تھا۔اس نچلے متوسط طبقے کی ایک متعین تنخواہ تھی اس طبقے کی لڑکیوں کو اپنی معاشی بنیادی حدود کے اندر رہنے کے ہنر کو ڈپٹی نذیر احمد ان کی تعلیم وتربیت بتا رہے ہیں۔چونکہ مذہبی کتابیں ان مقاصد کے تبلیغ وتکمیل کرنے سے قاصر تھیں لہٰذا انھوں نے اس کے مقابل انگریزی نظامِ تعلیم کے تحت اس کتاب کو انھیں خطوط پر تیار کیا جو ان نئے حاکموں کے منشا کے عین مطابق تھے۔یہی وجہ ہے کہ اس قصہ کے مرکزی کردار اکبری اور اصغری دونوں کے لیے ماحول اور توارث کے یکساں عوامل کے باوجود دونوں کی شخصیت ایک دوسرے سے متضاد دکھائی دیتی ہے لیکن اس کے باوجود ان کی شخصیت میں حد درجہ تضاد نظر آتا ہے ایک سراپا شر اور دوسری سراپا خیر کا مجموعہ ہے۔دراصل اکبری مشرقی نظم حیات کی پروردہ ہے۔اس کے برعکس اصغری پڑھ لکھ کر (نہیں معلوم ہوتا کہ اصغری نے کون کون سی کتابیں پڑھیں کہ اتنی سلیقہ شعار اور سمجھ دار ہوگئی )صرف اپنے سلیقہ سے گھر کا نقشہ بدل دیتی ہے۔گھر کا ماحول درست کرنے کے علاوہ اصغری کا دوسرا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اپنے بے کار اور قدرے آزاد مزاج شوہر کو انگریزی

نوکری دلوادی۔

''اصغری: انگریزی نوکری تلاش کرو۔

محمد کامل: انگریزی نوکری تو بے سعی وسفارش کے نہیں ملتی۔ ہزاروں لاکھوں آدمی مجھ سے بہتر بہتر مارے مارے پھرتے ہیں۔ کوئی نہیں پوچھتا۔

اصغری: جو لوگ نوکری پیشہ ہیں ان سے ملاقات پیدا کرو۔ ان سے محبت بڑھاؤ۔ ان کے ذریعے سے تم کو نوکری کی خبر لگتی رہے گی اور ان ہی کے ذریعے سے تم کسی حاکم تک بھی پہنچ جاؤ گے۔'' ۴۴

ہندوستان میں برطانوی سامراج کے جلو میں ہندوستانیوں پر عرصۂ حیات تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ قدیم جاگیردارانہ نظام دم توڑ رہا تھا اور استعماری نظام آہستہ آہستہ اپنی ایجادات واختراعات کے ذریعے ہندوستانی زندگی پر قابض ہوتا جا رہا تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد انگریزی حکومت سے متاثر و مرعوب تھے۔ وہ ان حالات کے اسباب دریافت کرتے ہوئے انگریزی علوم کے سبب انگریزوں کی برکات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سارے ہندوستانیوں پر انگریز قابض ہیں۔۔۔ سب کے سب پڑھے لکھے ہوتے ہیں اور اسی سے خدا نے ان کو یہ ترقی دی ہے کہ کہاں ان کی ولایت اور کہاں ہندوستان۔۔۔ مگر علم کے زور سے اس ملک میں آئے۔ علم ہی کے زور سے سلطنت کی اور علم ہی کے زور سے اس کو اس خوبی اور عمدگی کے ساتھ چلا رہیں کہ روئے زمین کی کسی سلطنت میں ایسا امن وانصاف اور ایسا نظام نہیں۔'' ۴۵

اس طرح وہ نہ صرف انگریزی عملداری کو سب سے بہتر و برتر حکومت تسلیم کرتے ہیں بلکہ ان کو اپنا آقا اور حاکم تسلیم کرتے ہوئے خود کو اس کا غلام بھی قرار دیتے ہیں:

''صاحب نے پوچھا: کیا آپ کا کوئی لڑکا بھی میری کچہری میں تھا؟

مولوی صاحب نے کہا: محمد کامل''

صاحب نے کہا: ''وہ تو ہمارے ساتھ آیا ہے۔ وہ آپ کا بیٹا ہے؟''

مولوی صاحب نے کہا: آپ کا غلام ہے''۔ ۴۶

مولوی فاضل اور جیمس صاحب کی اس گفتگو سے محکوم طبقہ کی ذہنیت کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ اس

نظام کا سیاسی جبر محکوم طبقے پر اس درجہ مسلط ہوا کہ وہ اپنی شناخت کو مٹا کر خود کو اس کا تابعدار تسلیم کرتا ہے ۔لیکن کسی حکومت کے دست نگر رہنا الگ بات ہے اور غلامانہ ذہنیت کو پروان چڑھانا جدا حقیقت ہے۔اور یہی نو آبادیاتی نظام کی برکات وثمرات کا ایک قابل حیرت نتیجہ ہے۔اس طرح نذیر احمد انگریزی تہذیب و معاشرت کے بھی قائل نظر آتے ہیں۔لہذا مغرب کی بے پردہ عورتوں کو مشرق کی باپردہ خواتین کے مقابلے میں حیا اور شرم کا پیکر قرار دیتے ہیں۔دراصل اس ناول میں کوئی بھی واقعہ محض واقعہ قرار نہیں دیا جاسکتا بلکہ اس کے ذریعے وہ فضا تیار کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس میں مشرق کا ہر فرد جاہل، بدطینت اور بدتہذیب ثابت کیا جا سکے۔چونکہ نو آبادیاتی نظام نے حاکم ومحکوم طبقے میں یہ حد فاصل قائم کی کہ ہندوستانی توہم پرست، غیر مہذب، ناشائستہ، جاہل اور کٹھ حجت قوم ہے۔اس کے برعکس انگریز تعلیم یافتہ، مہذب ،شائستہ، باسلیقہ، عقل مند اور ترقی یافتہ قوم ہے۔

## ڈپٹی نذیر احمد کے مکتب میں سائنس کی تعلیم

لہذا ڈپٹی نذیر احمد اور بشمول دوسرے اصلاح قوم نے اس تفریق کے تناظر میں محکوم طبقہ کی تعلیم و اخلاق کی اصلاح کا کام انجام دیا اور عہد نو کے تقاضوں اور اخلاقی ومعاشرتی خرابیوں کو دور کرنے کے لئے سائنسی علوم وفنون اور علوم جدیدہ پر زور دیا۔ان کا ماننا تھا کہ ہندوستانیوں کو چاہیے کہ وہ ’’علم و ہنر حاصل کریں جس سے دنیا و عاقبت دونوں درست ہوں‘‘ ۴۷۔یہاں علم و ہنر سے مراد مشرقی علوم نہیں ہیں اس لیے کہ ان کا خیال تھا کہ:

> ’’علم ہندوستان سے بالکل اٹھ گیا ہے اور جو ہے وہ جہل سے بدتر ناحق کی کٹھ حجتی اور جھوٹی شاعری کے سوائے ہندوستان میں کچھ اور بھی نہیں۔‘‘ ۴۸

وہ مشرقی علوم کو مسترد کرتے ہوئے علم کی یہ تفسیر بیان کرتے ہیں:

> ’’علم وہ باتیں ہیں جو کتابوں میں لکھی ہیں۔حساب، جغرافیہ، تاریخ، طبیعات، طب ،صرف ونحو، منطق، ہندسہ، ریاضی وغیرہ۔۔۔تمام تر علموں کا نتیجہ یہ ہے کہ۔۔۔کوئی چیز جو دیکھو اس کی حقیقت اور کوئی بات جو سنو اس کی وجہ سوچنی چاہیے۔‘‘ ۴۹

اس طرح نذیر احمد انگریزی علوم کی نشر واشاعت کے ذریعے سائنسی فکر پیدا کرنا چاہتے تھے۔ان

کے مطابق علم عقل کی غذا ہے اور علم سے مراد ہیں سائنسی علوم جسے وہ دین و دنیا کی درستگی کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔اس لیے کہ قدیم علوم غیر افادی ہیں اور اس کے مقابل انگریزی علوم مفید و بکار آمد ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

''جو علم بکار آمد ہیں انگریز سب سے زیادہ جانتے ہیں اسی علم کے زور سے وہ نادر کلیں ایجاد کی ہیں اور آئے دن ہوتی چلی جاتی ہیں کہ سن کر عقل دنگ ہوتی ہے۔دنیا کا تمام کام کلوں سے لیا جاتا ہے۔کلیں سوت کاتیں۔کلیں کپڑے بنیں اور کلیں آٹا پیسیں کلیں کتابیں چھاپیں،کلیں باجے بجائیں،کلیں لوہار بڑھئی کا کام دیں بلکہ کلیں وہ کام کریں جو آدمی سے نہ ہو سکے۔'' ۵۰

## حقوقِ نسواں اور ڈپٹی نذیر احمد

ڈپٹی نذیر احمد نہ صرف انگریز قوم اور انگریزی علوم کے دلدادہ تھے بلکہ ان کو تمام روئے زمین میں سب سے زیادہ دانش مند،مہذب اور شائستہ قوم قرار دیتے ہیں۔لہذا اس قوم کی طرز معاشرت سے واقفیت پیدا کرنے کے لئے ایک انگریز خاندان کے حالات ہندوستانیوں کے لیے بطور نمونہ پیش کیے گئے ہیں کیونکہ نذیر احمد چاہتے تھے کہ اس طرز حیات کی تقلید و پیروی کی جائے یا اسے اپنا آئیڈیل بنایا جا سکے۔اس ضمن میں ہندوستانی معاشرے میں مسلمان عورتیں اظہار رائے کی آزادی،خلع کا حق اور عقد ثانی وغیرہ ان تمام حقوق سے محروم قرار دیتے ہوئے اس نظام حیات پر جابجا تنقید کی ہے۔مثلاً انگریز خاتون کے ذریعے مغربی طرز حیات کے مقابل مسلمانوں کے طرز معاشرت پر اعتراض کرتے ہیں کہ:

''ہم لوگوں میں یہ بہت اچھا طریقہ ہے کہ شادی لڑکا لڑکی کی رضا مندی سے ہوتی ہے۔میں نے کتابوں میں پڑھا ہے کہ رضا مندی آپ لوگوں کے مذہب میں بھی شرط ہے مگر دیکھتی ہوں کہ اس کا برتاؤ کچھ بھی نہیں ہوتا۔'' ۵۱

نوآبادیاتی نظام میں محکوم طبقے کا اپنے آقاؤں سے مطابقت و مناسبت اختیار کرنا ضروری تھا لہذا اس طبقے کی اصلاح کے لیے معیاری نمونہ اپنے حاکموں کا طرز حیات تھا۔ڈپٹی نذیر احمد نے انھیں کے بتائے ہوئے طرز حیات کے مطابق اپنے معاشرے میں اصلاح و ترمیم کی کوشش کی۔ان کے ناولوں میں عورتوں کی تعلیم کا معاملہ ہو یا آزادی نسواں کا،اچھی بیوی کی صفات یا بچوں کی عمدہ تربیت کا،انتظام و انصرام کی عمدگی کا ہر جگہ حاکم طبقے کو مثالی نمونہ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔اپنے دوسرے ناولوں کی طرح وہ ناول

''فسانۂ مبتلا'' میں مسلمانوں کی اخلاقی و معاشرتی زوال کو پیش کرنے کے لیے عورتوں کے موروثی حقوق کو تلف کر لینا، نکاح کے معاملہ میں اظہار رائے کی آزادی کا نہ ہونا اور بیوہ کے نکاح ثانی کی ممانعت وغیرہ ہندوستانی مسلمانوں کی مختلف سماجی برائیوں کی نشاندہی کرتے ہیں اور اس ضمن میں وہ مغربی معاشرت کی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر چنبیلی کی زبانی بیان کرتے ہیں کہ:

''ہم لوگوں میں مرد دوسری بی بی نہیں کر سکتے۔ اور مرد اور عورت دونوں کے حقوق کو تولا جائے تو شاید عورت ہی کا پلہ جھکتا ہوا رہے گا۔'' ۵۲

ڈپٹی نذیر احمد عورتوں کے حقوق کے حامی اور لڑکیوں کی گھریلو تعلیم و تربیت کے نہ صرف طرفدار ہیں بلکہ اس کے لیے وہ اپنے ناولوں میں مدلل بحث بھی کرتے ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد اس قصے میں نہ صرف انگریز قوم اور ان کے طرز بود و باش کو تحسین آمیز قرار دیتے ہیں بلکہ انگریزوں کے ساتھ اختلاط پر بھی زور دیتے ہیں۔ اس طرح نذیر احمد نے قصے میں انگریز خاندان کے عادات و اطوار کو اس انداز میں پیش کیا ہے کہ انگریز خاندان کی حسن معاشرت اور اخلاق کو دیکھ کر حلیمہ کی ماں (ناول بنات النعش کا کردار) اس درجہ متاثر و مرعوب ہوتی ہے جس سے نو آبادیاتی طبقے کی ذہنیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

'' آگ لگے اس ملک کو جس میں ہنر کا نام نہیں ہم لوگ شہر میں بڑے سلیقہ شعار کہلاتے تھے مگر سچ یہ ہے کہ ہنر اور سلیقہ آپ لوگوں پر ختم ہے۔ غرض میم صاحب سے ہو کر گھر آئے تو جدھر آنکھ پڑی تھی ہر چیز حقیر اور بھونڈی نظر آتی تھی۔'' ۵۳

## مغرب پرستی

ڈپٹی نذیر احمد نے قومی اصلاح اور معاشرتی تعمیر میں مغرب کو اپنا آئیڈیل بنایا۔ اس مغرب پرستی کی بنا پر اس طبقے کی بے حد مخالفت ہوئی۔ مخالفت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انھوں نے اپنے ماضی کے احیاء و مراجعت کی کوشش نہ کی بلکہ مشرق کے مسلمہ اقدار و روایات اور مروجہ علوم کو متروک قرار دیتے ہوئے مغربی علوم و اقدار کو اختیار کرنے پر زور دیا۔ جب کہ مشرق و مغرب کی تہذیب ایک دوسرے سے مخالفت بلکہ بعض معاملات میں متضاد ہیں۔ اشپنگلر کے مطابق:

''ایک کلچر دوسرے کلچر کا طرز احساس مستعار لے نہیں سکتا۔ اس کے خیال میں تو ہر کلچر

زمان ومکان کا ایک مخصوص تصوّر رکھتا ہے۔اور اسی سے اس کے طرز احساس کا تعین ہوتا ہے۔ یہ ایسی چیز نہیں، جو کسی اور کلچر کو منتقل کی جا سکے۔ ہر کلچر اپنے اظہار کے لیے مخصوص شکلیں پیدا کرتا ہے جو اسی کے ساتھ مرجاتی ہیں یہ کسی اور کلچر کے کام نہیں آسکتیں بلکہ دوسرے کلچر والے اسے سمجھ تک نہیں سکتے۔'' ۵۴

اس دور کا اصلاح پسند طبقہ قوم کی قلب ماہیئت کا خواہاں تھا۔انگریزی تمدن اختیار کرنے سے ان کا مقصد قومی تعصّبات کو گھٹانا اور انگریزوں سے میل جول بڑھانا تھا۔لہذا ڈپٹی نذیر احمد کے ناول ''ابن الوقت'' میں شاہ کردار ابن الوقت کی تبدیلیٔ وضع ،اعلیٰ تمدن ،عمدہ معاشرت اور باعزت زندگی کے حصول کی شعوری کوشش ہے۔اس طرز معاشرت کی قبولیت سے اس کا مقصد حکمراں قوم سے مناسبت و برابری کا درجہ حاصل کرنا ہے۔ابن الوقت کا کردار انگریزی خواں طبقے کی داستان حیات کو پیش کرتا ہے۔یہ انگریزی وضع وقطع کے ذریعے اپنے آپ میں ''جنٹلمین'' بن گیا۔لیکن انگریز حکمراں نیٹو قوم سے برابری کی سطح پر ملنا جلنا اپنی حاکمانہ شان کے خلاف سمجھتے تھے۔انگریز حاکم شارپ کے رویے سے نوآبادیاتی حاکموں کی ذہنیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

''یہ لباس ہمارا قومی شعار ہے اور اگر کوئی ہندوستانی ہمارے جیسے کپڑے پہنے تو ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری نقل کرتا ہے یا ہم کو چھیڑتا ہے اور چڑھاتا ہے۔کوئی ہندوستانی ہمارے لباس کو جس میں اس کو کسی طرح کی آسائش نہیں بے وجہ اختیار کرے گا اور سوائے اس کے کہ اس کے دل میں ہمارے ساتھ برابری کا داعیہ ہو اور کیا وجہ ہوسکتی ہے؟۔۔۔ہم اپنی رعیت کو جسے ہم نے بہ زور شمشیر زیر کیا ہے کیوں اپنی برابری کرنے دیں گے؟'' ۵۵

محکوم طبقہ نہ صرف اس جھوٹ کو سچ تسلیم کرتا ہے بلکہ اس کو حق بجانب بھی سمجھتا ہے۔مثلاً حجتہ الاسلام کا بیان:

''بڑائی تو خدا کی ہے مگر خدا نے آپ لوگوں کو دنیاوی بڑائی دی ہے تو آپ کی چیزوں میں بھی بڑائی کی شان دی ہے یہاں تک کہ لباس میں تو بلاشبہ جو اس لباس کو پہنے گا لوگوں کی نظر میں بڑا دکھائی دے گا۔'' ۵۶

ابن الوقت نے شعوری طور پر مغربی طرز تمدن کو اختیار کیا اور اس نظام حیات سے مکمل طور پر مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی۔لیکن نوآبادیاتی نظام میں حاکم ومحکوم میں یکساں موانست کا پیدا ہونا ممکن نہ تھا۔اس طرز کے متعلق ژاں پال سارتر لکھتا ہے:

''کوئی شخص جرم کا مرتکب ہوئے بغیر اپنے جیسے انسانوں کو نہ غلام بنا سکتا ہے، نہ لوٹ سکتا ہے اور نہ قتل کر سکتا ہے۔اس لیے وہ نوآبایاتی حکمراں یہ اصول وضع کرتے ہیں کہ دیسی باشندہ ہمارے جیسا انسان نہیں، ہماری فوجوں کے سپرد یہ کام ہے کہ وہ اس مجرد ایقان کو حقیقت میں بدل دیں۔انھیں یہ حکم دیا جاتا ہے کہ مفتوحہ ملک کے باشندوں کو'بالاتر بندروں' کے درجہ پر پہنچا دیا جائے۔تاکہ نوآبادکاران سے بار برداری کرانے کو جائز قرار دیا جاسکے۔نوآبادیات میں تشدد کا استعمال محض اس لیے نہیں ہوتا کہ ان کی انسانیت ختم کردی جائے۔اس بات کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے کہ ان کی روایات کو مٹا دیا جائے۔ان کی زبان کی جگہ اپنی زبان رائج کی جائے اور ان کی تہذیب کو اپنی تہذیب دیے بغیر برباد کر دیا جائے۔''۵۷

نوآبادکار نے اپنے مقبوضہ اور جبری حکومت کی ترقی و بقا کے لیے ہندوستانیوں کا حد درجہ اقتصادی و معاشی استحصال بھی کیا۔انگریز حکومت کی سخت گیری اور نئے نظام زیست کے سبب حاکم ومحکوم میں کسی طرح کی مناسبت نہیں رہی۔برطانوی حکومت نے صنعت وحرفت کو متاثر کیا۔علوم جدیدہ، سائنس اور ٹکنالوجی کو قومی وملکی ترقی کا ذریعہ قرار دیا گیا لیکن یہ مشینی صنعت اہل حرفہ میں بے روزگاری کا سبب بنی۔ڈپٹی نذیر احمد انگریزی علمداری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عام لوگ جن کی معلومات کا دائرہ تنگ ہے اور جن کو سوچنے اور غور کرنے کی عقل نہیں سب کے سب بالاتفاق کہتے ہیں کہ انگریز کی عملداری میں امن ہے، انصاف ہے، زور نہیں، مگر خدا جانے کیا بات ہے اگلے وقتوں کی سی خیر و برکت نہیں۔''۵۸

انگریز حکمرنوں نے بعض زرعی اصلاحات کے تحت انتظام مالگزاری کو زیادہ مؤثر بنانے کی کوشش کی لیکن اس نظام کی بدولت زمینداروں اور کاشتکاروں کی حالت زبوں تر ہوگئی۔ابن الوقت انگریز حکام کو متوجہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

''رعایا اور سرکار کا تعلق من وجہ بندے اور خدا کا تعلق ہے۔ یہاں انصاف سے کام نہیں چلتا بلکہ رحم ورعایت سے۔ سرکار کو قرار دار جمع کرنے میں ایک سود خوار بنیے کی طرح دمڑی اور ادھی ادھی کا حساب نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' ۵۹

برطانوی استعمار، ہندوستانی قوم کے علوم وادب تہذیب ومعاشرت پر ہی اثر انداز نہیں ہوا بلکہ اس نے ان مذاہب وعقائد میں اصلاح وترمیم کی کوشش کی۔ ناول توبتہ النصوح میں ڈپٹی نذیر احمد نے انھیں اثرات کے تحت مذہبی اصلاح کے پیش نظر ناول تخلیق کیا۔ سرولیم میور نے اس کتاب کی افادیت کو تسلیم کرتے ہوئے اسے اہالیان یورپ کے لیے مسلمانوں کی خانگی حالات سے آگاہی اور واقفیت کا ذریعہ قرار دیا اور اسے ''کوئی امر متعلق تعصب مذہب یا ایسا کہ غیر مذہب والوں کو ناگوار ہو'' داخل نہ ہونے کے سبب اوّل انعام کا مستحق بتایا۔ سرولیم میور اور میتھو کیمپسن نے ناول شائع ہونے سے پہلے حاشیہ پر اصلاح کی غرض سے کچھ ہدایات بھی لکھی تھیں۔ نذیر احمد نے حسب منشا ان صاحبان کے اس میں اصلاحات کیں۔

ناول توبتہ النصوح میں مذہبی اصلاح کے ذیل میں قرآن وحدیث یا کسی مذہبی کتاب کا ذکر نہیں ملتا۔ بلکہ یہ کام پادری کے ذریعہ دی گئی سنہری جلد والی کتاب سے انجام پاتا ہے اور اس کتاب کے مطالعے سے ناول کا کردار کو ایک نئی آگہی نصیب ہوتی ہے۔ کہتا ہے:

''اس کتاب کے پڑھنے سے مجھ کو معلوم ہوا کہ میرا طرز زندگی جانوروں سے بھی بدتر ہے، اور میں روئے زمین پر بدترین مخلوق ہوں۔'' ۶۰

ڈپٹی نذیر احمد نے یہ ناول یورپی حاکموں کے حسب منشا اور سرکاری انعام کے اشتہار کی شرائط کے مطابق ترتیب دیا تھا۔ لہذا ناول میں کردار کے شاعرانہ کمالات کا اعتراف کرنے کے باوجود اسے اس کا سبب سے بڑا عیب قرار دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کیمپسن نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''مصنف نے جوان دنوں کے شاعروں کی تحقیر لکھی ہے وہ اسی لائق ہیں۔'' ۶۱ چناچہ انگریزی نظام میں یہ کمالات عیب بن جاتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ کسی جبری نظام کی اطاعت وبندگی کے قائل نہیں بلکہ اپنی ذہنی آزادی کو برقرار رکھتے ہیں۔ کلیم پر اس نظام کے برخلاف ہونے کے سبب عرصۂ حیات تنگ ہو جاتا ہے۔ وہ حصولِ معاش کے لیے دربدر کی ٹھوکریں کھاتا ہوا دولت آباد پہنچتا ہے جو دربارِ عیاشی میں ضرب المثل تھا لیکن حکومت

انگریزی کے سبب اس کے اختیارات ایک کمیٹی کو دیے جا چکے تھے۔ یہاں وہ شاعری کو ذریعۂ معاش بنانے کی کوشش کرتا ہے۔لیکن شاعری کے متعلق یہ خیالات پیش کیے جاتے ہیں کہ ''ایسے مضامین میں اشتغال وانہماک رکھنے سے ذہول وغفلت،استحسان لہوولعب،اختیار مالایعنی کے سوائے کچھ اور بھی حاصل ہے'' ٦٢ گویا سرکار انگریزی کے ماتحت انتظامی کمیٹی کے صدر اعظم کے یہ خیالات نہ صرف شاعری کے بے وقعتی و ناقدری کو پیش کرتے ہیں بلکہ فن شاعری کے ساتھ ساتھ خدمت شاعری کے خاتمے کا بھی اعلان کرتے ہیں۔ چنانچہ کلیم کو یہ اطلاع دی جاتی ہے کہ ''انتظام جدید کے مطابق ریاست میں کوئی خدمت شاعری باقی نہیں۔'' ٦٣

اس طرح کلیم بحیثیت شاعر اس ریاست میں جگہ حاصل نہیں کر سکا لیکن ایک فوجی اور شورہ پشت سپاہی کے طور پر اسے عزت و منصب عطا کیا جاتا ہے اس لیے بقول کیمپسن ''ہم شاعروں کو نہیں چاہتے ہم کو کام کے آدمی چاہئیں جو مالگزاری کی تحصیل کے وقت ان لڑاکے ٹھاکروں سے لڑائی بھڑائی کو خیال میں نہ لاویں۔'' ٦٤ اور جن کے ذریعے انگریزی نظام کو استحکام حاصل ہو۔یہی وجہ ہے کہ کلیم جو مشرقی تہذیب وثقافت کا نمائندہ ہے وہ اس نظام کا ناکام پرزہ تھا اس لیے وہ ناکام و نامراد رہ جاتا ہے۔کلیم کے انجام کے ذریعے جہاں مشرقی نظام حیات کے زوال کو پیش کیا گیا ہے وہیں سامراجی نظام کی اطاعت میں اس کی نجات کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔کلیم کا یہ انجام منشائے مصنف کے عین مطابق ہے۔ چنانچہ ناول کے آخر میں اس معتوب کردار کی ناکامی کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ نئے نظام کے تربیت یافتہ افراد کی کامیابی و ترقی کا ذکر بطور مثال کیا گیا ہے۔

نوآبادیاتی نظام میں وہ طبقہ جو اس طرز حیات سے مطابقت نہیں رکھتا مجہول قرار دیا جاتا ہے ۔ہندوستان پر برطانوی سامراج کے مسلط ہونے کے بعد ان کی نوازش ومہربانی حاصل کرنے کے لیے ان کی حاکمیت کو قبول کرنا ضروری تھا لیکن مسلمانوں میں ایک طبقہ ایسا تھا جو اس جبری نظام کا قائل نہیں تھا جس میں مولوی وعلماء کرام شامل تھے۔لیکن نذیر احمد نے وقتی مصلحت کے تحت خود کو محکوم و نااہل قرار دیتے ہوئے ان کی اطاعت وفرماں برداری کی تعلیم دی۔نذیر احمد اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ عوام اپنے مذہبی معاملات میں علماء کے مقلد اور ان کے پابند تھے۔ چونکہ عوام کے مولویوں پر اس انحصار کے سبب قوم

کی ترقی وتعمیر کے لیےضروری تھا کہ پہلے خودمولوی حضرات کی اصلاح کی جائے۔ڈپٹی صاحب قومی وملی انحطاط کا سبب انھیں مولویوں کو سمجھتے تھے۔

ڈپٹی نذیراحمد انگریزی سامراج سے مرعوب تھے۔انھوں نے مشرق کے مقابل مغربی علوم و افکار کی روشنی میں ہندوستانی قوم کی تعمیر وترقی اور اصلاح وتجدید کی کوشش کی۔جس کی مثالیں ان کے ناولوں سے پیش کی جاچکی ہیں۔ڈپٹی نذیراحمد نے اپنے ناولوں بلکہ اپنی دوسری تصانیف،تقاریر،خطابت اورشاعری کے ذریعہ جونظام حیات تشکیل دیا وہ مغرب سے مرعوبیت اوراثر انگیزی کا مثالی نمونہ تھا جسے نہ صرف انھوں نے برضاورغبت قبول کیا بلکہ ہندوستانیوں کی ترقی وبقاکے لیے ایک ناگزیر حقیقت کےطور پر پیش کیا۔اردوادب میں نذیراحمد کے تتبع میں کثرت سے اس طرز پر ناول لکھے گئے۔اوران مصنّفین کے پیش نظر یہی اصلاحات تھیں جن کا خاکہ نوآبادکار نے تیار کیا۔ڈپٹی نذیراحمد کے ناولوں کے نہج پر تیار کی گئی دوسری تصانیف کا مطالعہ وتجزیہ بھی اسی نقطۂ نظر کے ساتھ کیا جاسکتا ہے۔اوراس کے ذریعے اپنے علوم ،اپنی زبان،ادب،تہذیب،ثقافت اوراپنی اصل کی بازیافت کی جاسکتی ہے جسےنوآبادیاتی نظام میں مسخ کر دیا گیا۔ڈاکٹرنعیم احمداس مطالعے کی ضرورت کےمتعلق لکھتے ہیں:

> ''استعماریت کا مطالعہ اپنی نوعیت میں دراصل ان حربوں اورحکمت عملیوں کا مطالعہ ہے جن کی مدد سے یورپی ملکوں کا دنیا کے بڑے رقبے پر قبضہ ممکن ہوااوراس قبضے نے ایسے ہمہ گیراثرات ان ملکوں کی ثقافت،معاشی ڈھانچے،سیاسی طریقہ کاراورزبان و ادب پرچھوڑے کہ آزادی حاصل کرلینے کے باوجود بیشتر ملک نہ تواپنی منفرد شناخت قائم کرپائے ہیں اورنہ ہی ان اثرات سے پوری طرح نکل پائے ہیں۔'' ٦۵

ڈپٹی نذیراحمد مشرقی ثقافت اورطرزِ معاشرت کوعزیز رکھتے تھے۔ان کواپنے وطن کی ہر چیز سے محبت تھی۔ان کومغربی تہذیب پراعتراض تھا لیکن وہ دوجذبیت سے متاثرنظر آتے ہیں کبھی وہ مغرب کی پیروی کرنے کو کہتے اوراس کے مخالف بھی نظر آتے ہیں۔ان کی یہ نوآبادیاتی فکراورسوچ ان کےتمام ناولوں میں نمایاں طور پرنظر آتی ہے۔اس کے بارے میں ڈاکٹرفخرالاسلام اعظمی لکھتے ہیں:

> ''وہ مشرقیت کے دلدادہ اورمغربیت کے سخت مخالف ہیں۔ان کی یہ نفسیات ان کےتمام ناولوں مین جاری وساری نظر آتی ہے۔''٦٦

## نوآبادیاتی عہد میں ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں فکری رجحانات

نوآبادیاتی دور میں اگر فکری حوالے سے دیکھا جائے تو تنقید اور تخلیق دونوں میں نوآبادیاتی فکر کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔تنقید میں مولانا محمد حسین آزاد کی نظم آزاد کی بحث کے ساتھ ساتھ مولانا الطاف حسین حالی کی پیروی مغربی تو اک ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں۔اس کے علاوہ سر سید احمد خان کا کردار نوآبادیاتی فکر کی ترویج کے حوالے سے کسی تعارف کا محتاج نہیں۔تخلیق اور خاص طور پر ناول نگاری پر نوآبادیاتی فکر کے اثرات کے حوالے سے دیکھا جائے یہاں متنوع فکری رجحانات ملتے ہیں۔

نوآبادیات کے زیر اثر پروان چڑھنے والے ادب میں شروع میں ہی اک عجیب صورت حال پیدا ہوئی۔مغرب جو کہ صنعتی انقلاب کے ثمرات سمیٹ چکا تھا اس کی فکر کی نقالی کرتے ہوئے ادب تخلیق کرنے کی کوشش خاصی مضحکہ خیز ثابت ہوئی کیونکہ برصغیر میں تو صنعتی انقلاب آیا تھا نہ ہی نئے سرمایہ دارانہ نظام کی ابتدا ہوئی تھی اس کی بجائے یہاں کا معاشرہ اپنی قدیم مذہبی اور تہذیبی اقدار کو اپنائے ہوئے تھا،نوآبادیاتی دور کی ادبی صورت حال پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر علمدار حسین بخاری لکھتے ہیں:

> ''یورپی تعلیمی اور تہذیبی اداروں اور نوآبادیاتی استعمار کی ضرورتوں کے تحت جو نئی ادبی اصناف سامنے لائی جا رہی تھیں وہ صدیوں کی مستحکم مقامی ادبی اور تہذیبی روایات اور اصناف سے مختلف تھیں اس لئے شروع میں مغربی اصناف ادب کی نقالی اور چربہ سازی سے زیادہ کچھ نہیں تھیں،اس لیے ہندوستانی اہل دانش کے ساتھ ساتھ خود برطانوی لوگوں کو بھی کافی کچھ مضحکہ خیز لگتی تھیں۔''٦٧

نوآبادیاتی عہد میں اردو ادب خاص طور پر ناول نگاری میں فکری حوالے سے جو رجحانات سامنے آئے،ان میں سے اہم رجحان اسلامی فکر کا تھا۔برصغیر کا معاشرہ صدیوں سے اسلامی تہذیب وتمدن کا گہوارہ رہا تھا،مسلم حکمرانوں کے ادوار میں یہاں اسلامی ثقافت اور اسلامی طرز بود و باش کو کافی فروغ ملا،مساجد کی تعمیر میں بھی خصوصی دلچسپی لی گئی اور اس دور میں تعمیر ہونے والی مساجد اسلام کے ساتھ عوام الناس اور حکمران طبقہ کی گہری وابستگی کا مظہر ہیں۔مغلیہ دور حکومت میں تعمیر ہونے والی مساجد جہاں ایک طرف اسلامی شعائر سے محبت کو واضح کرتی ہے وہاں دوسری طرف فن تعمیرات کا بھی منہ بولتا ثبوت ہیں

۔اسلامی تہذیب وتمدن سے گہری وابستگی کا ہی نتیجہ تھا کہ نوآبادیاتی عہد تک آتے آتے اسلامی تہذیب و تمدن اور اسلامی فکر کی جڑیں اس علاقے میں گہری ہو چکی تھیں یہی وجہ ہے کہ نوآبادکاروں کے تمام تر خوش نما حربوں کے باوجود لوگوں اور خاص طور پر ادیب طبقہ کے اذہان سے اسلامی فکر کو ختم نہ کیا جاسکا ، زمینی حالات اور اپنی بقا کی خاطر ذہنی طور پر انگریز کی غلامی اختیار کرنے والوں کے ہاں بھی شعوری اور لاشعوری طور پر ایسے عناصر دکھائی دیتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ نوآبادیاتی عہد میں تخلیق ہونے والے ادب پر اسلامی فکر کے گہرے اثرات ہیں۔

اردو ادب اور خاص طور پر اردو ناول نگاری میں اسلامی فکر کے حوالے سے نوآبادیاتی دور کا مطالعہ کیا جائے تو اس دور میں تخلیق ہونے والے بیشتر ناول اسلامی فکر کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ نوآبادیات کے اس دور میں ایک مضبوط طبقہ ایسا بھی موجود تھا جو مغربی نوآبادکاروں کے مقابلہ میں اسلامی طرز زندگی کے احیاء اور اسلامی اقدار کے فروغ کا داعی تھا ،ادیب چوں کہ معاشرے سے متاثر ہوتا ہے اور معاشرے کے اثرات ادب پر لازمی طور پر پڑتے ہیں اس لئے اس مذہبی طبقے کی موجودگی میں اس وقت کے معاشرے میں مذہبی اقدار اور اسلامی طرز زندگی کے اثرات واضح طور پر ملتے ہیں اور یہی اسلامی فکری اثرات شعوری اور لاشعوری طور پر اس عہد کے ناول نگاروں پر بھی چھائے رہے ،اس کے علاوہ بعض ادیب ایسے بھی تھے جو ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ خود عالم دین ، مفسر اور مذہبی طبقے سے تعلق رکھنے والے تھے۔اس لئے ان کے ہاں اسلامی فکر کی عکاسی ہونا ایک فطری عمل ہے ،ایسے ادباء میں سرفہرست ڈپٹی نذیر احمد ہیں جنہیں اردو ناول نگاری کی ابتداء کا شرف حاصل ہے۔ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں اسلامی فکر کی عکاسی واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کا تعلق ایک مذہبی طبقے سے تھا، ڈاکٹر سہیل بخاری لکھتے ہیں:

> ''نذیر احمد مولوی اور حافظ ہونے کے ساتھ ساتھ مفسر قرآن بھی تھے،اس لئے ان کے
> تمام ناولوں میں مذہب اور تعلیم اخلاق پر زور ہے۔''۶۸

ابن الوقت (۱۸۸۸ء) ڈپٹی نذیر احمد کا معروف ناول ہے۔اس ناول میں ایسے لوگوں کی کہانی ملتی ہے جو نوآبادکاروں کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ کو دیکھتے ہوئے اس سے وقتی طور پر فائدہ اٹھانے کی

کوشش کرتے ہیں، ابن الوقت کا ہیرو انگریز سے فائدہ حاصل کرنے کے لیے اس حد تک آگے بڑھ جاتا ہے کہ اپنی مذہبی اور سماجی روایات کو بدلنے پر آمادہ نظر آنے لگتا ہے، تمام تر پیروی مغربی کے باوجود اس ناول میں اسلامی فکر کی عکاسی واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔ وہ دور جب اسلامی سلطنت کا وجود پارہ پارہ ہو چکا تھا، مسلمان مفلوک الحال ہو چکے تھے۔ نو آبادکاروں کی طاقت اور اثر ورسوخ میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا تھا اس وقت بھی ڈپٹی نذیر احمد اسلام کو ایسا مذہب قرار دیتے نظر آتے ہیں جو سپاہیانہ خصوصیات کا حامل ہے، ابن الوقت سے اقتباس ملاحظہ ہو:

''میں ان کے مذہب کو (آپ معاف کیجئے گا) سپاہیانہ مذہب خیال کرتا ہوں ،میرے نزدیک ہر مسلمان مذہباً سپاہی ہے۔'' ۶۹

اسی طرح ''ابن الوقت'' کے مذہبی خیالات ڈپٹی نذیر احمد کی زبانی سنئے:

''پانچوں وقت جامع مسجد کی اول جماعت کی تکبیر تحریمہ ناغہ نہیں ہونے پاتی تھی اور تہجد اور اشراق کے علاوہ تحیۃ المسجد، صلوٰۃ التسبیح، منزل فیل، دلائل الخیرات، ضرب والبحر اور خدا جانے اور کتنے وظائف، جمعے کے دن کبھی اس کے گھر جانے کا اتفاق ہوا تو پہر دن چڑھے سے نماز جمعہ کی تیاری ہو رہی ہے۔'' ۷۰

ڈپٹی نذیر احمد نے سماجی اصلاح کا جو بیڑہ اٹھایا تھا اس کا لازمی نتیجہ یہ ہی نکلتا تھا کہ وہ اسلامی طرز زندگی کو رواج دیں، یہی وجہ ہے کہ ان کے بیشتر ناول اسلامی فکر میں رنگے نظر آتے ہیں ''فسانہ مبتلا'' ان کا ایک اور معروف ناول ہے۔ ابن الوقت کی طرح اس ناول میں بھی جا بجا اسلامی فکر کے نمونے دکھائی دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جل شانہ کے قبضہ قدرت کے بارے میں خیالات ملاحظہ ہوں:

''اگر خدا نہ چاہے تو کیا بندے آپ سے آپ پیدا ہو جائیں اور اپنے اختیار سے زندگی بسر کریں، ایسا خیال کرنا تو کفر کے علاوہ غلط صریح بھی ہے۔ بندے بھلے اور بُرے، امیر اور غریب، قوی اور ضعیف، حاکم اور محکوم، بادشاہ اور رعیت، یہاں تک کہ ولی اور پیغمبر سب کے سب اس قدر عاجز اور بے اختیار ہیں کہ بدون خدا کی مرضی کے ایک پتا ہلانا چاہیں تو نہیں ہلا سکتے۔ ایک ذرے کو جگہ سے سرکانا چاہیں تو نہیں سرکا سکتے۔'' ۷۱

اسلامی فکر کی عکاسی کے ساتھ ساتھ نوآبادیاتی عہد میں ڈپٹی نذیر احمد کی ناول نگاری کے جو فکری رجحانات سامنے آئے ان میں اصلاحی فکر کو اہم مقام حاصل ہے۔اس دور میں جب باشندگان برصغیر نوآبادکاروں کے شکنجے میں جکڑتے چلے جا رہے تھے اور نوآبادکار کی پالیسیوں کی وجہ سے اخلاقی اقدار اور سماجی روایات بھی دم توڑ رہی تھیں تو ایسے میں بعض ایسے ادیب بھی تھے جو ادب کے ذریعے معاشرے کی اصلاح کا بیڑہ اٹھاتے نظر آتے ہیں۔اصلاح کی یہ کوشش کہیں تو ملکی سطح پر پائے جانے والی استعمار زدگی کے حوالے سے ہیں اور کہیں یہ گھریلو زندگی حتیٰ کہ ایسی رسومات کے حوالے سے ہیں جو وقت اور پیسے کی بربادی کا سبب بنتی ہیں۔

اصلاحی نقطۂ نظر کے حوالے سے لکھنے والوں میں ڈپٹی نذیر احمد بھی شامل ہیں،ان کے ناولوں میں فضول رسومات کی مذمت اور ان سے بچنے کی تلقین واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے،اس کے علاوہ ان کے ہاں عورتوں کی تعلیم و تربیت کے ذریعے اصلاح معاشرہ کا رجحان بھی ملتا ہے۔ان کے ناول ''مراۃ العروس'' اور ''بنات النعش'' اس حوالے سے خاص اہمیت کے حامل ہیں۔جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ استعمار کاروں نے استعمار زدگان کے اذہان کو تبدیل کرنے کے لئے جو لائحہ عمل مرتب کیا تھا،اس وقت کے ادیب نہ صرف اس کے مضر اثرات سے آگاہ تھے بلکہ وہ محکوم طبقے کی گھریلو اور سماجی اصلاح کو بھی اپنا مقصد بنائے ہوئے تھے تا کہ محکوم ہوتے ہوئے بھی یہ قوم اپنی مذہبی اور اخلاقی اقدار سے بغاوت نہ کر پائیں اور معاشرہ میں مذہبی اور اخلاقی اقدار کی جڑیں مضبوط رہیں،مگر یہ بھی حقیقت ہے نوآبادکاروں نے جس طرح برصغیر کی تہذیب و ثقافت اور یہاں کے باشندگان کے ذہنوں پر یلغار کی اس میں بہت سے ادیب بہتے چلے گئے اور اصلاحی نقطۂ نظر کی بجائے اردو ناول نگاری میں ایسے فکری رجحانات سامنے آنے لگے جو استعمار زدگی کی علامت قرار دیئے جا سکتے ہیں۔

نوآبادکار اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ برصغیر جیسے مذہبی اور تہذیبی گہرائی والے خطے پر بزور طاقت زیادہ دیر تک تسلط قائم رکھنا ممکن نہیں ہے،اس لئے طاقت کے ساتھ ساتھ انہوں نے اس خطے کے لوگوں کی فکر میں تبدیلی پیدا کرنے کے لیے بھی حکمت عملیاں ترتیب دیں وہ اس خطے میں ایسے لوگوں کا ایک طبقہ پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے جو ان کی ہاں میں ہاں ملانے والا تھا۔اس

طبقہ نے زندگی کے ہر شعبے میں ایسی فکر کو رواج دیا جس سے نوآبادکاروں کے مقاصد کے حصول میں آسانی پیدا ہوئی، استعمار زدگی کا یہ عنصر انیسویں صدی میں کئی حوالوں سے سامنے آیا، ان میں مذمت ، مدحت اور مرعوبیت کی صورتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ انیسویں صدی کے بیشتر ناول نگاروں کے ہاں ایسے فکری رجحانات ملتے ہیں جن سے نوآبادکاروں کے نظریات کے پرچار کی بوآتی ہے۔

نوآبادکاروں نے استعمار زدگان کے ذہنوں کو مطیع بنانے کے لئے یہاں کی ثقافت اور رسوم و رواج کو فرسودہ اور فضول قرار دینے کی حکمت عملی اپنائی، انھوں نے ہندوستانی ثقافت اور رسوم کے مقابلے میں استعماری ثقافت کو رواج دینے کی سعی کی، ہندوستانی ثقافت اور رسوم کی مذمت کی جانے لگی۔ یہی وجہ ہے کہ نوآبادکار طبقہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اس دور کے بیشتر ناول نگار اپنی تمام تر اسلامی اور اصلاحی فکر کے باوجود استعماری حربوں کے آلہ کار بنے نظر آتے ہیں اور ناول نگاری میں ہندوستانی رسومات کی مذمت میں ان کے قلم رواں رہتے ہیں۔ اسلامی اور ہندوستانی رسومات کی مذمت کے حوالے سے ڈپٹی نذیر احمد کا ناول ''ابن الوقت'' خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ پچھلے صفحات میں ابن الوقت میں اسلامی فکر کے عناصر کا بیان کیا گیا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ تمام تر اسلامی فکر کے باوجود اس ناول کا ہیرو انگریز حکمرانوں کا آلہ کار نظر آتا ہے اور انگریزی رسوم کے مقابلے میں اسلامی اور ہندوستانی رسومات کی مذمت کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے سابقہ حکمرانوں کی مذمت بھی کی گئی ہے۔ ابن الوقت میں نوبل کا بیان دیکھئے:

> ''آپ کے جہاں پناہ نے اپنے ساتھ نسل تیمور اور تمام خاندان شاہی بلکہ شہر کے برباد کر دینے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ انہوں نے ملک گیری کی ہوس کی جب کہ ان کو اور ان کے اعوان و انصار کو ملک داری تو کجا، خانہ داری کی بھی لیاقت نہ تھی۔'' ۴۷

ناول نگار کے خیالات فکری پسماندگی اور ذہنی غلامی کی الم ناک صورت حال کی تصویر کشی کرتے ہیں، مندرجہ بالا اقتباس میں ایسے خاندان کو حکومتی امور کے لئے نااہل ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس نے اس خطہ پر نہ صرف یہ کہ صدیوں تک کامیاب حکمرانی کی بلکہ پورے عالم میں اپنی قابلیت اور بہترین نظم و نسق کا بھی لوہا منوایا، نوآبادکاروں نے صرف حکمرانوں بلکہ مسلمان اہل علم لوگوں کے بارے میں گمراہ کن تصورات کا پرچار کیا اور انتہائی جھوٹ سے کام لیتے ہوئے اسلامی علوم اور مسلمان اہل علم

لوگوں کومغربی دانشوروں سے کم تر ثابت کرنے کی کوشش کی اس بارے میں برصغیر میں تعلیمی حوالے سے لارڈ میکالے کا نام خاص طور پرلیا جاتا ہے۔جس نے عربی اور فارسی سے اپنی ناواقفیت کا اعتراف کرنے کے باوجود عربی وفارسی اور دیگر اسلامی امور کے تمام اثاثہ جات کومغرب کی کسی ایک الماری کی کتابوں سے بھی کم تر گردانا۔

نوآبادیاتی دور کے اس فکری جائزے سے واضح ہوتا ہے کہ اس دور میں ایک طرف تو ڈپٹی نذیر احمد اپنے اسلامی تشخص اور اسلامی روایات کو برقرار رکھنے کی سعی میں لگے تھے تو دوسری طرف استعماری پالیسیوں کے اثرات بھی ان کی فکر پر گہرے اثرات مرتب کر رہی تھیں۔نوآبادکاروں کی بڑھتی ہوئی طاقت اور اثر ورسوخ نے ادباء کے قلموں کا رخ استعماری ایجنڈے کی تکمیل کی طرف کر دیا تھا۔ذہنی پسماندگی اور فکری ردعمل کی انمٹ مثالیں اس دور کے ادب میں دیکھی جاسکتی ہیں۔اس دور میں رواج پانے والے فکری رجحانات میں مادیت پرستی اور حقیقت نگاری کی مثالیں بھی ملتی ہیں،اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر علمدار حسین بخاری لکھتے ہیں:

''ہندوستان میں جدید اصلاحی سرگرمیاں دراصل مغرب کے اس سیکولر تصور زیست کی پیداوار تھیں،جس کی بنیادیں یورپی نشاۃ ثانیہ کے بعد جنم لینے والی انسان دوستی اور آزاد خیالی پر استوار تھیں،اس سیکولر تصور زیست نے مغرب کی طرح مشرق میں بھی رجائیت پرستی کی ایسی لہر پیدا کر دی،جس کے سامنے غلاموں کی قنوطی اور شکست خوردہ ذہنیت پسپا ہونے لگی اور خود انسان کی پیدا کردہ برائیوں کے خلاف جدوجہد کا حوصلہ پیدا ہوا،اسی بناء پر جدید ہندوستانی ادب میں انسان کی موجود اور مادی زندگی میں دلچسپی بڑھنے لگی اور سماجی حقیقت نگاری کا رجحان پروان چڑھنے لگا۔''[۳۷]

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو نوآبادیات کے دور میں بہت سے فکری رجحانات ادب میں ملتے ہیں جس کی وجہ سے اس دور کے ادب میں یکسانیت کی بجائے تنوع کی صورت ملتی ہے۔متنوع فکری رجحانات کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اس دور میں ادباء متنوع خاندانی اور سماجی پس منظر کے حامل لوگ تھے۔تاریخ کے مختلف ادوار نے اس تنوع کو اور زیادہ گہرا کر دیا تھا۔اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ ادب یکسانیت کا شکار

ہونے سے محفوظ رہا۔اس دور میں چلنے والی مختلف اصلاحی اور انقلابی تحاریک نے بھی ادب کو نئی جہتوں سے آشنا کیا۔انہی نئی جہتوں نے نوآبادیات کے خاتمے کے بعد بھی اردو ادب میں تنوع کی صورت حال کو برقرار رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔

## نوآبادیاتی ہندوستان میں تعلیمِ نسواں کا علمبردار: ڈپٹی نذیر احمد

ریاست کی جدید شکل سے قبل ، جسے صنعتی معیشت نے ممکن بنایا، ریاستی ڈھانچہ زرعی پیداوار اور جاگیردارانہ اقدار پر انحصار کرتا تھا۔ یورپی صنعتی انقلاب نے اس سماجی ساخت کو تبدیل کیا اور سرمایہ دارانہ معاشی نظام کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے ہنرمند افراد کی تیاری کا بندوبست عام تعلیمی اداروں کے اجرا اور باقاعدہ نظام الاوقات کے تعین سے کیا۔ برعظیم میں نوآبادیات کا ابتدائی دور ہندوستانی تہذیب اور اس کے مظاہر کے اعتراف کا دور جب انگریز مستشرقین کی پہلی نسل اٹھارویں صدی میں ہندوستانی زبانوں اور تہذیب کو حیرت و تحسین کی نظر سے دیکھتی ہے۔تاہم جیسے جیسے نوآبادیات کے قدم جمتے ہیں، برطانیہ میں لبرلزم عام ہوتا ہے اور ہندوستان میں نوآبادکاروں کی ضرورتیں بڑھتی ہیں، ویسے ویسے ہندوستانی تہذیب کے بارے میں نوآبادکاروں کی رائے میں تحقیر اور یہاں کی آبادی کو اپنے مقاصد کے تحت تعمیر کرنے کی خواہش زور پکڑتی ہے۔ جو خوب تھا اب بتدریج ناخوب ہوا۔۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی استعماریوں اور مقامیوں ہر دو کو مفاہمت کی راہ تلاش کرنے پر تیار کرتی ہے۔ایک کا مقصد دوبارہ ایسی بغاوت کی روک تھام ،دوسرے کے پیشِ نظر اپنی پوزیشن بحال کرنے کا سوال ہے۔ایسے عالم میں شمالی ہندوستان سماجی اصلاح کی مختلف تحریکوں کا گھر بنتا ہے جن میں ایک تعلیمِ نسواں ہے۔اسے لوگوں کے فکری مکالمے کا حصہ بنانے میں ناول نے بھرپور حصہ لیا۔ان مباحث کی ضرورتوں میں نوآبادیات کا براہِ راست حصہ ہے ۔مقامی آبادی کو اپنے مقاصد کے تحت تعمیر کرنے اور اپنے نظام کا کل پرزہ بنانے کے لیے نوآبادکاروں نے ہندوستان میں اصلاحی منصوبوں پر زور دیا۔ ہندوستانیوں کو جدید خطوط پر استوار کرنے کا بیڑہ اٹھایا گیا ۔جس کے ردِعمل میں ہندوستانی اہلِ قلم نے مختلف تحریروں میں دیسی باشندے کے سامنے اصلاح یا احیا کے مختلف رول ماڈل پیش کیے۔انھی میں تعلیمِ نسواں کے مختلف ماڈل سامنے آئے جو بدیسی حکمرانوں ،استعماری صورتِ حال اور مقامی سماج کی مختلف ضرورتوں کی بنیاد پر متشکل ہوئے۔آئندہ صفحات میں ان

ضرورتوں کو سامنے لاتے ہوئے ڈپٹی نذیر احمد کے ناول 'مرأۃ العروس' کا جائزہ لیں گے، جس سے شمالی ہند میں عام نسوانی تعلیم کے ابتدائی خدوخال کو سمجھنا ممکن ہو سکے گا۔

یورپ میں مڈل کلاس کا ارتقا کلیسا سے آزادی، مذہبی اجارہ داری پر سوال اٹھانے، اپنے حقوق کا شعور حاصل کرنے اور علمی دنیا میں تشکیلی رویے کے پھیلاو کی صورت میں ہوا جسے جدیدیت کا دیا گیا۔ تاہم شمالی ہندوستان کے متوسط یا اشراف مسلمانوں میں جدیدیت کی لہر نے ان رویوں کی بجائے مذہب کی روایتی اور جدید تعبیروں میں پناہ لی۔ جہاں دیگر کی بجائے دنیاوی زندگی کے مختلف شعبوں کی سمت توجہ منعطف کرنے کے باوصف شمالی ہند کے مسلمان مذہبی طرز احساس کو نظر انداز کرنے پر تیار نہ تھے۔ مذہب ان کے لیے استعماری صورتِ حال میں اپنی شناخت وضع کرنے کا ایک ذریعہ بن گیا تھا۔ یہ بات دیکھنے کی ہے کہ شناخت کی اس بنیاد کو قائم کرنے اور پختہ بنانے میں خود استعماری طرز علم کا بنیادی کردار تھا۔

یوپی میں کچہری سے وابستہ مسلم نوکری پیشہ اشرافیہ کے لیے فارسی کی بندش اور انگریزی و اردو کے نفاذ سے ایک نئی صورتِ حال نے جنم لیا۔ جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے نئے سیاسی انتظام نے پیدا کی تھی۔ مسلم اشرافیہ سے مراد وہ لوگ تھے جو مغل دربار سے منسلک رہے جنھیں جاگیریں، خلعتیں اور خطابات عطا ہوئے۔ اشراف ہونے کے لئے دوسری اور لازمی شرط نسلی شرف تھا۔ جس میں سید، شیخ، ترک اور پٹھان شامل تھے۔ یعنی اشراف کے لیے غیر ہندوستانی النسل ہونا ضروری تھا۔ نوآبادیات نے ہندوستان کے سماج ، معاشی ڈھانچے اور علمی وضعیں تبدیل کرنے کے لیے متعدد تدابیر اختیار کیں۔ ان تبدیلیوں سے معاملہ کرنے کے لیے مقامی اشرافیہ نے جدید تعلیم سے قربت اور عامیوں کے لیے مذہبی تعلیم کے اجرا کی حکمت عملیاں بیک وقت اختیار کیں۔ گھر سے باہر تبدیل ہوتی دنیا کے ساتھ تعامل کے لیے محض مردوں کی تعلیم کافی نہیں تھی۔ نوآبادکاروں سے میل جول نے ملازمت پیشہ اشرافیہ کو خواتین کی تعلیم و تربیت کی طرف متوجہ کیا۔ ان تبدیلیوں کے ضمن میں مردوں نے دوہری پالیسی اختیار کی۔ گھر سے باہر کی دنیا یعنی سماج میں مغربی جدیدیت کو قبول کیا تاہم گھر کے اندر کی دنیا یعنی ثقافت میں روایت کو محفوظ کرنے اور رواجی عناصر کو اگلی نسلوں تک منتقل کرنے کا وطیرہ اپنایا۔ اس لیے سماجی اصلاح کی ہندوستانی مثال یورپی جدیدیت سے مختلف صورت اختیار کرتی ہے۔

ایسے عالم میں اشراف کے ہاں آئندہ نسلوں کی تربیتِ نو اہمیت حاصل کرگئی اور تعلیمِ نسواں کی طرف نوآبادکاروں نے بھی توجہ دلائی۔ اپنے من چاہے تصورات کو فروغ دینے اور ناپسندیدہ خیالات کی عوامی ترسیل کی روک تھام کے لیے استعماریوں نے نگرانی کا نظام وضع کیا اور مختلف انعامی سلسلے متعارف کروائے۔ عام تعلیم کے فروغ کے بنیادی اسباب میں سے ایک اور اس کی وجہ سے مہمیز حاصل کرنے والی طباعت کے نتیجے میں تحریر اور سماجی مکالمے کے نئے امکانات بروئے کار آرہے تھے، تاہم ان پر پبلک انسٹرکشن جیسے اداروں اور سنسر شپ ایکٹ جیسے قوانین سے استعماری گرفت مظبوط کی گئی تھی، نتیجہ ان امکانات سے چند خاص دائروں میں ہی کام لیا جاسکتا تھا۔ ان امکانات میں سے چند ایک اردو ناول میں سامنے آئے۔ یہ بات خالی از دلچسپی نہیں کہ اردو کا پہلا ناول استعماری حکومت کی طرف سے انعامی اعلان کے جواب میں لکھا گیا اور یہیں سے تعلیم و تربیت کا جدید سلسلہ شروع ہوا۔

مراۃ العروس ۱۸۶۹ء میں اصغری بہترین نسوانی رول ماڈل کے طور پر پیش کی گئی ہیا ور اس کی خوبیاں اکبری کی خامیوں کے بالمقابل روشن ہوتی ہیں۔ یہ بات یادرکھنے کی ہے کہ اس اولین ناول کے دیباچے میں تعلیمِ نسواں کی اہمیت اور اس کے مفید نتائج کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ڈپٹی نذیر احمد نے ملکہ وکٹوریہ کی مثال کا ایک سے زائد بار حوالہ دیا ہے۔ اسی کو بنیاد بنا کر خواتین کی مخفی صلاحیتوں اور امکانات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ اس پر مستزاد پبلک انسٹرکشن کے ڈائریکٹر میتھیو کیمپسن نے ناول پر اپنی تقریظ میں اس کے تعلیم و تربیتِ نسواں کی ذیل میں مفید ہونے اور مستقبل میں اس کے مشہور ہونے کی نوید دی ہے ۔البتہ یہ پیش نظر رہے کہ اصغری کا باپ اس کی شادی کے موقع پر نصیحت آمیز خط میں عورتوں کی ناقص العقل ہونے کی بات کرتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زردو ناول کا یہ ابتدائی نمونہ سماجی فہم میں آنے والی تبدیلیوں سے ابھرنے والے رجحانات اور ثقافت کے باقی ماندہ عناصر کے درمیان چل رہی کشمکش کی نمائندگی کرر ہا تھا۔ اگر ایک طرزِ فکر عورت کو ناقص العقل کہتا تھا تو دوسرا اس کی نصف جہاں پر پھیلی سلطنت کو چلانے میں مہارت کا معترف تھا۔

نوآبادیاتی حکومت کے فروغ نے نئی سماجی اور معاشی صورتِ حال پیدا کی۔ اس میں قدیم ہنر جنھیں مغل دربار میں قبولیت اور اعتراف حاصل تھا، ان کی پوچھ گچھ نہ رہی۔ شاعری، زبان دانی اور دیسی

فنون کی قدر دانی کرنے والے امرانہ رہے۔ایسے عالم میں بدیسیوں کی پسند کے مطابق خود کو ڈھالنا زندہ رہنے کے لیے لازم ہوگیا تھا۔اس ضمن میں سرکاری تعلیم اور انگریزی پسند طرزِ زندگی کامیابی کے لیے ضروری ہوگئے تھے۔سماج میں در آنے والی تبدیلی کا مطلب تھا مردوں کی دنیا کا بدل جانا۔یوں گھر کے اندر کی دنیا کو بھی تبدیلی کے لیے تیار کرنا ضروری تھا۔دوسری بات یہ کہ لڑکوں کی تربیت گھر میں ہورہی تھی ۔یوں باہر کی بدلی ہوئی دنیا سے اگر زنانہ کی مطابقت نہ ہو تو نوخیز کے لیے اس سے مطابقت قائم کرنے میں مشکل ہوسکتی تھی۔اس لیے ماں کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری قرار پایا۔

اس میں شک نہیں ہے کہ یہاں کی عورتیں بالکل جاہل ہیں اور اکثر ان پڑھ ہوتی ہیں۔اس لیے اولاد کی تعلیم اچھی نہیں ہوتی ۔لڑکے ماؤں سے ایامِ طفولیت میں جس قدر ہلے ملے رہتے ہیں اس قدر کسی سے نہیں رہتے اور جو ماں کہ پڑھی لکھی ہوتی ہے وہ پہلے ہی سے ان لوگوں کی طبیعت پڑھنے لکھنے کی طرف رجوع اور بنیاد مستحکم کرتی ہے۔یوں مردوں کی آئندہ جدید تربیت کے لیے تعلیم نسواں لازم آئی دوسری طرف نوآبادیات کے زیرِ اثر معاشی نظام کے بدلنے سے پیدا ہونے والی غیر یقینی نے بھی اشراف کو مجبور کیا کہ وہ بدلتے حالات کے مطابق خود کو تیار کریں ،پھر نوآبادیاتی نظام میں ملازمت کے لیے دور دراز مقامات پر بھی ٹھہرنا پڑسکتا تھا۔جیسے مرأۃ العروس میں اصغری کا والد اور شادی کے بعد اس کا شوہر بھی ملازمت کے سلسلے میں دوسرے شہروں میں مقیم ہوتے ہیں۔ان حالات میں گھر کا نظم ونسق چلانے کی ذمہ داری بھی عورت پر آرہتی ہے۔اصغری کا کردار اسی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔

اصغری کی صفات اور طرزِ عمل پر غور کرنے سے ان توقعات اور مقاصد کو سمجھنا آسان ہوجاتا ہے جن سے اس کردار نے جنم لیا۔دوسری بات اس کردار کو ناول کے پورے تناظر میں رکھ کر دیکھنا اور اس دور میں عورت کے بارے موجود تصورات کے سیاق میں اس کی تفہیم سے کئی نئے زاویے سامنے آسکتے ہیں ۔اوپر مذکور خط میں اصغری کا والد اسے نصیحت کرتے ہوئے اس مردانہ طرزِ فکر کے بنیادی خدوخال وضع کرتا ہے جس میں اصغری کی تشکیل ہوئی ہے۔وہ سمجھتا ہے کہ حوا کو آدم کی خوشنودی کے لئے پیدا کیا گیا۔

> ''عورت کا پیدا کرنا صرف مرد کی خوش دلی کے واسطے تھا اور عورت کا فرض ہے مرد کو خوش رکھنا۔''۴۷

---

وہ عورتوں پر مردوں کی فضیلت کے دوسبب بیان کرتا ہے،جسمانی طاقت اور عقل ۔وہ عورتوں کی ان ڈینگوں کو بھی ناپسند کرتا ہے جس میں مردوں کو زیر بار رکھنے یا نخروں کے ذریعے مطیع کرنے پر فخر کرتی ہیں ۔اس کی دانست میں بیوی کو شوہر سے محبت کے ساتھ ساتھ اس کا ادب بھی کرنا چاہیے ۔وہ ایسی رسموں کو آڑے ہاتھوں لیتا ہے جن سے مردوں پر عورت کی برتری قائم ہوتی ہو۔اس کی نصیحت کا مرکز یہ ہے کہ اصغری شوہر کو ہر طرح سے خوش رکھے،اتفاق اور صلح کاری ،خانہ داری میں خوشی کے لیے لازمی عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں اور شوہر کا دل فرماں برداری سے رام کیا جاسکتا ہے۔ان نصیحتوں کی مدد سے مطلوب تعلیم وتربیت کے اشارے مل جاتے ہیں ۔یہیں عورت بطور صنف بھی کچھ صفات کا تعین ہوتا ہے ۔اصغری کے کردار میں انھی خوبیوں کی جھلک ملتی ہے اس ایک فرق کے ساتھ کہ وہ عقل کی مدد سے گھر بھر کو اپنا گرویدہ بنا لیتی ہے ۔اس میں انتظام وانصرام کی صلاحیت کو تقویت اور دلیل ملکہ وکٹوریا کے کردار سے ملتی ہے ۔اس طرح ناقص العقل ہونے کے باوصف اس کی تدبیر اور حسن انتظام کی خوبیاں ان مل نہیں لگتیں ۔تاہم یہ سمجھنا چاہیے کہ اصغری کی تمام خوبیوں کا مرکز اس کے شوہر کی ذات اور اس کا گھرانہ ہے ۔وہ گھر میں ایک مدرسہ کھولتی ہے،جس کی تقریب کچھ اس طرح بنتی ہے کہ برادری کی ایک پھوہڑ رئیس زادی حسن آرا کو اصغری کی سلیقہ شعاری کا شہرہ سن کر اس کے پاس تربیت کے لیے بٹھایا جاتا ہے ۔اصغری اس ایک شاگردہ کے ساتھ اپنی نند محمودہ کو بھی تربیت دیتی ہے جس کی خبر پا کر محلے سے اور لوگ بھی اپنی بچیاں یہاں چھوڑ جاتے ہیں ۔اصغری تربیت کے شوق میں آنے والی ہر طالبہ کو اپنے مکتب میں جگہ نہیں دیتی ۔وہ شاگردوں کے انتخاب میں نسلی شرف کو معیار بناتی ہے۔

”حسن آرا کے بیٹھتے ہی محلے کا محلّہ ٹوٹ پڑا۔جس کو دیکھو اپنی لڑکی کو لیے چلا آتا ہے اصغری نے شریف زادیوں کو چن لیا اور باقیوں کو حکمت سے ٹال دیا۔“ ۷۵

اصغری کے اس عمل اور بچیوں کی تعلیم گھر پر دینے سے کم از کم ایک بات صاف ہو جاتی ہے۔تعلیم و تربیت کا یہ منصوبہ اپنے اندر طبقاتی امتیاز رکھتا تھا۔اصغری کے مکتب میں جو تعلیم دی جاتی ہے وہ اشراف زادیوں کو گھر میں درپیش ممکنہ مسائل اور صورتحال کے لیے تیار کرنے کا مقصد لیے ہوئے ہے ۔قرآن ،ابتدائی حساب ،لکھنا،پکانا،رینldھنا اور سینا پرونا یہ وہ نصاب ہے جس کی اصغری کے گھر پر تعلیم ہوتی ہے۔

ان قابلیتوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ نصاب گھر کی چار دیواری کے اندر خانگی زندگی کو زیادہ باسہولت اور کامیاب بنانے کے لیے ترتیب دیا گیا ہے اور اس سے عورتوں کے رول کا تعین بھی ہو رہا ہے۔

نوآبادیات کے زیرِ اثر پروان چڑھنے والا یہ تعلیمی منصوبہ ہندوستانی تہذیب کے زبانی پن سے خواندگی کی طرف سفر کے حوالے سے بھی اہم ہے۔ ہندوستانی تہذیب زبانی روایت سے تعلق رکھتی تھی اور اس میں آمیخت ہونے والی مسلم روایت میں بھی کتاب کی بنیادی اہمیت کے باوصف زبانی پن کا کردار مسلمہ ہے۔ خود قرآن کو کتابی صورت بھی زبانی روایتوں سے سند لے کر دی گئی۔ زبانی روایت میں راوی کی حیثیت اساسی ہوتی ہے۔ اس کا استناد اس کی سماجی حیثیت، کردار اور تجربے سے قائم ہوتا ہے۔ دوسری بات زبانی روایت میں رواج بھی بطور سند استعمال ہوتا ہے۔ انیسویں صدی کی تبدیلیوں نے اس روایت کے استناد پر سوال اٹھانے کے لیے جو استدلال استعمال کیا وہ منطق سے زیادہ محکم حیثیت کو استعمال کرتا ہے۔ زبانی پن میں راوی یا رواج کو جو استناد حاصل تھا، وہ مقام اب مطبوعہ کتاب اور رسمی تعلیم یافتہ کو حاصل ہوا۔ جس طرح رواج کسی رسم یا طور کے مستند ہونے کی علامت نہیں اسی طرح کوئی مطبوعہ کتاب یا کسی رسمی تعلیم کے ذریعے حاصل کردہ ڈگری بھی علم کا معیار نہیں ہوسکتی۔ لیکن اگر ناول نگار کے زاویہ نظر اور کرداروں کی پیش کش پر نظر رکھی جائے تو کچھ ایسی ہی صورت برآمد ہوتی ہے۔

یہاں دو باتیں قابلِ غور ہیں۔ علم اور عقل کا تعین کرنے میں ہندوستانی آزاد نہیں رہے۔ یہ زمام اب انگریزوں کے ہاتھ میں ہے۔ وہی یہ طے کر رہے ہیں کہ علم کیا ہے۔ دوسری بات ان کی مقتدر حیثیت انھیں یہ موقع فراہم کر رہی ہے۔ نتیجہ اب وہی سرگرمیاں لائق تحسین ہیں جن کو وہ خوب قرار دے رہے ہیں۔ وہ کام جو انگلستانی لڑکیاں کرتی ہیں وہی اگر ہندوستانی کریں تو وہ بھی تعلیم یافتہ اور عاقل کہلائیں۔ اور ایسا نہ کرنے کی صورت لوگ نام دھرتے ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں بعض مقامات پر انگریزی قانون اور جغرافیے کا علم بھی بذریعہ قصہ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

اگر ناولوں میں تعلیم کی ضرورت کے بارے میں پیش کیے گئے خیالات اور غیر رسمی نصاب پر نظر کریں تو ایک نکتہ واضح ہوتا ہے کہ یہاں تعلیم، علم کی تخلیق، جاننے کے ذوق اور دریافت کے شوق کی پیداوار نہیں ہے۔ یہ چند ضرورتوں کو پورا کر رہی ہے سو اس میں افادی نقطۂ نظر غالب ہے۔ یہ چند ہنر مند

یوں کو سکھانے کے گرد گردش کرتی ہے۔اس کا مقصد انسان کے ذوقِ جستجو کو جلا بخشنا یا شوقِ تحقیق کی آبیاری کرنا نہیں ہے۔اس لیے تعلیم ایک محدود دائرہ کار کی حامل ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں یہ قدر مشترک ہے کہ تعلیم گھر پر ہو رہی ہے۔یہاں عورت کا ایک نیا روپ سامنے آرہا ہے جس میں گھر ساز اور تربیت کار ہے۔اسے ایسے ہنر سکھائے جا رہے ہیں جن سے گھر داری میں حسن سلیقہ در آئے اور نو آبادیاتی صورت حال سے پیدا ہونے والی ضرورتیں بھی پوری ہوں۔یہ بات صاف ہے کہ تعلیم نسواں، مردانہ ضرورتوں کے تابع تھی اور بڑی حد تک آج بھی ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد تعلیمِ نسواں اور اولاد کی اچھی تربیت پر بہت زور دیتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ گھریلوں نظام کی درستگی عورت کی ذمہ داری ہوتی ہے اور اچھی تربیت سے گھر کی خوشحالی اور زندگی کامیاب ہو جاتی ہے۔میں ڈپٹی نذیر احمد کے اس اقتباس کی طرف آپ کی توجہ کرنا چہتا ہوں جس میں وہ خواتین کی تعلیم اور بچوں کی تربیت کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

> ''مائیں تو باتوں باتوں میں وہ سکھا سکتی ہیں جو استاد برسوں کی تعلیم میں بھی نہیں سکھا سکتا۔'' (مراۃ العروس،ص۲۲)

## نوآبادیاتی تہذیب وفکر کے اثرات

یورپ میں نشاۃ الثانیہ کے بعد سے جس انسان مرکز اور عقل پرست رویوں کے تحت ایک نئے دور کا آغاز ہوا اسے اصطلاحاً جدیدیت کی تحریک کہتے ہیں۔اس اصطلاح نے کافی انتشار پیدا کیا ہے اور مختلف بلکہ متضاد معنی میں بھی استعمال کی جاتی ہے۔بیسویں صدی میں اس عقل پرستی اور حتمیت والے رویے کے خلاف یورپ ہی سے مختلف سطحوں پر آوازیں بلند ہونا شروع ہوئیں،اسے بھی جدیدیت کہا جاتا ہے۔بظاہر یہ دونوں قسم کی جدیدت متضاد عناصر کی حامل ہے،مگر اپنی روح میں چند باتوں کو چھوڑ کر یہ ایک ہی چیز ہے۔

مابعد جدیدیت ایک دور کا عبوری نام ہے۔اس دور کی شکل وصورت ابھی پوری طرح نکھر کر سامنے نہیں آئی۔کم از کم اتنی بات تو طے ہے کہ یہ دور جدیدیت کے دور سے مختلف ضرور ہے اور جدیدیت کی بنیادی روح سے اس میں انحراف موجود ہے:

'' جدیدیت نے مذہب کے بجائے عقلیت ،برادری کے بجائے انفرادیت ،روحانیت کے بجائے مادیت ،مابعد الطبیعات کے بجائے سائنس اور ترقی کو ترجیح دی جبکہ مابعد جدیدیت نے تاریخ اور سماجیات کے بجائے ثقافتی مطالعات کو زیادہ اہم قرار دیا۔'' ۷۶

اس بدلے ہوئے دور میں مصنف کے بجائے قاری نے زیادہ اہمیت حاصل کر لی ہے ۔اب ٹیکسٹ کی بجائے کنٹکسٹ زیادہ اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس طرح پوری تہذیب اور معاشرہ کا احاطہ ممکن ہو جاتا ہے۔اس کا اطلاق صرف نئے متون پر ہی نہیں ہوا بلکہ ماضی کے متون کا مطالعہ بھی از سر نو انہی خطوط پر کیا گیا۔اس ضمن میں سب سے اہم کام ایڈورڈ سعید کا ہے۔ان کی دو کتابوں 'شرق شناسی' اور 'ثقافت اور سامراج' نے نئے مباحث کو جنم دیا۔ایڈورڈ سعید کے مطابق نشاۃ الثانیہ کے بعد یورپ میں مخصوص حالات کے پیش نظر ''مشرق'' کا تصور ابھارا گیا۔مشرق سے نہ سمجھ آنے والا حسن وابستہ کیا گیا۔مشرق کو ایک معروض کے طور پر پیش کیا گیا جس کا مطالعہ درکار تھا۔دانشورانہ سطح پر یہ کام زبان،ادب،تاریخ،فلسفے غرض بہت سے شعبوں میں کیا گیا۔مغرب نے اپنے لیے ایک ''دگر'' other پیدا کیا۔اس 'مشرقیت' کے ذریعے مغرب نے قوت اور شناخت حاصل کرنا چاہی۔اس طرح شرق پسندی درحقیقت 'دگر' اور 'ہم' کا تنازعہ ہے۔جس کا عملی اظہار نو آبادیوں کی صورت میں پیدا ہوا۔

اسی پس منظر میں ایڈورڈ سعید نے 'ثقافت اور سامراج' میں انگریزی ناول بالخصوص کانرڈ اور جین آسٹن کا مطالعہ کیا۔ایڈورڈ سعید کے بقول ایک مخصوص ثقافت کو فروغ دینا اور دو مختلف ثقافتوں کو پروان چڑھانا سامراجی ایجنڈا ہوتا ہے۔وہ اس بات پر حیرت زدہ ہیں کہ انگریزی ناول میں انگریزی اور 'دیگر' ثقافت اتنے زوردار طریقے سے پیش کی گئی ہے کہ جسے نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے تھا۔وہ سامراج اور انگریزی ناول میں بھی ربط تلاش کرتے ہیں۔

ایڈورڈ سعید کے بقول سامراجیت اور ناول کا گٹھ جوڑ پرانا ہے۔ناول نے ثقافت کو ایک خاص رخ سے پیش کیا ہے۔ناول نے نو آبادیات کے لیے راہ ہموار کی۔دونوں نے ایک دوسرے کو تحفظ فراہم کیا۔ناول کے بیانیے میں اتنی گنجائش ہوتی ہے کہ وہ محتاط انداز سے اخلاقی ،سیاسی ،اقتصادی سمت بندی

کر سکے۔اس لیے ڈکنز،تھیکرے، جارج ایلیٹ،کونرڈ،جین آسٹن جیسے ناول نگاروں کے ہاں سمندر پار املاک، سستی مزدوری، گوروں اور سیاہ فاموں کی قدار میں فرق، یورپ کی برتری اور ایشیاء اور افریقہ کی پستی جیسے موضوعات فطری انداز میں در آتے ہیں۔ایڈورڈ سعید لکھتے ہیں:

''پہلی جنگ کے وقت برطانوی ایمپائر مطلق طور پر غالباً گئی تھی اور یہ سولہویں صدی کے اواخر میں شروع ہونے والے عوامل کا نتیجہ تھا۔یہ محض ایک اتفاق نہیں ہے کہ برطانیہ نے ناول کا رواج ڈالا اور اسے قائم رکھا۔جس کا کوئی یورپی مقابل یا مساوی نہیں تھا۔کم از کم انیسویں صدی کے نصف اول میں فرانس کے پاس زیادہ ترقی یافتہ عقلی ادارے تھے۔اکیڈمیاں، یونیورسٹیاں، انسٹی ٹیوٹس، جرائد وغیرہ۔لیکن اس کمی کا ازالہ برطانوی ناول کے غلبے نے کر دیا۔'' ۷۷

ہندوستان میں ۱۸۵۷ء نے ہماری سیاسی تاریخ کو ہی نہیں بدلا بلکہ ہمارے شعور اور رویوں کو بھی بدل کر رکھ دیا۔نوآبادیاتی صورت حال وضع کی گئی اور ایسا محض عسکری قوت کے بل بوتے پر ممکن نہیں تھا ۔یہ صورت حال تشکیل شدہ تھی،نوآبادکار اپنے مفادات کو طول دینے کے لیے بہت سے اقدامات کرتا ہے ۔

نوآبادیاتی نظام ثنویت پر قائم ہوتا ہے اور اس تقسیم کا اختیار نوآبادکار کے پاس ہوتا ہے۔ایک کے اختیار میں اضافے کا مطلب دوسرے کے اختیار میں کمی ہوتا ہے۔طرزِ زندگی مشاغل، عمارات، تفریح ، رہائش غرض ہر شئے میں ثنویت کا اظہار ہوتا ہے۔ناصر عباس نیرّ لکھتے ہیں:

''نوآبادکار اپنی شخصیت، اپنی ثقافت، اپنے علمی ورثے، اپنے سیاسی نظریات، اپنے فنون کے بارے میں جو آراء پھیلاتا ہے، وہ نوآبادیاتی دنیا کے افراد کی شخصیت ،ثقافت، علم اور رفنون کے متعلق موجود آراء کے متضاد اور انھیں بے دخل کرنے والی ہوتی ہیں۔'' ۷۸

مقامی باشندوں کے بارے میں ایک تصور خود ان پر مسلط کر دیا جاتا ہے۔انھیں بتایا اور باور کرایا جاتا ہے کہ وہ کیا تھے اور کیا ہیں۔علمی، سیاسی، ثقافتی غرض ہر طرح کی تاریخ کو خاص زاویے سے دکھایا جاتا ہے۔نوآبادکار کی برتری ثابت ہونے کے بعد نوآبادیاتی نظام کو استحکام ملتا جاتا ہے۔اس لیے رسمی اور غیر

رسمی طور پر ایک ایجنڈے پر کام کیا جاتا ہے۔فورٹ ولیم کالج ہو یا انجمن پنجاب سب نے مقامی باشندوں کے لیے ایک دنیا تشکیل دینے میں کردار ادا کیا۔علی گڑھ تحریک کو اس زاویے سے دیکھا جا سکتا ہے۔

یعنی ایک صورت 'پیروی مغربی' کی ہی جس میں نوآبادکار کی ہر سطح اور ہر مقام پر برتری طے شدہ ہوتی ہے۔ بظاہر یہ گروہ عقل پرست دکھائی دیتا ہے۔مگر ذہنی مغلوبیت کے بعد خود مختار حیثیت قائم رہنا ممکن نہیں رہتا۔نوآبادکار اپنی اور مقامی زبانوں کی ترویج پر خاصا زور دیتے ہیں۔فورٹ ولیم کالج کی پالیسی میں مقامی زبانوں کی ترویج شامل تھی۔اس گروہ کا مقصد مشرق شناسی تھا لیکن کچھ عرصے بعد کمپنی میں دوسرا گروہ غالب آجاتا ہے جس کا نمائندہ لارڈ میکالے تھا۔اس نے مقامی زبانوں کے بجائے انگریزی کو فروغ دیا۔ میکالے انگریزی زبان کے ذریعے تعلیم دینے کے حق میں تھے یعنی وہ انگریزی زبان کو Medium of Instruction بنانا چاہتے تھے۔انہوں نے کہا تھا کہ: *"A single shelf of a good European library was worth the whole native literature of India and Arabia."*۔اس کے نزدیک اس پالیسی کے دو نتائج برآمد ہوں گے: ایک کاروبار حکومت کے لیے افراد تیار ہوں گے، دوسرا ایسے ہندوستانی پیدا ہوں گے جو اپنی سوچ اور رویوں میں انگریزی ہوں گے۔ *"A class of people,Indian in blood and colour but English in tastes,in opinions,in morals and in intellect."*۔اس طرح معاشرے میں ثنویت کا دائرہ وسیع ہو جائے گا۔ظاہر ہے کہ اس پالیسی کے نتیجے میں کمپنی کو استحکام ملنا تھا۔مقامی باشندوں میں اس گروہ کی نمائندگی سرسید کر رہے تھے وہ لکھتے ہیں:

> ''اگر ہم اپنی اصل ترقی چاہتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی مادری زبان تک کو بھول جائیں۔ ہماری زبان یورپ کی اعلیٰ زبانوں میں سے انگلش یا فرینچ ہو جائے۔'' ۷۹

اس عہد کی سب سے توانا شخصیت سرسید کی ہے۔انہوں نے زبان، ادب، سیاست، معاشرت تعلیم غرض ہر شئے کو بدلتے ہوئے حالات کے مطابق دیکھا اور وسیع تر انقلاب کے خواہاں تھے۔انہوں نے جس طرح کا معاشرہ تشکیل دینا چاہتے تھے، ادب میں آپ کا خواب محمد حسین آزاد اور حالی نے پورا کیا۔

حالیؔ نے مقدمہ میں جس ادبی نظریہ سازی کو فروغ دیا اس میں بھی اردو شاعری اور اس کی جانچ

کے نئے معیار قائم کیے گئے اور باوجود اپنی مشرق پسندی کے شعوری اور غیر شعوری طور پر اسی ایجنڈے کے فروغ کا باعث بنے۔اس طرح کلاسکی ورثے کے خلاف مہم اپنے ہی بزرگوں نے چلائی۔ بالآخر ایک ایسی فضا قائم ہوگئی جس کے نتیجے میں ایسے ہندوستانی تعلیم یافتہ نوجوان پیدا ہوئے جو رنگ ونسل کے اعتبار سے ہندوستانی اور کردار اور روح کے اعتبار سے برطانوی سامراج کا نوآبادیاتی ماڈل تھے۔'شریف زادہ' میں عابد حسین کا کردار ایک ایسے تعلیم یافتہ ہندوستانی کا ہے۔ابوالکلام قاسمی لکھتے ہیں:

''برطانوی سامراج نے ہندوستانیوں کے ذہن کو ایسے مغربی رنگ میں رنگنے کا خواب دیکھا تھا کہ ان کی اپنی روایت ان کے لیے بے وقعت اور نا قابلِ تقلید بن جائے۔'' ۸۰

مقامی باشندوں میں دوسرا رویہ بغاوت کا ہوتا ہے۔اس رویے کا سامنا کرنے کے لیے نوآبادکار پہلے سے ہی تیار ہوتے ہیں اور یہ تیاری محض قوت کے بل بوتے پر نہیں ہوتی بلکہ دوررس نتائج حاصل کرنے کے لیے گہری تعلیمی وثقافتی پالیسیاں مرتب کی جاتی ہیں۔باغی گروہ مفاہمتی گروہ کی نسبت زیادہ دوراندیشی کا ثبوت دیتا ہے۔باغی گروہ تہذیب کی ظاہری چکا چوند اور ترقی سے مرعوب نہیں ہوتا۔لیکن اس گروہ کا بھی ایک حصّہ ظاہر پرست واقع ہوتا ہے اور نوآبادکار کی ہر شئے سے نفرت کا اظہار کرتا ہے جیسا کہ نذیر احمد 'ابن الوقت' کے آغاز ہی میں کہتے ہیں:

''ابن الوقت (بطور کردار) کی تشہیر کی بڑی وجہ یہ ہوئی ہے کہ اس نے ایسے وقت میں انگریزی وضع اختیار کی جب کہ انگریزی پڑھنا کفر اور انگریزی چیزوں کا استعمال ارتداد سمجھا جاتا تھا۔ابن الوقت جیسے ملامتی نہیں تو اس کے ہم خیال خال خال اور بھی چند مسلمان تھے جن کے لڑکے اکا دکا دہلی کالج میں پڑھتے تھے۔ان لڑکوں میں سے اگر کوئی عربی فارسی جماعتوں میں نکلتا اور آنکھ بچا کر پانی پی لیتا تو مولوی لوگ مٹکے تڑوا ڈالتے۔''۸۱

باغی گروہ کا دوسرا حصہ وسیع النظر تھا۔وہ نوآبادکار کی تہذیب کے شعائر کو علامت کی شکل میں دیکھتا تھا۔اس گروہ کے نمائندہ اکبرالہ آبادی ہیں۔یہاں اس بات کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ دادا بھائی نارو جی نے جو''ڈرین آف ویلتھ'' کا نظریہ دیا۔انہوں نے برطانوی حکومت کی پالیسیوں کو تنقید کا نشانہ بنایا اور کہا

کہ ہندوستان میں غریبی اور مفلسی کی وجہ یہ ہے کہ یہاں سے آمدانی کا ایک بڑا حصہ انگلستان کی تجوریوں میں چلا جاتا ہے ۔انہوں نے اپنی کتاب ''پورٹی اینڈ اَن برٹش رول ان انڈیا'' میں لکھا ہے: "He called the British rule as plundering,unrighteous,despotic,destructive and un-British." اسی طرح رمیش چندر دت نے اپنی کتاب ''دی اکونامک ہسٹری آف انڈیا'' میں برٹش راج کے متعلق لکھا ہے: " verily the moisture of India blesses and fertilises other lands."

انجذابی اور باغی گرہوں کے علاوہ ایک تیسرا نقطۂ نظر بھی سامنے آتا ہے جو آفاقی ہے۔نوآبادکار اور مقامی باشندوں کی دنیا میں جو ثنویت پر قائم ہوتی ہیں،قدرمشترک تلاش کی جاتی ہے۔آفاقی نقطۂ نظر کو دراصل انجذابی نقطۂ نظر کی ہی توسیع خیال کیا جائے تو بہتر ہے کیونکہ یہ نقطۂ نظر برابری کی بنیاد پر قائم نہیں کیا جاسکتا۔مثلاً جب سائنس کو کسوٹی مان کر مذہب کو پرکھا جائے تو برتری تو سائنس اور مادے کی ہی ثابت ہوئی۔دونوں دنیاؤں میں اشتراکات تلاش کیے جاتے ہیں لیکن اس سب کے باوجود مشرق مشرق رہتا ہے اور مغرب مغرب ۔سرسید دینیات اور ثقافت کے میدان میں اشتراکات تلاش کرنے کے باوجود بھی دونوں میں فرق اور افتراق کو کم نہیں کر سکے۔

ادھر ہندوستان میں غزل کے مقابلے پر نظم اور داستان کے مقابلے پر ناول کے لیے فضا ہموار کی گئی۔نظم کے سلسلے میں سرسید،آزاد اور حالی کی کوششوں کا ذکر ہو چکا ہے۔نظم اور ناول میں یہ خوبی ہے کہ یہ دونوں مخصوص نقطۂ نظر کے فروغ کے لیے بآسانی استعمال کی جاسکتی ہیں۔ابوالکلام قاسمی تحریر کرتے ہیں کہ انگریز سرکار نے ناول کے فروغ کے لیے باقاعدہ ترغیب دی:

> ''ان (ڈپٹی نذیراحمد) کو ناول لکھنے کی تحریک حکومت کی طرف سے انعام دیے جانے کے اعلان سے ملی۔اس لیے جس حد تک ان سے ممکن تھا انھوں نے حکومت کے ضابطے کے مطابق اپنی تحریروں کو ڈھالنے کی کوشش کی۔''۸۲

۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستانی سماج حاکم اور محکوم اور کالے اور گورے میں تقسیم ہوا اور محکوم تقسیم در تقسیم در ہوئے۔کسی بھی قوم پر طاقت سے غلبہ حاصل کرنے کے بعد اقتدار میں استحکام اور طوالت پیدا

کرنے کے لیے سیاسی ،سماجی ،ثقافتی ،تعلیمی نوعیت کے پروگرام ترتیب دیے جاتے ہیں ۔ایک طرف مراعات یافتہ طبقے اور دوسری طرف تعلیمی نظام کی بدولت ہندوستان میں ایسے خاندان اور افراد بڑی تعداد میں وجود میں آ گئے تھے جو اپنی تہذیب و تاریخ سے شرمندہ تھے اور مغربی تہذیب وفکر سے مرعوب ۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک بہت سے اردو تک بہت اردو ناولوں کا موضوع مغربی تہذیب وفکر کے اثرات ہے ۔ان میں خاص طور پر ڈپٹی نذیر احمد ،مرزا محمد ہادی رسوا ،قرۃ العین حیدر اور عزیز احمد قابل ذکر ہیں ۔یہاں ڈپٹی نذیر احمد کے ناول ''ابن الوقت'' کا مطالعہ نوآبادیاتی پس منظر میں کیا جا رہا ہے۔

اگرچہ ڈپٹی نذیر احمد کو ناول لکھنے کی تحریک حکومت کی طرف سے انعام دیے جانے کے بعد ملی ،مگر ان کا معاملہ دیگر ''ارکان خمسہ'' سے جدا تھا۔آپ کے ناولوں میں بظاہر دو متضاد باتیں یکجا ہیں۔ایک یہ کہ آپ برطانوی راج کو ہندوستان کے لیے ایک نعمت سمجھتے تھے اور دوسرا یہ کہ آپ مغربی تہذیب کو جزوی طور پر اپنی شرائط پر قبول کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اپنی ثقافتی اور ادبی ورثے کے بارے میں آپ کا رویہ حالی اور آزاد سے مختلف تھا۔آپ کے ناولوں میں مشرقی اور مغربی اقدار کی کشمکش دکھائی جاتی ہے اور یہ کہنا اتنا آسان نہیں ہوتا کہ آپ کا جھکاؤ کس طرف ہے ،مثلاً ابتداء میں محسوس ہوتا ہے کہ ابن الوقت مغربی فکر اور تمدن کے سامنے پسپائی اختیار کر رہا ہے مگر آخر میں اس کی شخصیت کا کھوکھلا پن واضح ہو جاتا ہے ۔اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ وہ ان معنوں میں نوآبادیاتی فکر کے آلہ کار نہیں بنے ۔مگر جب ہم نوآبادیاتی دور گزرنے کے بعد نذیر احمد کا جائزہ لیتے ہیں تو نوآبادیاتی فکر کی ترویج میں ان کا کردار واضح نظر آتا ہے ۔تاہم حالی اور آزاد کے برعکس آپ مغرب اور مشرق کی کشمکش کامیابی سے پیش کرتے ہیں ۔اس دور کا ہندوستان فکری اور جذباتی سطح پر دو حصوں میں تقسیم ہو رہا تھا۔آپ کے ہاں دو طرح کے کردار واضح ہیں ۔ایک وہ جو اپنے آپ کو بدلتی ہوئی صورت حال کے مطابق ڈھالتے ہیں ۔اس گروہ کی نمائندگی کلیم ،مبتلا اور سید ناظر کرتے ہیں ۔دوسرا گروہ پرانی اقدار سے چمٹا ہوا ہے ۔اس کی نمائندگی نصوح ،میر متقی اور حجتہ الاسلام کرتے ہیں ۔اس دور کے ہندوستان میں مغربی اور مشرقی اقدار میں تصادم کی صورت حال 'ابن الوقت' سے بہتر شائد ہی کہیں بیان کی گئی ہو ۔ناول کی پہلی ہی فصل سے اس تصادم کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔قدرے طویل اقتباس پیش کیا جا رہا ہے:

''ابن الوقت (بطور کردار) کی تشہیر کی بڑی وجہ یہ ہوئی کہ اس نے ایسے وقت میں انگریزی وضع اختیار کی جیسا کہ انگریزی پڑھنا کفر اور انگریزی چیزوں کا استعمال ارتداد سمجھا جاتا تھا۔دہلی کالج ان دنوں بڑے زوروں پر تھا۔ملکی لاٹ آئے اور تمام درسگاہوں کو دیکھتے بھالتے پھرے۔قدردانی ایسی کہ جس جماعت میں جاتے ، مدرس سے ہاتھ ملاتے ، بڑے مولوی ،صاحب نے طوعاً وکرہاً بادل نخواستہ آدھا مصافہ کیا تو سہی مگر اس ہاتھ کو عضو نجس کی طرح الگ تھلگ لیے رہے۔لاٹ صاحب کا منہ موڑنا تھا کہ بہت مبالغے کے ساتھ انگریزی صابن سے نہیں بلکہ مٹی سے رگڑ رگڑ کر اس ہاتھ کو دھو ڈالا۔سرکار بہ منزلہ مہربان باپ کے تھی اور بھولی بھالی رعیت بجائے معصوم بچوں کے۔انگریزی کا پڑھنا ہمارے بھائی بندوں کے لئے کچھ ایسا ناسزاوار ہوا جیسا آدم اور اس کی نسل کے حق میں گیہوں کا کھالینا۔انگریزی زبان انگریزی وضع کو اوڑھنا بچھونا بنایا تھا۔اس غرض سے کہ انگریزوں کے ساتھ لگاوٹ ہو مگر دیکھتے ہیں تو لگاوٹ کے عوض رکاوٹ ہے اور اختلاط کی جگہ نفرت ،حاکم ومحکوم میں کشیدگی ہے کہ بڑھتی چلی جاتی ہے۔دریا میں رہنا مگر مچھ سے بیر دیکھیں آخر کار یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔انگریزی اخباروں میں جس کے ایڈیٹر انگریز ہیں بابوانہ انگریزی کی ہمیشہ خاک اڑائی جاتی ہے۔ایک دوست ناقل تھے کہ ایک بار ان کو ایک انگریز سے ملنے کی ضرورت تھی ۔انھوں نے اپنے کانوں سے سنا کہ اندر بہت سے انگریز جمع ہیں اور ہندوستانیوں کی انگریزی کی نقلیں کر کر کے قہقہے لگا رہے تھے۔وہ دوست یہ بھی کہنے لگے کہ جس انگریزی کی ہنسی ہو رہی تھی بے شک وہ ہنسی کے قابل بھی تھی اور اہل زبان کو ہمیشہ دوسرے ملک والوں پر ہنسنے کا حق ہے۔مگر ہندوستانیوں کی انگریزی اگر ہنسنے کے قابل ہے تو اس کے مقابل میں انگریزوں کی اردو رونے کے لائق۔ساری ساری عمر ہندوستانی سوسائٹی میں رہتے ہیں اور پھر بھی وہی ول کیا مانگٹا۔انگریزی عمل داری نے ہماری دولت ،ثروت ،رسم ورواج لباس ،وضع طور طریقہ، مذہب ،تجارت ،علم ہنر ،شرافت سب چیزوں پر تو پانی پھیرا ہی تھا۔ایک زبان تھی اب اس کا بھی یہ حال ہے کہ اوپر انگریزوں نے بجز واقفیت کی وجہ سے اکھڑی اکھڑی ،غلط نا مربوط اردو بولنی شروع کی ،ادھر ہر عیب کہ سلطان بہ پسند و ہنر است ہمارے ہی بھائی بند لگے اس کی

تقلید کرنے ۔ایک صاحب کا ذکر ہے کہ اچھی خاصی ریش و بروت آغاز جوانی میں
ولایت گئے، چار پانچ برس ولایت رہ کرآئے تو ایسی سٹی بھولے کہ انگریزی اردو میں
بہ ضرورت کبھی بات کرتے تو رک رک کر اور ٹھہر ٹھہر کر اور آنکھیں میچ میچ کر جیسے کوئی
سوچ سوچ کر مغز سے بات اتارتا ہے۔''۸۳

اس اقتباس سے درج ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

الف۔۱۸۵۷ء میں سیاسی طور پر مغلوب ہونے کے بعد برصغیر میں مغربی تہذیب وتمدن کے خلاف شدید ردعمل تھا اور اس ردعمل میں انتہا پسندی کا عنصر بھی موجود تھا۔ایک انتہا پسندی نے دوسری انتہا پسندی کو جنم دیا ۔یہ ردعمل عوام اور خواص دونوں سطحوں پر موجود تھا۔ابتداء میں مغربی تہذیب کی ظاہری علامتوں مثلاً لباس نشست و برخاست اور دیگر طور طریقوں پر ہی شدید ردعمل تھا۔انگریزی پڑھنا کفر تصور ہوتا تھا۔انگریز سے کسی بھی نوعیت کا تعلق نا قابل برداشت تھا۔اس ردعمل کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہاں سیاسی زوال کے ساتھ تہذیبی زوال اس درجے کا نہیں ہوا کیونکہ یہاں تہذیب اور مذہب کی جڑیں بہت مستحکم ہیں۔اکبرالہ آبادی اس ردعمل کے نمائندہ ہیں۔ایک دوسری سطح پر دیوبند کی تحریک اپنے مقاصد کے اعتبار سے علی گڑھ تحریک کی ضد تھی۔اس نے فکری سطح پر نو آبادیاتی عزائم سمجھ کر افراد سازی کا کام شروع کیا۔

ب۔ڈپٹی نذیر احمد اگر چہ برطانوی اقتدار کو ہندوستان کے لیے ایک نعمت سے کم نہیں سمجھتے ،تاہم وہ ان کی ہر شے کو تسلیم نہیں کرتے ۔۱۸۵۷ء کے بعد جن مشرقی اور مغربی اقدار کا تصادم شروع ہوا تھا،نذیر احمد اس پر بے چین تھے۔وہ محسوس کر رہے تھے کہ وہ طبقہ جو انگریزی وضع اختیار کر رہا تھا وہ بھی انگریزوں کے ہاں مقام حاصل کرنے میں نا کام رہا۔

ڈپٹی نذیر احمد ابھی حتمی طور پر نہیں کہہ سکتے تھے کہ بالآخر اس کا کیا نتیجہ برآمد ہوگا۔ڈپٹی نذیر احمد حالی،آزاد اور اکبرالہ آبادی کا تعلق اس اولین نسل سے تھا جس کا انگریز سے ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی پڑا تھا ۔اس لیے اس نسل اور بعد کی نسلوں کے ردعمل میں فرق ہے۔اس ردعمل کے فرق کا جائزہ ایک علیحدہ مطالعہ کا تقاضا کرتا ہے۔

ج۔اردو زبان کے بگاڑ کے قصے میں ڈپٹی نذیر احمد کسی رورعایت سے کام نہیں لیتے ۔کم از کم یہاں وہ

برابری کی سطح پر آ کر بات کرتے ہیں ۔انگریزی عمل داری کے نتیجے میں ہندوستان کی دولت ،رسم ورواج ،تجارت ، مذہب علم و ہنر میں گراوٹ کو کسی حد تک ایک لازمی برائی کے طور پر قبول کرتے دکھائی دیتے ہیں ۔مگر جہاں اردو زبان کا معاملہ آتا ہے تو انگریزوں اور انگریز پرستوں پر چوٹ کرتے ہیں کہ اگر ہندوستانی انگریزی ٹھیک سے بول اور لکھ نہیں سکتے تو انگریزوں کی صورت حال اردو کے معاملے میں اور زیادہ خراب ہے ۔اسی طرح وہ ان لوگوں کو بھی ملامت کرتے ہیں جو مہذب بننے کے شوق میں اپنی زبان بھی بھلا بیٹھے ۔

ناول کی ساتویں فصل ''ایک ڈپٹی کلکٹر انگریزوں کی مدارت کا شاکی''، میں ایک ہندوستانی ڈپٹی کلکٹر اپنی دکھ بھری داستان سناتے ہیں ۔وہ انگریزوں اور ان کے ہندوستانی عملے کے توہین آمیز برتاؤ کے شاکی ہیں ۔ذہن میں رہے کہ یہ صاحب انگریز سرکار کا حصہ ہیں اور ڈپٹی کلکٹر ہیں ۔عام ہندوستانی سمجھتے ہیں کہ ان کے عہدے کے باعث وہ انگریزوں سے قربت رکھتے ہیں، ان سے برابری کی بنیاد پر برتاؤ کیا جاتا ہے ۔اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عام ہندوستانی اور کتے میں کیا فرق تھا : ''کتوں اور ہندوستانیوں کا داخلہ ممنوع ہے۔'' ابن الوقت کے ایک عزیز جو ڈپٹی کلکٹر ہیں، افسران بالا سے اپنی ملاقات کا حال بیان کرتے ہیں:

> ''اتنی مدت مجھے نوکری کرتے ہوئے اور چھوٹے بڑے صدہا انگریزوں سے میری معرفت ہے ۔مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں خوشی سے کبھی کسی انگریز سے ملنے گیا ہوں یا کسی انگریز سے مل کر میری طبیعت خوش ہوئی ہو ۔بڑے مؤدب مقطع بن کر ہاتھ باندھے، نیچی نظریں کیے ڈرتے ڈرتے ،دبے پاؤں کوٹھی کی طرف کو بڑھے ۔آخر نا چار ستون کی آڑ میں جوتیاں اتار کر ہمت کر کے بے بلائے اوپر پہنچے ۔کرسی نہیں ،مونڈھا نہیں ،فرش نہیں ،کھڑے سوچ رہے ہیں کہ کیا کریں؟ لوٹ چلیں ،پھر خیال آتا ہے کہ ایسا نہ ہو لوٹتے کو صاحب اندر آئینوں میں سے دیکھ لیں ۔غرض کوئی آدھ گھنٹے اسی طرح کھڑے سوکھا کیے ۔غرض بلائے گئے ،صاحب کو دیکھا تو پائپ منھ میں لیے ٹہل رہے ہیں ۔سر جھکائے کوئی کاغذ یا کتاب دیکھ رہے ہیں ۔اب کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی کہ کیوں کر ان کو خبر کروں کہ میں آیا کھڑا ہوں ۔شائد جان بوجھ کر کھڑا

رکھا ہو۔آخر آپ ہی سر اٹھایا۔ڈپٹی صاحب حاکم بالا دست ہوکر جو اتنی آؤ بھگت
کرے تو اس کا شکر گزار ہونا چاہیے۔صاحب نے بندہ نوازی میں کچھ کمی نہیں کی
،آنکھیں چار ہوتے ہی اپنے مقابل دوسری کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔کہنے کوتو کرسی پر
بیٹھا مگر حقیقت میں بید پر چوتڑ ٹیکے ہوں تو جیسے چاہو قسم لے لو۔کرسی پر بیٹھنا تھا کہ کم
بخت چپڑاسی نے پیچھے سے ہاتھ جوڑ کر کہا، خداوند سر شتہ دار حاضر ہیں۔'' ۸۴

اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انگریزی سرکار میں اہم عہدوں پر فائز بہت سے افراد بھی ملازمت نیم دلی سے کر رہے تھے اور وہ کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں تھے۔دوسرا یہ کہ حکمرانوں نے اپنے اور مراعات یافتہ طبقے کے بیچ بھی اتنا فاصلہ قائم کر رکھا تھا کہ قدم قدم پر انھیں حاکم اور محکوم میں تفریق سے سابقہ پڑا تھا ۔سرکاری عہدہ داران اور نوابین صاحب بہادر کے دربار میں سلام کے لیے حاضری دیتے اور گھنٹوں توہین آمیز انتظار کے بعد خوش قسمتی سے کبھی دیدار نصیب ہوتا اور سلام قبول ہوتا اور بعض اوقات تو چپراسی کی معرفت کہلوا دیا جاتا کہ سلام قبول ہے، اب تشریف لے جایئے۔

ایسے ہندوستانی افسران کا باہر کی دنیا میں بہت رعب و دبدبہ تھا حالانکہ یہ وہ افسران تھے جن کو حکام بالا کے اردلی بھی خاطر میں نہ لاتے تھے کیونکہ وہ ان کی اصلیت سے آگاہ تھے۔

مستشرقین کے انفرادی کام اور اداروں کے قیام کی بدولت ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی ہندوستانی ذہن پر یورپ کی برتری ثابت ہو چکی تھی۔مقامی کو ذہنی طور پر مغلوب کیے بغیر امپریل ایجنڈا کامیاب نہیں ہوسکتا ۔حتیٰ کہ یہ ثابت کر دیا گیا کہ ہم اپنی زبان، ثقافت اور تاریخ کی تفہیم کے لیے ان کے رحم و کرم پر ہیں۔ایک مرتبہ یہ چیز ذہن میں بیٹھنے کے بعد ہم ہر اس تصور اور نظر کو ایک نعمت سمجھیں گے جو مغرب سے آئے۔نوبل صاحب بہت گہرے آدمی ہیں۔انھوں نے جنگ آزادی کو آنکھوں سے دیکھا ہے۔وہ ہندوستانی مزاج کے آشنا ہیں۔امن قائم ہونے کے بعد دور اندیش نوبل صاحب نے مسلمانوں کی تربیت کے لیے ابن الوقت کو بطور ایک مصلح دیکھا۔وہ ابن الوقت کو مصلح کا کردار ادا کرنے کے لیے قائل کرتے ہیں اور جن دلائل سے کام لیتے ہیں وہ حسبِ ذیل ہیں:

''آپ کو یورپ جانے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن اگر آپ گئے ہوتے تو آپ پر ثابت
ہو جاتا کہ اہل یورپ کی عظمت سلطنت میں نہیں ہے بلکہ ان کی تمام عظمت ان علوم

میں ہے جو جدید ایجاد ہوئے ہیں اور ہوتے جاتے اور جن علوم کے ذریعے سے انھوں نے ریل اور تار برقی اور اسٹیمر اور ہزار ہا قسم کی بکار آمد کلیں بنا ڈالی ہیں۔ ہندوستانیوں کے پنپنے کی اگر کوئی تدبیر ہے تو یہی کہ ان میں علومِ جدید کو پھیلایا جائے اور ان کو اس بات کی طرف متوجہ کیا جائے کہ اپنی تمام قوت عقلی واقعات میں صرف کریں ۔تمام علوم جدیدہ جن پر ملّی ترقی کا انحصار ہے انگریزی میں ہیں ۔سب سے پہلے زبان انگریزی کو رواج دینا ہوگا ۔اس کا علاوہ انگریزی زبان کے رواج دینے سے ایک غرض تو علوم جدیدہ کا پھیلاؤ ہے اور دوسری غرض اور بھی ہے یعنی عموماً انگریزی خیالات کا پھیلانا اکیلے علوم جدیدہ سے کام چلنے والا نہیں ۔ جب تک خیالات میں آزادی ،ارادے میں استقلال ،حوصلے میں وسعت ، ہمت میں غلو،دل میں فیاضی اور ہمدردی، بات میں سچائی ،معاملات میں راست بازی یعنی انسان پورا پورا جنٹلمین نہ ہو اور وہ بدون انگریزی جاننے کے نہیں ہوسکتا۔انگریزی دان آدمی کو اخباروں اور کتابوں کے ذریعے سے انگریزی خیالات پر آگہی بہم پہنچانے کے بڑی آسانی ہوسکتی ہے۔رفارم جس کی ضرورت ہندوستان کو ترقی کے لیے ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ہندوستانیوں کو انگریز بنایا جائے ۔خوراک میں ،پوشاک میں ،زبان میں ،طرزِ تمدن میں ،خیالات میں ہر ایک چیز میں اور وقت اس کے لیے چپکے چپکے کوشش کر رہا ہے مگر اس کی کوشش دھیمی ہے اور اس پر نتیجے کا مرتب ہونا دیر طلب ،لوگوں کے دلوں میں خود بخود اس طرح کے خیالات بہ تقاضائے وقت پیدا ہو چلے ہیں۔کوئی رفارمر کھڑا ہو کر اس جلتی ہوئی آگ کو جلد سے بھڑکا دے۔'' ۸۵

نوبل صاحب ایسے اقدامات کرنے کے خواہاں ہیں جن سے ہندوستان میں برطانوی حکومت کو طوالت اور استحکام نصیب ہو۔وہ لارڈ میکالے کے پیروکار نظر آتے ہیں ،دوررس نتائج کے حصول کے لیے انگریزی زبان اور تہذیب کو فروغ دینا چاہتے ہیں ۔وہ چاہتے ہیں کہ یہ بات ایک تحریک کی شکل اختیار کرے اور یہ تحریک خود ہندوستانیوں کے اندر سے اٹھے ۔نوبل صاحب کے عزائم وہ امپیریل ایجنڈا ہے جو نوآبادکاروں نے رفتہ رفتہ مختلف ذرائع کے ذریعے سے پھیلایا۔

یہ بات واضح ہے کہ اس آئیڈیالوجیکل ادارے کے بغیر طاقت کے بل بوتے پر حاصل کردہ نتائج

کو زیادہ عرصہ قائم نہیں رکھا جاسکتا۔نوبل صاحب جس قسم کے 'جنٹلمین' کو وجود میں لانا چاہتے ہیں حالی اور آزاد بھی اس کوشش میں ان کے ہم نوا ہیں اور یہ وہی 'جنٹلمین' ہے جو ہادی رسوا نے عابد حسین کی شکل میں تخلیق کیا ہے۔یعنی مغرب کی ریل کے سامنے بالکل بجھ گئے اور کلیں دیکھ کر اوسان خطا ہو گئے۔نوبل صاحب کے بقول انگریزی زبان اور خیالات کے پھیلنے سے جو جنٹلمین وجود میں آئے گا وہ درج ذیل خصوصیات کا حامل ہوگا: آزاد خیال ہوگا، پختہ ارادے کا مالک ہوگا، عالی حوصلہ ہوگا، باہمت ہوگا، فیاض ہوگا، ہمدرد اور سچا ہوگا، معاملات میں صاف ہوگا۔اور یہ وہ حقائق ہیں جو انسان میں انگریزی جانے بغیر پیدا ہونا محال ہے۔نوبل صاحب کہتے ہیں کہ وقت اس طرح کے 'جنٹلمین' کے ظہور کے لیے بے تاب ہے اور چپکے چپکے کوشش کر رہا ہے، نوبل صاحب اچھی طرح سمجھتے ہیں اگر چہ ابن الوقت نہیں سمجھتے، کہ یہ چپکے چپکے کوشش کتنے عرصے سے ہو رہی تھی۔یہ کوشش دراصل سامراجی ایجنڈا ہے اور جس کے لیے رسمی اور غیر رسمی ادارے بھی وجود میں آئے اور بہت سی تحریکیں اٹھیں۔یہ اسی کوشش کا ہی ثمر ہے کہ ہم اکیسویں صدی میں بھی جدید نوآبادیاتی دور میں رہ رہے ہیں۔ہمارے وہ اکابر جنھوں نے دانستہ یا نادانستہ امپیریل ایجنڈے کو فروغ دیا، ہم ان کے اخلاص پر شک نہیں کر سکتے۔اس دور کے معروضی حالات کو بھی نظر میں رکھنا ضروری ہے۔۱۸۵۷ء کے بعد مختلف ردعمل سامنے آئے اور مختلف حکمت عملیاں وضع کی گئیں جن میں سے ایک حکمت عملی علی گڑھ کی تحریک کی صورت میں یہ بھی تھی۔

ناول کی نویں فصل میں ابن الوقت کی تبدیلی وضع کا حال بیان کیا جاتا ہے۔نوبل صاحب کا ایک ملازم جاں نثار، تبدیلی وضع کے سلسلے میں ابن الوقت کو قیمتی مشوروں سے نوازتا ہے۔امکان ہے کہ ایسا کرنے کو خود نوبل صاحب نے کہا ہے۔جاں نثار اسم بامسمٰی ہے۔ہر وقت انگریزوں کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔اس کے بقول انگریزوں کے برے بھی ہمارے اچھوں سے اچھے اور بہت اچھے ہیں۔ابن الوقت رفارمر بننے کے لیے رضا مند ہو گئے ہیں، لیکن جاں نثار کا مشورہ ہے کہ حلیہ بدلا جائے تاکہ انگریزوں کی ان سے اجنبیت ختم ہو۔اس موقع پر جاں نثار اور ابن الوقت میں اہم مکالموں بھی خالی از دلچسپی نہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد خود اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک اہم بات کہتے ہیں کہ اس میں نوبل

صاحب کا کوئی قصور نہیں تھا۔ابن الوقت میں اپنی قوم اور قوم کی ہر چیز کی حقارت اور انگریز اور ان کی ہر بات وقعت پہلے سے اس کے ذہن میں مرتکز تھی ۔مراد یہ کہ رفارمر کا کردار ادا کرنے کے لیے ابن الوقت کا انتخاب خواہ مخواہ نہیں کیا گیا۔لیکن سوال یہ ہے کہ اس کے دل میں اپنی قوم کی حقارت اور انگریز کی عظمت کس طرح بیٹھ گئی ۔ یہ وہی 'چپکے چپکے کی کوشش' تھی ۔ وہ جوان تھا اور یہ وہ نسل تھی جس پر انگریزی تعلیم اور تہذیب کا جادو اپنا رنگ دکھا چکا تھا۔اس کا خیال تھا کہ ظاہری وضع قطع میں تبدیلی سے انگریز اسے اپنی سوسائٹی میں قبول کر لیں گے،مگر کچھ عرصے بعد اس کی یہ بات خام خیالی ثابت ہوتی ہے۔ابن الوقت اپنی پوری توانائیاں انگریزی آدابِ معاشرت سیکھنے میں صرف کرتے ہیں۔وہ کوّے کی طرح ہنس کی چال چل رہے تھے۔اگرچہ نذیر احمد کی ہمدردیاں ابن الوقت کے ساتھ ہیں مگر یہاں وہ اسے بطور مضحکہ خیز کردار پیش کرتے ہیں:

> ''ابن الوقت نے آئینے میں دیکھا تو اپنے تئیں انگریزوں کے ساتھ پایا۔بے اختیار تن کر کپڑے بدلنے کے کمرے میں لگا پینترے بدلنے ۔جاگا تو ہوا خوری کے کپڑے بدل باہر نکل گیا۔ڈنر کے بعد تیاری شروع ہوئی ، کچہری نہیں ،دربار نہیں ،کوئی پارٹی نہیں ،اس پر بھی دن کے گیارہ بجے سے لے کر اب یہ تیسری دفعہ ہے کہ انگریزی تہذیب کپڑے بدلنے کی متقاضی ہے۔'' ۸۶

ابن الوقت کے انگریزی وضع اختیار کرنے کے بعد نوبل صاحب ان کے اعزاز میں کھانا دیتے ہیں جس میں بڑی تعداد میں انگریز مدعو ہیں ۔ یہاں ابن الوقت کو بطور رفارمر متعارف کروانا مقصود تھا ۔کھانے کے بعد ابن الوقت ایک طویل تقریر کرتے ہیں جس کے چند نکات اہم ہیں:

> ''غرض ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلاط کا یہ نتیجہ ضرور ظاہر ہوا ہے کہ ایک دوسرے سے وحشت باقی نہیں رہی ۔اور پھر بھی میں اس کو اتحاد کے درجے میں نہیں سمجھتا۔دونوں کے دل بدستور ایک دوسرے سے پھٹے ہوئے ہیں ۔آج کوئی بھڑکانے والا کھڑا ہو تو مسلمانوں کے نزدیک ہندو ویسے ہی کافر اور مشرک ہیں اور ہندوؤں کی نظر میں مسلمان ویسے ہتیارے بھرشٹ اور یہ نااتفاقی گورنمنٹ کے حق میں ایک فال مبارک اور شگون نیک ہے مگر وہیں تک کہ باہم رعایا میں ہو۔'' ۸۷

وہ کہتے ہیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو آپس میں کبھی بھی لڑایا جا سکتا ہے اور رعایا کی اس نااتفاقی کو انگریزی حکومت کے لیے نیک شگون گردانتے ہیں۔ یہ بات بہت معنی خیز ہے۔ ابن الوقت 'لڑاؤ اور حکومت' کی پالیسی کا عندیہ دے رہے ہیں۔ یہاں وہ صحیح معنوں میں امپریل ایجنڈے کا آلہ کار دکھائی دیتے ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ موقع محل کی مناسبت سے انگریزوں کے دل کی بات کر رہے ہوں۔ مگر ایک ہندوستانی کی زبان سے ایسی بات کا نکلنا باعث شرم ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں تفریق کو بڑھانا اور بڑھا چڑھا کر پیش کرنا برطانوی حکومت کی حکمت عملی کا تقاضا تھا۔ یہ وہی ہندوستان تھا جہاں مسلمانوں نے اقلیت میں ہونے کے باوجود سینکڑوں برس حکومت کی اور اب اتنی بڑی تعداد میں ہونے کے باوجود وہ اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھ رہے تھے۔ یہ تفریق پیدا کرنے میں، خاص طور پر لسانی سطح پر ایشیاٹک سوسائٹی اور فورٹ ولیم کالج جیسے اداروں کا بھی کردار ہے ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد برطانوی سرکار کے لیے سب سے بڑا خطرہ تھا، لہذا لسانی، مذہبی اور ثقافتی سطح پر ان میں موجود فرق کو مزید پاٹا گیا جس کے ٹھوس شواہد موجود ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد ابن الوقت میں ہونے والی ظاہری، ذہنی اور قلبی تبدیلیوں کا باریک بینی سے جائزہ لیتے ہیں۔ تیرہویں فصل کا عنوان ہے: ''انگریزی وضع کے ساتھ اسلام کا نبھنا مشکل ہے۔'' نذیر احمد شعائر اسلامی کی اہمیت دل و جان سے جانتے تھے۔ اس فصل میں وہ بتاتے ہیں کہ کس طرح انگریزی وضع اور طور طریقے اپنا رنگ دکھانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ یہ وہی بات ہے جو اکبر نے کہی تھی کہ:

؎ دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے ۸۹

ڈپٹی نذیر احمد انگریزی وضع اور طور اطوار کو اسلام کی ضد گردانتے ہیں کہ دونوں کو ایک ساتھ نہیں چلایا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ جوں جوں ابن الوقت انگریزی معاشرت کا حصہ بنتے گئے توں توں وہ مذہب سے دور ہوتے گئے۔ یقیناً اس کا ایک پہلو خود ابن الوقت کے کردار کی کمزوری بھی ہے لیکن تنہا فرد پر معاشرت بالآخر غلبہ پا ہی لیتی ہے، جیسا کہ ہوا:

''پھر اکثر اتفاق پیش آجاتا تھا کہ ابن الوقت اپنے پرائیوٹ روم میں نماز پڑھ رہا ہے

اور کوئی صاحب اس کی کچہری میں آنکلے اور اجلاس خالی دیکھ کر واپس چلے گئے یا نماز کا وقت ہے اور انگریزوں نے آگھیرا ہے ۔ان کو چھوڑ کر جا نہیں سکتے یا کوئی صاحب کچہری برخاست کر کے جانے لگا تو ابن الوقت کے پاس سے ہو کر نکلا کیوں مسٹر ابن الوقت ؟ ہوا خوری کو چلتے ہو یا چلو ذرا بلیرڈ کھیلیں ۔ یہ اور اس طرح کے دوسرے اتفاقات ہر روز پیش آتے تھے اور نماز کا انتظام ممکن نہ تھا کہ باقی رہ سکے ۔غرض نماز پر تو انگریزی سوسائٹی کا اثر یہ دیکھا کہ پہلے وقت سے بے وقت ہوئی ۔پھر نوافل، پھر سنن جا کر نرے فرض رہے ۔پھر جمع بین العصرین والمغربین شروع ہوا پھر قضائے فائتہ پھر بالکل چٹ ۔کھانے پینے میں احتیاط کے باقی رہنے کا کوئی محل ہی نہیں تھا۔ابن الوقت کو انگریزوں کے پرچانے کی پڑی تھی اور وہ بے شراب کے پرچ نہیں سکتے تھے۔''۹۰

انسان پر تعلیم ،صحبت اور معاشرت کے اثرات کسی نہ کسی طور حاوی ہو کر ہی رہتے ہیں ۔اسی لیے ۱۸۵۷ء سے قبل ہی انگریزی زبان ،تعلیم اور معاشرت کے پھیلاؤ کی منظّم کوشش سامنے آچکی تھیں اور ۱۸۵۷ء کے بعد ان کوششوں میں تیزی آگئی اور اعتماد بڑھ گیا۔اس ضمن میں سب سے کامیاب تحریک علی گڑھ کی تھی جو تعلیم ، مذہب اور معاشرت کو محیط تھی ۔'ارکان خمسہ' کسی نہ کسی طور اسی تحریک سے وابستہ تھے ۔ایسا نہیں کہ ان میں سے کسی کو بھی ہم ابن الوقت پر قیاس کریں؟ یہ تمام افراد اپنی وضع اور اطوار میں خالص ہندوستانی تھے اور ہر تحریک کی طرح یہ تحریک بھی اپنے اندر مثبت اور منفی رجحانات لیے ہوئے تھی۔

ابن الوقت کی نئی وضع اور جدید خیالات کو معاشرے میں پذیرائی نہ مل سکی ۔انھیں جگہ جگہ خفت اٹھانا پڑی ،آہستہ آہستہ انگریز بھی ان سے بدظن ہوتے گئے ۔ناول کے ایک اور کردار حجتہ الاسلام کا جائزہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ۔ابتداء میں محسوس ہوتا ہے کہ ابن الوقت کے پردے میں نذیر احمد بول رہے ہیں ۔مگر بہت جلد وہ نذیر احمد کے طنز کا نشانہ بنتے نظر آتے ہیں ۔حجتہ الاسلام کو ابن الوقت کی طرز زندگی اور خیالات پر سخت اعتراضات ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ انھیں اس میں بھی شبہ نہیں کہ انگریز سرکار ہندوستان کے لیے ایک نعمت ہے ۔انھیں نذیر احمد کا نمائندہ کہا جا سکتا ہے ۔اس ناول کو ایک ایسی دستاویز کے طور پر بھی دیکھا جا سکتا ہے جس میں ۱۸۵۷ء کے بعد کا ابتدائی دور محفوظ ہو گیا ہے ۔نوآبادکاروں کے عزائم اور

مقامی باشندوں کا مختلف طرح کا ردعمل اس میں موجود ہے۔ ہندوستان پر مغربی تعلیم اور تہذیب کے کیا اثرات مرتب ہوں گے۔ حاکم اور محکوم کا تعلق کس نوعیت کا ہوگا اور مقامی باشندوں کی آپس کی گروہ بندیاں کیا صورت اختیار کریں گی یہ اور اس طرح کے سوالات پیدا ہو چکے تھے لیکن جواب بعد کے دور میں ملے۔ناول کے جائزے کو ابوالکلام قاسمی کی اس رائے پر ختم کیا جاتا ہے:

''اس ناول میں ابن الوقت کا کیریکٹر تمسخر کا انداز اختیار کرنے کے باعث نوآبادیاتی فکر کے معاملے میں نذیر احمد کے تحفظات کو نمایاں کرتا ہے۔اس طرح اپنے بعض دوسرے ناولوں میں بھی نذیر احمد نوآبادیاتی فکر سے کبھی مغلوب ہونے اور کبھی مزاحمت کا انداز اختیار کرنے کا تاثر دیتے ہیں، مگر جب وہ ہندوؤں کے مقابلے میں برطانوی سامراج کو ترجیحی نگاہ سے دیکھتے ہیں تو ان کا یہ خوف ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہتا کہ صدیوں سے حکمرانی کرنے والا مسلمان اس اندیشے میں مبتلا رہتا ہے کہ کہیں اس پر ہندو حکمران نہ ہو جائے اس لیے اہل کتاب کی حکمرانی ان کو بسا غنیمت اور خدا کی رحمت معلوم ہوتی ہے۔اس لیے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہو کہ نوآبادیاتی فکر جزوی طور پر سہی قبول کرنے اور فروغ دینے کے معاملے میں نذیر احمد کا رول بھی خاص غور طلب ہے۔''۹۱

ڈپٹی نذیر احمد کے ساتھ ساتھ سرسید، آزاد اور حالی کے معاصرین اور متاخرین میں یوں تو کئی اور ایسے نام لیے جا سکتے ہیں جن کی تحریروں نے نوآبادیاتی فکر کو مستحکم کرنے اور اس کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا، مگر ان کے ساتھ ہی ایسے قلم کاروں کی تعداد کچھ کم نہیں جنھوں نے لگاتار مزاحمت کا انداز اختیار کیے رکھا۔

سرسید احمد خاں، محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالی نے اردو کی شعری و ادبی نظریہ سازی کے ذریعہ اردو زبان وادب کی جو خدمت انجام دی اس کی اساسی اور غیر معمولی اہمیت کے باوصف ان کی تحریروں کے ان محرکات کی نشان دہی، جو برطانوی نوآبادکاری کا حصہ تھے، اردو کی کلاسیکی شعریات کی بازیافت کے لیے ضروری ہو گیا ہے۔اس سلسلے میں ان کے معاصر ڈپٹی نذیر احمد کی تحریریں بھی نوآبادیاتی فکر کی طرف ہندوستانی ردعمل کا ایک دلچسپ نقشہ پیش کرتی ہیں۔ڈپٹی نذیر احمد نے تفسیر لکھی، لکچر دیے اور اردو میں ناول کی روایت استوار کرنے میں اساسی کردار ادا کیا۔واضح رہے کہ ایڈورڈ سعید نے مغرب میں

پروردہ ناول کی صنف کو ہی اسلامی تصورِ کائنات کے منافی ثابت کیا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد برطانوی اقتدار کو ہندوستانی کے لیے خدا کی رحمت تصور کرتے ہیں، مگر چوں کہ انہوں نے ادبی اظہار کے لیے ایسی مغربی صنف نثر کا انتخاب کیا جس کی روایت سوائے داستانوں کے اردو میں نہ ہونے کے برابر تھی۔ شاید اسی لیے انہوں نے اپنے ادبی سرمائے کی تحقیر کا رویہ اختیار نہیں کیا۔ مگر قصہ نگاری کے تعلیمی اور سماجی مقاصد کا بار بار ذکر کرنے کے باوجود بھی اس فکر کے منفی اثرات سے اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھ سکے۔ ان کو ناول لکھنے کی تو تحریک حکومت کی طرف سے انعام دیے جانے کے اعلان سے ملی۔ اس لیے جس حد تک ان سے ممکن تھا انہوں نے حکومت کے ضابطے کے مطابق اپنی تحریروں کو ڈھالنے کوشش کی تاہم وہ آسانی سے نوآبادیاتی تہذیب کی کلی برتری کو قبول کرنے پر آمادہ نظر نہیں آتے۔ وہ اپنے ناولوں میں سماجی مسائل کی مرکزیت ضرور قائم رکھتے ہیں، مگر ساتھ ہی کرداروں اور مکالموں کی مدد سے اس ساری کشمکش کو بھی پیش کرنے کی کرتے ہیں جس میں وہ خود کو بحیثیت مصنف مبتلا و معلق پاتے ہیں۔ وہ توبتہ النصوح میں نصوح اور کلیم کے کردار کے وسیلے سے مشرقی اقدار اور نئی مغربی فکر کے تصادم کو نمایاں کرتے ہیں اور شاید نہ چاہتے ہوئے بھی مغربی اقلیت پسندی اور آزادیٔ خیال کے نمائیدہ کردار کلیم کو زیادہ فعال، زیادہ توانا اور مستقبلیت کا نمائندہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اپنی صفات کے اعتبار سے نصوح مشرقی طرزِ فکر کی اور کلیم نوآبادیاتی فکر کی نمائندگی کرتا ہے اور ناول پڑھتے ہوئے توبتہ نصوح کا کردار نیم خودسوانحی کردار ہونے کا بھی تاثر دیتا ہے مگر ناول کے انجام کے طور پر کلیم کی پسپائی نوآبادیاتی فکر کی پسپائی نہیں بن پاتی بلکہ اس کرادر کو ایک طرح کے المیاتی ہیرو جیسا ارتفاع مل جاتا ہے اسی طرح نذیر احمد کے ناول ابن الوقت میں ابن الوقت کا کردار دوسرے کردار نوبل کا وہ مثالی آدمی بنتا ہوا دکھایا گیا ہے جو نوآبادیاتی فکر کی سطحیت کی نمائندگی کرتا ہوا بھی معلوم ہوتا ہے، جب کہ اس کے بالمقابل حجتہ الاسلام کا کردار مشرقی اقدار یا مذہب کا نمائندہ ہے اس ناول میں ابن الوقت بقول ابوالکلام قاسمی کا کیریکچر تمسخر کا انداز اختیار کرنے کے باعث نوآبادیاتی فکر کے معاملے میں نذیر احمد کے تحفظات کو نمایاں کرتا ہے۔ اسی طرح اپنے دوسرے ناولوں میں بھی نذیر احمد نوآبادیاتی فکر سے کبھی مغلوب ہونے اور کبھی مزاحمت کا انداز اختیار کرنے کا تاثر دیتے ہیں۔

☆☆☆

## حوالہ جات


۱۔مولوی بشیر احمد، مرتبہ لکچروں کا مجموعہ، لکچر نمبر ۱۵، جلد اوّل ۔ص ۲۸۱

۲۔ پروفیسر افتخار احمد صدیقی، مقدمہ فسانۂ مبتلا ۔ص ۳۸

۳۔سید خواجہ حسینی، نذیر احمد اور ابن الوقت ۔ص ۳۱

۴۔لکچروں کا مجموعہ، حصّہ اوّل، لکچر نمبر ۱۱ ۔ص ۲۸۱

۵۔ ڈپٹی نذیر احمد، ابن الوقت، ص ۸۵

۶۔ لکچروں کا مجموعہ، لکچر نمبر ۱۶، جلد اول ۔ص ۴۱۲

۷۔ لکچروں کا مجموعہ، لکچر نمبر ۳۶، جلد دوم ۔ص ۲۹۹

۸۔ لکچروں کا مجموعہ، لکچر نمبر ۱۱، جلد اول ۔ص ۲۶ ۔۲۷

۹۔ لکچروں کا مجموعہ، لکچر نمبر ۱۲، جلد اول ۔ص ۳۲

۱۰۔ لکچروں کا مجموعہ، لکچر نمبر ۱۱ جلد اول، ص ۴۲۳

۱۱۔ ڈپٹی نزیر احمد، ابن الوقت ۔ص ۱۴۷

۱۲۔عبداللہ یوسف علی، انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ ۔ص ۱۵۹۔۱۶۰

۱۳۔محمد عارف ڈاکٹر، پروفیسر، اردو ناول اور آزادی کے تصورات ۔ص ۲۵

۱۴۔ایضاً، ص ۳۰۲

۱۵۔ ڈپٹی نذیر احمد، ابن الوقت، مرتبہ سبط حسن ۔ص ۱۲۹

۱۶۔ ڈپٹی نذیر احمد، مراۃ العروس مشمولہ مجموعہ ڈپٹی نذیر احمد ۔ص ۹۳۵

۱۷۔ ڈپٹی نذیر احمد، بنات النعش مشمولہ مجموعہ ڈپٹی نذیر احمد ۔ص ۵۸۷

۱۸۔ ڈپٹی نذیر احمد، مراۃ العروس مشمولہ مجموعہ ڈپٹی نذیر احمد ۔ص ۹۲۵

۱۹۔ایضاً، ص ۹۶۷ ۔۔۔ ۲۰۔ ایضاً ۔ص ۹۷۷

۲۱۔ ڈپٹی نذیر احمد، ابن الوقت، مرتبہ سبط حسن، ص ۲

۲۲۔ایضاً،ص۱۰۲ ۲۳۔ ایضاً۔ص۱۰۲

۲۴۔ایضاً،ص۱۱۵ ۲۵۔ ایضاً۔ص۱۲۸

۲۶۔ڈپٹی نذیر احمد،فسانۂ مبتلا،مرتب پروفیسر افتخار احمد صدیقی،ص۱۱۳

۲۷۔ڈپٹی نذیر احمد،ابن الوقت مرتبہ سبط حسن،ص۱۳۴

۲۸۔ایضاً،ص۱۳۹ ۲۹۔ ایضاً،ص۱۳۹

۳۰۔ڈپٹی نذیر احمد،مراۃ العروس مشمولہ مجموعہ ڈپٹی نذیر احمد،ص۸۰۴

۳۱۔ایضاً،ص۸۰۴

۳۲۔ڈپٹی نذیر احمد،فسانۂ مبتلا مرتب پروفیسر افتخار احمد صدیقی،ص۱۷۸

۳۳۔ایضاً،ص۱۷۸

۳۴۔نذیر احمد،مرأۃ العروس۔ص۱۳۲

۳۵۔افتخار عالم بلگرامی،حیات النذیر۔ص۱۳۹

۳۶۔مظہر مہدی،اردو دانشوروں کے سیاسی میلات۔ص۱۳

۳۷۔بحوالہ شمیم حنفی،اردو کلچر اور تقسیم کی وراثت۔ص۱۸۶

۳۸۔پروفیسر قاضی جمال حسین،اردو ادب کا تہذیبی اور فکری پس منظر۔ص۱۷۴

۳۹۔بحوالہ محمد حسن عسکری،ستارہ یا بادبان۔ص۱۰۴۔۱۰۳

۴۰۔پروفیسر قاضی افضال حسین،داستان کی نئی قرأت۔ص۴۱

۴۱۔پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی،ہندوستان میں سماجی اصلاح کی تحریکات۔ص۱۹۔۱۸

۴۲۔بحوالہ عقیل احمد صدیقی،نذیر احمد اور کولونیل ڈسکورس کی مزاحمت۔ص۹۴

۴۳۔سید افتخار عالم بلگرامی،حیات النذیر۔ص۵۶۵

۴۴۔ناصر عباس نیر،معنی واحد اور معنی اضافی کی کشمکش،مشمولہ فکر و نظر سہ ماہی،مارچ ۲۰۱۴۔ص۲۳

۴۵۔ڈپٹی نذیر احمد،مرأۃ العروس۔ص۱۲۳

۴۶۔نذیر احمد،مرأۃ العروس۔ص۲۰

۴۷۔ایضاً،ص۱۹۳

۴۸۔ڈپٹی نذیر احمد، بنات النعش۔ص۳۰

۴۹۔ایضاً،ص۱۲۰
۵۰۔ایضاً،ص۱۰۷۔۱۰۶

۵۱۔ایضاً،ص۱۳۰
۵۲۔ایضاً،ص۱۳۵

۵۳۔ایضاً،ص۱۳۷
۵۴۔ایضاً،ص۱۳۸

۵۵۔بحوالہ شمیم حنفی،اردو کلچر اور تقسیم کی وراثت۔ص ۱۸۶

۵۶۔ڈپٹی نذیر احمد،ابن الوقت۔ص۲۵۵۔۲۵۴

۵۷۔ایضاً،ص۲۵۲

۵۸۔فرانز فینن ،افتادگان خاک۔ص۱۴۔۱۳

۵۹۔ڈپٹی نذیر احمد،ابن الوقت۔ص۱۴۸

۶۰۔ایضاً،ص۱۳۸

۶۱۔محمد نذیر احمد ڈپٹی کلکٹر، دیباچہ توبتہالنصوح۔ص۸۷

۶۲۔محمد نذیر احمد ڈپٹی کلکٹر،توبتہ النصوح۔ص۸۷

۶۳۔ایضاً،ص۱۳
۶۴۔ایضاً،ص۲۰۸

۶۵۔ایضاً،ص۲۰۷

۶۶۔محمد نعیم،اردو ناول اور استعماریت۔ص۵

۶۷۔ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی،شعورِفن،ص۱۸۴

۶۸۔ڈاکٹر علمدار حسین بخاری،نوآبادیاتی ڈسکورس اور فکشن : مماثلتیں اور امتیازات معیار شمارہ ۸،۔ص۱۷

۶۹۔ڈاکٹر سہیل بخاری،اردو ناول نگاری۔ص۴۹

۷۰۔ڈپٹی نذیر احمد،ابن الوقت۔ص۴۸

۷۱۔ایضاً،ص۹۰

۷۲۔ڈپٹی نذیر احمد،فسانۂ مبتلا۔ص ۳۵

۷۳۔ڈپٹی نذیر احمد،ابن الوقت ۔ص ۳۱

۷۴۔ڈاکٹر علمدار حسین بخاری ، برصغیر میں جدید ادب کا سماجی تناظر اور نیا متوسط طبقہ،مشمولہ تخلیقی ادب ،شمارہ ۹۔ص ۲۱۸

۷۵۔نذیر احمد،مراۃ العروس۔ص ۸۶

۷۶۔ایضاً،ص ۱۵۵

۷۷۔دیوندر اسر،نئی صدی اور ادب ۔ص ۱۳۵

۷۸۔ایڈورڈ سعید،ثقافت اور سامراج مترجم یاسر جواد۔ص ۶۱

۷۹۔ڈاکٹر ناصر عباس نیر،نوآبادیاتی صورت حال مشمولہ لسانیات اور تنقید۔ص ۲۴

۸۰۔مشتاق حسین ،سر سید احمد خان،خطوط سر سید احمد خان۔ص ۱۸۔۱۷

۸۱۔ابوالکلام قاسمی،نوآبادیاتی فکر اور اردو کی ادبی وشعری نظریہ سازی۔ص ۱۸۸،ص ۱۹۷

۸۲۔ڈپٹی نذیر احمد،ابن الوقت،ص ۵

۸۳۔ابوالکلام قاسمی ،نوآبادیاتی فکر اور اردو کی ادبی وشعری نظریہ سازی مشمولہ مابعد جدیدت ،اطلاقی جہات۔ص ۱۹۶

۸۴۔ڈپٹی نذیر احمد،ابن الوقت ۔ص ۹۔۵

۸۵۔ایضاً،ص ۴۹۔۴۶

۸۶۔ ایضاً،ص ۶۱۔۵۸

۸۷۔ایضاً،ص ۷۰

۸۸۔ ایضاً،ص ۹۰۔۸۴

۸۹۔اکبر الہ آبادی،کلیات اکبر الہ آبادی۔ص ۸۷

۹۰۔ڈپٹی نذیر احمد،ابن الوقت ۔ص ۱۰۹

۹۱۔ابوالکلام قاسمی،نوآبادیاتی فکر اور اردو کی ادبی وشعری نظریہ سازی مشمولہ مابعد جدیدت،اطلاقی جہات۔ص ۱۹۷۔۱۹۶